مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ القصص —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۂ القصص —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	جون 2008ء
مطبع	....	پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہِ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷' از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات واعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ القصص

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ 19

پہلا باب: سورۃ القصص (آیات 1 تا 6)

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ مختلف واقعات کا مقصد 21

باطل نظام کے خدوخال اور اس کا نتیجہ 22

انسانوں کی انسانوں پر حکومت کا دوسرا نام ملوکیت ہے 22

کسی انسان پر حکومت کرنے کا جذبہ محرکہ صرف دوسروں
کی کمائی کو حاصل کرنا ہی ہوتا ہے 23

ملوکیت کے استحکام کی خاطر وعظ و نصیحت کرنے والوں کا سہارا 23

انسانیت کی پوری تاریخ ہامانیت، فرعونیت اور قارونیت
کے گرد ہی گھومتی ہے 23

حق کی خاطر باطل کے نظام کو ختم کرنے کی سعی و کاوش 24

حق کی تو ایک کرن ہی گھٹا ٹوپ اندھیرے کو کافور کرنے
کے لیے کافی ہوتی ہے 24

لفظ صعود اور ارتقا کا قرآنی مفہوم 25

حق یہ ہے کہ ظلم کا مقابلہ حق کے ساتھ کیا جائے 26

سورۃ القصص میں داستان بنی اسرائیل کی تفصیل اور
حرف مقطعات کا ذکر 26

قرآن حکیم کی عربی مبین اور اہل حجاز 27

خدا تعالیٰ کی صفات کو مقطعات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے 27

انسانوں کی سطح پر تیار ہونیوالے قانون کی حالت 28

یہودیوں کے ہاں موجودہ تورات کی حالت اور قرآن حکیم کی عظمت 28

ایک فرانسیسی سائنسدان ڈاکٹر بوکائے کا اعتراف 29

داستانوں کو مان لینا اور بات ہے لیکن ان سے کوئی نتیجہ اخذ
کرنا دوسری بات ہے 29

اقلیت کے ساتھ اکثریت پر حکومت کرنے کا فرعونی طریق 30

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ علیہ السلام طلسم سامری 31

مذہبی پیشوائیت ہمیشہ ملوکیت کا سہارا بنتی ہے 32

فرعون کا لڑکوں کو ذبح کرنے کا تصور درست نہیں 32

عورتوں کے متعلق ایک غلط محاورہ 33

حکمرانی کے سلسلہ میں فرعون کی ایک دوسری چال 33

ذبح کے معنی ذلیل کرنے کے بھی ہوتے ہیں 33

فساد کیونکر پیدا ہوتا ہے یا کس طرح برپا کیا جاتا ہے؟ 34

سیاسی طور پر ملوکیت کے عملی خدوخال کا عکس 34

غلط معاشرے میں اندر ہی اندر استبدادی قوت کے خلاف پکنے والا لاوا 35

احسانِ خداوندی کو سمجھنے کے لیے تحریک پاکستان کی
داستان ایک زندہ مثال ہے 35
اس تحریک آزادی کی پوری تاریخ طلوع اسلام کے
فائلوں میں آج بھی موجود ہے 36
تحریک پاکستان کے دوران انگریز کا کردار، ہندو کا کردار،
مولانا ابوالکلام آزاد کا رویہ اور قائداعظم کے چار تاریخی الفاظ 36
انڈین نیشن کے خلاف محسنِ ملت سرسید احمد خان کی مجاہدانہ اذان 37
سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی مومنانہ فکر اور جگر سوزی
نے ملتِ اسلامیہ کے پژمردہ چہرے کو رونق بخشی 38
ہمارے لیے مشیت ایزدی کی طرف ابر سے رحمت کا
یہ لازوال حسین نظارہ نوید سحر ثابت ہوا 40
مملکت پاکستان کے حصول کا مقصد ایک ایسی مملکت ہے
جہاں قرآنی حکومت کے لیے تمکن حاصل ہو 40
تحریک پاکستان کے سلسلہ میں قائداعظمؒ کے زادِ راہ کی تفصیل 41
قائداعظم کا گاندھی کو مشورہ کہ "قوم کو سول نافرمانی نہ سکھاؤ" 42
دنیا میں سب سے عمدہ اور منافع بخش پیشہ مذہبی پیشوائیت کا پیشہ ہے 42

دوسرا باب: **سورۃ القصص** (آیات 7 تا 16)

سابقہ درس کی تجدید یادداشت 44
انسان نے دوسرے انسانوں کو اپنے تابع رکھنے کے
مختلف طریق اپنا رکھے ہیں 45
مذہبی پیشوائیت کی تھپکیاں 46
کسی بات کو شروع کرنے کا انداز 46
قرآنِ حکیم میں داستان حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ابتدا
اُن کی پیدائش سے ہوتی ہے 47
اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کا معاملہ اور مرزا غلام احمد قادیانی
کی نبوت کی حقیقت 47
عربی زبان میں وحی، نبی اور رسول کے الفاظ کا صحیح استعمال اور مفہوم 48
رسول کے لفظ کے استعمال کے سلسلہ میں ایک تاکید 49
قرآن حکیم نے شہد کی مکھی اور زمین و آسمان کو وحی کر رکھی ہے 50
رسول ہمیشہ مرد ہوتے تھے 50
کسی آسمانی کتاب کو قرآنِ حکیم کی طرح محفوظ نہیں کیا گیا 51
نزولِ قرآن کے متعلق ایک اہم نکتہ 52
ذاتِ خداوندی قرآن حکیم کے ذریعے ہر اہلِ ایمان سے
ہم کلام ہوتی ہے 53
مقامِ رسالت، ختم نبوت کی حقیقت اور وحی کی کیفیت 53
امت مسلمہ تیرہ سو سال سے کشف اور الہام کے چھلاوے
میں گرفتار رہے 54
وحی کے بالمقابل عقل انسانی کا مقام 55
داستان موسیٰ علیہ السلام کی ابتدا 55
انبیائے کرام کا تعلق ہمیشہ باوقار گھرانے سے ہوتا تھا 56
قوموں کے عروج و زوال کا انحصار بچوں کی تعلیم و تربیت پر منحصر ہوتا ہے 56
فرعون کے ہاں بچوں کو قتل کرنے کا تصور ٹھیک نہیں 57
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں مشیت خداوندی کا آغاز 57
صندوق کے سہارے دریا کی موجوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر 58

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے شاہی محلات کے اسرار ورموز
سے آگہی حاصل کرنا ضروری تھا 59
ماں کی مامتا اور اس کی تشنگی کا سامان 60
قرآن کا کوئی ایک لفظ بھی رموز سے خالی نہیں ہوتا 60
خدائے رحیم انسانی جذبوں کو کچلتا نہیں ہے بلکہ ان کی قدر کرتا ہے 61
انسانی جذبات کے ثمر بار ہونے کا سنہری اصول 61
قرآنِ حکیم کے انداز بیان میں ایمائیت کی اہمیت اور خصوصیت 62
دودھ پلانے کے بہانے ماں کی مامتا کو دلی سکون میسر آ گیا 63
بچپن سے جوانی تک کی پرورش نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو
ایک متوازی شخصیت بنا دیا 64
نبی کی زندگی کا اوائلی دور بھی سورج کی شعاؤں کی طرح
روشن اور چشمے کے پانی کی طرح صاف ہوتا تھا 64
نبی اکرم ﷺ کی قبل از نبوت کی زندگی بذاتِ خود ایک شہادت ہے 64
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قتل کا ذکر 65
قرآن حکیم کے نزدیک شیطان کا مفہوم 66
انسان کا ہر جرم اس کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے 66

تیسرا باب: **سورۃ القصص** (آیات 17 تا 28)

مجرم کے مقابلے میں رسہ گیر زیادہ مجرم ہوتا ہے 70
وکلا کا کردار 70
حاکم قوم کی ذہنیت 71
جبار کا قرآنی مفہوم ایک فرق کے ساتھ 71
حاکم قوم کے حکمرانوں کے حکومتی نظم ونسق کا ایک طریق 73
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدین کی طرف نقلِ مکانی 73
نبی کی قبل از نبوت زندگی کے خدوخال کی ایک جھلک 74
غیر قرآنی معاشی نظام کی روشِ زندگی 75
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کا غیر متبدل اصول 75
ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی ایک حدیث مبارک: خدا کی
زمین خدا کے بندوں کے لیے رکھو 76
ظلم واستبداد کے راج کا پیدا کردہ ماحصل 76
نبی کے گھرانے کی تعلیم وتربیت کی ایک جھلک 77
گزرے ہوئے زمانے کی ایک یاد کا ذکر 78
لفظ حیا کا قرآنی مفہوم 78
غلط نگہی یا بدنگاہی کے ردِعمل کا اظہار ہی تو زندگی ہے 79
فکرِ قرآنی کے ایک اور گوشے کی نشاندہی 80
نوعِ انسانی کے لیے حضرت عمرؓ فاروق کا عہد خلافت
ایک روشنی کا مینار ہے 81
لفظ امین کا قرآنی مفہوم 82
خدا تعالیٰ کی ایک صفت المؤمن بھی ہے 82
سابقہ دور میں معاشرتی رسم ورواج اور ان کی افادیت 83
آج ہمارا سارا اسلام ہندوانہ ہے 83
ہندو کی تنگ نظری اور بدذوقی کی کیفیت 84
سسرال کے ہاں بیچاری عورت کی حالت زار 85
قرآنِ حکیم کے نزدیک میاں بیوی کا گھر آزاد ہونا چاہیے 86
گھریلو زندگی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی تعلیم 86
چرواہے کی شکل میں نبوت کی ابتدائی زندگی 87
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت سے مصر کے گورنر کی سزا کی نوعیت 87

مملکت کے حاکم کے لیے راعی کے لفظ کا استعمال 88

چوتھا باب: سورۃ القصص (آیات 29 تا 30)

طور کے دامن میں حضرت موسیٰ کے احوال 89

حضرت موسیٰ کو مقام نبوت سے سرفراز کر دیا گیا 90

حضرت موسیٰ کی طرف وحی کے سلسلہ میں پیش کیے جانے والے عام مروجہ تراجم کی نوعیت 91

خدا کی طرف سے آواز آنے کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے 91

انسانی علم از خود حاصل کیا جاتا ہے جب کہ وحی عطا ہوتی ہے 92

انسانیت کی پوری تاریخ عقلِ انسانی کے تجرباتی طریق کی داستان ہے 93

وحی انسانی مشکلات کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے: اقبالؒ 94

وحی کا ماحصل یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں 94

فرمودۂ اقبالؒ: انسانی کوششوں اور وحی کے متعلق 95

وحی خداوندی ہر انسانی سوال کا جواب اپنے اندر لیے ہوئے ہے 95

منصبِ نبوت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت 96

حضرت موسیٰ کی تربیت اور آپ کا کردار خدا تعالیٰ کی نگاہوں میں تھا 96

انسانوں کی معاشرتی زندگی کا کنٹرول انسانوں کے ہاتھوں میں ہی ہوتا ہے 97

نبوت سے پہلے نبی کی زندگی کا کیریکٹر 97

آپ ﷺ نے اپنی چالیس سالہ زندگی بطور ثبوت پیش کی 98

نبی انسان کی افتادِ طبع زندگی کا انمول زیور ہوتا ہے 98

نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ مروجہ تراجم کے آئینہ میں 99

انسانی سیرت پر مختلف قسم کے اثرات کا وارد ہونا 99

نبی کی شخصیت اپنے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے 99

ذہنی جمود ان گنت تصوراتی خداؤں کو جنم دیتا ہے 100

فریب نفس اور اطمینان میں بنیادی فرق ہے 101

ذہنی اضطراب کے سلسلہ میں "معراج انسانیت" کے چند ایک اقتباسات 101

رموزِ حیات کی جستجو کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق کا رلائل کا بیان 103

علامہ اقبال کی سوچ جمود کا شکار نہ تھی 103

بادصبا کا پیغام کہ جمود تو موت کا دوسرا نام ہے 104

جناب پرویزؒ: کے دل کی دھڑکن کی وہ آواز جسے ہم سن نہ سکے پا نہ سکے 104

انسانی تگ و تاز کے لیے بہشت بھی آخری منزل نہیں 107

کشف والہام کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ یہ ایک گہری سازش ہے 107

حضور نبی اکرم ﷺ کا غارِ حرا میں مراقبوں کے تصورات کی حقیقت 107

مقام نبوت اور وحی کا نزول اس قسم کے افسانوں کی تردید کرتا ہے اور ان سے بہت بلند ہے 108

قرآنِ حکیم میں خضر کا لفظ ہی نہیں 108

وادیٔ طویٰ کے سلسلے میں ہمارے ہاں کے تراجم کی نوعیت 109

وحی انسانی زندگی کے طویل تجرباتی سفر کو لپیٹ کر اس میں آسانی پیدا کر دیتی ہے 109

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا پہلا حکم ایک انقلاب پیدا کرنا تھا 111

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی جانے والی آواز کا مقصدِ عظیم 111

لفظ طغی کا قرآنی مفہوم 112

پانچواں باب: سورة القصص (آیات 31 تا 43)

کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کا آغاز 114
خدا تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کی بعثت اور وحی کا
ماحصل تین گوشوں پر محیط ہے 114
انسانوں کے نظام میں مذہبی پیشوائیت کے ستون کا کردار 114
فرعون کے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت 115
خدا کے کام کی تکمیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں 115
دنیائے انسانیت میں انقلاب انسانوں کے ہاتھوں
ہی وقوع پذیر ہوتا ہے 116
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں بات کرنے کے لیے محاکاتی
انداز کو بھی اپنایا ہے 116
قرآنِ حکیم کے محاکاتی انداز کا مفہوم لسانِ عربی مبین
سے ہی سمجھنا چاہیے 117
احکام ملنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نفسیاتی کیفیت اور
خدا کی طرف سے ثابت قدمی کی ترغیب 118
میدانِ عمل میں ہر نبی منذر بھی ہوتا ہے اور مبشر بھی 118
ہاتھوں کی نورانیت کا مفہوم 118
ہر نبی کی ہر بات دلیل و برہان پر مبنی ہوتی تھی 119
شعبدہ بازی کا انسانی نفسیات پر اثر 119
ساحرین کی اصل حقیقت اور مناظروں کی اصلیت 119
خالقِ کائنات کی تعلیم اور نبوت کا مقام اس قسم کی
توہم پرستوں سے کہیں بلند تر ہے 120
قرآنِ حکیم کے محاکاتی انداز کو انہی تصورات کے تحت سمجھنا ہوگا 121
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق 121
اہل قرآن کے نزدیک ہاتھ کو یوں کر لیا کرو کے محاورے کا استعمال 122
قتل کے الزام کے علاوہ زبان کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ
کی مجبوری کی وجہ 122
فصاحتِ زباں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تاریخی افسانے 123
حضرت موسیٰ کے پاس یہ عصا کتاب مبین کے قوانین ہی تھے 124
کسی رسول نے کسی سانپ کے ذریعے کامیابی حاصل نہیں کی 124
ہمارے ہاں اسلاف کا معیار 124
ہمارے نزدیک تو حجت قرآنِ حکیم ہے، اسلاف کے اقوال نہیں 125
قانون کی Defintion (تعریف) 125
ظلم کا مفہوم 127
حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے نزدیک اصل سوال حقِ حکومت
کا تھا یعنی الٰہ خدا کو تسلیم کروانا تھا 127
قرآنِ حکیم تفسیروں اور ترجموں سے سمجھ میں نہیں آ سکتا 128
الٰہ کا مفہوم لا اِلٰہ کے الفاظ میں مضمر ہے 128
فرعون نے اپنے آپ کو رب کہا تھا 129
اگر دلیل نہ ہو تو انسان استہزا پہ اتر آتا ہے: استہزا اور
غصہ میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے 129
مذہبی پیشوائیت کی زبانی فرعون کی طرف سے تمسخر کی ایک جھلک 130
تکبر کا قرآنی مفہوم کبریائی ہے 131
انا للہ وانا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم 132
انسان کا ایک ایک قدم خدا کے قانونِ مکافات کی طرف
بڑھ رہا ہوتا ہے 132

انسان کے ہر عمل کا نتیجہ جانور کی دم کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہوتا ہے 133
لعنت کا قرآنی مفہوم گالی نہیں بلکہ خدا کی نعمتوں سے محروم ہو جانا ہے 134
داستان موسیٰ علیہ السلام میں نوع انسانی کے لیے ایک سبق آموز پیغام ہے 135
چھٹا باب: **سورة القصص** (آیات 44 تا 47)
قرآنِ حکیم کے اندر بیان کردہ واقعات کا مقصد 136
قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے واقعات کا بیان کرنا کیونکر ممکن ہوا 137
بائبل، قرآن اور سائنس کے حوالے سے پیدا ہونے والا
ایک سوال اور الجھن 138
ڈاکٹر موریس بوکائے کا تحقیقی طریقِ کار 139
قرآنی حقائق تک پہنچنے میں ڈاکٹر موریس بوکائے کی تگ و تاز
اور اس کا ماحصل 139
ہم قرآنی حقائق کو آفاق اور انفس میں دکھاتے رہیں گے 140
موریس بوکائے کی بائبل کو مسترد کر دینے کی وجہ جواز 141
ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنے کا طریق 142
قرآنِ حکیم نے کائناتی حقائق کو اس طرح بالمشافہ دیکھنے
والوں کو علما کہا ہے 142
موریس بوکائے کے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں
بائبل کا تذکرہ اور تاریخی شواہد 143
قرآنی حقائق کے سلسلہ میں فرعون کی لاش کا ذکر 144
ہمارے ہاں کی افسانہ نگاری تورات کی رہینِ منت ہے 144
قرآنی حقائق کی روشنی میں فرعون کے ڈوبنے کی وضاحت 145
آخر کار تورات کو بھی یہی کچھ تسلیم کرنا پڑا 145
قال رسول اللہ ﷺ کی بنا پر ہمارے ہاں کے تفسیری بیان 145
موریس بوکائے کی مسلمانوں سے اپیل 146
دورِ نبوت میں انسانی ذہن کی رسائی کی کیفیت 146
مقامِ نبوت سے خدا کو نکال دینے کا نتیجہ 146
آخر یہ سائیٹسٹ مسلمان کیوں نہ ہوا؟ 147
اسبابِ زوالِ امت کی وجہ جواز 148
نوعِ انسانی پر خدائے رحیم کی طرف سے رحمت کی بارش 148
آگاہ کرنے کی ذمہ داری ادا کرنے کی نوعیت اور اہمیت 149
انسانوں کے مستقبل کا فیصلہ انسانوں کے ہاتھ میں ہے 150
آگاہ کیے بغیر یا پیغام پہنچائے بغیر کسی پر تباہی نہیں آتی 150
قوموں کی ہلاکت کا قرآنی مفہوم 151
قرآنِ حکیم کا محاکاتی اور تمثیلی انداز بڑا پُر مغز اور بامعنی ہوتا ہے 151
آگہی مل جانے کے باوجود انسان اپنے جذبات کا غلام بنا رہتا ہے 152
انسان کے لیے غور و فکر کی اہمیت 152
جن و انس کی ذہنی کیفیت اور ان کا اندازِ زیست 153
حیوانات کو سوچنے والی صلاحیت سے نوازا ہی نہیں گیا،
یہ مخلوق تو تقلید پرست واقع ہوئی ہے 153
دوسرے انسانوں کے مقابلے میں ایک شرابی کی کیفیت 154
شراب کے نشے کے بالمقابل قوت کا نشہ کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے 154
نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد ایک آنے والے کا تصور
قرآنی فکر کے خلاف ہے 155
نبوت کے بعد کتاب کے وارثوں کا فریضہ 157
رسالت کے فریضہ کی ادائیگی کے متعلق وارثانِ کتاب
سے پوچھا جائے گا 157

ساتواں باب: **سورۃ القصص** (آیات 48 تا 49)

بنی اسرائیل کی الزام تراشی اور اس کا جواب 159
راہِ حق کو قبول کرنے کا طریق صرف علم و بصیرت کی راہ
کو اختیار کرنے میں ہے 160
سحر کا حقیقی ترجمہ ''جادو'' نہیں بلکہ ''فریب دہی'' ہے 161
سرزمین عرب میں یہودیوں کی کیفیت 161
آج یورپ اور امریکہ کی معاشی دنیا پر یہود کی اجارہ داری مسلط ہے 161
نبی اکرم ﷺ کے دور میں مدینے کے اندر یہودیوں
کی طرف سے مخالفت کی وجہ 162
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں غیر مسلموں کے
حقوق کے تحفظ کی کیفیت 162
دورِ فاروقی رضی اللہ عنہ میں اسلامی مملکت سہولت فراہم کیے بغیر
کسی سے ٹیکس وصول نہیں کر سکتی تھی 163
مملکت کے خلاف اہل یہود کا وطیرہ اور ان کی ذہنیت 163
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں تورات اور عہد نامہ عتیق کی کیفیت 163
''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں'' اِن پر لکھی جانے والی
ایک کتاب کا ذکر 164
دین خداوندی کے متعلق قرآن حکیم کا فرمان 164
ملت کے اندر فرقہ بندی دین خداوندی کے ساتھ
بغاوت ہے، شرک ہے، ایسا کرنے والا مملکت کا باغی ہے 165
ہمارے ہاں مذہبی دنیا کی حالت 166
مذہبی دنیا غیر مسلم کو تو برداشت کرتی ہے امت واحدہ
کے تصور کو برداشت نہیں کرتی 166
قرآنِ حکیم کے غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے
جزئیات کی تبدیلی کا معاملہ 167
قرآنِ حکیم کے نزدیک شیطان کی تعریف 168
ناسخ و منسوخ کی اصل حقیقت یعنی شیاطین کی کارگزاری 168
خدا تعالیٰ کی بادشاہت کے اندر اپنے اقتدار کا سکہ رائج
کرنے کی جسارت 169
بنی امیہ کے دور تک قرآنِ حکیم کے علاوہ کسی اور کتاب
یا فقہ کا تصور نہ تھا 170
مسئلہ معہ دو واز اڑھائی سو سال کے بعد وجود میں آئی لیکن کیسے؟ 170
ہر کسی کی فقہ کی عمارت کا دارومدار انہی روایات کی بنیاد پر استوار ہے 171
قرآن حکیم کے برعکس ان روایات اور فقوں میں
قدم قدم پر اختلاف ہے 171
اس متضاد کیفیت کا حل متعدد آیاتِ قرآن کی منسوخی
کی شکل میں پیش کر دیا گیا 172
قرآنِ حکیم نے اپنی کسی آیت کو منسوخ کرنے کا اعلان نہیں کیا 172
شاہ ولی اللہؒ نے آخر پر 5 آیات کی منسوخی پر یہ بات مصلحتاً ختم کردی 173
قرآنِ حکیم سات زبانوں میں نازل ہوا: مودودیؒ کا فرمان 173
رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک منسوب کردہ واقعہ 174
ہماری ہزار سالہ تاریخ اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے 175
قرآنِ حکیم کے متعلق یہودیوں کے اعتراض پر نبی اکرم ﷺ
کا ان کو جواب 175
نماز کے سلسلہ میں آج فرقوں کے اختلاف کی حالت 175

نماز کے سلسلہ میں چوہدری ظہور الٰہی کی کوٹھی پر
علمائے کرام کا ایک عملی مظاہرہ 176
پاکستان میں امام کعبہ کی آمد پر لاکھوں نمازیوں کا اجتماع
اور پھر داتا صاحب کے مزار پر حاضری 176
مولانا نورانیؒ کا فتویٰ: امام کعبہ کے پیچھے نمازیں پڑھنے
والوں کی ساری نمازیں باطل ہیں 177
نورانیؒ صاحب اور جنرل ضیا کی باہمی ملاقات میں
سات زبانوں میں قرآن نازل ہونے کا ذکرِ خیر 177
مولانا نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام کعبہ کی اہمیت وتکریم 178
نبی اکرم کی عملی زندگی کے برعکس علیحدہ علیحدہ طریقہ نماز کی ادائیگی 178
فرقوں کی موجودگی میں ایک ضابطہ قوانین کا نفاذ ناممکن
اور سعی لاحاصل ہے 179
فرقوں میں اپنی اپنی خواہشات کا اتباع ہوتا ہے حدود اللہ کا نہیں 179

آٹھواں باب: **سورة القصص** (آیت 50:
زندگی اور جبلی تقاضے)

روزِ اوّل سے آخر تک دین کے اصولوں میں کوئی
تضاد ہے اور نہ کوئی فرق 180
نوع انسانی کے نزدیک انسانی جذبات کا اتباع اور اس
کی حدود کے تعین کا مسئلہ 181
سیکولر نظام کا بنیادی فلسفہ 181
انسانی فکر کا ایک دوسرا پہلو یعنی جذبات کی مکمل نفی
جو تصوف کی دنیا کا ماحصل ہے 182
سیکولرازم کا نتیجہ پوری دنیا کی تباہی 182
نوع انسانی چودہ سو سال سے اسی مرضِ کہن کی شکار چلی آ رہی ہے 183
قرآن حکیم کے نزدیک نفسیاتی طور پر انسانی جذبات کا
مقام اور معاشرتی جرائم کا حل 183
فکرِ قرآنی کی روشنی میں انسانی ہیت کا تجزیہ 184
انسانی جسم کو متحرک رکھنے والی شے کی خصوصیات 185
تغلب کے جذبے کے علاوہ حیوانات میں افزائشِ نسل
کے جذبے کی نوعیت 185
انسان کی فضیلت اختیار وارادہ کی نعمت کی ہی رہین منت ہے 187
حیوان کے بالمقابل انسانی اختیار وارادے کے کرشمے 188
انسانی جذبات کی Satisfaction (تسکین) کا
طریق ان کے دبا دینے میں مضمر نہیں 188
قدرت نے کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی، خدا شر کا خالق ہی نہیں 189
انسان کے حیوانی جذبات کو بے لگام چھوڑ دینے کا نتیجہ
جرم کی شکل اختیار کرتا ہے 190
حیوان قانون کے تصور سے آگاہ ہی نہیں ہوتا 191
قرآن حکیم انسان کی بے مہابہ زندگی کو کنٹرول کرنے
کا طریق عطا کرتا ہے 191
حدود اللہ کے بغیر عقل وفکر کی چابکدستی کی لامحدودیت 192
یہ ہے عقل بے باک کہ جس کو قندیل آسمانی کی احتیاج
ہر آن محسوس ہوگی 192
لفظ ھوٰہ کا قرآنی مفہوم 193
لفظ تسبیح کا قرآنی مفہوم 193
انسان کے لیے احسن تقویم کے مدارج کو برقرار رکھنے کا طریق 194

معراجِ انسانیت تک پہنچنے والی اقدار کو وضع کرنا انسانی
عقل سے ماورا ہے 195
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ 195
ایمان کی پختہ شعوری کے بغیر عمل صالح کا تصور ممکن ہی نہیں 196
زندگی کا حسین ترین ہو جانا چہ معنی؟ 196
انسان کے لیے اس کرہ ارض کی زندگی جہانِ فردا کی پہلی کڑی ہے 197
خدا تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق انسان کی موجودہ
زندگی قابل نفرت شے نہیں 198
جسم انسانی میں اسیر "مرغِ جاں" کی قدر و قیمت اور ذاتِ انسانی
کے لیے حیاتِ جاوید کو اپنانے کا طریق 199
نبی اکرم ﷺ کی 13 سالہ مکی زندگی کی مصروفیات کا ماحصل 200
زاویہ نگاہ بدل جانے کے نتائج 200
انسانی جذبات کو تباہ کیا ہی نہیں جا سکتا 200
نظامِ مصطفیٰ کی اصطلاح کے بجائے نظام خداوندی یا
حکومت الٰہیہ کے الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے 201

نواں باب: **سورة القصص** (آیات 51 تا 56)

وحی کی طرف سے عطا کردہ اصولِ حیات ازل سے ابد تک
ایک ہی رہے ہیں 202
اہل مذاہب میں سے ایمان لانے والوں کو دوہرا اجر دیا جائے گا 203
مذہب کی تبدیلی کے باعث پیش آنے والی اذیت ناکیاں 204
قتل مرتد کے فتوی کی پیدا کردہ مشکلات 204
اہلِ قریش کے لیے ایمان لانا کوئی اتنا مشکل نہ تھا 205
مذہب سے دین کی طرف رجوع کرنا ایک کٹھن منزل ہے 205

قرآنِ حکیم کی ایک آیت کا غلط مفہوم 206
زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے کی خاطر انسان کو کئی ایک
کٹھن منازل سے گزرنا ہوگا 206
سخت ترین مخالفت کے باوجود بلند اقدار کی پاسداری کا تصور 207
تخریبی سوچ کا مقابلہ تعمیری عمل سے 208
غلط راستے پر چلنے والا کبھی صحیح راستے پر نہیں پہنچ سکتا 208
قرآنی سیاست کا ایک سنہری اصول:
تنگ نظری کی بجائے فراخ دلی کا عمل 208
لفظ لغو کا قرآنی مفہوم 209
قانونِ مکافاتِ عمل خود نتیجہ مرتب کر دے گا 209
باہمی تعلقات منقطع کرنے کے باوجود دلی طور پر ہمدردی کی کوشش 210
لفظ متقی کے غلط استعمال کی وضاحت 211
لفظ ہدایت کے سلسلہ میں تین لوازمات کی وضاحت 212
تصریفِ آیات کی روشنی میں جاہلیت کے دو گوشوں کی وضاحت 212
انسان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ زندگی کی اہمیت کے پیش
نظر اس کے معاملہ میں سنجیدہ ہو 213
راستہ بتایا تو جا سکتا ہے، اس پر چلایا نہیں جا سکتا 213
آگہی کی تڑپ ہی انسان کو صحیح راستے کی طرف آمادہ کرتی ہے 214
قومی معاشرے کی حالت قوم کی نفسیاتی تبدیلی کی ہی
رہین منت ہوتی ہے 215
صحیح راستے کو اپنانے کے سلسلہ میں طبعی یا معاشرتی تعلقات کی کیفیت 215
صحیح راستے کی طرف آمادگی کے بارے میں محبت جیسا
قیمتی اور مضبوط رشتہ بھی کارگر نہیں ہوتا 216

انسانیت کی پوری زندگی میں نازک ترین مقام شخصیت پرستی کا مقام ہے 216
عقلِ انسانی کا پیدا کردہ مذہب، مقامِ نبوت، مقامِ وحی اور
صداقتِ محمدیؐ کا علیحدہ علیحدہ باہمی فرق 217
ایک زندۂ جاوید بے مثل کریڈٹ کی حامل شخصیت ﷺ 218
دین میں بھی ذرہ بھر شخصیت پرستی نہیں ہوتی 218
ختم نبوت کے اعلان کے بعد کسی بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی 219
مامور من اللہ کا عقیدہ خودساختہ تصور ہے 219
مذہب کا حوالہ ایک شخصیت تک آ کر رک جاتا ہے جب
کہ دین کی سند قرآن ہے 220
آج کی حالت زار اور غلط تراجم کی کیفیت 220
قرآن حکیم کا فرمان 221
دسواں باب: **سورۃ القصص** (آیات 56
(بارِ دگر) تا 61)
قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کو شخصیت پرستی کے بجائے
اصول پرستی کا درس دیتا ہے 222
شخصیت پرست قوموں کا مستقبل ہمیشہ زوال پذیر ہوتا ہے: کیوں؟ 223
قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے باوجود آج ہمارے ہاں
مذہب ہی رائج ہے، دین نہیں ہے 224
حقیقت سے ماورا اور متضاد نظریات انسانی زندگی کو
اجیرن بنا دیتے ہیں 225
مجھے کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں: پرویزؒ 226
شیعہ حضرات کے ہاں ایک عقیدہ رجعت کا بھی ہے 226
ایمان کی شرطِ لازم 227
لفظ ''من یشآء'' کا قرآنی مفہوم اور ہمارے پیش کردہ تراجم 227
انسانی اختیار و ارادہ کی اہمیت اور اس کی کیفیت 228
مومن بنانے کے سلسلہ میں زبردستی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 229
ایمان لانے کا عمل اور رِجس کا مفہوم 229
قرآنی ہدایت کے شفاف ہونے کے ثبوت میں کائنات کی
مثال کافی ہے 230
ضد کا عنصر اور مالی مفاد، حق کو حق تسلیم کرنے میں سب سے
بڑی رکاوٹ بنتے ہیں 230
کعبے کے مجاور ہونے کی بنا پر عرب میں قریش کے وقار کی کیفیت 231
خادمین کعبہ کا فریضہ اور ان کی فضیلت 232
قوموں کی تباہی کا سبب صرف غربت ہی نہیں ہوتی 232
غربت کی نسبت دولت کا نشہ زیادہ تباہ کن ہوتا ہے 233
صرف شرفِ انسانیت کا چراغ ہی بستیوں کو روشن کرتا ہے 233
قوموں کے زوال کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی ایک پیش کردہ مثال 234
عربی زبان میں کَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ کا مفہوم نعمتوں کو
چھپا کے رکھ لینا ہے 234
انسانی زندگی کے لیے بھوک اور خوف کا عذاب سب
سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے 234
اجڑی ہوئی بستیوں میں پھر کوئی شخص مالکانہ حقوق کا دعویٰ
کرنے والا باقی نہیں رہتا 235
فرعون کی فرعونیت کا انجام قوموں کے لیے باعث عبرت ہے 235
قرآن حکیم کے معاشی نظام میں ملکتِ زمین کا یہی اصول ہے 236

ذاتِ خداوندی انسانوں کو زمین استعمال کے لیے تو
دیتی ہے اس کے مالکانہ حقوق نہیں دیتی 236
خدا تعالیٰ کسی قوم کو بھی متنبہ کیے بغیر تباہ نہیں کرتا 237
قوموں کے مرضِ کہن کا علاج مملکت کے سرکردہ
اعلیٰ با اختیار لوگوں کی اصلاح میں ہے 237
ختم نبوت کے بعد رسالت کا فریضہ پوری امت کی ذمہ داری ہے 238
زندگی دو تصورات کو محیط کیے ہوئے ہے 238
خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے اجرِ عظیم کے تصور کا ثبوت 239
زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود 239
فریبِ قلب سے ماورا زندگی ہی کامرانیوں کی زندگی ہے 240
اگر زندگی کی خوشگوار و شاداب ندی ایک جگہ رک جائے
تو پھر وہ جوہڑ بن جاتی ہے 240

گیارھواں باب: **سورة القصص** (آیات 62 تا 69)

دو مختلف نظریات رکھنے والوں کے لیے دو مختلف نتائج و عواقب 242
غلط نظام کو تشکیل دینے اور اسے اپنانے والوں کے
باہمی مکالمے کا ایک محاکاتی انداز 243
ہمارے پیچھے لگنے والوں کا تو اپنا مفاد وابستہ تھا: لیڈروں کا بیان 244
قرآن حکیم کی طرف سے فردِ جرم کی تفصیل 244
اپنے سامنے نتائج کو دیکھ کر وہاں ایک بدحواسی کا عالم ہوگا 244
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے 245
لفظ جہنم کا مفہوم اور موجودہ زندگی کی کیفیت 246
بقول علامہ اقبال رحمہ اللہ ''یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں'' ہے 246
ہم نے اپنے ہر عمل کا نتیجہ قیامت تک اٹھا رکھا ہے 247
قرآن حکیم کے مروجہ تراجم نے الفاظ و معانی میں بڑی
دُوری پیدا کر دی ہے 247
خود پرستی ایک عجیب و غریب فریب ہے 248
غلامی ہر قسم کی محرومیوں کو جنم دیتی ہے 249
قومی اسمبلی میں چار چار بیویوں کی ممانعت پر کم از کم
ایک لونڈی کی تمنا کا اظہار 249
نوعِ انسانی کے لیے بدترین غلامی کی شکل قلب و نظر کی ناپختگی ہوتی ہے 250
دینِ خداوندی پہاڑ کی ایک ایسی چوٹی ہے جس میں انسان
کا ہر قدم بلندی کی طرف اٹھتا ہے 250
اقبال رحمہ اللہ کے ہاں غلامی کی تعریف 250
قرآنِ حکیم نے انسان کی اس زندگی کی تباہی و بربادی
کو جہنم سے تعبیر کیا ہے 252
عالم گیر انسانیت کا عالم گیر سطح پر ربوبیت عالمینی کے لیے
اٹھ کھڑے ہونے کا نام یومِ قیامت بھی ہے 254
قرآنی لفظ استکبار اور استضعفوا کا مفہوم 255
مجرموں کے کٹہرے میں مجرموں کی باہمی تکرار کا منظر
اور قرآنِ حکیم کا ارشاد 255
وہاں ہر کوئی ایک دوسرے پر الزام عائد کرے گا 256
قرآنِ حکیم کی بصیرت افروز تعلیم 257
قرآنِ حکیم کی نظر میں فلسفہ اجتماعیت کی اہمیت 258
خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر دو فریقین کے لیے کیا جانے والا فیصلہ 258
معاشرتی طور پر تباہی سے بچنے کے لیے پہلے ہی انتظام کرنا ہوگا 259

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں سوشیالوجی کو اپنانے کے اصول بڑی
وضاحت سے دے رکھے ہیں 260
ہر انسان کا نفع ونقصان یا تباہی و بربادی پورے
معاشرے کی بدنظمی کا نتیجہ ہوتی ہے 260
سوال و جواب کا یہ تمثیلی انداز یہاں کی معاشرتی زندگی کے متعلق ہے 261
قرآن حکیم کی یہ ساری تعلیم ہماری اس زندگی کو سنوارنے کے لیے ہے 261
مہلت کا وقفہ خدا کی کرم نوازی ہے لیکن ایک قانون کے تحت 262
ایک اچھے نظام کی مثال سرسبز وشاداب کھیتی کی مانند ہے 263
قانون مشیّت کے مطابق نشوونما کا ہونا 264
صرف نشوونما یافتہ صلاحیت ہی طبعی قانونِ انتخاب کے
تحت آگے بڑھتی ہے 264
خدا تعالیٰ اپنے کسی قانون میں دوسرے کو شریک نہیں ہونے دیتا 265
بارھواں باب: **سورۃ القصص** (آیات 69 تا 77)
نظریہ ارتقا کے بارے میں اہل یورپ کی تحقیقی کوشش اور نتائج 268
ہمارے یہاں زندگی کے خاتمے کے لیے سورۃ یٰسین سنادی جاتی ہے 269
قانون سلیکشن کے تحت تخلیقی عمل کی بنا پر آج کے انسان
کی بھی ارتقائی منازل رواں دواں ہیں 270
کوئی انسان بھی قانون سازی اور اقتدار میں خدا تعالیٰ
کی ہمسری نہیں کر سکتا 271
قوموں کی موت وحیات کا فیصلہ دلوں میں گزرنے والے
خیالات کی بنا پر ہوتا ہے 271
موسمِ خزاں اپنے اندر آنے والی بہار کی نوید لیے ہوئے ہوتا ہے 272
لفظ ''حمد'' کا قرآنی مفہوم 272
ظالم کی موت اپنے ساتھ مظلوم کے لیے زندگی کا پیغام
لیے ہوئے آتی ہے 273
خدا تعالیٰ کے ہاں قانون کی ایسی حکمرانی ہے جو ربوبیت
عالمینی کی مظہر ہے 273
خدا تعالیٰ کے قانون کی نظروں سے کوئی شخص بھی پوشیدہ نہیں 274
قرآنِ حکیم کے بات کرنے کا انداز دو طرح کا ہے 275
ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ کو قرآن حکیم میں باہمی ربط ہی نظر نہیں آتا 275
قرآن کے حقائق تک پہنچنے کے لیے بصارت کی ضرورت ہے 276
صدیوں سے ہماری سوچ اندھی تقلید کی اسیر ہونے کے
باعث معدوم ہو چکی ہے 277
نیند کے اندر بھی سامان نشوونما پوشیدہ ہے: موجودہ سائنسی تحقیق 277
تصوف کی ان وادیوں کا مسافر'پرویز' 282
غلط نظام میں جسمانی Cells کا بننا محال ہو جاتا ہے اور
پھر اس میں رزق کی بہار نہیں آتی 282
ذہنی اور قلبی سکون کے لیے اسلامی مملکت کا فریضہ 283
کائنات کے متعلق سر جیمز جینس کی تحقیق' موجودہ سائنس
کا کمال اور قرآن حکیم کا ربط 284
مکافاتِ عمل اور عدالتِ خداوندی کا یہ نقشہ بات کو
سمجھانے کے سلسلہ میں ہے 285
قرآنِ حکیم کے ربط کے سلسلہ میں ریڈیو پر ایک
علامہ صاحب کا خطاب 286
قرآنِ حکیم میں قارون کا ذکر بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے 286

مقروض کا دبنا حاکم کے ڈنڈے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے 287
معاشرے کا حسن ہی انسانی زندگی کے حسن کا مظہر ہے 288
طبقاتی تقسیم معاشرتی حسن میں بگاڑ پیدا کرتی ہے اور اسے فساد کہتے ہیں 288
نظامِ سرمایہ داری کی پیش کردہ دلیل یہ ہے کہ یہ دولت
میرے ہنر کی پیدا کردہ ہے 289
قارون کی یہ داستان، داستانِ پارینہ نہیں بلکہ ہر دور کی کہانی ہے 289
قرآنِ حکیم کا جواب نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے 290
دیکھنا یہ ہے کہ انسان نے یہ صلاحیتیں کہاں سے حاصل کیں 291
دراصل انسانی صلاحیتوں اور معاشرے کے تعاون کو اپنا
ذاتی سمجھ لینا فریبِ نفس ہے 291
قرآنِ حکیم کا معاشی نظام، قرآنِ حکیم کی تین آیات
میں بیان کر دیا گیا ہے 292
تیرھواں باب: **سورة القصص** (آیات 78 تا 85)
قارون کے حوالے سے پیش کردہ معاشی نظام کی
اساس اور اس کا جواب 294
قرآن حکیم کے نزدیک نظامِ سرمایہ داری فتنے کی جڑ ہے 296
قرآن حکیم کے نزدیک مساوات کا مفہوم یا معیار 296
نظامِ سرمایہ داری وجہ نزاع کیوں؟ 297
انسان کو صلاحیتیں دینے کا جو مقصد تھا وہ اسے پورا کرنا ہوگا 298
قیامت کا غلط تصور انسان کو غافل کر دیتا ہے 298
خدا انسانی اعمال کے نتائج کے ظہور کے لیے بڑا
سریع الحساب واقع ہوا ہے 298
اعمال کے نتائج تو غیر محسوس طور پر برابر انسان کا پیچھا
کرتے چلے آتے ہیں 299
انسان کا ہر قدم خدا کے قانون کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے 300
فکرِ قرآنی کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ ایک یادگار ملاقات 301
انسان سے خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مالک بن
جانے کا ثبوت طلب کیا جائے گا 302
اقبالؒ کا کمیونسٹوں سے کمیونزم کے متعلق ایک بنیادی سوال 302
خدا کو ساتھ شامل کرنے کا مفہوم 303
کمیونزم بذاتِ خود ایک مذہب ہے 303
مارکس کے ہاں اسی اساس کی کمی تھی جس کی بنا پر وہ خدا
کو ساتھ ملانے سے قاصر رہا 304
کمیونزم کی موجودہ حالت 305
قرآنِ حکیم کا معاشی نظام اپنے اندر مختلف پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے 305
بچپن کی تربیت اور تاریخی حقائق کی روشنی میں صفات مومن 306
سرمایہ داری نظام کے متبادل ایک اور نظام 307
''حسف'' کے لفظ کا قرآنی مفہوم 308
رزق وہی رزق ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق میسر آئے 309
لفظ علوا کا مفہوم اور صفاتِ مومن کی تشریح 309
نوعِ انسانی کی کبریائی کا راز اقتدارِ خداوندی کو اپنانے میں ہی مضمر ہے 310
نظامِ خداوندی میں انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کا
ملاپ سب سے بڑا شرک ہے 311
ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا استحکام 311
قوموں کی تعمیر اور جہانِ نو کی نمود ہمیشہ افکارِ تازہ کی رہینِ منت ہوتی ہے 311
اقبالؒ کی نظر میں کمیونزم کا تجزیہ 313
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے بالمقابل سوشلزم بھی
نظامِ سرمایہ داری پر ہی استوار ہے 314

Wages(اجرت) کا تصور قرآنی نظام کو قائم کر ہی نہیں سکتا 315

آج کا دَور بھی Export of Men (انسانوں کی برآمد) کا دَور ہے 315

قرآنِ حکیم نے کسی انسان کے لیے محنت کش یا مزدور کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا 315

قرآنِ کریم کے نزدیک جو انسان محنت نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں 316

نظام سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ طبقاتی تقسیم کے باعث تباہی ہے 316

نبی اکرم ﷺ کو کامیابی کی نوید 316

چودھواں باب: **سورۃ القصص** (آیات 86 تا اختتام)

داستانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم علیہ السلام کی کشمکش حیات میں باہمی مماثلت اور کامرانیوں کی نوید 318

مقامِ نبوت اور علم انسانی میں مایہ الامتیاز بنیادی چیز 319

نبوت سے قبل نبی کی شخصیت 319

ہزار کوشش کے باوجود انسانی تصورات دل کی رنگینی سے مُبرّا نہیں ہو سکتے 319

عقلِ انسانی کے مقام اور وحی کی رفعت میں ایک بنیادی فرق ہے 321

قرآنی نظام میں شرفِ انسانیت کے مقامِ بلند کا راز مضمر ہے 322

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ارشادِ خداوندی 322

انسانیت پر مذہبی پیشوائیت کے فتووں کا راج ظلم واستبداد کی بدترین شکل ہے 322

فرعون کی داستان کے ذکر کے بعد ہامان کے تذکرے کا مقصدِ عظیم 323

معاشرتی طور پر انسانیت کے لیے وحی کی اقدار قوانین فطرت کی طرح اٹل بھی ہیں اور نتیجہ خیز بھی 323

خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ 324

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان کے مایوس ہونے کی وجہ 324

صبر واستحکام کی آبیاری کے لیے باہم پرواز کے لیے دو پرندوں کی ایک لازوال مثال 325

ایمان کی قوت اور جذبۂ استقامت' کامرانی کی سند ہے 326

کسی انسان کو بھی آئین سازی کا حق حاصل نہیں کیونکہ خدا کے ہاں یہی شرکِ عظیم ہے 327

قانون سازی کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کردار 327

ایمان کسے کہتے ہیں' شرک کیا ہے' اور کفر کیا؟ 328

خدا کے احکامات کی اطاعت کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ شرک ہے' توحید نہیں ہے 329

مروجہ غلط تراجم کی ایک مثال لفظ ''فان'' یا ''ھالک'' کا غیر قرآنی مفہوم 330

''فان'' اور ''ھالک'' کے معنی معدوم ہونے کے بجائے تغیر رونما ہونے کے ہیں 330

خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مقابلے میں انسانی قانون ہمیشہ تغیر پذیر واقع ہوا ہے 331

توحید کی خصوصیت' عظمت اور منفعت 332

وحی انسان کو اطمینانِ قلب کی نعمت سے نوازتی ہے 332

خدا تعالیٰ کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہونے کے باعث اسے علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کیا جاتا ہے 333

حقیقت ہمیشہ اپنے زورِ دروں سے اپنے آپ کو منوا لیتی ہے شرط صرف غور وفکر اور استقامت کی ہے 333

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

''قرآن حکیم کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است...... ہمارا خیال ہے کہ نوعِ انسانی کی عقل وفکر کو جلا بخشنے والی یہ قندیل آسمانی اس کرۂ ارض پر اپنی نوعیت کی ایک ایسی بے مثل کتاب ہے کہ جس کے متعلق خود باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

عظمتِ قرآن کے متعلق خدائے علیم کا ارشاد

''ان سے کہو کہ اس قسم کے منفرد ضابطۂ حیات کا بلا مزد و معاوضہ مل جانا خدا کے فضل و کرم سے ہے جسے تم کسی قیمت پر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انہیں چاہیے کہ اس کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ کیونکہ یہ ہر اس شے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے جسے تم اپنے ہاں جمع کرتے ہو۔''

جہاں تک اس سورۃ القصص کا تعلق ہے محترم پرویزؒ کا کہنا یہ ہے کہ

''القصص سے ذہن قصوں اور داستانوں کیطرف منتقل ہو جاتا ہے اور قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ اور انبیائے گزشتہ کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ قصوں اور کہانیوں کی کتاب نہیں ہے' نہ ہی یہ عام تاریخی سرگزشتیں ہیں۔ تاریخی واقعات تو ضرور ہیں لیکن ایک تاریخ کی کتاب کے انداز سے یہ بات نہیں بیان کی گئی' نہ ہی اس سے مقصد صرف واقعات کو سامنے لانا ہے۔ اس کا ایک بلند مقصد ہے۔ اُس مقصد کی صداقت کی شہادت کے طور پر تاریخی واقعات' اقوامِ سابقہ کی داستانیں' انبیائے کرام علیہم السلام کے قصے' پیش کیے جاتے ہیں۔ قرآن جو ایک قانون یا اصول بیان کرتا ہے' اُس کی صداقت کی شہادت کی تائید میں یہ قصے یا جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں' اس سے مقصد اُن کی تائید کرنا ہے۔ وہ بنیادی مقصد یا اصول کیا ہے؟ دو لفظوں میں تو یہ ہے کہ آدم کو پیدا کیا تو ساتھ ہی ابلیس کو پیدا کیا۔ عام الفاظ میں یہ بات ہے۔ اور اُس کے بعد ابلیس نے مہلت مانگی اور مہلت دی گئی کہ ہاں جب تک آدم ہے اُس وقت تک تم بھی رہو گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو کشمکش ہے آپ اسے خیر و شر کی کشمکش کہیے' Good & Evil (خیر وشر) کی کہیے یا یوں سمجھیے کہ ایک باطل پر مبنی نظام ہوتا ہے ایک

الحق، یہ ان کے درمیان کشمکش ہے''۔

سورۃ القصص میں داستانِ بنی اسرائیل کے جن مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنے ہاں ایک منفرد انداز اور سوچ لیے ہوئے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح طور پر نکھر اور ابھر کر سامنے آ جائے گی، قوموں کی تعمیر اور جہاں نو کی نمود ہمیشہ افکار تازہ کی رہین منت ہوتی ہے۔

سورۃ القصص میں داستانِ بنی اسرائیل کے علاوہ خاندان نبوت کے کئی ایک انبیائے کرامؑ یعنی حضرت شعیبؑ، حضرت نوحؑ، حضرت صالحؑ، کی طرف سے وحی کی پیش کردہ تعلیم کا تذکرہ اس قدر وضاحت سے پیش کیا گیا ہے کہ جس سے عقل انسانی پر توہم پرستی کے باعث پیدا ہونے والے انگنت مصائب وآلام سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ النمل کے بعد محترم پرویزؒ نے سورۃ قصص میں ایک بار پھر ایک فرانسیسی سائنسدان ڈاکٹر مورس بکائے کا بھی ذکر کیا ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ قرآن حکیم کے بیان کردہ حقائق کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لیے کائنات کا مطالعہ کسی قدر ضروری قرار پاتا ہے۔ پھر یہ کہ وحی کی حقیقی تعلیم تک پہنچنے کے لیے ایک قرآنی محقق کو کون کون سے اصول وضوابط پیش نظر رکھنے پڑتے ہیں اور اگر ان امور کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو نوع انسانی تنہا عقل کے باعث صدیوں سے جہالت اور لاعلمی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی اور مشکلات کے گرداب میں الجھی رہتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس حقیقت کی وضاحت ذیل میں دیئے گئے ایک چھوٹے سے واقعہ سے بخوبی ہو سکے گی جس سے قرآن حکیم کی حقیقت کشا تعلیم کا ثبوت واضح طور پر میسر آ سکے گا۔

ڈاکٹر مورس بکائے کا ایک پادری سے اہم سوال

عزیزانِ من! پھر اس نے اپنے ہاں کے پادریوں سے پوچھا کہ بھائی صاحب! بات ذرا صاف کر کے مجھے بتا دیجیے۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اگر خدا نے یہ کچھ کہا ہے، مثلاً یہی چیز کہ زمین گول نہیں چپٹی ہے، ساکن ہے، اس قسم کی چیزیں اُس نے بہت سی لکھی ہیں اور اُس نے کہا ہے کہ اگر جیسا تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے تو معاف رکھیے تو پھر وہ خدا تمہارا بڑا ہی بے خبر اور جاہل ہے اور وہ خالقِ کائنات ہو نہیں سکتا، اُسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ جو زمین میں نے بنائی ہے وہ گول ہے کہ چپٹی ہے۔ اور اگر وہ خدا اِس قسم کا ہے کہ اُسے ان تمام چیزوں کا علم ہے وہ خالقِ کائنات ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب وہ کیا دے سکتے تھے!! اُس نے کہا کہ یہ دو مذہب عیسائیت اور یہودیت تو یوں چھٹ گئے۔ وہ دونوں بائبل کو مانتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ حق کی تو ایک کرن ہی گھٹا ٹوپ اندھیرے کو کافور بنانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

محمد اشرف ظفر

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

۲۴۔۶۔۲۰۰۸

پہلا باب: سورۃ القصص (آیات 1 تا 6)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی وَ فِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ
لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَ جَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا یَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَۃً
مِّنۡہُمۡ یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَہُمۡ وَ یَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۴﴾ وَ نُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ
عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ نَجۡعَلَہُمۡ اَئِمَّۃً وَّ نَجۡعَلَہُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ ﴿۵﴾ وَ نُمَکِّنَ
لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ نُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ وَ جُنُوۡدَہُمَا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1978ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی پہلی آیت سے ہوتا ہے: (28:1)

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ مختلف واقعات کا مقصد

القصص سے ذہن قصوں اور داستانوں کیطرف منتقل ہوجاتا ہے اور قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ اور انبیائے گزشتہ کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ قصوں اور کہانیوں کی کتاب نہیں ہے' نہ ہی یہ عام تاریخی سرگزشتیں ہیں۔ تاریخی واقعات تو ضرور ہیں لیکن ایک تاریخ کی کتاب کے انداز سے یہ بات نہیں بیان کی گئی' نہ ہی اس سے مقصد صرف واقعات کو سامنے لانا ہے۔ اس کا ایک بلند مقصد ہے۔ اُس مقصد کی صداقت کی شہادت کے طور پر تاریخی واقعات' اقوامِ سابقہ کی داستانیں' انبیائے کرام علیہم السلام کے قصے' پیش کیے جاتے ہیں۔ قرآن جو ایک قانون یا اصول بیان کرتا ہے' اُس کی صداقت کی شہادت کی تائید میں یہ قصے یا جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں' اس سے مقصد اُن کی تائید کرنا ہے۔ وہ بنیادی مقصد یا اصول کیا ہے؟ دو لفظوں میں تو یہ ہے کہ آدم کو پیدا کیا تو ساتھ ہی ابلیس کو پیدا کیا۔ عام الفاظ میں یہ بات ہے۔ اور اُس کے بعد ابلیس نے مہلت مانگی اور مہلت دی گئی کہ ہاں جب تک آدم ہے اُس وقت تک تم بھی رہو گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو کشمکش ہے آپ اسے خیر و شر کی کشمکش کہیے Good & Evil (خیر و شر) کی کہیے یا یوں سمجھئے کہ

باطل نظام کے خدوخال اور اس کا نتیجہ

اب سوال یہ ہے کہ کیا معنی ہیں باطل پر مبنی نظام کے؟ کچھ لوگ قوت حاصل کر لیتے ہیں اور اُس قوت کے بل بوتے پر وہ دوسروں کو کمزور سے کمزور تر کرتے چلے جاتے ہیں' محتاج' محکوم بناتے چلے جاتے ہیں' پھر اُن کی محنت کی کمائی کا آخری پیسہ تک' اُن کے خون کا آخری قطرہ تک' نچوڑ کر اپنے عشرت کدوں کی رنگینیوں کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اُنہیں اتنا کمزور کر دیتے ہیں کہ اُن میں اِن کے خلاف اٹھنے کی سکت نہیں رہتی۔ اُن میں سکت تو نہیں رہتی لیکن نفرت تو پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر اُن میں ایک صاحبِ نظر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اِن بکھرے ہوئے افراد کو ایک امت' ایک جماعت' ایک قوم کی' شکل میں متحد کرتا ہے۔ وہ جو باطل کا نظام ہوتا ہے یہ اُس سے ٹکر لیتا ہے۔ اصول یہ ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے کہ اگر انسانوں کی کوئی جماعت صحیح طریق پر حق کا نظام قائم کرنے کے لیے کھڑی ہو جائے تو حق کے اندر بھی اتنی قوت ہوتی ہے کہ مقابلتاً جو اِن کی کمزوری ہوتی ہے وہ اُس کی تلافی کر دیتی ہے۔ خود حق کے اندر ایک طاقت ہوتی ہے۔ قرآن میں جو مختلف انبیائے کرام کی اور مختلف اقوام کی داستانیں بیان کی گئی ہیں' اُن میں باطل کے نظام کا کوئی ایک ایک ٹکڑا لیا گیا ہے۔ اُس کو سامنے لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اُنہوں نے کس طرح اُس کا مقابلہ کیا' کس طرح اُس کو شکست دی۔ اُس کی جگہ حق کا نظام قائم کیا۔ ان داستانوں میں یہ جو صاحبِ ضربِ کلیم' حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش ہے۔ اِسے قرآن نے زیادہ وضاحت اور زیادہ تسلسل سے بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ باطل کے نظام کی جو تین بنیادی کڑیاں یا عناصر ہوتے ہیں وہ اِس میں بیک وقت جمع ہو کر مقابلے میں آ گئے تھے۔ اس لیے یہ مقابلہ بڑا سخت تھا۔ انسانیت کی تاریخ پہ غور کیجیے' یہ غریبوں اور کمزوروں کے خون کو نچوڑنے والی تین ہی قوتیں ہوتی ہیں۔

انسانوں کی انسانوں پر حکومت کا دوسرا نام ملوکیت ہے

ایک ملوکیت کی قوت ہوتی ہے۔ ملوکیت کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ باپ کے بعد بیٹا بادشاہ ہو جاتا ہے۔ وہ تو اُس طاقت کو اپنے ہی اندر محدود رکھنے کا ایک انداز ہوتا ہے کہ وراثتاً وہ چیز آتی ہے۔ ملوکیت کے معنی ہیں انسانوں کا دوسرے انسانوں پہ حاکم ہو جانا' وہ اُس کی کوئی شکل بھی کیوں نہ ہو۔ اگر آپ اُن کی جو آراء ہیں وہ انہیں اُس کو اپنے فیصلے کا محکوم بنا لیتی ہیں تو یہ بھی ملوکیت ہے۔ کوئی فرد بھی اس لیے نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) ہر بنی آدمؑ ایک یکساں طور پر واجبِ تکریم ہے۔ انسانوں کے نیچے کے یہ جتنے جانور ہیں' مویشی ہیں' یہ تو انسانوں کے محکوم ہو سکتے ہیں۔ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر یکساں واجب التکریم ہے۔ اس لیے یہ سوال ہی نہیں کہ کوئی ایک انسان کسی دوسرے انسان کے احکام وقوانین کا محکوم بن کے رہ جائے۔ یہ ملوکیت ہوتی ہے جو کسی دوسرے سے اپنا حکم منواتی ہے۔

کسی انسان پر حکومت کرنے کا جذبہ محرکہ صرف دوسروں کی کمائی کو حاصل کرنا ہی ہوتا ہے

یہ جو منواتے ہیں تو محض یہی نہیں ہے کہ اُن کو اِس کی چاہ ہوتی ہے اور حکم منوائے جاتے ہیں۔ وہ اس لیے حکم منواتے ہیں کہ محنت وہ کریں اور اُن کی محنت کی کمائی یہ لوگ لے جائیں۔ یہ جو اُس کے اندر معاشی نظام ہوتا ہے' اِسے آج کی اصطلاح میں Capitalism یا سرمایہ داری کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ حاکم طبقہ تو ایک گروپ ہوتا ہے' یہ تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں جو اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھ لیتے ہیں یا سرمایہ داروں کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اکثریت ان کے اندر انہی کمزوروں، غریبوں' محتاجوں' محکوموں کی ہوتی ہے۔ تو اتنی اکثریت اس پہ رضا مند کس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے محکوم بھی رہیں اور دوسروں کے محتاج بھی رہیں' محنت یہ کریں اور کھا جائیں' وہ یہ کس طرح سے ہوتا ہے اور یہ کیسے ہوتا ہے؟

ملوکیت کے استحکام کی خاطر وعظ ونصیحت کرنے والوں کا سہارا

اِس کے لیے ایک تکنیک یہ ہے کہ ایک گروپ پیدا ہوتا ہے جو اِن عوام کے ذہن میں یہ چیز ڈالتا رہتا ہے' مسلسل اُن کو یہ وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے کہ اِن لوگوں کو یہ چیزیں خدا کی دی ہوئی ہیں۔ اس لیے اِن کے خلاف اگر تمہارے دل میں کوئی نفرت کا یا دشمنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خدا کی تقسیم کے خلاف جذبہ ہے' اِس سے ڈرو۔ اللہ کی رضا پہ ہمیشہ راضی رہنا چاہیے۔ وہ جسے چاہے امیر بنا دے' جسے چاہے غریب بنا دے' جسے چاہے وہ بادشاہ بنا دے' جسے چاہے وہ غلام بنا دے۔ یہ تو اُس کی تقسیم ہے' یہ تو اُس کے فیصلے ہیں۔ یہ خود نہیں یہ کچھ بن گئے ہوئے' انہیں خدا نے یہ بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا ان کے خلاف اگر تمہارے دل میں کوئی خیال پیدا ہو تو توبہ کرو اور ڈرو اس چیز سے۔ یہ بات خدا کے فیصلوں کے خلاف ہے جو تمہارے دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ اِنہیں اس چیز کے اوپر سمجھاتا رہتا ہے' بہکاتا رہتا ہے' ورغلاتا رہتا ہے۔ یہ ان کو افیون دیتا رہتا ہے کہ سلائے رکھو ان کو۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے

یہ گروہ یہ Part Play (کردار ادا) کرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ ہامانیت کا گروہ ہوتا ہے۔

انسانیت کی پوری تاریخ ہامانیت' فرعونیت اور قارونیت کے گرد ہی گھومتی ہے

پوری انسانیت کی تاریخ میں اگر آپ دیکھیں گے تو یہ ہامانیت' فرعونیت اور قارونیت تینوں ہی عناصر ہیں۔ ان کے نام بدل جائیں گے' پیکر بدل جائیں گے' شکلیں بدل جائیں گی' پیراہن بدل جائیں گے۔ حقیقت ہر جگہ یہی رہے گی۔ یہ جو تاریخ کا واقعہ ہے جسے میں نے صاحبِ ضربِ کلیم علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش بتائی ہے' اُس میں یہ تینوں عناصر یکجا جمع ہو گئے تھے۔ فرعون' استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ تھا۔

اُس کا نام اب ضرب المثل ہو گیا ہے۔ قارون' سرمایہ داری کا نمائندہ' وہ بھی ضرب المثل ہے۔ اور ہامان' مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہے۔ یہ تینوں یکجا اور ان کی قہر مانیت کے تلے بنی اسرائیل کی قوم تڑپتی پھڑکتی تھی ہڈیاں تک اُن کی توڑ دی گئیں تھیں۔ یہ کیفیت پیدا کی ہوئی تھی ۔اُس استبداد کے خلاف جیسا میں نے کہا کہ دلوں میں نفرت تو پیدا ہوتی ہے۔ تو ایسے میں ایک صاحبِ نظر پیدا ہوتا ہے' اُس کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یہ پوری داستان یا اِس کا ماحصل اقبالؒ نے ایک شعر میں سمٹا کے رکھ دیا کہ

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں

یہ جو محکوم اور کمزور ہیں وہ اُن کو دباتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی انسان ہیں' ان کے دلوں میں اِس کے خلاف ایک ردِ عمل اٹھتا ہے۔ وہ ردِ عمل نفرت کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اور یہ چیز جب عام ہو جاتی ہے تو وہ خونِ اسرائیل آخر جوش میں آ جاتا ہے تو اُس وقت

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

حق کی خاطر باطل کے نظام کو ختم کرنے کی سعی و کاوش

اُس وقت ایک موسیٰ علیہ السلام کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ یہ جو محکوموں اور ضعیفوں کا خون جوش میں آتا ہے اُس کو ضائع نہ ہونے دے۔ اُسے صحیح طریقے پر استعمال کرے' حق کی خاطر استعمال کرے' ورنہ استبداد کا ٹکراؤ استبداد سے تو ہوتا رہتا ہے۔ قومیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی رہتی ہیں' خونریزیاں بھی اُن میں ہوتی ہیں لیکن یہاں یہ صورت ہوتی ہے کہ یہ شخص ان کی اس قوت کو' باطل کے نظام کو' توڑ کر حق کا نظام قائم کرنے میں 'صَرف میں' لاتا ہے۔ قرآن میں انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گزشتہ کے جتنے بھی قصے بیان کیے گئے ہیں' بس وہ اسی نکتے کی تفسیر ہیں۔ کوئی چھوٹے پیمانے پر ہیں' کوئی بڑے پیمانے پر ہیں۔ یہی ہوتا چلا آ رہا ہے' یہی ہوتا چلا جائے گا کیونکہ ابلیس کو بھی تو قیامت تک کے لیے مہلت دی ہوئی ہے۔ مہلت دی ہوئی کے معنی یہ ہیں کہ وہ تو سمجھانے کا ایک محاکاتی طریق ہے' قرآن میں جو قصہ آدم بیان کیا گیا ہے' وہ آدم کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے' وہ آدمیت کی تاریخ ہے' وہ انسانیت کی تاریخ ہے' خیر و شر کی تاریخ ہے' وہ حاکم و محکوم کی تاریخ ہے' مستبد کی اور مظلوم کی تاریخ ہے' اور پھر باطل پر حق کی فتح کی تاریخ ہے۔ یہ ہے اصل اصول جو قرآن نے کہا ہے کہ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَهَقَ الۡبَاطِلُ (17:81) حق کو لانا ہوتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو پھر باطل ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ اُس وقت تک ٹھہرتا ہے جب مقابلے میں حق نہیں آتا ہے۔

حق کی تو ایک کرن ہی گھٹا ٹوپ اندھیرے کو کافور کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے

کتنا ہی دبیز اندھیرا کیوں نہ ہو' اگر آپ کمرے میں ایک دیا سلائی جلاتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ تاریکیوں کے پردے کس طرح

چاک ہوجاتے ہیں۔حق کی تو چھوٹی سی کرن باطل کے اتنے دبیز پردوں کو چاک کردیتی ہے لیکن دیا سلائی جلانے والا وہاں ہونا چاہیے۔ اُس کے پاس دیا سلائی بھی ہونی چاہیے۔قرآن نے اِس اصول کو بیان کیا ہے کہ جو حق ہے جسے اس نے کلمۃ اللہ کہا ہے' اِس کے اندر یہ قوت ہوتی ہے کہ یہ اوپر کو جاتا ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) لیکن اِس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ خدا کا تو ایک ایک دن پچاس پچاس [1] ہزار سال کا ہوتا ہے۔''اونوں جلدی کاہدی پئی ہوئی ہیگی اے۔اونوں مرنا تے نئیں ناہیگا۔جلدی تے اونوں ہوندی اے جنے مرنا ہونداا ے'' [2]۔اُس کا ایک ایک دن پچاس پچاس [1] ہزار سال کا ہوتا ہے۔لیکن انسان تو اپنی پیائش سے چاہتا ہے کہ یہ تغیرات' یہ انقلاب اس کی پیائش کے مطابق واقع ہوجائے۔اِس کی پیائش سے واقع ہونے کے لیے یہ بڑی عجیب آیت ہے اور قرآن کی کونسی آیت عجیب نہیں ہے۔کہا کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) حق اپنی رفتار سے بھی اونچا ہوتا رہتا ہے۔

لفظ صعود اور ارتقا کا قرآنی مفہوم

عروج اور ارتقا' اور بلندیوں کی طرف جانے کے لیۓ' دو چیزیں ضروری ہیں۔ایک تو الْكَلِمُ الطَّيِّبُ یعنی اب تصورِ حیات یا نظریۂ زندگی جس میں بڑھنے پھولنے پھلنے اور خوشگوار نتائج پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اور دوسرے وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ [3] (35:10)۔عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہاں صعود اور ارتقا میں کیا فرق بیان کیا ہے۔ترجمہ تو دونوں کا ہی بلندی کی طرف جانے کا ہوتا ہے۔یصعد ہوتا ہے جو از خود جا رہا ہوتا ہے۔''یرفع'' یہ ہوتا ہے کہ اِس جماعت کا عملِ صالح جو ہے وہ اُس کو سہارا دے کر جلدی سے اوپر اٹھاتا ہے۔اب یہ چیز خدا کے ایام کی رفتار سے نہیں بلکہ انسانوں کی گنتی اور شمار کی رفتار سے ہوجاتی ہے۔خدا نے جس چیز کو پچاس [1] ہزار سال میں کہیں بروئے کار لانا تھا تو محمد ﷺ اور اُن کے دست و بازو والذین معہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وہ تیئیس سال کے عرصے میں بلکہ سات سال کے عرصے میں انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔یہ فرق ہوتا ہے دونوں کی پیائش کے اندر۔یہ ہے وہ ٹکراؤ جو ہوتا ہے۔

---

[1] (22:47) خدا کے کائناتی نظام میں ایک ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے'(32:5) ارتقائی منازل کی مدت تمہارے حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال بلکہ بعض اسکیموں کے سلسلہ میں پچاس پچاس ہزار سال (70:4) کی ہوتی ہے۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص764)

[2] اسے کاہے کی جلدی پڑی ہے۔اسے تو مرنا ہی نہیں ہے۔جلدی تو اسے ہوتی ہے جسے مرنا ہوتا ہے۔

[3] وہ صلاحیت بخش اعمال جو اس نظریہ کو اوپر اٹھائیں۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1006)

حق یہ ہے کہ ظلم کا مقابلہ حق کے ساتھ کیا جائے

یہ ہے جو انقلاب ہوتا ہے بشرطیکہ استبداد کا مقابلہ کرنے والا حق کی خاطر اٹھے' خود اپنے ہاتھ میں اقتدار لینے کے لیے نہیں۔ اُس سے اقتدار چھینا اور اپنے ہاتھ میں اقتدار لیا تو وہ تو ظلم کا مقابلہ ظلم کے ساتھ ہے۔ یہ مقابلہ نہیں بلکہ ٹکراؤ ہے۔ حق کی خاطر اٹھنے والا جو ہے اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ جو انبیائے کرامؑ کی داستانیں بیان کی ہیں' وہ اصل میں حق اور باطل کے نظام کے ٹکراؤ کی داستانیں ہیں' بس کہیں جستہ جستہ ہیں اور کہیں ذرا تفصیل سے ہیں۔

سورۃ القصص میں داستان بنی اسرائیل کی تفصیل اور حرف مقطعات کا ذکر

یہی داستان حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' مختلف مقامات پر آئی ہے اور یہ میں آپ کے سامنے درس میں پیش کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن اِس سورۃ القصص میں اسے تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اِس سورۃ کے اندر اس داستان کے نقطۂ نگاہ سے بڑی جامعیت ہے۔ اس کا آغاز ہوتا ہے: طٰسٓمٓ (28:1)۔ آپ کو یاد ہوگا' میں نے ان حروف کے متعلق پہلے بھی بتایا تھا کہ اصطلاحی طور پر انہیں حروفِ مقطعات کہتے ہیں۔ مقطعات کے معنی ہوتے ہیں: لفظوں سے الگ کیے ہوئے' قطع کیے ہوئے۔ یہ حرف ہوتے ہیں' لفظ نہیں ہوتا۔ ویسے ہر لفظ حرف سے ہی بنتا ہے لیکن حروف کا اس طرح سے آپس میں باہمی امتزاج رکھنا کہ وہ بامعنی لفظ بن جائے تو وہ تو لفظ ہو جاتا ہے۔ لیکن حروف ہی اُسی طرح سے رکھے ہوئے ہوں تو اُنہیں مقطعات کہا جاتا ہے۔ یہ جو سامی نسلیں تھیں مثلاً یہ یہودی اور اُس کے بعد عرب وغیرہ' اِن کے ہاں' ان کے ادب میں' یہ انداز تھا کہ یہ اس قسم کے مقطعات یعنی الفاظ جو ہیں اُن میں سے ایک ایک حرف لے کر وہ ان حرفوں کو اکٹھا کر دیتے تھے۔ عام طور پہ شعر میں یہ بات زیادہ ہوتی ہے۔ یہ شعر کے ابتدا میں بھی لاتے تھے' درمیان میں بھی لایا کرتے تھے۔ مقطعات کا یہ وہ انداز تو نہیں تھا لیکن ''پنجابی اچ اک بیت ہوندے سَن' بیت بازی جنوں کیندے سَن' جان میری توں کتھے گئی۔'' [1] ج جان میری' یہ وہی انداز تھا عربوں کی شاعری کا۔ وہ دو تین حروف اکٹھے لے آیا کرتے تھے۔ [2] یہ وہی ہے جسے انگریزی میں Abbreviation کہتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کو یاد ہوگا کہ نہیں' میں نے ایک دفعہ وہ مثال دی تھی اور آپ ہنسے بھی تھے۔ جیسے یہ پورا خط لکھنے کے بعد نیچے لکھا ہوا ہوتا ہے P.S یعنی ایک نیا فقرہ جو خط کے بعد اُس کے اندر Add (مزید شامل) کیا جاتا ہے۔ وہ ہے P.S۔ وہ دو حروف (Alpabets) ہیں جسے انگریزی میں Post Script کہتے ہیں تو میں نے کہا تھا کہ وہ اسکرپٹ (Script)

---

1. پنجابی زبان میں ایک ''بیت'' ہوتے تھے جسے بیت بازی کہتے تھے (مثلاً) ج جان میرے تُو کہاں چلی گئی۔
2. اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان: سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2005' ص ص 21 تا 22۔

کے بعد کی بات ہے۔اس وقت میں نے کہا تھا کہ یہ اصل میں پنجابی کے مخففات ہیں' یعنی پی ایس کے معنی ہیں: پچھوں سجھی [1] ہے نا صحیح! یہ ہے' وہ جو R.S.V.P ہوتا ہے۔ یہ حروف مقطعات ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم کی عربی مبین اور اہل حجاز

ان حروف مقطعات میں سے ہر حرف (Alphabet) ایک لفظ (Word) کا Representative (نمائندہ) ہوتا ہے۔تو عربی زبان میں یہ انداز تھا اور قرآنِ کریم لسانِ عربی مبین میں آیا ہے۔حجاز کے عربوں کی جیسے کہ آپ کے ہاں لکھنوی اردو اور دہلی کی اردو کہا جاتا ہے' جو عربی تھی اُسے ٹکسالی عربی کہا جاتا تھا۔اُن کے ہاں' اُن کی شاعری میں یہ بڑا انداز تھا۔یاد رکھیے! ان کے ہاں نثر کی کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔عربوں کے ہاں یہ اتنی وسیع زبان ہزاروں سال کے عرصے سے چلی آ رہی تھی' لیکن ان کے ہاں نثر کی کوئی کتاب ہی نہیں تھی' صرف شاعری ہوتی تھی۔قرآنِ کریم عربی زبان میں نثر کی پہلی کتاب ہے اور پھر کتاب بھی وہ آئی ہے کہ اس نے اُن کی شاعری کو ماند کر دیا تھا۔وہ عرب جو ساری دنیا کو گونگے کہا کرتے تھے خود گونگے ہو گئے۔عرب کے معنی فصیح البیان کے ہیں' اور عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔عرب اپنے علاوہ ساری دنیا کو گونگے کہا کرتے تھے۔ساری دنیا کو گونگے کہنے والوں کے سامنے جب یہ قرآن آیا ہے تو اِس نے چیلنج کیا ہے کہ تمہیں اپنی اس زبان پہ بڑا مان ہے۔حقائق نہیں زبان کے اعتبار سے ہی پورا قرآن نہیں' تو تم سارے مل کر دس آیتوں کی مثل لے آؤ۔اتنے اتنے بڑے شعراء ان کے ہاں موجود تھے' ان کے قصیدے کعبے کی دیواروں پہ سونے کے حروف میں لکھے ہوئے چسپاں ہوا کرتے تھے۔تئیس سال تک اُن کے سامنے یہ چیلنج رہا لیکن کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ ایک آیت کی مثل بنا کے بتائے۔یہ تو اعجاز ہے اس قرآن کا:

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

خدا تعالیٰ کی صفات کو مقطعات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے

بات مقطعات کی ہو رہی تھی۔سورۃ القصص کی پہلی ہی آیت ہے کہ طٰسٓمٓ (28:1)۔اب ان کے جو معانی ہیں' وہ کہیں متعین نہیں ہیں۔عام طور پہ تفسیر کرنے والوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کہا ہے کہ اِس کے یہ معنی ہیں۔میں نے اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جو مختلف صفات ہیں' اُن صفات میں سے ایک ایک صفت کا کوئی ایک ایک حرف لے کر اُس کو اکٹھا کر کے بیان کیا گیا ہے۔میں نے اپنے مفہوم القرآن میں ان مقطعات کے متعلق یہی انداز اختیار کیا ہے۔

---

[1] کام ختم ہونے کے بعد سوجھی۔

طٰسٓمّٓ (28:1)۔خدائے ذی الطّول سمیع وحلیم کا ارشاد ہے کہ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ (28:2)۔میں یوں اِس کا مفہوم بیان کرتا ہوں: یہ تینوں صفتیں قرآن میں ہیں۔ذی الطّول یعنی وسعتوں والا' سمیع بھی ہے حلیم بھی ہے۔اُس کا بیان یہ ہے کہ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ (28:2) یہ آیات ہیں' یہ قوانین ہیں' یہ ضابطہ کتاب ہے۔ضابطہ قوانین کو کہا جاتا ہے۔آیات احکام یا قوانین ہوتے ہیں۔یہاں کتاب کی ایک بنیادی صفت بیان کردی اور ہر قانون میں یہ صفت بنیادی ہونی چاہیے کہ مبین ہو۔خود واضح ہو اور ہر Problem(مسئلے) کو واضح کردے۔ایک لفظ کے اندر بتایا کہ قانون ہونا کیسا چاہیے۔

انسانوں کی سطح پر تیار ہونیوالے قانون کی حالت

قانون اگر مبہم ہے تو وہ قانون ہی نہیں ہوسکتا۔یہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سال سال دو دو سال چھ چھ مہینے کے بعد کہیں جاکے اتنا سا قانون بنتا ہے۔وہ ابھی پریس میں بھی نہیں گیا ہوتا کہ اس کی Correction Slips (تصحیح نامے) پہلے جاری ہوجاتی ہیں۔کسی وکیل کے پاس قانون کی کوئی کتاب دیکھئے اور اُس میں پھر دیکھئے کہ ''کنیاں چٹاں لگیاں ہوندیاں نیں''۔ ❶ چٹوں پہ چٹیں ان Correction Slips (تصحیح نامے) کی لگی ہوئی آرہی ہوتی ہیں۔یہ واضح ہی نہیں ہوتا' مبہم ہوتا ہے۔اور عدالتوں کے اندر جو فائدہ اٹھایا جاتا ہے تو وہ کس چیز سے اٹھایا جاتا ہے۔وہ الفاظ جو ہوتے ہیں وہ کہیں ذو معنیٰ' کہیں سہ معنی ہوتے ہیں۔اُن کے معانی متعین کرکے مقدمے کو جیت لیتے ہیں۔قانون کو مبین ہونا چاہیے۔یہاں کہا ہے کہ یہ ہے وہ کتاب جو کتابِ مبین ہے۔عزیزانِ من! یاد رکھیے! قرآن کے اندر کوئی چیز مبہم نہیں ہے۔

یہودیوں کے ہاں موجودہ تورات کی حالت اور قرآن حکیم کی عظمت

یہاں کہا ہے کہ نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ (28:3) اے رسول! ہم بیان کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان کیا تھی اور حقیقت یہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔افسانے تو بہت مشہور ہوگئے ہوئے ہیں اور یہ بڑی عام داستان ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ بیتی ہوئی تھی۔ بنی اسرائیل تو یہودیوں کی شکل کے اندر اُس زمانے سے بلکہ اُس سے پہلے سے بھی لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک وہ یہودی موجود تھے اور آج تک موجود ہیں۔یہودیوں کے ہاں کی جو کتابیں تورات وغیرہ ہیں وہ ان کو اپنے ہاں مبینہ آسمانی کتابیں کہتے ہیں۔اُن میں اس داستان کو دیکھیے اور جو قرآن نے بیان کی اُس داستان کو دیکھیے۔نظر آجائے گا کہ وہاں افسانے ہی افسانے ہیں' یہاں حقیقت ہی حقیقت ہے۔اور یہ ہماری عقیدت نہیں ہے جس بنا پہ ہم یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ یہاں

---

❶ کتنی کتنی چٹیں لگی ہوتی ہیں۔

حقیقت ہے بلکہ تاریخ کے جتنے انکشافات اب ہو رہے ہیں اُن میں ہر انکشافی چیز جو ہے وہ قرآن میں بیان کردہ ان واقعات کی کسی نہ کسی کڑی کی تصدیق کرتی ہے اور بائبل کی تردید کرتی ہے۔

ایک فرانسیسی سائنسدان ڈاکٹر بوکائے کا اعتراف

آپ کو یاد ہے میں نے ایک کتاب کا ذکر کیا تھا۔ وہ فرانسیسی سائنسدان کی کتاب ہے' اس کا نام ہے: The Bible, The Quran & Science۔ [1] جس میں اُس نے Scientific (سائنسی) انکشافات میں سے ایک ایک کو لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن ایک ایک انکشاف کی تائید اور تصدیق کرتا ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب چودہ سو سال پیشتر کسی انسان کے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا کہ یہ بات اس طرح سے ہے۔ میں نے پورے درس میں اس کتاب کے متعلق تعارف کرایا تھا۔ پچھلے جمعہ کو' ہمارے ہاں خصوصی درس تھا' وہ تھا جشنِ جوبلی' جسے ان لوگوں نے پکارا' اُس میں جو میرا خطاب ہے' میں نے اُس میں اِس کتاب کے متعلق کچھ تشریح کی ہے۔ اُس شخص نے یہ سارا کچھ بیان کرنے کے بعد آخری جو Chapter (باب) ہے' وہ ہسٹری پہ بھی لیا ہے' اس میں اس نے چند واقعات لیے ہیں اور بتایا یہ ہے کہ بائبل یہ کہتی ہے اور قرآن یہ کہتا ہے۔ اس دوران میں تاریخی انکشاف یا تحقیق ان معاملات کے متعلق نہیں ہوئی تھی۔ اب جو تاریخی تحقیقات ہو رہی ہے تو اُس میں مثالیں دے کے اُس کتاب میں وہ یہ کچھ بتا رہا ہے۔ یاد رکھیے! وہ غیر مسلم ہے۔ وہ مثالیں دے دے کر بتا رہا ہے کہ اِس واقعہ کے متعلق بائبل نے یہ کہا' قرآن نے یہ کہا ہے اور آج تاریخی انکشافات وہ بتا رہے ہیں جو قرآن نے کہا ہے۔ اُس کی تردید کر رہے ہیں جو بائبل نے کہا تھا۔

اب قرآن کریم سورۃ القصص کی تیسری ہی آیت میں بتا رہا ہے کہ **نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی وَ فِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ** (28:3) یہ ہے بالحق داستان کا کہنا' یہ افسانہ نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ محض داستاں گوئی نہیں ہے' ہم تمہیں باتیں نہیں سنا رہے۔ اِس کے اند بہت بڑی حقیقت مستور ہے' بہت بڑا اصول ہے زندگی کا جو مستور ہے' بہت بڑا قانون ہے جو ہم تمہیں دے رہے ہیں لیکن اُس سے کون فائدہ اٹھائے گا؟ صرف وہ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔

داستانوں کو مان لینا اور بات ہے لیکن ان سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا دوسری بات ہے

داستان تو ہر ایک سن لیتا ہے ہم بھی رامائن سنا کرتے تھے' اب تو یہاں ہندو ہے نہیں۔ داستانیں تو ہر ایک سن لیتا ہے۔ یہ جس مقصد

---

[1] اس کتاب کا منصف ایک فرانسیسی سائنسدان ڈاکٹر مورس بوکائے (Dr. Maurice Bucaille) ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 مکمل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء ص۔235 (نیز فٹ نوٹ 1)۔

کے لیے داستان بیان کی جا رہی ہے اُس سے فائدہ کون اٹھائے گا؟ یہ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (28:3) ہے' جو قوم ان حقائق کی صداقت پر یقین رکھتی ہے ورنہ آسانی سے کہا جاتا ہے کہ محض اتفاقی امر تھا کہ ایسا ہو گیا۔ جس طرح کئی اتفاقات ہوتے ہیں یہ بھی ایک اتفاق تھا۔

قرآن کہتا ہے کہ یہاں اتفاقی طور پہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جن واقعات کی Cause & Effect '(اسباب وعلل) کا تمہیں پتہ چل جاتا ہے' وہ کہتے ہو کہ صاحب! یہ اس طرح سے ہوا' یوں ہوا' اس قانون کے تابع ہوا۔ جن کا تمہیں علم نہیں ہوتا اُس کے متعلق تم کہتے ہو کہ یہ محض اتفاقی طور پہ ہو گیا' By chance ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ بھی By chance (اتفاقیہ) نہیں ہوتا' تمہیں ابھی اُس کے Cause (وجہ' سبب) کا پتہ نہیں ہوتا۔ یہاں کوئی چیز بھی اتفاقیہ نہیں ہوتی۔ یہ تو خدائے حکیم کی کائنات ہے' اس میں کسی چیز کا At Random' یا اتفاقیہ کیا معنی رکھتا ہے۔ یہاں ہر چیز بالحق ہے۔ لیکن اس سے فائدہ کون اٹھاتے ہیں؟ وہ جو اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ یہاں ہر چیز ایک Cause (سبب) کا Effect (علل) ہوتی ہے۔ یہاں مکافاتِ عمل کارفرما ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تباہی اگر آتی ہے تو یہ اس لیے ہم کر رہے ہیں کہ جسے زندہ رہنا ہے' وہ بھی دلیل کی رو سے زندہ رہے' جسے تباہ ہونا ہے وہ بھی دلیل کی رو سے تباہ ہو۔ وہاں تو موت اور حیات بھی دلیل کی رو سے ہوتی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ یہ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (28:3) کے لیے ہے۔

اب داستان شروع ہوتی ہے۔ کہا کہ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ (28:4)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ صوتی اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عربی زبان کی خصوصیت یہ ہے۔ علا کے معنی ہیں: بے حد سرکش ہو جانا' طغیانیوں پہ آ جانا' تلاطم پہ آ جانا' حدود فراموش ہو جانا۔ خود علا بتا رہا ہے صوتی اعتبار سے بھی کہ اِس میں کوئی بہت بڑے غلبہ اور تسلط کی بات ہو رہی ہے۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ فرعون بے حد سرکش ہو گیا ہے۔ کیا تھی وہ سرکشی جس کو چھوٹتے ہی داستان کی ابتدا میں ہی اس طرح بیان کیا کہ اُس کی کیفیت یہ ہو گئی تھی؟ کیا کرتا تھا وہ' کیا سرکشی تھی اُس کی؟

اقلیت کے ساتھ اکثریت پر حکومت کرنے کا فرعونی طریق

یاد رکھیے کہ یہ جو فرعون [1] کی قوم تھی' یہ تعداد کے اعتبار سے کم تھی۔ بنی اسرائیل جو محکوم قوم تھی وہ وہاں اکثریت سے تھی۔ اِن پہ وہ حکومت کرتا تھا۔ کسی مملکت میں اکثریت کے اعتبار سے ایک قوم بستی ہو' اُس پہ حکومت کس طرح کی جاتی ہے' کیا تطبیق ہے' کیا طریق ہے کہ اتنی اکثریت کے اوپر ایک جو اقلیت ہے وہ غالب آئی ہوئی ہے اور اُس نے اپنے جوئے کے نیچے ان کو دبا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے' یہ کرتے کیسے ہیں؟ کہا کہ یہ تو بات آسان ہے۔ کرتا وہ کیا تھا؟ عزیزانِ من! بڑے غور سے سننے کی چیزیں ہیں۔ یہ قصہ صرف

---

[1] فرعون کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص۔109 (فٹ نوٹ 1)

داستانِ بنی اسرائیل کا نہیں ہے' یہ تو مسلسل انسانیت کی داستان ہے' آج کی داستان ہے' ہر دور کی داستان ہے' ذی اقتدار فرد ہو' جماعت ہو' پارٹی ہو' تو وہ کرتے کیا ہیں؟ اتنی بڑی اکثریت کے اوپر وہ حکمرانی کر کیسے سکتے ہیں' وہ کرتے کیا ہیں؟ کہنے لگے کہ کرتا وہ یہ تھا کہ **وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا** (28:4) اکثریت تو اتنی بڑی تھی وہ اگر ایک پارٹی' ایک جماعت' ایک قوم کی' حیثیت سے رہتی تو اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' وہ اُسے پارٹیوں میں تبدیل کرتا رہتا تھا۔ ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ داستانوں کے رنگ میں ابدی حقائق بیان کیے جا رہے ہیں ورنہ یہ جسے ذی اقتدار کہتے ہیں' استبداد والا' قوت والا حکمران' کیا اُس کے کچھ دس ہاتھ ہوتے ہیں؟ وہ دوسرے انسانوں جیسا ہی انسان ہوتا ہے۔ اور جیسے میں نے کہا ہے عام طور پہ ذی اقتدار جو طبقہ ہوتا ہے وہ تعداد کے اعتبار سے اقلیت میں ہوتا ہے' بڑا مختصر سا طبقہ ہوتا ہے۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ وہ نیچے جو اتنی اکثریت ہوتی ہے جس کو وہ محکوم قوم کہتا ہے مظلوم و مقہور قوم' وہ اُس کے اوپر اس طرح حکومت کرتا ہے کہ **جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا** (28:4) وہ انہیں پارٹیوں میں تقسیم کیے رہتا ہے۔ یہ پارٹیوں میں تقسیم کرنے سے پھر ہوتا کیا ہے؟ کہتا ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ اگر وہ متحد اور مجتمع اور ایک پارٹی اور ایک جماعت رہے تو اُن کی قوت بہت بڑی ہوتی ہے۔ یہ پارٹیوں میں تقسیم کرتا ہے تو **يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ** (28:4) تو یوں وہ پھر اُن کی قوت کو کمزور کرتا جاتا ہے اور اُس کا طریقہ یہ ہے کہ کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھاتا ہے اور دوسری کو نیچے لے آتا ہے' کبھی اِس کو اوپر لے آتا ہے اُس کو نیچے لے آتا ہے۔ تو یوں اُن میں ایک تو تفریق پیدا کرتا ہے اور پھر اِس طرح سے آپس میں اُن میں رقابت پیدا کرتا ہے۔ باہمی دشمنی پیدا کرتا ہے' کبھی اُس پارٹی کو اقتدار میں شریک کر لیا' کبھی اُن کو اتار کر دوسرے کو لے آئے۔ اور آپس میں وہ ٹکراتے رہتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ داستان جو شروع ہو رہی ہے تو کس کی شروع ہو رہی ہے۔ کہتا ہے کہ وہ یہ کرتا تھا۔

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ علیہ السلام طلسم سامری

اب اُس کے بعد اگلی تکنیک اور ہے۔ انہی جماعتوں کے اندر بنی ہوئی یہ پارٹیاں بانجھ تو ہو نہیں جاتیں کہ اِن میں انسان پیدا ہونے ہی بند ہو جائیں۔ ان میں بھی انسان پیدا ہوتے ہیں۔ انسان سے مراد آپ سمجھ گئے ہونگے۔ یہ وہ ہیں جو اِن میں صاحبِ نظر ہوتے ہیں' صاحبِ ہمت ہوتے ہیں' انقلابی ذہن رکھتے ہیں' حق کو سربلند کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ اربابِ اقتدار ان کے ساتھ کرتے کیا ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ **يُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَ يَسْتَحْيِ نِسَآءَ هُمْ** (28:4)۔ یہ قرآن میں متعدد مقام پہ آتا ہے۔ اِس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ یہ ترجمہ اور یہ مفہوم تاریخ کے خلاف ہے' واقعات کے خلاف ہے۔ یاد رکھیے! فرعون کسی ایک بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ نام ان کے اور تھے' فرعون لقب تھا۔ وہ جو ایک

Dynasty (شاہی خاندان) ایک خاندان مصر[1] پہ حکمران تھا' اُس کے ہر بادشاہ کو فرعون کہتے تھے۔ یہ اُن کا لقب تھا۔ وہ قوم تو سورج کی پرستش کرتی تھی اور یہ سورج کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ ''رع'' کے جو اوتار تھے وہ پھر بادشاہ یہ تھا۔ یہ وہ ہے' جو مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔

مذہبی پیشوائیت ہمیشہ ملوکیت کا سہارا بنتی ہے

وہ بتاتی یہ ہے کہ یہ بادشاہ عام انسان نہیں ہوتا۔ یہ تو دیوتاؤں کے اوتار ہوتے ہیں۔ خود دیوتا اس دنیا کے اندر آئے ہوتے ہیں' انہیں عام انسان نہ سمجھو۔ ضمناً عرض کر دوں کہ پھر جب آپ کے ہاں ملوکیت آئی ہے تو یہ تصور بھی تو ساتھ آنے تھے۔ پھر بادشاہ یہ عام بادشاہ نہیں ہوتا تھا وہ تو **ظل اللہ علی الارض** بنا یعنی زمین پر خدا کا سایہ۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اُن میں سے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا۔ اُن میں سے ہر بادشاہ جو تھا وہ سورج دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ اور اِس اعتبار سے اُسے فرعون کہتے تھے۔

فرعون کا لڑکوں کو ذبح کرنے کا تصور درست نہیں

اگر یہ بات تھی کہ وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیا کرتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا تو یہ جس دور کے جس فرعون کا یہ واقعہ ہے تو وہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تو بنی اسرائیل مرد وہاں موجود تھے' پوری قوم موجود تھی۔ اگر وہ ذبح کرا دیا کرتے تھے تو پھر یہ کہاں سے آ گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اُس دور کے اندر ہم دیکھتے کہ بنی اسرائیل کی وہاں عورتیں ہیں اور اس ملک میں عورتیں ہی عورتیں ہیں' ایک بھی مرد باقی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ زبان کا جو صحیح مفہوم ہوتا ہے اُس کو چھوڑ کر جب ہم صرف Literal Meaning (لفظی معنی) لے لیتے ہیں تو اُس سے یہ ساری مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ عربی زبان میں ہی ذبح کے معنی گلا کاٹ دینا بھی ہے لیکن مجازی طور پہ ہم اپنے ہاں بھی کہتے ہیں کہ وہ تو حق کو ذبح کر دیتا ہے۔ اُس نے سچائیوں کو ذبح کر کے رکھ دیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اس لیے استعمال ہوتا تھا کہ ''کسی کو کمزور کر دینا' کسی کو ذلیل کر دینا' کسی کو پست کر دینا' ناتواں بنا دینا' کسی کام کے قابل نہ چھوڑنا۔ یہ لفظ ذلیل کے معنی میں زیادہ آتا تھا۔ اس کے مقابل میں جو زندگی عطا کرنا ہے آج ہمارے ہاں محاورے ہیں۔ زندگی توانائی کا ہی نام ہوتا ہے بلکہ عزت کا نام ہوتا ہے' قوت کا نام ہوتا ہے' حشمت کا نام ہوتا ہے۔ جتنی بلندی کی طرف لے جانی والی خصوصیات ہیں اُن کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ حیات بخش' زندگی آور' ان معنوں میں عربی زبان میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہی بات ہے جو پہلے کہی تھی کہ اِس قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا۔ ایک پارٹی کو اوپر چڑھاتا تھا' دوسری پارٹی کو نیچے لے آتا تھا۔ ابناء کے معنی ''ابنائے قوم'' ہمارے ہاں بھی

---

[1] اس خاندان کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 120-119 (فٹ نوٹ 1)۔

استعمال ہوتا ہے۔ یہ سرآوردہ افراد ہوتے ہیں' ''سرکڈ جناں نوں کیندے ہیگے نیں'' [1] ۔عربی زبان میں ابناء ان کو کہا جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ بیٹوں کو بھی کہتے ہیں لیکن جو ابنائے قوم ہے ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں۔قوم کے جو بڑے بڑے سرکردہ افراد ہیں اُن کو ابنائے قوم کہتے ہیں۔اور اِس کے مقابل میں جس قوم کے مردوں کے اندر مردانگی کے جوہر نہ پائے جاتے ہوں' اُنہیں ہم بھی عورتیں کہتے ہیں۔

عورتوں کے متعلق ایک غلط محاورہ

ہمارے ہاں کی یہ بیٹیاں بہنیں' ان سرگرمیوں میں اُن لیڈروں کو جو پست ہمتی کا ثبوت دیتے ہیں چوڑیاں بھیجتی ہیں۔اُنہیں کہتی ہیں کہ تم عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ جاؤ۔ یہ محاورہ ہے۔میں اپنی بیٹیوں بہنوں سے کہوں کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ واقعی عورتیں اس جوہر سے بیگانہ ہوتی ہیں۔ یہ محاورہ عام چلا آرہا ہے۔یوں کہہ دیجیے کہ عورت کو ایسا بنا دیا گیا' پھر عورت کو ایسا کہہ دیا گیا۔زبانوں کے یہ محاورے ہیں۔

حکمرانی کے سلسلہ میں فرعون کی ایک دوسری چال

فرعون کرتا کیا تھا؟ وہ پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا۔وہ اُن لوگوں کو اوپر چڑھاتا تھا جن میں دیکھتا تھا کہ جوہرِ مردانگی نہ ہو۔اس قسم کے جو خنثیٰ صفت ہوں وہ اُن کو لے کے لیڈر بنا دیتا تھا' منصب عطا کر دیتا تھا۔اور جن میں یہ چیزیں پائی جاتی تھیں اُن کو پست اور ذلیل کرتا تھا۔ یہ تکنیک تھی۔یعنی یہ انسانیت کی مستقل تاریخ ہے۔ہر مستبد صاحبِ اقتدار یہی کرے گا' یہی کرتا چلا آرہا ہے' طریقہ ہی یہ ہے ورنہ اتنی تعداد کے اندر اکثریت کے اندر یہ جس کو وہ محکومیت یا رعایا کہتے ہیں کونسی قوت ہے کہ اِن کو بھیڑ بکریوں کی طرح وہ چراتا پھرے اور یہ میں میں میں کرتی اُس کے ڈنڈے کے آگے بھاگتی پھریں۔وہ کرتا یہ ہے۔یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے یہ ملوکیت کی تکنیک ہوتی ہے۔

ذبح کے معنی ذلیل کرنے کے بھی ہوتے ہیں

ذبح کے معنی ہوتا ہے: ذلیل کرنا۔قرآن نے یہ بات دوسرے مقام پہ کہی ہے لیکن میں ایک فقرہ اور دہرا دوں۔ یہ کہنے کے بعد کہا ہے کہ یہ بات اُس ایک فرعون کی ہی نہیں ہے بلکہ ملوکیت کا خاصہ ہی یہ ہوتا ہے۔اس لیے کہا کہ **اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ** (28:4) فساد کے معنی ہوتے ہیں: ناہمواریاں پیدا کرنا۔یہاں اسے من المفسدین کہا ہے۔تاریخ انسانیت میں جتنے ناہمواریاں پیدا کرنے والے

---

[1] جنہیں سرکردہ افراد کہتے ہیں۔

ہونگے وہ مفسدین ہونگے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ بھی اُنہی میں سے ایک تھا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جو ملوکیت (Monarchy) ہوتی ہے اِس کا مسلک بھی فساد پیدا کرنا' ناہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ناہمواریاں کیا ہوتی ہیں۔ پچھلی ہی سورۃ النمل تھی جس میں ملکہ سبا نے یہ بات کہی تھی۔ یہ بڑی عمدہ بات کہی تھی۔ کہا تھا کہ جب حضرتِ سلیمان کا قاصد وہاں گیا ہے اور اُس نے یہ کہا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ تم سرِتسلیم خم کرو' سرکشی چھوڑ دو' ورنہ اِس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اُس نے اپنے درباریوں سے مشورہ لیا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے کہ فیصلہ تو تمہارا ہی ہوگا لیکن ہم ہر طرح کے مقابلے کے لیے تیار ہیں' ہم میدانِ جنگ میں جائیں گے۔ اُس نے بھانپ لیا تھا کہ مقابل میں جو آ رہا ہے' اُس کی قوت بہت زیادہ ہے۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ **قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا** (27:34) تمہیں پتہ نہیں ہے کہ جب بھی بادشاہ کسی ملک میں حملہ کر کے آتے ہیں تو وہاں فساد برپا کر دیتے ہیں۔

فساد کیونکر پیدا ہوتا ہے یا کس طرح برپا کیا جاتا ہے؟

کیا ہے وہ فساد؟ اگلے دو الفاظ میں بات صاف کر دی ہے۔ کہا کہ **وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً** (27:34) اُس کے جو اربابِ عزت ہوتے ہیں' جو سرکردہ افراد ہوتے ہیں' اُن کو ذلیل اور پست کر دیتے ہیں۔ یہ ہے فساد۔ اور یہ ایک فقرہ ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ **وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ** (27:34) یہ بات کسی خاص بادشاہ کی نہیں ہے' سب یہی کرتے ہیں۔ خدا کا قرآن ہے۔ داستان ملکہ سبا کی بیان کر رہا ہے' سنا ہمیں رہا ہے۔ سنا رہا ہے دنیا کی ہر مستبد قوم کو۔ یہ اس کا انداز ہے۔ ''دِھیے اے نی! توں گل سن' نوحیں نی! توں کن کر۔ ایویں سمجھاندی اے ناسِں''۔ وہ یہی کرتا ہے۔ باتیں وہ کر رہا ہے کہیں ملکہ سبا کی' کہیں فرعون کی اور کہتا ہمیں ہے کہ تم کان کرو۔ عزیزانِ من! یہ ہے خصوصیت! یوں قرآن سمجھا کیجیے۔

سیاسی طور پر ملوکیت کے عملی خدوخال کا عکس

یہ بات اُس ملکہ سبا کی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ یوں ہوتا ہے اور یاد رکھو' وہ یہ کرے گا: **وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ** (27:34) اور یہ بات میں اسی بادشاہ کی نہیں کہہ رہی۔ یہ جو بادشاہ آ رہا ہے' یہ سب اِسی طرح سے ہی کرتے ہیں۔ ملوکیت جہاں بھی ہے وہ یہی کرے گی۔ اِسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ **يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ** (28:4) جو وہاں کے اربابِ عزت ہوتے ہیں' جو سرکردہ لوگ ہوتے ہیں' اُن کو وہ ذلیل کرتا ہے۔ **اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ** (28:4) فسادیوں برپا کرتے ہیں' ناہمواریاں یوں پیدا کرتے ہیں کہ اُس محکوم قوم کو پہلے پارٹیوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اُن پارٹیوں میں سے کبھی ایک کو اوپر چڑھاتے ہیں' دوسرے کو نیچے

کرتے ہیں۔ اُن کے اندر جو اُن کو نظر آتے ہیں کہ یہ کچھ سرکردہ افراد ہیں، یہ کچھ گڑبڑ پیدا کریں گے۔ اُن کو پہلے سے ہی پست اور ذلیل کر دیتے ہیں اور جو اِس قسم کے مصاحب قسم کے لوگ ہوتے ہیں اُن کو پھر وہ مقرب بھی بناتے ہیں، اربابِ عزت بھی بناتے ہیں۔ ملکہ سبا نے کہا تھا کہ ملوکیت یہ کیا کرتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (27:34) یہی ہوتا چلا آ رہا ہے، یہی ملوکیت کرتی ہے اور اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (28:4) یہ بھی مفسدین میں سے ہے۔

غلط معاشرے میں اندر ہی اندر استبدادی قوت کے خلاف پکنے والا لاوا

میں نے عرض کیا ہے کہ میں پھر اقبال رحمہ اللہ (1983-1877ء) کا وہی شعر دہرا دوں۔ نظر یہ آتا ہے کہ یہ ایک لمبے عرصے کے اِس قسم کے فسادِ ملوکیت میں، استبداد میں، اس قوم کے اندر بھی ان کی ہمتیں تو پست کر دی تھیں، قوتیں تو چھین لی تھیں لیکن یہ جو استبداد کے خلاف، ظلم کے خلاف احساس ہوتا ہے اُس کو نہیں مٹایا جا سکتا۔ وہ اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے۔ وہ نفرت بنتا رہتا ہے۔ اور پھر ایک اسٹیج ایسی آ جاتی ہے کہ جہاں وہ پکے ہوئے پھل کی طرح گرتا ہے۔ وہاں میں نے کہا ہے کہ پھر وہاں کسی موسیٰ علیہ السلام کی ضرورت ہوتی ہے کہ پھر وہاں

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

وہ اُن میں اجتماعیت پیدا کر دیتا ہے۔ اور حق کا پیغام دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں یہ جو اسٹیج آ گئی تو اِس مقام پہ اُس نے یہ کہا ہے کہ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ (28:5) ہمارے قانونِ مشیت کا اس مقام پہ تقاضا ہوا۔ اِسے قرآن قانونِ مشیت کہتا ہے کہ ہم نے جو اِس قسم کے وہ قانون مشیت بنا رکھے ہیں کہ جب قوموں کے اندر استبداد کے خلاف احساسات اتنے شدید ہو جائیں کہ وہ نفرت کی کیفیت اختیار کر لیں اور وہاں ایک صاحبِ نظر پیدا ہو جائے جو حق کو لے کر اٹھے۔ اُس مقام پہ وہ کہتا ہے کہ ہماری مشیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے۔ لیکن الفاظ یہ ہیں کہ ایسے مقام پہ ہم نے چاہا کہ ہم اِس قوم کے اوپر احسان کریں، جسے اِس طرح کچل کے رکھ دیا گیا ہے۔ اس قسم کی کچلی ہوئی، محکوم کمزور قوم کو، جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کی فضا میں لا کر، پھر بلندیوں کی طرف لے جانا ہے، اسے قرآن میں احسانِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم نے چاہا، بڑے حسین الفاظ ہیں، کہ وہ قوم جنہیں ناکردہ گناہوں کی پاداش میں کچل کے رکھ دیا گیا تھا، ہم نے چاہا کہ ہم اُن پہ کچھ احسان کریں، اُن کو اٹھائیں۔

احسانِ خداوندی کو سمجھنے کے لیے تحریکِ پاکستان کی داستان ایک زندہ مثال ہے

کیا بات ہے! احسان اس طرح سے یہ ہوتا ہے۔ اُس قوم کے ذہن میں بھی یہ نہیں ہوتا کہ ہم اِس حالت سے اُبھر کر کہیں اُس حالت میں جا بھی سکیں گے۔ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن اُس کی مشیت کے قانون کی رو سے اِس قسم کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں،

اُس کی کڑیاں اکٹھی ہوجاتی ہیں کہ اِس قوم کو جب بلندیوں کے یہ مدارج مل جاتے ہیں' تو واقعی اُس کی سمجھ میں بات ہی نہیں آتی کہ یہ کیسے ہوا۔ وہ یہی کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' اُس کا احسان ہے۔ اور اگر ہم کہنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے وقت میں کسی اس قسم کے ایک فرد کا پیدا ہوجانا یہ کچھ احسانِ خداوندی ہے۔ اسباب کے ذریعے کی یہ بات ابھی کچھ سمجھ میں آتی نہیں ہے۔

عزیزانِ من! یہ پوری داستان ہماری داستان ہے جو تحریکِ پاکستان کی داستان تھی۔ ہمارے آنے والی نسل کو اُس تاریخ سے بیگانہ رکھا گیا ہے' انکو کچھ پتہ نہیں ہے۔ بیگانہ رکھا گیا ہے اور اب مسلسل بیگانہ رکھا جارہا ہے۔ غلط واقعات بتائے جارہے ہیں' غلط تاریخ یہاں پیش کی جارہی ہے' اس تحریک کے خلاف مسلسل ایک سازش ہورہی ہے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہے اُس پوری تاریخ کے اندر ہم موجود تھے اور یہاں میرے کچھ اور دوست بھی موجود ہیں اور جو موجود تھے' وہ پتہ نہیں ہے ہم کتنے دنوں کے مہمان ہیں۔ اس انتظار میں ہیں کہ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھا ہوا تھا' یہ باقی نہیں رہیں گے تو کوئی تردید کرنے والا ابھی یہاں نہیں رہے گا۔ آپ کے ہاں اُس تاریخ کی حقیقی ہسٹری کہیں موجود نہیں ہے۔

اس تحریک آزادی کی پوری تاریخ طلوع اسلام کے فائلوں میں آج بھی موجود ہے

عزیزانِ من! زندگی کا اعتبار نہیں ہے۔ کبھی ہسٹری مرتب کرنی ہو تو اُس دور کے طلوعِ اسلام [1] کے فائل لے لیجیے گا۔ وہ میری مرتب کی ہوئی ہسٹری ہے۔ وہاں ہماری حالت یہ ہوچکی تھی کہ ہم واقعی کچلے گئے تھے۔ ہندو اور انگریز کی ایک سازش تھی کہ اس قوم کو ابھرنے ہی نہ دیا جائے۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

تحریک پاکستان کے دوران انگریز کا کردار' ہندو کا کردار' مولانا ابوالکلام آزاد کا رویہ اور قائداعظم کے چار تاریخی الفاظ

انگریز نے انڈو پاک کی اس مسلم قوم کو اتنی پارٹیوں میں تقسیم کردیا گیا تھا کہ اِس قوم کا کچھ پوچھو ہی نہیں۔ انگریز بھی اُن کو مقرب بناتا تھا' مصاحب بناتا تھا۔ یہ وہی ہے جس کو قرآن نے یَسْتَحۡیٖ نِسَآءَ هُمۡ (28:4) کہا ہے۔ ہندو کی بھی یہی کیفیت تھی۔ جو غدار تھا اِس قوم انگریز نے' اُسے مقرب بنایا' ہندو نے بھی اپنے ہاں' کانگریس میں' اُس کو بڑے بڑے مراتب دیئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد [2]

---

[1] اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' 2005ء ص 359 (فٹ نوٹ 3)۔ نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ العنکبوت' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2008 کا نواں باب (پہلا ہی فٹ نوٹ)

[2] آپ کا اصل نام احمد محی الدین (1958-1888) ہے۔

جیسا شخص، جس کا مسلمان قوم کے اندر اتنا وقار تھا، اُس کو نہ صرف انہوں نے کانگریس میں لیا بلکہ کانگریس کا President (صدر) بنا دیا۔ یہ عین اُس زمانے میں ہوا جب یہاں لاہور میں قراردادِ پاکستان ❶ پاس ہونے کے لیے ہمارا جلسہ ہوا ہے۔ فسادگروں نے، وہاں کانگریس کا جلسہ کیا۔ وہاں اُس کو President بنایا۔ اس دور کا اُس کا ذرا خطبہ پڑھ کے دیکھئے۔ اُس نے جب جناحؒ ❷ کو یہ کہا تھا کہ آ وَ! میں بات کرتا ہوں۔ تو جواب میں چار لفظ قائداعظمؒ کے ہیں۔ میں نے طلوعِ اسلام میں یہ لکھا ہے کہ یہ تار نہیں، یہ مضراب تھا جس نے ان تاروں کے اندر چھپے ہوئے اضطرابات کو جھنجھنا کے رکھ دیا۔ قائداعظمؒ ❷ نے چار لفظ لکھے تھے: ❸

You show boy of Congress: shut up.

کیا بات تھی اِس شخص کی۔ عزیزانِ من! یہ ہوتا تھا ہمارے ساتھ کہ جو ذرا ابھرنے لگا اُس کو خرید لیا، جس نے اپنی قوم سے غداری کی وہ اُن کا مقرب بن گیا۔

انڈین نیشن کے خلاف محسنِ ملت سر سید احمد خان کی مجاہدانہ اذان

ایسے میں اس قوم کے اندر پہلے سر سیدؒ (احمد خاں: 1898-1817) کا پیدا ہونا بڑی ہی گرانقدر بات ہے۔ یہ کانگریس 1884ء میں وجود میں آئی۔ ایک انگریز ❹ نے اس کا تصور دیا، ہندو نے اس پر لبیک کہا۔ تصور یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے سارے، جتنے لوگ بھی ہیں، وہ ایک قوم ہیں۔ اس سے مسلمانوں کا جداگانہ وجود ختم ہو جاتا ہے۔ یہ صرف ایک انڈین نیشن ہے، اس کا نام ہی انڈین نیشنل کانگریس رکھا کہ اس قوم کا الگ تشخص ختم کر دیا جائے۔ کسی کو اس چیز کا احساس نہیں ہوا۔ اب یہ جو مقام جہاں میں کہتا ہوں کہ وہ خدا کا ایک فضل یا جسے اُس کا احسان کہا جائے گا، کچھ اور سمجھ میں آتا نہیں، وہ سر سید تھا۔ ❺ سر سیدؒ (1898-1817) انگریزوں کا ملازم تھا۔ پہلے مغلیہ خاندان کا درباری تھا۔ جب بغاوت کے بعد وہ سلطنت گئی ہے تو انگریزوں کے ہاں کا ملازم ہوا۔ اندازہ لگایئے۔ انگریز کی بنائی ہوئی یہ کانگریس، ہندو اُس پہ مسلط، اُس میں یہ کچہری کا ملازم ہے۔ یہ آواز بلند کرتا ہے۔ مسلمانوں کو کہتا ہے کہ او دیکھنا! اس سے دُور رہنا،

---

❶ اس کا نام لاہور یا پاکستان قرارداد 1940ء ہے جو 24 مارچ 1940ء کو منٹو پارک (جس کا آج نام اقبال پارک ہے) میں پاس ہوئی۔

❷ قائداعظم محمد علی جناح (1948-1876ء)

❸ اے کانگرس کے شعبدہ باز یا قفلِ تماشا کار! اپنی زبان کو لگام دو۔

❹ Allan Octavian Hume, a retired British Official نے اس کا تصور دیا اور اس یعنی انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا صدر وولیش چندرا بینر جی تھا۔

❺ سر سید احمد خان (1898-1817ء)

یہ تمہارے خلاف بہت بڑی خطرناک سازش ہو رہی ہے' یہ سازش تمہارے تشخص کو مٹانے کے لیے ہے اس لیے تمہارے خلاف ہے۔ اُس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے اندر مسلمان ایک قوم بستی ہے جو سب سے منفرد ہے۔ اُس نے اپنے کمشنر کو جس کے ماتحت وہ کام کرتا تھا' کہا کہ یاد رکھو! یہ جو آج آپ لوگ ڈھونگ رچا رہے ہیں کہ سارے ہندوستان میں بسنے والے ایک قوم ہیں' یہ فریب دیا جا رہا ہے' یہ ایک قوم نہیں ہیں۔ یہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک نہ ہوئے تھے' نہ کبھی ایک ہو سکتے ہیں۔ اور اگر تم نے یہ کوئی زبردستی کرنا چاہا تو اِس کا انجام یہاں وہ خانہ جنگی ہوگی جب میں اور تم تو نہیں ہونگے۔ کہہ دو اپنی قوم کے آنے والے مورخوں سے کہ لکھ رکھیں کہ یہاں یہ ہونے والا ہے ۔کیا بات ہے ان لوگوں کی نگاہ کی! کوئی دعویٰ نہیں' مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں' پیشن گوئی کا دعویٰ نہیں۔ یہ سیاسی ادراک ہے۔ اور وہ اِس لیے ہے کہ کوئی ذاتی مصلحت کام نہیں کر رہی۔ عزیزانِ من! اگر ذاتی مفاد اور مصلحت کار فرما نہ ہو تو جو انسانی ادراک یا ذہن ہے' واقعی آنے والے واقعات کے اوپر اُس کی نظر ہوتی ہے:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہ تھے وہ لوگ۔

سرسیدؒ ' اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی مومنانہ فکر اور جگر سوزی نے ملتِ اسلامیہ کے پژمردہ چہرے کو رونق بخشی

یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس ماحول میں یہ سرسیدؒ (احمد خان: 1898-1817) کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ گیا ہے تو یہ شمع اقبالؒ (1938-1877ء) کے ہاتھ میں دے گیا ہے۔ یہ وہی اقبالؒ ہے جو کہا کرتا تھا کہ ''ہندی ہیں ہم' وطن ہے ہندوستاں ہمارا۔'' یہ الا پتا ہوا وہ یورپ میں گیا جہاں نیشنل ازم گلے تک آئی ہوئی ہے۔ وہاں سے جب واپس لوٹا ہے تو اُس نے کہا کہ یہ غلط ہے جو میں نے کہا تھا بلکہ صحیح یہ ہے کہ

چین و عرب ہمارا ' ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے' سارا جہاں ہمارا

اور آتے ہی اُس نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! یاد رکھو:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے' وہ مذہب کا کفن ہے

اس قومیت کے بت کو خاک میں ملا دو۔ اُس نے کہا کہ یہ نیشنل ازم مسلمان کے تشخص کو ختم کرنے کے لیے ایک سازش ہے۔ 1911ء

میں آ کے اُس نے یہ اعلان کیا ہے۔ ساری عمر یہ اعلان کرتا چلا گیا۔ اُس شخص نے اس چیز کے اوپر ذہن صاف کر دیئے کہ مسلمان ایمان کی بنیادوں کے اوپر ایک جداگانہ قوم ہے۔ یہ کسی قوم کے اندر مدغم نہیں ہوسکتی۔ وہ یہ بات کہتا چلا گیا۔ یہ سارے نیشنلسٹ علما مخالفت کرتے چلے گئے۔ سب سے بڑا معرکہ مولانا حسین احمد ❶ مدنی مرحوم کے ساتھ تھا۔ ''معرکہ دین و وطن'' اقبالؒ نے خود اس کا نام رکھا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی یہ کہتے تھے کہ وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے ہندو مسلمان ایک قوم ہے۔ اقبالؒ کہتا تھا کہ یہ تصور اسلام کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ایمان کی بنیادوں کے اوپر مسلمان ایک الگ قوم ہے۔ وہ جو کہ فخر سے کہتا تھا کہ

I am nationalist first, nationalist second and nationalist last.

اُس کی یادگار، بمبئی میں، جناح کانگریس ہال بنا ہوا ہے۔ یہ شخص ❷ ہندوستان سے دلبرداشتہ ہو کر لندن چلا گیا کہ میں نے آنا ہی نہیں ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کرتے ہوئے ناکام ہو گئے، تو کہنے لگے کہ نہیں، صاحب! میرا مشن فیل ہو گیا ہے، میں یہاں واپس نہیں آؤنگا۔ اسی اقبالؒ (1877-1938) نے کوشش کی۔ اگر یہ مشیّت کی کڑیاں نہیں ہیں تو ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس نے جناحؒ جیسے شخص کو (تبدیل) Convert کیا۔ وہ شخص بڑا ہی اصول پرست تھا۔ ہم سے پوچھیے ہم نے تو دس سال اُن کے ساتھ گزارے ہیں۔ جناحؒ جو یہ کہتا تھا کہ ❸ I am nationalist first, nationalist second and nationalist last. اور یہی کہتا ہوا گیا تھا، اقبالؒ اسی کو Convert (تبدیل) کر کے واپس لے آیا۔ اور اُس کے بعد یہی ایک چیز ہے جو اس نے کہی کہ نہیں، مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنا پہ ایک الگ قوم ہے، اور یہ اسلام ایک مذہب نہیں ہے کہ جو ہر مقام پہ پوجا پاٹ سے، بھگتی اور عبادت کے ذریعے سے قائم ہوسکتا ہے، یہ صرف اپنی آزاد مملکت کے اندر زندہ ہوسکتا ہے۔ ہم اس لیے اس آزاد مملکت کو چاہتے ہیں۔ یہ تمام لوگ جو آج کہہ رہے ہیں کہ ہم نے مخالفت نہیں کی، ہم بھی یہی چاہتے تھے، اِنہوں نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا۔ آخری وقت تک، تقسیم کے زمانے تک، اِنہوں نے زور لگایا کہ یہ غلط ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو اس میں سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں، اس مقام پہ ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو خدا نے یہاں کہا کہ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ (28:5) ہم نے چاہا کہ جس قوم کو اتنا کچلا گیا ہے، اس پہ کچھ احسان کر دیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ جیسے مشیّت کو بھی کچھ ترس آ گیا ہو کہ جنہیں اتنا کچلا گیا ہے اور اُن کے اپنے اندر سکت نظر نہیں

---

❶ مولانا حسین احمد مدنیؒ (1879-1957ء)۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورہ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص۔296 (فٹ نوٹ 1)

❷ یہ اشارہ قائد اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948ء) کی طرف ہے۔

❸ میرا بال بال نیشنلسٹ ہے۔

آتی کہ خود اٹھیں۔ اس لیے ہم نے چاہا کہ اُن پہ کچھ احسان کر دیں۔ یعنی الفاظ کہہ رہے ہیں کہ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا اس قوم کو اتنا کچل دیا گیا تھا' ہم نے چاہا کہ اِس پہ کچھ احسان کریں۔ کچھ ترس آ گیا:

کام آخر جذبہء بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا

ہمارے لیے مشیت ایزدی کی طرف ابر سے رحمت کا یہ لازوال حسین نظارہ نوید سحر ثابت ہوا

یوں نظر آتا ہے جیسے مشیتِ ایزدی کو ہم پہ کچھ پیار آ گیا تھا ورنہ ہم تو ایسے ہی نالائق تھے لیکن اُس کے پیار نے کچھ ایسی کیفیت پیدا کی تھی' وہ قوتیں ہمارے اندر پیدا کی گئیں' پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا کہ ایک انقلابی شخصیت حق کی آواز لے کے اٹھے تو اُس کا اثر بڑا متعدی ہوتا چلا گیا۔ اقبالؒ (1938-1877) اور جناحؒ (1948-1876) کی کوششوں سے قوم کے اندر یک نئی تبدیلی پیدا ہوگئی لیکن اگر ہمیں کہا جائے کہ بتاؤ اِس کے بظاہر اسباب کیا تھے تو اسباب سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ اُنہوں نے کیا۔ سوچیے کہ کیا بعینہٖ یہی کچھ ہمارے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہسٹری میں یہ ایک Unique (انوکھا' منفرد) واقعہ ہے کہ ایک ملک کے اندر بسنے والی قوم کے ایک حصہ نے بغیر ایک قطرۂ خون بہائے اتنی بڑی مملکت اُس سے حاصل کر لی۔ انسانیت کی تاریخ میں اس کی مثال ہی نہیں ملتی۔ اب اِس کے لیے یہی الفاظ کہے جائیں گے جو یہاں بنی اسرائیل کے لیے کہے گئے کہ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ (28:5)۔ ہم کیا چاہتے تھے کہ اُن پہ کیا احسان کیا جائے۔ وَّ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً (28:5) پہلی چیز تو یہ ہے کہ اُن میں اچھے لیڈر پیدا کر دیئے جائیں۔ امامت اُن کے حصے میں آ جائے جو اتنے کچلے ہوئے ہیں۔ وَ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ (28:5) پھر اُن کو ہم وارث بنا دیں' مالک بنا دیں۔ کس کا؟ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ (28:6) اور مملکت کا ایک حصہ اُن کے سپرد کر دیں' اُن کے قبضے میں دیدیں۔ اُن کو اس میں تمکن حاصل ہو جائے۔

مملکت پاکستان کے حصول کا مقصد ایک ایسی مملکت ہے جہاں قرآنی حکومت کے لیے تمکن حاصل ہو

عزیزانِ من! یہ تو پاکستان کی داستان بیان ہو رہی ہے۔ جھگڑا ہی یہ تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ٹھیک ہے' یہ الگ بھی ہونا ہے تو یہ حصہ لے لو لیکن صرف ذاتی خودمختاری تک لو' جو سنٹر ہے وہ مشترک رہے گا۔ اُسے تمکن تو نہیں کہتے۔ تمکن تو وہ ہوتا ہے جو خالصتاً آزادانہ اقتدار حاصل ہو' Sovereignty (اقتدار) اِس کی اپنی ہو۔ تمکن اُس کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے اُسی ملک کے اندر اُن کو رہنے دیا اور وہاں فرعون سے کچھ مراعات اُن کو دلا دیں۔ ہمارے ساتھ مراعات کے سودے وہاں ہوتے تھے۔ ہندو اور انگریز مراعات

دیتا تھا' یہ جو سارے نیشنلسٹ ہیں' وہ اُن مراعات کو عین اسلام کہتے تھے۔ قرآن نے مراعات نہیں کہا۔ اس نے کہا ہے کہ **وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ** (28:5) ان کو تمکن حاصل ہو' ان کو Sovereignty (اقتدار) حاصل ہو۔ یہ کہا کہ ہم نے اُس قوم کے ساتھ یہ کیا۔ یہ ہے احسانِ خداوندی۔ انہوں نے کوئی خارقِ فطرت بات کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہم تمہارے جیسے عام انسان ہیں' غلطیاں بھی ہم سے ہوتی ہیں' سہو بھی ہوتے ہیں۔ کوئی دعویٰ کسی قسم کا نہیں ہے۔ اور انسان سے بڑی قوت اور ہوتی کس میں ہے۔ ''ایہہ تے بندے دا پتر بنڑ دائیں ہیگا ورنہ پوچھو نہ کنی قوت ایہدے اندرا ے۔'' [1] وہاں انگریز اور ہندو کی جتنی متحدہ قوتیں تھیں' اُس سے خوف آتا تھا۔ ہمارے پاس تھا کیا!

تحریک پاکستان کے سلسلہ میں قائداعظمؒ کے زادِ راہ کی تفصیل

انہوں نے ہال کے جلسے میں کھڑے ہو کر کہا تھا کہ کہا جاتا ہے کہ جناحؒ [2] کے پاس بڑی فوجیں ہیں۔ ہاں جناحؒ کے پاس فوجیں ہیں۔ سنو! یہ اُس کا اٹیچی کیس ہے' ایک اُس کا اسٹینوگرافر ہے اور ایک ٹائپ رائٹر ہے۔ یہ ہے میری ساری فوج۔ اس کے پاس تھا ہی اتنا لیکن یہ جو حق کی بات ہوتی ہے ہم نے وہاں دیکھا ہے کہ اِس کے اندر کتنی قوت ہوتی ہے۔ جو شخص حق کو لے کر کھڑا ہو جائے اور وہ باطل کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت نہ چاہے' تو وہ اس اصول پر کاربند ہے کہ

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

ان کو مصالحت کے لیے ہزار بار کہا گیا۔ اُس نے کہا کہ حق کے ساتھ مصالحت ہو ہی نہیں سکتی۔ میرا مطالبہ سیاسی مطالبہ نہیں ہے۔ میرا مطالبہ حق پر مبنی مطالبہ ہے اور حق پر مبنی مطالبہ کسی سے مصالحت نہیں کیا کرتا۔ یہ ہیں شرطیں۔ وہ ایک ایک منواتا چلا گیا بغیر کسی قسم کے فساد برپا کیے' جھگڑا کیے' پتھر پھینکے' شیشے توڑے۔ گاندھی (موہن داس: 1948-1869) جیسا اَہنسا کا قائل' وہ کہتا تھا کہ جو تشدد ہے یہ دھرم کے خلاف ہے لیکن 1942ء میں انگریز جب کلکتے تک آ پہنچا تو نظر آ رہا تھا کہ ہندوستان گیا۔ اُس شخص نے یہاں 1942ء میں Quit India [3] کی مہم شروع کی تو ریلوں کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں' ٹیلیفون کے کھمبے اکھیڑ دیئے' دفتروں میں اودھم مچا دیا' شیشے توڑے' سارے ملک میں جھگڑے برپا کر دیئے۔

---

[1] یہ انسان ہی نہیں بنتا ورنہ پوچھو نہ کہ اس میں کس قدر قوت ہے۔

[2] قائداعظم محمد علی جناحؒ (1948-1876ء)

[3] ہندوستان چھوڑ دو۔

قائداعظم کا گاندھی کو مشورہ کہ "قوم کو سول نافرمانی نہ سکھاؤ"

قائداعظمؒ کو بھی اُس نے کہا تھا کہ اِس حد تک تو تمہارا مقصد مشترک ہے کہ انگریز کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ آ وَاِس مشترک مقصد کے حصول کے لیے اِس Quit India Movement [1] میں ہم سے تعاون کرو۔ کیابات ہے اس حق پہ مبنی شخص کی! جواب دیا تھا کہ گاندھی! یہ مقصد ہے میرا۔ یہ اُس کے لیے جو ذریعہ تم اختیار کرتے ہو یہ باطل ہے۔ یاد رکھو' اپنی قوم کو Civil [2] Disobedience (سول نافرمانی) نہ سکھاؤ۔ نافرمانی قوم کو نہ سکھاؤ۔ اگر یہ اس کی عادی ہوگئی تو آج انگریز کے خلاف یہ Civil Disobedience (سول نافرمانی) کرتی ہے تو کل تمہارے خلاف کرے گی۔ میں اپنی قوم کو قانون کی Obedience (اطاعت) سکھاؤنگا' Disobedience (نافرمانی) کبھی نہیں سکھاؤنگا۔ او میرے اللہ! کہاں سے یہ داستانیں آپ کے سامنے آ ئیں گی کہا کہ (ونمکن لھم فی الارض) (28:6)۔ عزیزانِ من! میں یونہی تحریکِ پاکستان درمیان میں نہیں لے آیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ایک کڑی اُس کے ساتھ مل رہی ہے۔ یہ ہمیں کوئی قصہء پارینہ نہیں سنایا جارہا کہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے مصر کی سرزمین میں ایسا ہوا تھا۔ کہا کہ یادرکھو! ہر دور میں ایسا ہوتا ہے۔ ہم نے چاہا کہ یہ کیا جائے۔ **وَ نُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوۡدَهُمَا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ** (28:6) فرعون کے تو جنود تھے۔ جنود کے معنی لشکر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہامان [3] کے بھی لشکر تھے۔ وہ حکومت کے لشکر تو اتنے ہوتے ہی نہیں جوان کے لشکر ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ عجیب دلچسپی ہوتی ہے۔ حکومت کو تو اپنے لشکر کو Maintain (قائم ودائم) کرنے کے لیے اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لشکر یہ ہوتے ہیں کہ وہ کماتے ہیں' یہ کھاتے ہیں۔

دنیا میں سب سے عمدہ اور منافع بخش پیشہ مذہبی پیشوائیت کا پیشہ ہے

میں نے کہا ہے کہ دنیا میں سب سے عمدہ پیشہ مذہبی پیشوائیت کا ہے۔ اِس قسم کی Capitalism یعنی سرمایہ داری' دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گی۔ یہ ایک پیسہ Invest (لگاتے) نہیں کرتے اور ساری عمر عیش کرتے پھرتے ہیں۔ یعنی یہ ٹرین میں کبھی سفر ہی نہیں کرتے بلکہ ہوائی جہازوں میں اڑتے رہتے ہیں۔ جا کے کہیں دیکھیے وہ Inter Continental کے اندر ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ پیسہ

---

1. ہندوستان چھوڑو تحریک
2. سول نافرمانی کی تحریک کی منظوری تو 1920ء میں ہوئی جس پر 7 اگست 1942ء کے بعد عمل شروع کیا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان: سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص۔ 279 (فٹ نوٹ 2)
3. ہامان اور قارون کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورہ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص 124 (فٹ نوٹ 1 اور 2)

کہاں سے آتا ہے؟ یہ جنود کماتے ہیں؟ وہ بیچارے حکومت والے جو جنود ہیں اُن کا تو سارا بجٹ ہی اِن پہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اور اُن کی انوسٹمنٹ کی صورت یہ ہے کہ نہ کوئی کارخانہ لگایا ہوا ہے' نہ اُس نے کیپٹل انوسٹ (سرمایہ لگایا) کیا ہوا ہے' نہ کوئی کاروبار ہو رہا ہے۔ اور اُن سب سے زیادہ عیش کر رہے ہیں۔ قرآن نے دونوں کے لشکر یہاں کہا ہے۔ کوئی اور نہ ہوتا تو صرف فرعون کے لشکر ہی کہتا۔ کہا کہ پھر ان بنی اسرائیل کا جو تمکن تھا' ان کے تمکن میں فرعون' ہامان اور اُن کے لشکروں کو وہ کچھ دیکھنا پڑا کہ جس کے تصور سے بھی وہ کانپتے تھے۔ حذر کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ یوں آنکھیں بند کرتے تھے کہ یا اللہ! ایسا کبھی نہ ہو جائے۔ یہ جو انداز ہوتا ہے کہ جس کے متعلق کہتے تھے کہ کبھی ایسا نہ ہو جائے انہیں وہ کچھ دیکھنا پڑا۔

عزیزانِ من! ہم سے پوچھیے کہ تین جون (1947ء) کو ہندوستان کے اندر انگریز کی اور ہندو کی' دونوں کی' کیا کیفیت تھی۔ ہم تو اُن دفتروں میں تھے جہاں ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ ہمارا تو واسطہ اُن سے پڑتا تھا۔ ہم سے پوچھیے کہ کیفیت کیا تھی جس دن یہ اعلان ہوا۔ اور پھر چودہ اگست کی تو بات ہی آپ کیا پوچھتے ہیں کہ اُن کے اوپر کیا بیت رہی تھی جس کے دیکھنے سے یہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے تھے! کہا کہ ہم نے اُن کو وہ کچھ دکھا کے چھوڑا۔ ان کا تمکن صرف اتنا ہی نہیں تھا بلکہ جس چیز سے وہ اس قدر کانپ رہے تھے' ہم نے وہ کچھ ان کو دکھا کے چھوڑا اور اِس کے بعد پھر کڑی شروع ہوتی ہے کہ بات تو یہ ہے جو ہم نے کرنی ہے اور تم سے کہنا ہے اور داستان تو یوں ہے۔

اب آؤ! اِس داستان کو شروع سے بیان کریں۔ اگلی آیت سے بنی اسرائیل کی قوم کے اندر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا بیان کیا ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ نظر آتا ہے کہ یہ بہت بڑا ممتاز گھرانہ تھا اور قرآنِ کریم میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جو انبیائے کرام ہیں' وہ بڑے ہی ممتاز گھرانوں کے اندر پیدا ہوتے تھے۔ اور بڑے ہی غریبوں کے اندر زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ بھی آگے چل کے نظر آئے گا کہ قومِ بنی اسرائیل کے اندر تو یہ پیدا ہوئے لیکن گھرانہ بڑا ممتاز تھا جس میں یہ پیدا ہوئے۔ پیدائش کے بیان کے ساتھ ہی قرآن یہ واقعہ شروع کرتا ہے اور پھر ایک ایک کڑی کے ساتھ چلتا ہوا واپس آ کر اسی فرعون کے ہاں بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر ان کی آزاد مملکت کے قیام تک کی سرگذشت کو سامنے لے آتا ہے۔ وہ جناحؒ اتنا عرصہ لندن میں گیا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین کی طرف چلے گئے تھے۔ یہ سارے واقعات کڑی کے ساتھ کڑی ملاتے ہوئے اس سورۃ القصص میں آئیں گے۔

ہم سورۃ القصص کی آیت 6 تک آئے ہیں۔ 7 ویں سے یعنی اس داستان کی پہلی کڑی سے ہم شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

دوسرا باب: سورۃ القصص (آیات 7 تا 16)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ‌ ۚ اِنَّا
رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجٰعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۷﴾ فَالۡتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرۡعَوۡنَ لِيَكُوۡنَ لَهُمۡ عَدُوًّا وَّحَزَنًا‌ ؕ اِنَّ
فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا كَانُوۡا خٰطِـئِيۡنَ ﴿۸﴾ وَقَالَتِ امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ قُرَّتُ عَيۡنٍ لِّىۡ وَلَكَ‌ ؕ لَا
تَقۡتُلُوۡهُ ‌ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَـتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾ وَاَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰى فٰرِغًا‌ ؕ اِنۡ
كَادَتۡ لَتُبۡدِىۡ بِهٖ لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰى قَلۡبِهَا لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۰﴾ وَقَالَتۡ لِاُخۡتِهٖ
قُصِّيۡهِ‌ ۚ فَبَصُرَتۡ بِهٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ ﴿۱۱﴾ وَحَرَّمۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ فَقَالَتۡ هَلۡ
اَدُلُّكُمۡ عَلٰٓى اَهۡلِ بَيۡتٍ يَّكۡفُلُوۡنَهٗ لَـكُمۡ وَهُمۡ لَهٗ نٰصِحُوۡنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدۡنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَىۡ تَقَرَّ عَيۡنُهَا وَلَا تَحۡزَنَ
وَلِتَعۡلَمَ اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسۡتَوٰٓى اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا
وَّعِلۡمًا‌ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الۡمَدِيۡنَةَ عَلٰى حِيۡنِ غَفۡلَةٍ مِّنۡ اَهۡلِهَا فَوَجَدَ فِيۡهَا
رَجُلَيۡنِ يَقۡتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنۡ شِيۡعَتِهٖ وَهٰذَا مِنۡ عَدُوِّهٖ‌ ۚ فَاسۡتَغَاثَهُ الَّذِىۡ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ عَلَى الَّذِىۡ مِنۡ
عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوۡسٰى فَقَضٰى عَلَيۡهِ ‌ۖ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ‌ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ
رَبِّ اِنِّىۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ فَاغۡفِرۡ لِىۡ فَغَفَرَ لَهٗ‌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1978ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی ساتویں آیت سے ہو رہا ہے: (28:7)۔

سابقہ درس کی تجدید یادداشت

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ سابقہ درس میں سورۃ القصص کی ابتدا ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ داستانیں نہ تو

کوئی تاریخی قصے ہیں' نہ ہی وعظ و نصیحت کی باتیں ہیں۔ یہ وہ انقلابات ہیں جو انسانیت کی تاریخ میں' انسانوں کے خود ساختہ غلط نظام کے خلاف جس سے وہ انسانیت کو کچل کر رکھ دیتے تھے' برپا ہوئے۔ ایسی انقلابی شخصیتیں آتی رہیں جو اُس نظام کو مٹا کر اُن مستقل اقدار کے مطابق ایک نظام متشکل کرتیں جنہیں اقدارِ خداوندی کہتے ہیں جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ اور اِس طرح اُن مقہور' کمزور قوموں کو' انسانوں کے گروہوں کو' جنہیں انسانی استبداد نے کچل دیا ہوا تھا' پھر سے شرفِ انسانیت سے ہمکنار کرا دیتی تھیں۔ یہ ہے ساری داستانوں کا ملخص۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اِس سورۃ میں داستانِ حضرت موسیٰؑ یا بنی اسرائیل کی داستان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ باقی داستانوں میں غلط نظام کے کسی ایک گوشے کو نمایاں طور پہ سامنے لایا گیا ہے' مگر اِس میں اس غلط نظام کے جو تینوں بنیادی ستون ہوتے ہیں' اُنہیں سامنے لایا گیا ہے یعنی ملوکیت' قارونیت اور ہامانیت اور ملوکیت۔ ملوکیت کے معنی میں نے عرض کیا تھا کہ صرف بادشاہت ہی نہیں ہیں کہ ایک بادشاہ ہوا' پھر اُس کے بعد اُس کا بیٹا بادشاہ ہوا' تو یہ ملوکیت ہے۔ ملوکیت کے معنی انسانوں کو قانون سازی کا اختیار دینا ہے خواہ وہ ایک فرد کو بادشاہ کی حیثیت سے ہو' ڈکٹیٹر کی حیثیت سے ہو یا آج کی اصطلاح میں جسے آپ جمہوری نظام کہتے ہیں کہ جسے بہت بڑی رحمت قرار دیا گیا' انسانوں کے کسی گروہ کو' کسی فرد کو اختیار دینا کہ وہ قانون بنائے اور دوسرے انسانوں پر لاگو کرے۔ تو یہ ہے ملوکیت۔ آج کی اصطلاح میں اِسے سیکولر نظام کہا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ غلط نظام کے تین بنیادی ستون ہوتے ہیں۔ ایک اقتدار اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اُنہیں اگر آپ قانون سازی کا اختیار دیدیتے ہیں تو وہ کسی طریقے سے وضع کرکے اُس کا نام Constitutional یا (آئینی) یا Lawfull (قانونی) یا Legal (حسب قانون) قرار دے دیتے ہیں۔ اصل میں تو وہ دوسرے انسانوں کو اپنے اختیارات کے تابع رکھتے ہیں۔

انسان نے دوسرے انسانوں کو اپنے تابع رکھنے کے مختلف طریق اپنا رکھے ہیں

غلط نظام کا دوسرا بنیادی ستون نظامِ سرمایہ داری ہے کہ دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کسی نہ کسی طریقے سے غصب کرکے' اُس کے بل بوتے کے اوپر قوت حاصل کرتے چلے جانا اور اِس طرح سے محنت کشوں کو اپنے پروگرام یا ارادے کے تابع رکھنا۔ بات وہی تابع رکھنے کی ہوتی ہے۔ اس نظامِ سرمایہ داری یعنی Capitalism کی بھی شکلیں بدلتی ہیں لیکن بنیاد اِس میں یہی ہوتی ہے کہ دوسرے کی محنت کو کسی طرح سے غصب کرلیا جائے۔ پہلے زمانے میں ہنٹر کے زور پر غلاموں سے کام لیا جاتا تھا' آج روپے کو Invest (لگا کر) کرکے دوسروں کی محنت کو غصب کیا جاتا ہے۔ بنیادی چیز حقیقت میں وہی ہے' صرف اِس کا طریقہ بدلا ہوا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے

جس سے انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے خون کے آخری قطرے تک کو نچوڑ لیتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی تھپکیاں

میں نے عرض کیا تھا کہ اِس غلط نظام میں ایک تیسری چیز نمایاں پارٹ Play (ادا) کرتی ہے اور وہ ہے مذہبی پیشوائیت۔ کوئی انسان دوسرے انسان کو برضا و رغبت گوارا نہیں کرتا' خواہ وہ اقتدار کا استبداد ہو یا یہ سرمایہ داری کا استبداد ہو اِس کے خلاف طبیعت اِبا کرتی ہے' ردِعمل اِس کے خلاف ہوتا ہے لیکن وہ جو مذہبی پیشوائیت والا گروہ ہوتا ہے وہ اِن لوگوں کو بار بار تھپکیاں دے کر سلاتا رہتا ہے کہ وہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے' اُس کے فیصلے ہیں' اُس کی مشیّت ہے۔ وہ جسے چاہے اختیار دے' جسے چاہے اقتدار دے' جسے چاہے دولت دے' جسے چاہے غریب رکھے۔ اِس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر لانا تو ایک طرف' اگر آپ کے دل میں بھی اِس کے خلاف ردِ عمل یا اِبا یا نفرت ابھرتی ہے تو یہ خدا کے فیصلے کے خلاف ہوتا ہے۔ اس سے تمہیں ڈرنا اور کانپنا چاہیے۔ اُن کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ یہ کچھ کرتے رہیں۔ گویا پہلے جو دو نظام ہیں' اُن کے استحکام کی خاطر یہ اِن عوام کو اِس مغالطے میں رکھتے رہتے ہیں کہ یہ اِن کے جرائم نہیں ہیں' خدا کے فیصلے ہیں۔ وہ ان کا اسطرح سے یہاں اطلاق کرتے ہیں۔ ساری انسانیت میں آپ دیکھیں گے کہ یہ تین ہی گوشے ہیں۔ باقی جتنی قوموں کی داستانیں آئیں تو اِن میں سے کوئی ایک گوشہ سامنے آتا تھا لیکن داستانِ بنی اسرائیل کے اندر یہ تینوں گوشے بیک وقت آتے ہیں۔ فرعون ملوکیت کا نمائندہ ہے' قارون نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ ہے اور درمیان میں ہامان مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہے۔ بات یہاں سے چلی تھی۔ قرآن کا یہ جو داستان بیان کرنے کا ایک انداز یا اسلوب ہے' اِس میں دیکھا جائے تو جس طرح سے انسانیت ترقی کرتی آگے آتی ہے وہ اُسی انداز پہ آجاتی ہے جو قرآن نے کہا تھا یا اُن حقائق پہ آجاتی ہے جو قرآن نے کہے تھے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اِس نے بات بیان کرنے کا یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

کسی بات کو شروع کرنے کا انداز

اس اندازِ بیان میں یہ جتنے بھی ادیب' افسانہ نگار' Story Writer (کہانی نویس) ہیں وہ سب آجاتے ہیں۔ آپ بھی یہ دیکھیں گے۔ ذرا ہمارے دور سے پہلے کی بات ہے کہ جب کبھی آپ کو کوئی اسٹوری یا افسانہ دینا ہوتا تھا تو وہ پیدائش سے بات شروع کرتے تھے اور آہستہ آہستہ آخر تک لے جاتے تھے۔ یہی انداز چلا آ رہا تھا۔ ہمارے دور میں اِس چیز نے ترقی کی ہے۔ اب آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کوئی بات اُنہوں نے بیان کرنی ہوتی ہے تو آخر میں جو اُس کا انجام ہوتا ہے' شروع میں یونہی اُس کے لیے چار لفظ دیدیتے ہیں۔ اور وہ وہاں ایک مقام پہ لے جا کر پھر وہ ابتدا کی طرف لاتے ہیں۔ یہ بڑا موٴثر طریق ہے جو آج اختیار کیا گیا ہے اور سمجھا گیا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پیشتر اِس طریق کو اختیار کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی بات شروع کرنی تھی' ان

کی ابتدا سے یعنی پیدائش سے داستان مسلسل یہاں بیان ہونی تھی۔قرآن نے اِس انداز کے اندر یہ کیا کہ داستان یہاں سے شروع کی کہ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ (28:4) فرعون نے اودھم مچا رکھا تھا' سرکشی اختیار کر رکھی تھی' حدود فراموش ہو گیا ہوا تھا۔وہ کیا کیا کرتا تھا؟ اس کے جواب میں کہا کہ وَ جَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ❶ (28:4)۔یعنی وہ جو بات آخر میں ٹکراؤ کی آنی ہے' یہاں پہلے شروع میں اُس کے چند اشارات دیدیئے۔وہ یہ کرتا تھا اور یہ قوم کچھ نہیں کہتی تھی۔اُس کے بعد یہ ہے کہ وَ نُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا (28:5) ہم نے چاہا کہ اُس قوم پر احسان کریں جس کو اس طرح سے کچلا جا رہا تھا۔اور پھر احسان کے معنی یہ تھے کہ ہم انہیں اُس کی غلامی سے نکالیں۔ اُسی کے مملکت کے ایک حصے کا اُس کو وارث بنائیں' اُنہیں وہاں اقتدار اور Sovereignty حاصل ہو اور فرعون اور ہامان جس چیز کو دیکھنے سے خائف رہتے تھے' وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے آ جائے۔یہ کہنے کے بعد پھر بات چلی کہ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اُمِّ مُوۡسٰٓى (28:7) حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور ہم نے اُن کی ماں کی طرف یہ اشارہ بھیجا۔یہ بڑا مؤثر اور حسین انداز ہے۔اب اسٹوری رائٹر (کہانی نویس) نے اِس اسلوبِ بیان کو اختیار کیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں داستان حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ابتدا اُن کی پیدائش سے ہوتی ہے

قرآن کا یہ اسلوب بھی عجیب ہے۔یہاں پیدائش سے بات شروع کرتا ہے۔اور پھر پیدائش سے مسلسل لے جاتا ہے آخر تک اور آخر میں جا کر یہیں آ جاتا ہے جو ابتدا میں اس کے متعلق چار لفظ کہہ دیئے تھے۔بات شروع کرتا ہے پیدائش سے وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ (28:7)۔یہیں ایک بات وضاحت طلب آ گئی۔یہاں ایک لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے کہ ''ہم نے وحی کی اُمِ موسیٰ کی طرف کہ بچے کو دودھ پلاتی رہے''۔ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ (28:7) اور جب اِس کے متعلق کچھ خدشہ پیدا ہو تو پھر وہ اِسے دریا میں بہا دے۔یہ دریا میں بہا دینے والی بات میں آگے چل کر ابھی عرض کرونگا۔

اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کا معاملہ اور مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کی حقیقت

یہ کیا بات تھی؟ میں نے کہا ہے کہ ابتدا میں ہی ایک چیز وضاحت طلب آ گئی۔وہ لفظ ہے اوحینا۔ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے اُمِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔معاف رکھیے گا جو کچھ میں ابھی بیان کرنے لگا ہوں' یہ اُس انقلابی داستان کا تو ٹکڑا نہیں لیکن یہ بڑی اہم چیز ہے' اس لیے اس پہ ذرا غور کیجیے گا۔یہ نہ کہیے گا کہ یہ تو Theoretical یا نظری سی بحث اس نے شروع کر دی۔ یہ بات اہم ہے۔

---

❶ وہ ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا۔

قرآنِ کریم میں ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) اسی قرآن سے تم دیکھو گے کہ بہت سے لوگ ہدایت حاصل کریں گے اور بہت سے گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہیوں میں ڈالیں گے۔ تو اِسی قرآن سے کس طرح سے کرنے کی یہ بات ہے۔ ہمارے ہاں پنجاب میں ایک مدعی نبوت مرزا غلام احمد (1908-1835) پیدا ہوا۔ بنیاداً اُس نے یہ کہا کہ میری طرف وحی ہوتی ہے۔ اعتراض ہوا کہ وحی تو انبیائے کرامؑ کی طرف ہوتی ہے۔ وہ شخص سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دعویٔ نبوت تک بتدریج پہنچا تھا' بڑے جھُل دیتا ہوا (پینترے بدلتا ہوا)۔ کہا کہ نہیں یہ ضروری نہیں کہ وحی انبیاء ہی کی طرف ہو' غیر نبی کی طرف بھی خدا کی وحی ہوتی ہے۔ ارے بھئی! وہ تو تخصیص ہی نبی اور غیر نبی میں یہ ہے کہ نبی کی طرف خدا کی وحی ہوتی ہے' دوسرے انسانوں کی طرف وحی نہیں ہوتی۔ کہنے لگا کہ دیکھیے وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (28:7) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی۔ اگر امِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی ہوسکتی ہے تو میری طرف کیوں نہیں ہوسکتی۔ میں نے کہا کہ یہ چیزیں آج آپ کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اِس کی اہمیت ہم سے پوچھیے جنہوں نے پچاس ساٹھ سال اس جنگ میں گزارے۔ انہی کا مناظرہ اور مقابلہ کرتے رہے۔ آپ نے میری کتاب دیکھی ہوگی اُس میں میں نے لکھ دیا ہے۔ لیکن وہ آج بھی وہ یہی چیز ہے۔ جہاں بھی وہ آپ کو ملیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اسی پہ آجائیں گے کہ صاحب! دیکھیے' حضرتِ اُمّ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی ہوئی۔ تو میں ایک اصول سمجھا دینا چاہتا ہوں۔ اِسی پہ نہیں اور باتوں پہ بھی اُس کا اطلاق ہوگا۔

عربی زبان میں وحی' نبی اور رسول کے الفاظ کا صحیح استعمال اور مفہوم

قرآنِ کریم عربی زبان میں ہے۔ اُس زبان میں وہ نازل ہوا اور اُس زبان کی کتاب ہے۔ الفاظ تو اُسی زبان کے اِس میں استعمال ہوئے ہیں۔ لفظ کے استعمال میں ایک اصولی بات یاد رکھیے کہ ایک تو لفظ کے عام لغوی معنی ہوتے ہیں' Dictionary Meaning (لغوی معنی) اُس کے ہوتے ہیں۔ اور پھر وہی لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب وہ اصطلاح کے طور پہ کہیں استعمال ہو تو اُس کے معنی وہی متعین ہوتے ہیں جو اصطلاح کے معنی ہوتے ہیں۔ یہ جو Dictionary Meaning ہیں' بنیادی طور پہ تو وہ ہوتے ہیں۔ وہ اصطلاح کے طور پہ جو معنی ہیں' وہ خاص انہی معنی کے اندر استعمال ہونگے جن کے لیے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں عربی زبان کے الفاظ تو اس طرح آئیں گے اور بعض الفاظ اُس میں ایسے ہیں جنہیں اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً نبوت ہے۔ نبی کے معنی ہوتے ہیں یا تو خبریں دینے والا یا مقامِ بلند پر جو کھڑا ہو۔ عربی زبان میں قرآنِ کریم میں جو لفظ ان معنوں کے اندر' لغوی معنوں کے اندر' عام طور پہ استعمال ہو لیکن جب قرآن النبی کہے گا یا کسی کے متعلق نبی کہے گا تو یہ اصطلاح ہوگی' اِس کے معنی عام خبریں دینے والا نہیں ہوگا' عام بلند مقام پہ کھڑا نہیں ہوگا۔ یہ اصطلاح ہے کہ خدا کی طرف سے خبریں لانے والا۔ خدا کی

طرف سے علم پانے والا۔ نبی کے معنی ہیں جسے خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہو۔ انسان جو حاصل کرتا ہے وہ کسی ذریعے سے حاصل کرتا ہے۔ معلومات حاصل ہوتی ہیں' پھر وہ استنباط کرتا ہے' فکری طور پہ ایک نتیجے پہ پہنچتا ہے۔ اُسے اُس کا علم کہتے ہیں۔ کسی استاد سے سیکھتا ہے' کسی کتاب سے پڑھتا ہے' تجربہ کرتا ہے' مطالعہ کرتا ہے۔ یوں علم حاصل ہوتا ہے لیکن نبی وہ ہے جسے حقائق کا علم خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ اُس میں اُس کی اپنی عقل' فکر' دانش' تجربہ' مطالعہ' تعلیم کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ براہِ راست اُس کو یہ علم ملتا ہے جسے اس طرح خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملے' تو خدا کی طرف سے اُس علم دینے کو وحی کہا گیا ہے' جسے یہ علم ملتا ہے اُسے نبی کہا گیا ہے۔ جب یہ علم وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے یا اِس کے مطابق معاشرہ متشکل کرتا ہے تو اُسے الرسول کہا گیا ہے۔

رسول کے لفظ کے استعمال کے سلسلہ میں ایک تاکید

رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں' پیغامبر کے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ ہر Messanger (پیغامبر) کے لیے استعمال ہوتا ہے' ہر قاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آج بھی عربوں کے ہاں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ پنڈت جواہر لال نہرو (1889-1964) کئی دفعہ مڈل ایسٹ میں گیا تھا' غالباً عراق میں تھا تو اُنہوں نے کہا کہ یہ رسولِ امن ہے۔ اُن کی زبان میں آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظِ رسول خالص قاصد کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ تو ہوگا کیونکہ وہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن جہاں وہ کسی نبی کو الرسول کہے گا تو یہ عام معنی میں قاصد نہیں ہوگا۔ یہ ہوگا خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچانے والا۔ اور یہ خصوصیت ہو جائے گی نبی کی' نبی کے منصبِ رسالت کی۔ یہ ہے جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے بڑی تاکید کی تھی اور جب میں نے احمدیت کے خلاف لکھا ہے تو میں نے یہ کہا تھا کہ ٹھیک ہے عربی زبان میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن جب یہ اصطلاحی طور پر ہمارے ہاں آ جائے تو ہمیں اپنے ہاں ان لفظوں کو عام معنی میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ اِس سے الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں قاصد یا پیغامبر کو رسول نہیں کہنا چاہیے کیونکہ جب ہم رسول کہیں گے تو پھر وہ وہی رسول ہوگا جو خدا نے اصطلاحی طور پہ کہا ہے اور نبی اکرم ﷺ رسول ہو گئے۔ یہی چیز اس لفظِ وحی کی ہے۔ وحی کے معنی ہوتا ہے اشارۂ خفیف۔ تیزی سے اشارۃً کوئی بات کہہ دینا۔ یہ ہے اِس کے بنیادی معنی۔ اب قرآنِ کریم میں یہ جو اِس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے کی ہے' یہ تو شیاطین کے متعلق بھی قرآن میں ہے۔ شیاطین کے متعلق ہے کہ **يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ** (6:112) اور **لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ** (6:121) وہ ایک دوسرے کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اگر یہ وہی ایک ہی معنی لیے جائیں کہ جو خدا نبی کی طرف وحی کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ صاحب! یہاں تو لکھا ہے کہ شیطان شیطانوں کی طرف وحی کرتے ہیں تو گویا پھر یہ شیاطین بھی نبی ہو گئے کیونکہ ان کی طرف وحی ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ **وَ أَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى**

النَّحۡلِ (16:68) خدا نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ لفظ وہی وحی ہے۔ گویا یہ چیز Instinctly (جبلی طور پر) ان چیزوں کے اندر خدا کی طرف سے رکھی جاتی ہے تو اُس نے اُس کو بھی وحی کہا ہے۔ اسی طرح زمین کی طرف اور سما کی طرف وحی کی۔ تو ایک وحی کا لفظ لے کر اُس کے متعلق یہ کہنا کہ صاحب! یہ دیکھ لیجیے کہ غیرِ نبی کی طرف بھی وحی ہوتی ہے' اس لیے میری طرف بھی وحی ہوئی اور پھر آگے اِس اعتبار سے یہ کہنا کہ خدا نے میری طرف وحی کی ہے' یہ بھی ایک قسم کی نبوت ہے۔

قرآن حکیم نے شہد کی مکھی اور زمین و آسمان کو وحی کر رکھی ہے

اب وہ یہاں آ گئے تو پھر وہ اِس قسم کی نبوت تو شہد کی مکھیوں کو حاصل ہوگی' زمین کو حاصل ہوگی' آسمان کو حاصل ہوگی' یہ شیاطین ایک دوسرے کی طرف وحی کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے Dictionary Meaning میں یعنی لغوی معنوں میں کہاں استعمال ہوتا ہے اور وہ جو قرآن کی اصطلاح ہے اُس میں کہاں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ مشکل نہیں ہے کیونکہ قرآن نے خود ان چیزوں کو واضح کر دیا ہے۔ اب کہا کہ اُمّ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہم نے وحی کی۔ یہ جسے آپ وحی نبوت کہیں گے یعنی جو صرف نبیوں پر ہوتی ہے' پہلی چیز تو اِس میں یہی اُن سے کوئی پوچھے۔ یہ لوگوں کو مغالطہ دیتے ہیں کیونکہ قرآن پہ عبور نہیں ہوتا اس لیے مغالطہ دیتے چلے جاتے ہیں۔

رسول ہمیشہ مرد ہوتے تھے

قرآنِ کریم میں تین چار مقام ہیں جہاں یہ کہا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مرد ہوتے تھے عورت کی طرف وہ وحی' جو رسالت کی وحی ہے یا نبوت کی وحی ہے' وہ تو قرآن کے خود خلاف ہوگیا۔ تخصیص سے قرآن نے یہ کہا ہے۔ ان کے یہ حوالے لکھ لیجیے: (16:43 ❶, 21:7 ❷, 12:109)۔ انہی میں کی ایک آیت ہے کہ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ (12:109)۔ ان تینوں آیات میں یہی لفظ ہے کہ رسول ہمیشہ مرد ہوتا تھا۔ تو اگر یہ لے لیا جائے کہ یہ وہی وحی ہے جو امِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے تو یہ تو عورت کی طرف ہے۔ گویا یہ وہ وحی نہیں ہے جو رسالت یا نبوت کی وحی ہوتی ہے۔ اِس کے لغوی معنی لیے جائیں گے۔ اس کے بنیادی معنی تو ہوتے ہیں: ''خفیف اور کچھ سریع سا اشارہ کسی کی طرف کرنا۔'' اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی حکم کا دوسرے کیطرف کسی کی معرفت بھیجنا''۔ یہ لغت میں اِس کے بنیادی معنی ہیں۔ تو امِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف جو کہا کہ ہم نے اپنا حکم بھیجا۔ تو ٹھیک ہے' اپنے کسی نبی سے یہ کہا کہ یہ بات جا کے امِ موسیٰ علیہ السلام سے کہہ آؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی قوم تو نبیوں کو ماننے والی قوم تھی۔ اِن کے

---

❶ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ (16:43)۔

❷ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ (21:7)۔

ہاں تو عام نبی ہوتے تھے۔ آخر میں جا کر ایک نبی تو پوری عالمگیر انسانیت کے لیے آیا۔ پہلے تو ایک ایک گاؤں کے لیے ہوتا تھا' ایک ایک گروہ کے لیے نبی ہوتا تھا۔ ''او حینا'' کے معنی ہیں کہ خدا نے اپنے کسی مامور کے ذریعے سے اِمِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ یہ کرنا۔ عربی زبان میں اِس کے لیے وحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ او حینا کے معنی یہ ہیں۔

کسی آسمانی کتاب کو قرآنِ حکیم کی طرح محفوظ نہیں کیا گیا

عزیزانِ من! یہ جسے ختمِ نبوت کہتے ہیں' اس بات کو سمجھ رکھیے کہ نبی خدا کا پیغام لے کر آتا تھا' خدا کی کتاب لے کر آتا تھا۔ پہلی کتابوں میں سے کسی کتاب کے متعلق بھی جس شکل میں بھی وہ آج موجود ہیں یا اُس کتاب کے ماننے والوں کے جو دعاوی ہیں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی کہ یہ دین اس کے اندر مکمل ہو گیا ہے' یہ محفوظ کر لی گئی ہے' خدا نے اِس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ کسی کتاب کے متعلق یہ نہیں کہا گیا۔ قرآن کے متعلق یہ کہا گیا کہ یہ وَ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) مکمل ہو گیا دین اِس کے اندر' تکمیل ہو گئی' کوئی کمی نہیں رہی۔ اِس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اور اُس کے بعد یہ کہ ہم نے اِس کو نازل کیا ہے' ہم اِس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ مکمل' غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ اور کہا کہ یہ عالمگیر انسانیت کی طرف ہے' قیامت تک کے لیے ہے۔ جب ایک کتاب ایسی آ گئی جو خدا کا نظام لیے ہوئے ہے' جو مکمل ہے' غیر متبدل ہے' محفوظ ہے' پوری انسانیت کے لیے ہے' سارے زمانوں کے لیے ہے تو اب خدا کی طرف سے کوئی کتاب یا حکم یا پیغام آنے کی تو ضرورت ہی نہ رہی۔ یا تو اُس نے کوئی چینج (تبدیل) ہونا ہوتا تو جب کوئی نبی وہ بھیجتا' کوئی اور پیغام بھیجتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غیر متبدل ہے۔ یا اِس میں کوئی کمی رہ گئی ہوتی تو اُس کو مکمل کرنے کے لیے بھیجتا کہ لیجیے یہ Supplement اُس کے ساتھ اضافہ کر لیجیے۔ یا یہ غیر محفوظ ہو جاتی جیسی پہلی کتابیں تھیں تو پھر دوسرا نبی بھیجتا کہ اصلی کتاب وہ پھر آ کر دیدیتا۔ تینوں شکلوں میں سے تو ایک شکل بھی باقی نہیں ہے۔ سو اِس کے بعد کوئی نبی کاہے کے لیے آئے گا۔ وہ[1] خود ہی کہہ رہے ہیں۔

من نیستم رسول و نیاوردہ ام کتاب (نہ میں رسول ہوں اور نہ میں کتاب لایا ہوں)۔

کہ نہیں نہیں میں کتاب وتاب تو نہیں لایا۔ ''تے تسی کرن کی آئے او جی''۔[2] معاف رکھیے' وہی جو میں کہا کرتا ہوں کہ وہ چٹھی

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔ ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوع اسلام کراچی' 1949' ص ص 807 تا 827۔

[2] تو پھر آنجناب کیا کرنے تشریف لائے ہیں۔

رساں آتا ہے‘ اُس کے پاس آپ کے لیے خط ہوتا ہے‘ اور وہ Deliver (حوالے) کرتا ہے۔ ’’اک او وی آجیہڑا بغیر خط دے وی اونداا ئے‘ عید والے دن عیدی لین واسطے‘‘۔ ❶ عزیزانِ من! اس قوم میں جب مرکزیت فنا ہوئی تو یہ ساری‘ جتنی چیزیں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں‘ یہ لامرکزیت کی وجہ سے ہیں۔ ایک مرکز اس قوم کا ہو اور مرکز قرآن کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہو تو کسی کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ اس طرح سے قوم کو فریب دے اور بہکا تا پھرے۔ اب جس کا جو جی چاہے دعویٰ کرتا پھرے‘ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔

میں احباب کے لیے ایک اور بات عرض کروں۔ میں اس لیے بھی یہ عرض کرتا ہوں کہ غنیمت ہے کہ ہمارے پاس یہ ذرائع ابلاغ ایسے ہیں کہ ان میں بات محفوظ ہو جاتی ہے۔ شاید آج یہ کام کی نہ ہو لیکن آنے والوں کے لیے محفوظ رہے گی تو کام کی بات ہوگی۔

نزولِ قرآن کے متعلق ایک اہم نکتہ

قرآنِ کریم کے متعلق ایک اور بات بھی بڑی معنی کی ہے۔ کتاب رسول کے اوپر نازل ہوتی تھی۔ عربی نہ جاننے والوں کے لیے میں عرض کردوں کہ ایک تو لفظ ہوتا ہے ’’الی‘‘ جس کے معنی ہوتا ہے ’’کی طرف‘‘ کہ فلاں نبی کی طرف ہم نے کتاب بھیجی یا کتاب نازل کی۔ ایک لفظ ہوتا ہے ’’علی‘‘ جس کے معنی ’’اوپر‘‘ ہوتا ہے کہ اُس کے اوپر نازل کی۔ نبی کے لیے یہ لفظ ’’علی‘‘ آتا ہے۔ تمام انبیائے کے لیے یہ لفظ ’’علٰی‘‘ آیا ہے کہ اُن کے اوپر یہ نازل کی۔ قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی یہ لفظ ’’علٰی‘‘ آیا ہے اور پوری امت کے متعلق ہے کہ مَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ (2:231) یہ پوری امت کے اوپر نازل ہوا ہے۔ سوچ رکھیے‘ لکھ رکھیے‘ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ کہا کہ وَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ مَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَ الۡحِكۡمَةِ (2:231) یہ ’’علیکم‘‘ آیا ہے۔ تمام مومنین کے متعلق ہے۔ دوسری جگہ خود نبی اکرم ﷺ سے یہ کہا گیا ہے کہ قل اعلان کردے کہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (3:84) ہم ایمان لائے خدا پر۔ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ اگر واحد ہوتا تو رسول کو تو کہنا چاہیے تھا کہ میں خدا پر ایمان لایا۔ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ کہا کہ اعلان کردو کہ ہم خدا پر ایمان لائے۔ اور وَ مَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا (3:84) اور ہم ایمان لائے اُس پر جو ہم پہ نازل ہوا ہے۔ رسول اپنے ساتھ اپنی جماعت امت کو شامل کر رہا ہے۔ قیامت تک کے لیے یہ امتِ محمدیہؐ کے اوپر قرآن نازل ہو رہا ہے۔ جو اِس کے اوپر ایمان لاتا ہے وہ اِس کے اندر شامل ہے تو وہ قیامت تک سلسلہ ہے۔ کتاب موجود ہے اور ہم پہ نازل ہو رہی ہے۔ بڑے عجیب انداز میں سمجھانے والا سمجھاتا ہے‘ ایسے مقام پہ سمجھاتا ہی وہی شخص ❷ ہے کہتا ہے کہ

---

❶ وہ بھی ہے جو بغیر خط عید کے دن عیدی لینے آتا ہے۔

❷ یہ اشارہ مفکرِ اسلام ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف ❶

کوئی تفسیر، تمہیں قرآن کو نہیں سمجھا سکتی جب تک قرآن خود تیرے ضمیر کے اوپر نازل نہ ہو۔ اور یہ چیز رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی تو تھی کہ جبریل یہ تیرے قلب پہ نازل کرتا ہے۔ یہ وہی ضمیر پہ نازل ہونے والی بات ہے۔

ذاتِ خداوندی قرآن حکیم کے ذریعے ہر اہل ایمان سے ہم کلام ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ تو جب تک ماننے والے کے ضمیر کی گہرائیوں سے اوپر ابھرے نہیں، تو قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اور پھر وہ بات بھی ہے کہ قرآن کو خدا نے کلام اللہ کہا ہے۔ خدا کے کلام کے کیا معنی ہیں؟ جب میں قرآن پڑھتا ہوں اور وہاں خدا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ ''یوں کرو'' تو خدا مجھ سے بات کر رہا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ سارے قرآن میں خدا مجھ سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب میں کہتا ہوں: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ (2:286) تو میں خدا سے باتیں کر رہا ہوتا ہوں۔ یہ تو ہمکلامی ہے۔ خدا پہ ایمان رکھ کر قرآن پڑھنے والے کا کتنا بڑا مقام ہے کہ اُس کے ساتھ خدا باتیں کر رہا ہے اور وہ خدا سے باتیں کر رہا ہے۔ عزیزانِ من! شعر تو وہ عام سا ہے لیکن ہے وہ برمحل۔

وہ مجھ سے ہوئے ہمکلام اللہ اللہ

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

عزیزانِ من! جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو خدا آپ سے باتیں کر رہا ہوتا ہے اور آپ خدا سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ جب اِس کتاب کی کیفیت یہ ہو تو اِس کی موجودگی میں کسی اور کے درمیان میں آنے کے معنی کیا ہیں؟ کچھ نہیں ہم براہِ راست اُس کے ساتھ جو باتیں کر رہے ہیں تو یہ درمیان میں ''وچ وچولا'' آ گیا۔ یہ کیا کرنے کے لیے درمیان میں آتا ہے!!

مقامِ رسالت، ختم نبوت کی حقیقت اور وحی کی کیفیت

یاد رکھیے! نبی اکرم ﷺ کے ختمِ نبوت کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ جو کتاب حضور ﷺ کی طرف نازل ہوئی، وہ پوری امت کے اوپر نازل ہوئی۔ یہ قیامت تک کے لیے غیر متبدل، مکمل، محفوظ کتاب ہے۔ ہر ایک کے ساتھ خدا بات کرتا ہے جو یہ کتاب پڑھتا ہے۔ پڑھنے والا خدا کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ قیامت تک کے لیے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ عالمگیر انسانیت کے لیے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب اِس

---

❶ بالِ جبریل۔

کے لیے نہ کوئی انسان باقی' نہ کوئی زمانہ باقی' نہ اِس کی ضرورت' نہ اِس میں کمی' نہ اِس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔عزیزانِ من! یہ ہیں ختمِ نبوت کے معنی۔اب اِس کے بعد یہ کہنا کہ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی (28:7) دیکھیے' موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی ہوئی ہے اس لیے ہماری طرف بھی وحی ہو رہی ہے۔تو میں نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے آپ کہتے چلے جایئے' تو شیطان بھی ایک دوسرے کی طرف وحی کرتے تھے۔تو وہ معنی یہاں پہ کیوں نہ چسپاں ہو جاتے۔

یاد رکھیے! الفاظ جو قرآن میں ہیں' ایک تو اُن کے لغوی معنی ہیں یعنی Dictionary Meaning ہیں۔عام طور پہ یہ معنی لیے جائیں گے لیکن جہاں اُس نے کسی چیز کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے' وہاں اُس کے یہی معنی لیے جائیں گے جو اُس نے اصطلاحی طور پہ کہے ہیں۔صوم کے معنی رکنا ہے لیکن جب اُس نے کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) کہا ہے تو الصیام پھر وہ روزہ ہو گیا جس کی تشریح خود اُس نے کر دی ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔رسول' قاصد کو کہتے ہیں لیکن جب الرسول کہہ دیا کہ وہ جس کی طرف ہماری وحی ہوتی ہے تو پھر یہ رسول کا لفظ کسی دوسرے کے لیے استعمال نہیں ہوگا۔اور اِس کے معنی عام قاصد کے نہیں لیے جائیں گے۔نبی کے معنی خبر دینے والا نہیں لیا جائے گا بلکہ النبی کے معنی ہوگا کہ خدا کی طرف سے وحی پا کر لوگوں کو خبریں پہنچانے والا۔میں نے یہ اس لیے اتنی تفصیل عرض کی ہے کہ ہمیں تو معلوم ہے کہ تقریباً ایک صدی تک یا پون صدی تک اس امت کو کس طرح سے ان الفاظ کے ذریعے سے چھلاوے کے اندر رکھا کہ خدا کی طرف سے وحی بھی آتی ہے' نبی بھی آتے ہیں' رسول بھی آتے ہیں۔

امت مسلمہ تیرہ سو سال سے کشف اور الہام کے چھلاوے میں گرفتار ہے

وہ [1] تو اتنی غلطی کر گیا کہ اُس نے یہ اصطلاحیں اپنے لیے استعمال کر لیں ورنہ یہ جو خدا کی طرف سے براہِ راست علم پانے کا سلسلہ ہے۔اس میں یہ لفظ آپ کے ہاں' امت میں' تیرہ سو سال سے جاری ہے۔یہ جسے آپ اولیائے کرام یا صوفیائے عزام کا کشف اور الہام کہتے ہیں' وہ کیا ہوتا ہے؟ دعویٰ یہ ہے کہ اُنہیں خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے۔وحی نہ کہا' کشف کہا تو بات تو وہی ہے۔یہ تو ہزار برس سے آپ کے ہاں ہو رہا ہے۔اور پھر یہ کہ وہ جتنے زیادہ صاحبِ کشف اور صاحبِ الہام ہیں' وہ اتنے ہی بڑے آپ کے ہاں مقرب اور مہذب بن جاتے ہیں اور اُن کو آپ اولیائے عظام بناتے ہیں۔تو ایک طرف آپ اُن کی قبروں کو پوجتے ہیں۔اُن کے متعلق کبھی یہ بات آپ کے ذہن میں نہیں آتی۔وہ چونکہ یہ لفظ استعمال کر گیا ''تے اوہدے پچھے لا دتا''۔عزیزانِ من! خدا کی طرف سے براہِ راست علم صرف النبی یا الرسول کو ملتا تھا۔علم کا جو یہ ذریعہ تھا جو خدا نے بتایا ہے' یہ حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر ختم کر دیا۔اب خدا

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔

کی طرف سے براہِ راست کسی کا علم پانے کا کوئی امکان نہیں۔ جو دعویٰ کرتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے خواہ وہ لفظ کوئی استعمال کرے۔ قرآن میں کہیں کشف اور الہام کا ذکر نہیں آیا۔

وحی کے بالمقابل عقل انسانی کا مقام

قرآن میں یا تو یہ علم ہے جو انبیائے کرام کو ملتا تھا اور باقی وہ علم ہے جس میں تمام انسان مطالعہ سے، تجربہ سے، مشاہدہ سے، تعلیم سے، تدریس سے، شریک ہوتے ہیں۔ ان ذریعوں سے یہ علم حاصل ہوتا ہے۔ انسان کی اپنی فکر اُس میں ہوتی ہے، اپنی عقل ہوتی ہے، اپنا شعور ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو علم پایا جاتا ہے اُس میں انسان کا اپنا عقل و شعور نہیں ہوتا۔ انسان کے اپنے کسب و ہنر کا بھی اِس میں دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک مختص سی چیز تھی جو انبیائے کرام کے ساتھ مخصوص تھی، وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ہم اُسے آج سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہ ذریعہ تھا کیا۔ یہ یاد رکھیے کہ خدا کی طرف سے جو براہِ راست علم ملنے کا ذریعہ علم تھا، وہ وحی تھی، وہ کتاب کے اندر محفوظ ہو گئی۔ آخری وحی رسول اللہ ﷺ تک آ گئی، ختم نبوت ہو گئی۔ اب جو خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا تھا وہ قرآن کے اندر ہے اِس سے باہر کہیں اور نہیں ہے اور نہ کسی اور کو مل سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کے یہ معنی ہیں۔

داستان موسیٰ علیہ السلام کی ابتدا

اب داستان شروع ہو گئی کہا ہے وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ (28:7) ہم نے اپنے کسی مامور کے ذریعے امِ موسیٰ کی طرف یہ پیغام بھیجا، یہ حکم بھیجا کہ سرِ دست تُو بچے کو دودھ پلاتی رہے لیکن اگر تمہیں کوئی خدشہ محسوس ہو تو پھر تم اِس کو دریا میں بہا دینا۔ دوسری جگہ ہے کہ ایک صندوق میں بند کر کے، صندوق کو دریا میں بہا دینا۔ میں نے پچھلی دفعہ آپ سے عرض کیا تھا کہ عام طور پہ مشہور یہ ہے کہ وہ جو فراعنہ مصر تھے وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ذبح کر دیا کرتے تھے، قتل کر دیا کرتے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن میں تو یہ چیز یوں نہیں ہے، نہ تاریخ اِس کی کوئی تائید کرتی ہے، نہ یہ واقعتاً ایسا ہے۔ اگر وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرا دیا کرتے تھے تو حضرتِ موسیٰ کے زمانے میں لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل وہاں کیسے موجود تھے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو تو سمجھ لیا کہ وہ اِس انداز سے بچا لیے گئے، ان کے بھائی حضرتِ ہارونؑ وہاں زندہ موجود تھے۔ پھر پوری کی پوری بنی اسرائیل کی قوم وہاں موجود تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ذبح کر دیا کرتے تھے۔ وہ میں نے جو کہا ہے کہ ''یذبحون'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ ابنائے قوم جنہیں وہ دیکھتے تھے کہ ان میں ذرا جوہرِ مردانگی پائے جاتے ہیں، اِن کی طرف سے مملکت کو، حکومت کو، خطرہ ہو سکتا ہے، وہ اُن کو ذلیل کر دیتے تھے، پست کر دیتے تھے، دبا کے رکھتے تھے۔ وہ اپنی محکوم رعایا کو اپنے نقشے کے مطابق ابھرنے دیتے تھے۔ وہ جس طرح سے یہ مالی ہاتھ میں قینچی لیے ہوئے پھرتا

رہتا ہے۔ آپ کی باڑ کے اندر سے ذرا کسی پتے نے اُس کے نقشے سے زیادہ اوپر سر ابھارا تو اُس نے کتر چ کر دیا۔ یہاں تک رہو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ استبداد کسی کو سر اٹھا کر چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ عربی زبان میں بھی یہ ہیں ذبح کے معنی۔ فرعون کرتا یہ تھا۔ اب یہ چیز تھی کہ قوموں کے اندر خاص خاندان ایسے ہوتے ہیں جن میں اِس قسم کے افراد پیدا ہوتے ہیں۔

انبیائے کرام کا تعلق ہمیشہ باوقار گھرانے سے ہوتا تھا

قرآن نے یہ بتایا ہے کہ انبیائے کرامؑ ہمیشہ بڑے ہی معزز گھرانوں کے اندر پیدا ہوا کرتے تھے۔ اُن کی آواز بھی اسی لیے شروع سے سنی جاتی تھی۔ وہ نبوت سے پہلے بھی نامور ہوتے تھے۔ اسی لیے قوم اُن کو جھٹک کر نہیں رکھ دیتی تھی' ورنہ اگر کوئی غریب مفلس یا آج کی اصطلاح کے اندر چھوٹے درجے کا یا چھوٹی قوم کا آدمی' کوئی کمین یا کوئی اِس قسم کا فرد ہوتا' اگر یہ اٹھ کے دولت مندوں سے کہتا کہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ یہ دولت اپنے پاس رکھو' اِس کو بانٹنا چاہیے تو وہ کہہ دیتے کہ ٹھیک ہے یہ خود چھیننا چاہتا ہے لیکن اگر اُنہی میں سے ایک شخص اٹھ کر کہے کہ دیکھو بھائی! یہ جو ہم اِس طرح سے دولت سمیٹتے ہیں یہ بالکل غلط ہے' ہمارا اس کے اوپر کوئی حق نہیں ہے' یہ حق اُنکا ہے جو محنت کرتے ہیں' تو یہ بات نہیں کہ پھر وہ Motive (محرک) اُس کی طرف Attribute (منسوب) کیا جائے کہ یہ اپنے لیے یہ کچھ کرتا ہے۔ نبی اسی لیے ممتاز گھرانے میں سے ہوتا تھا۔ وہ ٹھیک کہا ہے سعدی (1291-1184) نے کہ

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئی اوست

مانگنے والا فقیر اگر تمہیں سلام کرتا ہے تو یہ اُس کی عادت ہے۔ سوال اُس کا ہے جو گھوڑے پہ چڑھا ہوا آتا ہے اور نیچے چلنے والوں کو سلام کرتا ہے۔ جو حضور ﷺ نے کہا ہے کہ گھوڑے سوار کے لیے فرض ہے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔ پیدل چلنے والا تو ہر گھڑ سوار کو سلام کرتا ہے۔ اِس کا سلام تذلیلِ انسانیت ہے۔ اُس کا سلام شرفِ انسانیت ہے کہ اپنے سے نیچے والے کو سلام کرتا ہے۔ نبی ہمیشہ ممتاز گھرانے میں پیدا ہوتا تھا۔ اور ممتاز گھرانے کی طرف سے ہمیشہ اِس قسم کی مستبد حکومتیں خائف رہتی ہیں۔ باقی تو خس و خاشاک ہوتا ہے۔ اُن کی طرف سے انہوں نے کیا خائف ہونا ہے۔ اور یہی ہیں جن سے وہ خائف ہوتے ہیں کہ اِن کے ان مردانِ حق آگاہ کو چن چن کے وہ دیکھتے ہیں۔ نظر یہ آتا ہے کہ اُنہوں نے کچھ انداز اس قسم کا اختیار کر رکھا تھا۔

قوموں کے عروج وزوال کا انحصار بچوں کی تعلیم و تربیت پر منحصر ہوتا ہے

کمیونزم والوں نے جو کمیونزم کا نقشہ دیا تھا' شروع شروع میں روس کے ہاں بھی یہی تھا کہ وہ ابتدا ہی سے بچوں کو لے کر خودان کی

تعلیم وتربیت کرتے تھے یعنی بچپن سے ہی اُن کو اپنے قالب کے اندر ڈھالتے تھے۔ یہ تعلیم وتربیت بڑی بُری بلا ہے۔ یہ تو پگھلے ہوئے لوہے کی طرح ہے کہ جس قالب میں آپ ڈھالتے ہیں' اُس وقت تو جس قالب میں چاہیے ڈھل جاتا ہے' پھر جب وہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے تو وہ ہتھوڑوں سے بھی نہیں توڑا جاسکتا۔ عزیزانِ من! کسی قوم کو جس قسم کا آپ نے بنانا ہو' اُن کے بچوں کی تعلیم وتربیت اُس قسم کی کیجیے' قوم خود بخود اُس قسم کی ہوجائے گی۔ یہ پگھلا ہوا لوہا ڈھل گیا۔ اُس کے بعد اُس کو دوسری Shape (شکل) میں لانے کے لیے بہت بڑے Furnace (الاؤ۔ بھٹی) کی ضرورت ہوتی ہے' بڑی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات تو یہ ٹوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے' کسی اور قالب میں ڈھلتا ہی نہیں۔ اور پھر وہ اپنے قالب میں ڈھالنے کے لیے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کردیتے ہیں۔ اُس قالب میں اُس کو رہنے نہیں دیتے۔ استبداد تو یہ کرتا ہے۔

فرعون کے ہاں بچوں کو قتل کرنے کا تصور ٹھیک نہیں

نظر یہ آتا ہے کہ یہ فراعنہ کرتے یہ تھے کہ اس قسم کے ممتاز گھرانوں کے جو بچے تھے' اُن کو شروع میں ہی اپنی تحویل میں لے لیتے تھے۔ اور یہ تھا ممتاز گھرانوں کے افراد کو اُن کی طرف سے خطرہ کہ بچے کے متعلق پتہ نہ چلے' ورنہ وہ لے جائیں گے۔ یہ ہے چیز جو کہی گئی ہے۔ پہلے کہا ہے کہ اِس کو تم دودھ پلاؤ' ورنہ اگر یوں ہوتا کہ پیدائش کے ساتھ' ہی وہ بچوں کو قتل کردیا کرتے تھے تو جونہی وہ بچہ پیدا ہوا تھا تو وہ آتے اور قتل کردیتے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ تم اِسے دودھ پلاؤ تو اِس کے معنی ہیں کہ پیدائش کے ساتھ ہی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اُس کے بعد یہ ہے کہ فاذا خفت (28:7) اگر تمہیں خطرہ محسوس ہو کہ وہ جس طرح سے ممتاز گھرانے کے بچوں کو لے جاتے ہیں' تو بجائے اِس کے کہ وہ لے جائیں تم اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں مشیت خداوندی کا آغاز

اب یہاں مشیت خداوندی آتی ہے' جسے ہم آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات جب حضرتِ موسیٰؑ نے کہی ہے جب وہ طور پہ آگ لینے کے لیے گئے ہیں اور وہاں سے بات ہمکلامی کی ہوئی ہے تو اِنہوں نے شکریہ ادا کیا کہ یہ تو بہت بڑا مقام ہے جو مجھے عطا ہو رہا ہے۔ بڑی دلچسپ باتیں آئیں گی' یہ بڑی دلچسپ داستان ہے۔ کہا کہ موسیٰ! شکریہ ادا کرنا ہے تو اسی ایک نعمت کا شکریہ کیا ادا کرتے ہو۔ چلو ذرا پیچھے' قدم قدم کے اوپر شکریہ ادا کرتے چلے جاؤ۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

تیری تو ساری زندگی میں ایک ایک لمحہ آئے گا کہ تجھے قدم قدم کے اوپر سجدہ شکرانہ ادا کرنا ہوگا۔ ابتدا اِس کی ہوگی جب تم پیدا ہوئے تھے اور تیری ماں سے ہم نے کہا تھا کہ اِس کو دریا میں بہادے۔ کہا کہ وہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے شکر یہ کی باتیں ہیں۔ گویا نظر آتا ہے کہ ایک نبی کی ابتدا سے ہی تربیت مشیت کے زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔ مشیت نبی کو اس کے لیے تیار کرتی تھی۔

صندوق کے سہارے دریا کی موجوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر

کہا تھا کہ صندوق میں بند کر کے بہادے۔ یہ بڑے دل گردے کی بات تھی۔ ماں سے اس کا بچہ کوئی چھین کے لے جائے تو پھر بھی صبر ہو جاتا ہے۔ دریا میں بہانا آج تو ہم نہیں سمجھتے۔ عزیزانِ من! یہ سمجھیے۔ بچہ مر جائے تو اپنے ہاتھ سے ماں باپ اُسے قبر میں ڈال دیتے ہیں۔ دو چار دس دن مہینہ دو مہینے کے بعد صبر آجاتا ہے۔ بچہ گم ہو جاتا ہے تو مرتے دم تک ماں باپ اُس کو بھلا نہیں سکتے۔

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ عشق میں بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا [1]

ایک بار کا دکھ سہا جا سکتا ہے' لیکن عزیزانِ من! جو گم گشتہ بچہ ہے' اُس کے لیے تو مائیں پاگل ہو جاتی ہیں۔ جس بچے کے متعلق کہا جائے کہ اپنے ہاتھوں سے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہادو تو وہ تو ہاتھوں سے گم کرا دیا۔ اِس ماں کو تسلی دینے کی بڑی ضرورت تھی۔ کہا کہ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ (28:7) خوف بھی نہ کرنا کہ بچہ کہیں مارا جائے گا' حزن بھی دل میں نہ لانا کہ پتہ ملے گا بھی کہ نہیں۔ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ (28:7) ہم ذمہ لیتے ہیں کہ اُسے ہم تیری طرف لوٹا دیں گے۔ ماں اسی صورت میں بچے کو اپنے ہاتھوں سے دریا میں بہانے کے لیے تیار ہو سکتی ہے کہ اُسے اِس کی ضمانت دیدی جائے کہ ''تھوڑے دناں دی گل ہیگی اے'' [2] ہم لوٹا دیں گے تمہیں۔ عزیزانِ من! کیا یہ کہانی بیان ہو رہی ہے؟ یہ تو فطرت بیان ہو رہی ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ یہی ہے اُس خبیر' علیم اور دلوں کے احوال جاننے والے کی خصوصیت کہ جس کے نہ بیوی' نہ بچے' نہ بیٹا' نہ بیٹی' نہ اُس کو یہ پتہ کہ بیٹے کے گم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے۔ ماں کے قلب کے اندر اتر کے باتیں کر رہا ہے یہ خدا۔ اسی کو خدا کہتے ہیں: ڈرنا نہیں' غم بھی نہ کرنا' ہم لوٹا دیں گے تمہاری طرف۔ اور لوٹا ہی نہیں دیں گے' اب دیکھئے' یہ ایک دن چاند سا بنے گا' سہرے لگیں گے' شادی ہوگی۔ اتنی ہی بات نہیں ہے۔ کہا کہ وَ جَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ (28:7) اِسے تو ہم پیغمبر بنانے والے ہیں۔ بہت بڑا حوصلہ دیا۔ نظر آتا ہے کہ یہ قوم خدا کے احکام پہ غور کرنے والی تھی'

---

1. اِس شعر کا پہلا مصرعہ دیوانِ غالب میں یوں درج ہے:
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
2. یہ چند ہی دن کی بات ہے۔

ماننے والی تھی۔ یہ ایک عورت ہے لیکن بڑے ممتاز گھرانے کی عورت ہے۔ پیغام پہنچتا ہے تو یقین کر لیتی ہے کہ ہاں ٹھیک ہے' ایسا ہی ہوگا۔ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (28:8) وہ صندوق بہا۔ میں یہی کہونگا کہ مشیّت کے ایک موج کے تھپیڑے نے اُس کو اُس ساحل کے اوپر لگا دیا' جہاں فرعون کے جو لوگ تھے وہ چلتے پھرتے تھے۔ اُنہوں نے صندوق سمجھ کے پکڑ لیا' لے لیا' اُس کو لے گئے۔ اور قرآن یہی کہہ رہا ہے کہ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (28:8) اتنی بڑی متاع کو اُنہوں نے پکڑا اور لے گئے تا کہ وہ کل کو ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔ کیا انداز ہے داستان نگاری کا! یہ ل کے معنی ''تا کہ'' کے ہیں۔ یوں جھپٹ کے لے گئے' بڑے خوش تھے کہ پتہ نہیں کتنی بڑی متاع ہے۔ جھپٹ کے لے گئے تا کہ یہ کل کو ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ (28:8)۔ تباہی کا موجب یوں نہیں بن جائے کہ ایک بچے کو کیوں لے گئے۔ وہ مجرم قوم تھی' وہ فرعون اور ہامان اور ان کے لاؤ لشکر سب مجرم اور خطا کار تھے ان کے جرائم کے مکافات' اس کے ہاتھوں سے عمل میں آنا تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے شاہی محلات کے اسرار و رموز سے آگہی حاصل کرنا ضروری تھا

یہاں بھی یہ فرعون' یہ ہامان اور یہ ان کے لشکر ہیں۔ کہہ دیا کہ کیا یونہی وہ By chance (اتفاقیہ) ایسا کچھ ہو جانا تھا یا موسیٰ علیہ السلام نے آ کر ایسا کچھ کر دینا تھا یا اُن کے اپنے جرائم نے اُن کی تباہی کا موجب بننا تھا۔ کہا کہ اس کے لیے کسی انسان کے ہاتھ کی ضرورت تھی۔ اِس انسان کو وہ خود لے گئے کہ ذرا چل ہمارے ساتھ' اس کا ٹاکرا ہونا ہے۔ بنی اسرائیل کی قوم میں پیدا ہونے والا بچہ' محکوم قوم میں پیدا ہونے والا بچہ' وہ شاہی محلات کے اسرار و رموز کو کیا سمجھ سکتا ہے' وہ تو اُس کے سایہ تک کے قریب نہیں جا سکتا۔ اب اُس نے ان کے ساتھ ٹکراؤ لینا ہے۔ ضرورت تھی کہ اُس کی تربیت اِس قسم کی ہو کہ اُس کو پتہ چلے کہ اِن کے اندر ہوتا کیا ہے۔ رموزِ مملکت بادشاہ خویش کسی کو نہیں بتاتے' یہ غلاموں کو شریکِ حکم نہیں کرتے۔ ایسا مشیت کا پروگرام تھا کہ محکوم قوم کا ایک بچہ جو اچھی صلاحیتوں کا مالک ہو وہ ان کے محلات کے اندر جائے' وہاں جا کر اُس کی پرورش اور تعلیم ہو اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ یہ کرتے کیا ہیں۔ کیا پروگرام ہوتے ہیں! وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (28:9)۔ اب یہاں پھر وہی مامتا کی بات آئی۔ فرعون نے وہ بچہ دیکھ کر ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ اُس کی بیوی نے یہ کہا۔ کسی کا بھی بچہ کیوں نہ آئے' عورت جس انداز سے اُسے پیار کرتی ہے مرد اُس انداز سے پیار نہیں کرتا' مرد کاروباری نقطہء نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مامتا ماں ہی کے سینے کے اندر سے ابلتی ہے' خواہ بچہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

ماں کی مامتا اور اس کی تشنگی کا سامان

یہ مامتا بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ شاعری ہی سہی لیکن میں نے کہیں لکھا ہے کہ ماں جب بھی بچے کو اٹھاتی ہے تو اسے بائیں جانب رکھتی ہے۔ ہمیشہ آپ دیکھیں گے کہ اُس نے اسے بائیں جانب رکھا ہوتا ہے۔ وہ اُسے اپنے دل کے ساتھ سمٹائے ہوئے رکھنا چاہتی ہے۔ وہ بچے کو دائیں طرف نہیں رکھتی۔ ماں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ دیکھو! باقی بچوں جیسا اِس کا حال نہ کرنا۔ تم اسے ایسے ہی جھٹک دو گے، پھینک دو گے کہ پتہ نہیں کیسا لڑکا ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ یہ تو میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنے گا۔ نظر آتا ہے کہ ان کے گھر میں بچہ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو شاید وہ اپنے ہی کے لیے کہتی، اُس کے لیے نہ کہتی۔ کہا کہ ہم اِس کو بیٹا بنالیں گے۔ اب اُس کا Interest (دل چسپی) پیدا کر دیا۔ یہ نہیں کہا کہ میں ہی اچھا سا بچہ چاہتی ہوں تا کہ اس کی پرورش کروں۔ کہا کہ ہم اِسے بیٹا بنالیں گے۔ تو یہ ہے جو تخت کا وارث بننے والا ہے۔ یہ بڑا لالچ ہوتا ہے۔ اگر بیٹا پیدا نہیں ہوا اور بیٹیاں ہی پیدا ہوں تو عام طور پہ ہمارے ہاں بھی اور شادیاں کر لیتے ہیں۔ یہ جو بادشاہ ہوتے ہیں، اِن کا تو پوچھو نہیں۔ جب تک وہ بیٹا پیدا نہ لے آئے اِس وقت تک اُن کو چین ہی نہیں پڑتا کہ ان کو کوئی وارثِ تخت ملنا چاہیے۔ یہ چیز تھی کہ ہم اِسے بیٹا بنالیں گے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بیٹا نہیں ہے تو پھر یاد رکھو ''شریکاں نوں چلا جائے گا''۔ [1] اپنا بیٹا کیوں نہ بنالیں۔ تو اُس کا Interest (دل چسپی) اِس کے اندر پیدا کر دیا۔

قرآن کا کوئی ایک لفظ بھی رموز سے خالی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ قرآن جو کہانیاں بیان کرتا ہے تو اُس میں دیکھنے کے یہ نکات ہوتے ہیں۔ یہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں کہ ہم اِسے بیٹا بنالیں گے۔ اور پھر قرآن وہ اپنی سی بات کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ یہ کر رہے تھے کہ ''ٹھنڈ پے گئی سانوں''، [2] بیٹا بنالیں گے، بڑا فائدہ دے گا، وارث بھی ہوگا (لیکن) وَ هُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ (28:9) اُنہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ کر کیا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! انداز اور اسلوب بھی ایک داستان کے بیان کرنے کا دیکھتے ہیں کہ کیا ہے! اِس کے تو اسلوب میں بھی ایک اعجاز ہے۔ کہا کہ ماں کو یقین تو آ گیا تھا۔ ایک نبی کے ذریعے پیغامِ خداوندی آیا، ایمان تو تھا لیکن ماں پھر ماں ہی تھی کہہ تو دیا اور رات کو یہ کر بھی دیا لیکن وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا (28:10) صبح اٹھی ہے تو مامتا کی ماری دل کو پکڑے ہوئے ہے۔

---

[1] (یہ تخت) شریکوں کو مل جائے گا۔

[2] سکونِ قلب مل گیا۔

خدائے رحیم انسانی جذبوں کو کچلتا نہیں ہے بلکہ ان کی قدر کرتا ہے

عزیزانِ من! حکم کی تعمیل اور چیز ہے' قلب کا اطمینان اور چیز ہے۔ یہ ایک جبلی جذبہ ہے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ تعمیلِ ارشاد تو کردی۔ یہ چیز قرآن نے نہیں کہی کہ اُس کے دل میں پھر کیوں بچے کی محبت نے جوش مارا۔ اس پہ کسی کا قابو نہیں ہوتا۔ وہ بھی صرف ارشاد کی تعمیل ہی چاہتا ہے' اِن جذبوں کو وہ کچلنا نہیں چاہتا۔ یہ تو وہ جذبہ تھا کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے بھی یہ پوچھ لیا تھا کہ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (2:260) یا اللہ! مجھے دکھا کہ تُو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا کہ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ (2:260) کیا تو اِس پہ ایمان نہیں رکھتا؟ کہا کہ ایمان تو رکھتا ہوں وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (2:260) ذرا دل کا اطمینان بھی چاہتا ہوں۔ اِس پہ ڈانٹا نہیں گیا کہ جب ہم نے کہہ دیا ہے پھر تم کون ہوتے ہو۔ یہ کہنے والا تھانیدار نہیں تھا۔ وہ رؤف بھی ہے وہ رحیم بھی ہے۔ وہ اِن جذبات کی قدر کرتا ہے۔ ٹھیک ہے ابراہیم! یہ جو تم نے ہم سے کہا ہے تو لیجیے ہم دکھا دیتے ہیں تمہیں۔ صبح اٹھی تو ماں کا دل محبت سے خالی ہوا چلا جا رہا تھا۔ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (28:10) اگر ہم اُس کے دل کو تھامے ہوئے نہ رہتے تو ہوسکتا تھا کہ وہ اِس اضطراب کے اندر سارا راز ہی اگل دیتی کہ یہ تو ہمارا بچہ تھا' ہم نے صندوق میں ڈالا تھا' ہم نے بہایا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ راز ہی اگل دیتی۔ اور بڑی عجیب بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم نہ تھامے رہتے تو وہ راز ہی اگل دیتی۔ ہم تھامے نہ رہتے کے معنی میں یہ بات آتی تھی کہ یہ تو خدا کا حکم تھا۔ اُدھر وہ جذبہ جو مامتا کا تھا وہ اُبھر رہا تھا۔ کہنے لگے کہ اگر وہ خالی جذبہ ہی جذبہ رہ جاتا تو شدت میں ہوسکتا تھا کہ وہ راز اگل دیتی لیکن جب یہ بات آتی تھی کہ خدا کا یہ حکم ہے تو پھر وہ تھم جاتی تھی۔

عزیزانِ من! یہی دین ہے۔ انسانی جذبات کوئی جرم نہیں' کوئی گناہ نہیں' کوئی معصیت نہیں۔ ان کا پیدا ہونا کوئی معیوب نہیں۔ یہ مذموم نہیں ہیں' قابلِ نفرت نہیں ہیں۔ انسان کی تخلیق ہی ایسی ہے کہ اس کے اندر جذبات رکھے ہیں۔ اُن جذبات کو احکامِ خداوندی کے تابع رکھ کر استعمال کرنا انسانیت ہے۔ اسی کا نام دین ہے۔ جذبات دیئے اور آپ کو اختیار و ارادہ دیا کہ جس طرح جی چاہے استعمال کرلو۔ اگر اُنہیں حیوانی سطح پہ رکھ کر آپ استعمال کرتے ہیں تو پھر سارا فساد ہے جو دنیا میں برپا ہوتا ہے۔ اُنہی جذبات کو اگر آپ احکام او راقدارِ خداوندی کے کنٹرول میں رکھتے ہیں' اُن ساحلوں کے اندر رکھتے ہیں' تو تعمیر ہی تعمیر ہوتی ہے۔

انسانی جذبات کے ثمر بار ہونے کا سنہری اصول

یہ جو جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ حضرتِ ابراہیمؑ تک نے کہہ دیا کہ میں اطمینان چاہتا ہوں' اُمِ موسیٰ کے دل کے اندر مامتا جوش مار رہی ہے' خدا اِس کو معیوب نہیں قرار دے رہا کہ جب ہم نے کہہ دیا تھا کہ اِس کو بہا دو اور ہم اِس کے لیے حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں تو یہ خوامخوہ

کے لیے شور وغوغا کا ہے کا مچار کھا ہے تم نے۔ خدا یہ نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا بڑا ضروری ہے۔ اُس وقت سمجھاؤ' دلیل دو لیکن دبانے والی بات نہیں ہے' ڈانٹنے والی بات نہیں ہے۔ وہی تو گھر جہنم بنتے ہیں جہاں دوسروں کے جذبات کی رعایت نہیں رکھتے۔ یہ رعایت رکھے جا رہا ہے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے لیکن اطمینان تو ہو گیا۔ کتنی خوبصورت داستان ہے! وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (28:11) بیٹی کو کہا کہ ذرا جانا تو سہی' دیکھنا تو سہی کہ وہ صندوق کدھر جا رہا ہے۔ کیسے انوکھے انداز سے یہ اُس کی بات کو بیان کیے جا رہا ہے! بڑا پیارا انداز ہے۔ خود نہیں گئی کہ ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر بھی میں جذبات پہ قابو نہ رکھ سکوں' وہاں دریا کے کنارے ہی کراہ اُٹھوں اور راز کھل جائے۔ خود گھر میں رہی اور بیٹی سے کہا کہ ذرا جانا' دیکھنا تو سہی کہ اُس صندوق کو کیا بیتتی ہے' تمہارے بھیّا پہ کیا گزری ہے۔ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (28:11) جانا تو اِس انداز سے کہ دور دور سے کن اکھیوں سے دیکھنا' ایسا نہ ہو کہ اُن کو پتہ چل جائے کہ تم اِس کی تلاش میں پھر رہی ہو۔ عزیزانِ من! دیکھا کہ جذبات اور شعور کی کشمکش بھی ہے اور کتنی احتیاط برتی جا رہی ہے۔ نہ رہا گیا تو بیٹی کو بھیجا۔ تاکید یہ کی کہ کن اکھیوں سے دیکھنا' کسی کو پتہ نہ چل جائے۔

قرآنِ حکیم کے اندازِ بیان میں ایمائیت کی اہمیت اور خصوصیت

اب وہ جو میں نے کہا ہے کہ آج بھی یہ جو نیا انداز ہے' وہ بڑا ہی بہترین انداز ہے۔ یہ جو اختیار کیا جاتا ہے تو اسٹوری کی جو ساری کڑیاں ہیں اُن کو بیان نہیں کرتے چلے جاتے' درمیان میں سے کڑیاں چھوڑتے چلے جاتے ہیں' جو Fill in the gap ہے اور وہ پڑھنے والے کے ذہن پہ چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ خود اتنی کڑی ملا لے گا۔ انداز ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے ملانے میں دقت نہیں ہوتی لیکن اگر اُس کو بیان کر دیا جائے تو اُس میں وہ لذت باقی نہیں رہتی۔ ''او دودھ دی لسی بن جاندی ہیگی۔''❶ اُسے درمیان میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے شاعری میں ایمائیت (Suggestiveness) کہتے ہیں کہ بات کو کھول کے الفاظ میں بیان نہ کر دیا جائے' تھوڑی سی اشارۃً بات کی جائے اور باقی قاری پہ چھوڑ دیا جائے اور یہ انسان کی تو فطرت ہے کہ اپنی سمجھ سے جب بات سمجھتا ہے تو فخر محسوس کرتا ہے کہ میں نے بات پا لی' ورنہ ساری بات ہی بتاتے چلے جائیں تو وہ بچوں کی طرح پڑھانا ہوتا ہے۔ قرآن جو داستانیں بیان کرتا ہے اُس میں ایمائیت کی صورت ہوتی ہے۔ اور وہاں تک تو یہ بیان کیا ہے۔ اب یہ نہیں کہا کہ وہ گئی' وہ صندوق چلا گیا' وہ لے گئے محل میں پہنچ گئے' بچے کو وہاں بٹھا دیا۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر قبل اس کے کہ وہ جو اُس کی بہن تھی' وہ وہاں پہنچتی' اب وہ صندوق محلات میں پہنچ گیا' بیٹا بھی وہاں بن گیا۔

---

❶ وہ دودھ کی لسّی بن جاتی ہے۔

دودھ پلانے کے بہانے ماں کی ممتا کو دلی سکون میسر آ گیا

فرعون کی بیوی نے پہلے کہا تھا کہ ہم اِس کو اپنا بیٹا بنالیں **وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ** (28:12)۔لیکن بچے نے وہاں کسی کا دودھ نہیں پیا۔لفظ یہ ہے کہ **وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ** (28:12) ہم نے بچے پہ اُن کا دودھ حرام کر دیا۔نظر یوں آ تا ہے کہ فرعون کی بیوی کے تو غالباً دودھ ہوگا ہی نہیں کیونکہ وہ تو صاحبِ اولاد نہیں تھی۔محلات کے اندر خادمائیں ہوتی ہیں لیکن بچہ اُن کا دودھ نہیں پیتا اور اتنے میں یہ لڑکی وہاں پہنچ گئی۔اب یہاں سے یہ چیز مستنبط ہوتی ہے کہ یہ بہت بڑا گھرانہ تھا ورنہ یوں تو نہیں ہوسکتا کہ وہ عام رعایا تھی اور وہ بھی جو بنی اسرائیل کی کوئی لڑکی ہو وہ محلاتِ شاہی کے اندر جا پہنچے اور وہاں جا کر براہِ راست پھر وہ ملکہ سے بات کر رہی ہے۔دیکھا' قرآن نے یہ نہیں کہا۔وہ اتنے اشارے ہی دیتا چلا جا رہا ہے جس سے یہ چیز مستنبط ہوتی ہے کہ یہ بڑے اونچے گھرانے کا فرد تھا' ورنہ عام لڑکی کا محلاتِ شاہی کے اندر چلے جانا اور پھر وہاں جا کر ملکہ کے ساتھ بات کرنا ممکن نہیں تھا۔وہاں جا کر اِس نے دیکھا اور جاتے ہی یہ نہیں کہہ دیا کہ "ایہہ تے میرا بھرا اے' تے میں ایہدی ماں کول لے جانی آں"[1] کہا: کیا یہ دودھ نہیں پیتا؟ **هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ** (28:12) میرے علم میں ہے کہ ایک گھر ایسا ہے' بڑا اونچا سا گھر ہے۔میرا خیال یہ ہے کہ وہاں کی جو دودھ پلانے والی ہے اُس کو دیدیا جائے تو شاید وہ وہاں دودھ پی لے۔اب اُس ملکہ کے لیے اِس بچے کو پالنا تھا اور دودھ یہ پیتا نہیں ہے۔**هَلْ اَدُلُّكُمْ** کہہ رہی ہے کہ کچھ میں تمہیں پتہ نشان بتاؤں کہ ایک گھر ایسا ہے جہاں ممتاز گھرانہ ہے۔تمہارے شاہی گھرانے کا فرد اس نے بننا ہے' عام ماؤں سے اِس کو دودھ نہ پلاؤ۔اونچے گھرانے کی کوئی عورت ہونی چاہیے۔تو میں تمہیں کچھ پتہ بتاؤں ایسے گھرانے کا۔اور گھرانہ کہا ہے' اہلِ بیت کہا ہے۔ **وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ** (28:12) ایک لفظ میں بات کہہ گئی۔بچہ ہو بنی اسرائیل کا' انداز اُنہوں نے دیکھ لیا ہوگا' وہ تو پیدائش سے ہی یہ قبائل اور شعوب کے جو بچے ہیں' پیدائش سے پتہ چل جاتا ہے کہ کس نسل سے ہیں' کس قوم سے ہیں۔کہا کہ گھرانہ بھی وہ ہے جو اِس کا دشمن نہیں ہے' اس کا بہر حال ہمدرد ہی ہے۔ایسا ہی میں تمہیں بتاتی ہوں۔اُس نے جھٹ کہا ہوگا کہ ہاں ہاں بتاؤ بیٹی! کونسا گھرانہ ہے۔ **فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ** (28:13) اُس کی ماں سے کہا کہ کیوں ہم نے کہا تھا نا کہ غم نہ کرنا ہم لوٹا دیں گے' آ گیا نا بچہ۔مبارک ہو۔ **وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ** (28:13) اور تمہیں معلوم ہو جائے کہ ہم جو کہا کرتے ہیں وہ سچ کر کے دکھایا کرتے ہیں۔ہمارے وعدے ایسے نہیں ہیں کہ کیے اور اُس کے بعد بھول گئے' ہر روز اُن کو بدل دیا۔ **وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ** (28:13) بات یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت ایسی ہے جو بات سمجھتے نہیں ہیں کہ ہمارا کہا ہوا نہیں ٹلا کرتا۔

---

[1] یہ تو میرا بھائی ہے میں اسے اس کی والدہ کے پاس لے جاتی ہوں۔

بچپن سے جوانی تک کی پرورش نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک متوازی شخصیت بنا دیا

قرآن درمیان کی ساری کڑیاں چھوڑ گیا ہے۔ضرورت ہی نہیں ہے۔کہا کہ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسۡتَوٰۤی اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّ عِلۡمًا (28:14) بات تو وہاں بچے کی تعلیم' تربیت' پرورش کی تھی۔ یہ اُس انداز کی ہوئی جیسی محلاتِ شاہی کے شہزادوں کی ہوتی ہے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوکہ جب وہ ذرا بڑی عمر کو پہنچا تو اسۡتَوٰۤی (28:14) ایک متوازن شخصیت اُس کو بنا دیا۔علم بھی حاصل ہوا' اسرار و حکومت بھی معلوم ہو گئے۔ یہ تھی وہ چیز۔اور وہاں بھی یہ کہا کہ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں یونہی مل جایا کرتی ہیں۔استوی بھی ہو ہے (متوازن شخصیت) Balanced Personality بھی ہو' علم بھی ہو' حکومت کے راز بھی معلوم ہوں' اقتدار بھی حاصل ہو جائے' کہتا ہے کہ عام شہزادوں میں اگر یہ باتیں ہوں تو پھر پوچھو نہیں کہ بپھرا ہوا شہزادہ ہوتا کیا ہے۔ وہ استبداد میں باپ سے دو ہاتھ آگے ہوتا ہے۔ یہ باتیں یوں نہیں مل گئی تھیں۔

نبی کی زندگی کا اوائلی دور بھی سورج کی شعاؤں کی طرح روشن اور چشمے کے پانی کی طرح صاف ہوتا تھا

کہا کہ وَ كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِيۡنَ (28:14) موسیٰ علیہ السلام نے خود ہی ایسی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی کہ یہ اُس کا نتیجہ تھا۔اب نظر آ گیا کہ نبی قبل از نبوت کے زمانے میں بھی بلند کردار و اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ یہ ابھی تو نبی نہیں ہوئے تھے۔اُس سے پہلے کی زندگی بھی اُس کی ایسی ہوتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوت کی زندگی بذاتِ خود ایک شہادت ہے

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ وہ پہلے کی زندگی ہی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت میں پیش کی تھی۔ دعویٰ نبوت کے بعد حقیقی چچا اور رشتہ دار سارے مخالفین تھے۔اُنہوں نے پوچھا تھا کہ اِس کی شہادت کیا ہے' گواہی کیا ہے' ثبوت کیا ہے کہ تم جو دعویٰ کر رہے ہو کہ مجھے یہ خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے' وہ تو ہم کوئی آنے والا دیکھتے نہیں' نہ اِس کا کوئی زندہ ثبوت ملتا ہے' تو اِس کا ثبوت کیا ہے کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ آپ کو یاد ہو گا کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے بعد یہ نہیں کہا کہ دیکھیے جناب! میں چاند کو دو ٹکڑے کر کے بتا دیتا ہوں تو معلوم ہو جائے گا کہ سچا ہوں۔اُنہوں نے یہ نہیں کہا ہے۔ پتہ ہے کیا کہا ہے؟ کہا یہ ہے کہ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16) میں کوئی باہر سے نہیں آیا ہوا' میں نے چالیس سال کی عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ اپنی زبان سے میں ایک لفظ نہیں کہنا چاہتا۔تم میری اس پوری عمر پر نگاہ رکھو اور بتاؤ کہ ایسی عمر ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ جو تم گواہی دو میں اُسے منظور کرنے کے لیے تیار ہوں۔اور یہ میری سچائی کا ثبوت ہے کہ جو شخص چالیس سال تک تمہارے اندر

رہے اور تم نے دیکھ لیا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا' کیا وہ شباشب اتنا بڑا فریب کار ہو جائے گا کہ وہ کہہ دے کہ میں نبی ہوں؟ عزیزانِ من! دشمنوں کے نرغے میں یہ دعویٰ کیا۔ ایک لفظ کسی کی زبان سے اِس کے خلاف نہیں آیا۔ نبی کی تو قبل از نبوت زندگی یہ ہوتی ہے۔ اور نبوت کے بعد تو پھر کیا بتاؤں! ہمارے ہاں کہا یہ جا رہا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو فریب کاری سے مرادیا کرتے تھے (معاذ اللہ)۔ نبی کو ماننے والے' آج اِس دور کے آپ کے ہاں کے مفسر' سب سے بڑے اقامتِ دین کے داعی' یہ کہہ رہے ہیں۔ وہ اپنی قبل از نبوت کی زندگی دشمنوں کے نرغے میں پیش کر رہے ہیں کہ کوئی ایک ایسی بات تو بتا دو جو میرے خلاف جائے۔ دشمنوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ اُس کے دعویٰ نبوت کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ﷺ کہا کرتے تھے کہ فلاں فلاں معاملے میں جھوٹ بولنا جائز ہے' اس لیے ضرورت کے وقت تم بھی بولا کرو (معاذ اللہ)۔ میں یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ **وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ** (28:14) یہ قرآن کہتا ہے' یہ باتیں یونہی نہیں کہی جاتیں۔ علم بھی حاصل ہو سکتا ہے' حکومت کے راز بھی مل جاتے ہیں۔ استویٰ کی کیفیت Balanced Personality کی پہلے ہوتی ہے' تو استویٰ اور محسنین تو ایک ہی بات ہے۔ حسن تو نام ہی صحیح Proportion (تناسب) کا ہوتا ہے۔ سائیکولوجی (علم نفسیات) کے دونوں لفظ قرآن لے آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قتل کا ذکر

اب ایک واقعہ نظر آتا ہے۔ اُس میں ایک ٹکراؤ سا نظر آتا ہے۔ مظلوم کی مدد کرنے کی بات ہے۔ **وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا** (28:15) ایک دن سوتے میں' جیسے ہم کہتے ہیں کہ ذرا تنہائی کا وقت تھا' گرمی کے موسم میں دوپہر میں میرا خیال ہے جیسے عام بازاروں میں ہوتا ہے تو کچھ ایسا ہی ہوگا۔ وہاں دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ جھگڑا بھی ایسا ہے جیسے ایک دوسرے کو مرنے مارنے کے اوپر وہ تیار ہو رہے ہیں۔ **هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ** (28:15) اتفاق کی بات یہ ہے کہ اُن میں سے ایک بنی اسرائیل کا آدمی تھا دوسرا فرعون میں سے تھا۔ اب یہاں وہ کیفیت تھی۔ اب حضرتِ موسیٰ تو اپنے متعلق جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کی قوم کے ہیں۔ آئے تھے محلاتِ شاہی سے۔ اُس کے دل میں ہوگا کہ یہ ہم میں سے ہے۔ بات قرآن نے واضح طور پہ نہیں کہی' وہ کہتا ہی نہیں ہے۔ **فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ** (28:15) وہ جو بنی اسرائیل کا آدمی تھا تو اُس نے مدد چاہی' وہ مظلوم تھا۔ اُس نے کہا کہ میری مدد کیجیے۔ دیکھیے' یہ قوی ہے' یہ مارتا ہے۔ ویسے بھی حاکم قوم کا جو فرد ہوتا ہے وہ تو کمزور بھی ہو تو وہ حاکم ہوتا ہے' اُس کا کلّا بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ **فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ** (28:15) موسیٰ علیہ السلام نے اُس کو ہٹانے کے لیے یوں ذرا سا ایک مکا مارا۔ مارا تو مکا ہی تھا۔ پتہ نہیں وہ اس طرح سے قلب پر لگ گیا ہوگا' وہ ڈھیر ہو کے رہ گیا۔ یعنی یہ جس کو دانستہ

قتل کہتے ہیں وہ نہیں کیا۔ پیچھے ہٹانے کے لیے ایک یونہی مکا مارا، دھکا دیا اور دیکھا تو وہ ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

قرآن حکیم کے نزدیک شیطان کا مفہوم

اب یہاں یہ کہہ دیا جائے گا کہ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ ‌ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيۡنٌ (28:15) آپؑ نے کہا کہ نہیں صاحب! میں نے تو یہ کیا ہی نہیں ہے، وہ شیطان مکہ مار کر چلا گیا ہے۔ ''چلو جاؤ، جا کے تھانے رپٹ لکھاؤ، تے ایہہ جیہڑا ملزم اے اوہدا نام شیطان رکھ دینا، اوہدے باپ دا نام تے تہانوں پتہ ای نئیں کہ کی ہیگا۔'' ❶ شیطان کسے کہتے ہیں؟ جب انسان کے اس قسم کے غصے کے جذبات حد سے آگے بڑھ جائیں تو اُس کو عربی زبان میں شیطٰن کہتے ہیں، بھڑک اٹھنے والا شعلہ۔ آگ تک، حرارت تک وہ رہے تو وہ چیز شیطٰن نہیں ہوتی۔ یہ تو ہونی چاہیے، ہی حرارت۔ جب وہ شعلہ بیباک ہو جاتا ہے جس سے پھر آگ پھیلتی ہے تو اُس کو شیطان کہتے ہیں۔ غصہ تو تھا اور رہنا چاہیے۔ غصہ ہی تو وہ چیز ہے جس سے غیرت اور حمیت انسان کے اندر ہوتی ہے۔ کس قدر کی حفاظت کے لیے؟ عصمت کی حفاظت کے لیے، مظلوم کی حفاظت کے لیے۔ غصہ اندر نہ ہو تو آپ کچھ مظلوم کی مدد ہی نہیں کر سکتے لیکن اگر وہی سرکش و بیباک ہو جائے تو پھر ساحلوں میں رہنے والے پانی کی طرح ندی نہیں رہتا، سیلاب بن جاتا ہے۔ اسے شیطان کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ غصے پہ قابو نہ رکھ سکا۔ اگر یہ امرِ شیطان ہوتا، اُس شیطان کو جو ہم سمجھتے ہیں کہ ''کارِ بد تو خود کرو اور لعنت کرو شیطان پر''، تو یہ تو کسی اور کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ Regret (ندامت وافسوس) کی تو ضرورت ہی نہیں۔ جب یہ کہیں کہ میں نے تو نہیں کیا اُس نے کیا ہے، پھر یہ نادم کیوں ہوں۔

عزیزانِ من! بات واضح ہوگئی کہ اس شیطان کے معنی کیا ہیں۔ کوئی باہر کی ہستی نہیں ہے جو کچھ کرے اور ذمہ داری اُس کی ہو۔

انسان کا ہر جرم اس کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ (28:16) موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اُو میرے اللہ! کیا بات ہے قرآن کی۔ عزیزانِ من! ایک راز اُس میں ہے کہ جو جرم تم دوسروں کے خلاف کرتے ہو، وہ دوسروں کے خلاف نہیں ہوتا، خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے، وہ قول تو نیٹشے ❷ کا ہے۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ تم نے میرے خلاف جو جرم کیا ہے، اُسے تو میں بخش دونگا لیکن اِس

---

❶ جاؤ تھانے رپٹ (FIR) درج کراؤ کہ یہ جو ملزم ہے اس کا نام شیطان ہے، اس کے باپ کا نام کا تو آپ کو علم ہی نہیں۔

❷ Nietzshe, Friedrich (1844-1900). He proposed a philosophy asserting the self and the "will to power".

سے جو جرم تم نے اپنے خلاف کیا ہے' اُسے کون بخشے گا' قرآن جہاں اِس جرم کی بات کرتا ہے تو وہاں ظلمت نفسی کہتا ہے۔ ''میں نے اپنے خلاف یہ جرم کیا ہے۔'' **فَاغْفِرْلِیْ** (28:16) وہ عرقِ انفعال پیشانی پہ آ گئے' ندامت ہوئی۔ اور وہ تو اُس کی بارگاہ میں کوئی بھی جھکی ہوئی نگاہ سے جا کر اقرار کرے کہ یہ تو بھول ہوگئی' آئندہ نہیں کرونگا۔ کہا **فَغَفَرَلَهٗ** (28:16) خدا نے بھی اُس کو حفاظت کا سامان دیدیا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ نظر آتا ہے کہ پہلے زیادہ ہی کچھ گرم تھے' کچھ انتقام بھی تھا۔ محکوم قوم کے دل میں جب یہ چیزیں جوش مارتی ہیں تو انتقام کا جذبہ بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر یہ شہزادہ بھی تھا' یہ بات ہو سکتی ہے۔ وہ ضربِ کلیم اسی لیے ان کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہا کہ **اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ** (28:16) وہ غفور ہی نہیں ہے کہ جو کچھ کیا ہے اُس کی سزا سے Protection (حفاظت) دی ہے۔ اِس کی تو نشوونما آگے ہونی تھی' وہ بھی اُس کے راستے میں حائل نہیں ہوئی' جو یہ جرم تھا۔ اِس چیز کے معنی ہی یہ ہیں۔ بخش دینا تو کوئی بات نہیں۔ کہا کہ **قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ** [1] (28:17) اُس کو اپنے اس جرم سے Protection (حفاظت) مل گئی جو اِس کی ذات کا نقصان ہوا تھا۔ یہ حفاظت کیسے مل گئی؟ اُس نے یہ کہا تھا کہ یہ تو تیرا بڑا انعام ہے کہ مجھے یہ وسائل اور یہ چیزیں مہیا ہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اِس کے بعد کبھی بھی میں کسی مجرم کا پشت پناہ نہیں بنوں گا۔ یہ تھا وہ وعدہ جس کی بنا پہ ہم کہیں گے کہ صاحب! گناہ بخشا گیا۔ آئندہ کے لیے اس قسم کا جو وعدہ ہے' یہ ہے جسے توبہ کہا جاتا ہے۔

اب پھر وہی بات آگے ہوگئی۔ یہی جو قصہ ہے یہ آگے بھی چلا جا رہا ہے۔ دوسرے دن صبح پھر اسی قسم کا واقعہ ہوتا ہے۔ لیکن وقت ہو گیا ہے۔ میں عرض کر دوں کہ وقت کی شدید پابندی اس لیے ہے کہ رکارڈنگ کے لیے ان کے اندر جو کیسٹ ہوتا ہے وہ ایک وقت کے اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اب اگر میں اس متعین و مقرر وقت سے آگے بڑھتا ہوں تو وہ اِس کے اندر ریکارڈ نہیں ہوتا۔ اور یہ ٹیپ تو ساری دنیا میں جانا ہے۔ اس لیے اُن کی خاطر ہمیں رکنا پڑتا ہے' خواہ درمیان میں ہی کیوں نہ رکنا پڑے۔ تو یار زندہ' صحبت باقی۔ آئندہ ہفتے سہی۔

عزیزانِ من! سورۃ القصص کی آیت 16 تک ہم آ گئے۔ 17 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

---

[1] موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان کے بعد' بحضورِ ربّ العزت اظہارِ تشکر کیا اور کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو دیکھے گا کہ میں کبھی مجرموں کی مدد نہیں کروں گا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 887)۔

تیسرا باب: سورۃ القصص (آیات 17 تا 28)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا
الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ
بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ
جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ
يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا
يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ
السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ
تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٜ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ
تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ
اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۟ نَجَوْتَ
مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ
اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَآ
اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ
قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1978ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 17 سے ہو رہا ہے: (28:17)۔

گزشتہ جمعہ کو درس کا ناغہ رہا تھا اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ اِس سورۃ میں کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیم

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی یا باطل کے ایک پورے نظام کی داستان چلی آ رہی ہے جس میں ملوکیت' سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت ایک طرف تھی اور نظامِ خداوندی برپا کرنے والا ایک انقلابی نبی دوسری طرف تھا۔ اس سورۃ میں قرآنِ کریم نے اس داستان کو ابتدا سے آخر تک پہنچایا ہے۔ ہم وہاں تک پہنچے تھے کہ حضرتِ موسیٰ کی پرورش فرعون کے محلات میں ہورہی تھی۔ اور یہ مشیت کے پروگرام کی بڑی اہم کڑی تھی کہ کل کو جن کے ساتھ اِنہوں نے نبردآزما ہونا ہے اُن کی محلاتی سازشوں کا انہیں علم ہونا چاہیے' ورنہ محکوم قوم کے ایک فرد کو کسی طرح اِس کا علم ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں اور اُس کا جواب کس طرح دینا چاہیے۔ بات وہاں تک پہنچی تھی کہ یہ ایک دن بازار میں آئے اور وہاں دیکھا کہ دو شخص جھگڑ رہے تھے۔ ایک سراسر دوسرے پہ زیادتی کر رہا تھا۔ جس پہ زیادتی ہورہی تھی وہ فریاد کے لیے آواز بلند کر رہا تھا۔ یہ اتفاق کی بات تھی' ہاں اسے اتفاق نہیں کہنا چاہیے بلکہ یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جس پہ زیادتی ہورہی تھی وہ محکوم قوم کا فرد تھا' زیادتی کرنے والا حاکم قوم کا فرد تھا۔ اِنہوں نے اُس کی مدد کی: جھٹکا دے کر اُس کو پیچھے ہٹانا چاہا۔ ایک مُکا اُس کو لگ گیا' غالباً تلی پھٹ گئی۔ یہ سہواً ہوا تھا۔ قرآن میں یہ چیز ہے۔ اور وہ وہیں مر گیا۔ انہیں اِس کا افسوس ہوا۔ یاد رکھیے کہ قرآن میں بھی یہ قتل ہے' اس میں قتلِ عمد اور قتل بالخطا میں بڑا ابنیادی فرق رکھا ہے۔ جو قتلِ عمد ہے' وہ ارادتاً قتل کرنا ہے' اُس کی سزا موت ہے لیکن یہ جو نادانستہ' سہواً یا خطاءً کسی کے ہاتھوں کوئی یونہی قتل ہوجائے تو اِس کی سزا موت نہیں رکھی' کوئی سزا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ خون بہا دینے کی بات ہے۔ اور اگر مقتول کے وارث اِس کو بھی چھوڑ دینا چاہیں تو چھوڑ سکتے ہیں۔ یعنی قرآن نے خود بھی ایک جرم جو عمداً کیا جائے اور ایک وہ جو یونہی سہواً کیا جائے تو اُن دونوں میں بڑا ابنیادی فرق کیا ہے۔ یہ جو قتل تھا' یہ بالعمد نہیں تھا بلکہ سہواً تھا۔ اس لیے اس میں قتل کا جرم تو عائد نہیں ہوتا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم باتیں داستان کی سی کر رہا ہے جیسے ایک تاریخی واقعہ بیان کیا جارہا ہے لیکن وہ تو تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ وہ تو واقعہ بیان کرتے کرتے بھی جو اخلاقیات کے بنیادی اصول ہیں' جو اقدارِ خداوندی ہیں' اُن کی طرف اشارہ کرتا چلا جاتا ہے۔ مقصود اُس کا اصل میں یہی ہوتا ہے کہ غلط روش کے نتائج کس طرح تباہ کن ہوتے ہیں اور صحیح نظام کے عواقب کتنے خوشگوار ہوتے ہیں۔ وہ تاریخی واقعات کو حقیقت کے ثبوت میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ مقصود بالذات تو ان چیزوں کا اجاگر کرنا ہے۔ اس لیے جب بھی وہ کوئی تاریخی واقعہ بیان کرتا ہے تو جہاں جہاں اِس قسم کی چیز آتی ہے' وہ ساتھ کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ جو حضرتِ موسیٰ سے ہوگیا تو اُنہیں ندامت ہوئی۔ سہواً ہی سہی ایک انسان کا قتل تو ہوگیا۔ چلتے چلتے' بات کرتے کرتے' قرآن یہ کہتا ہے کہ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ (28:17) حضرتِ موسیٰ نے کہا کہ بارِالٰہا! تیرا تو مجھ پہ بڑا انعام ہے اور میں اِس چیز کا وعدہ کرتا ہوں یا میں اِس چیز کا اقرار کرتا ہوں کہ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَہِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ (28:17) میں مجرموں کا مددگار یا پناہ گزیدہ نہیں ہونگا' مجرموں کو پناہ نہیں دونگا' اُن کی مدد نہیں کرونگا۔

مجرم کے مقابلے میں رسہ گیر زیادہ مجرم ہوتا ہے

اب یہ ایک بہت بڑا اصول ہے جو یہاں بیان ہو رہا ہے۔ آپ غلط معاشرے میں دیکھیے' مجرم تو بہرحال ایک مجرم ہوتا ہے۔ وہ جو اُن کو پناہ دینے والے ہیں اصل میں مجرم وہ لوگ ہوتے ہیں۔ مجرم کو اگر تنہا چھوڑ دیا جائے' اُس کا پشت پناہ کوئی نہ ہو تو آپ دیکھیے' جرائم کس قدر کم ہو جاتے ہیں۔ یہ جیسے رسہ گیری کہتے ہیں' یہ اصطلاح ہے جو مویشیوں کی چوری پہ عام طور ہمارے ہاں دیہات میں ہوتی ہے۔ مویشیوں کی جو چوری کرنے والے ہوتے ہیں' وہ کوئی اتنے طاقتور نہیں ہوتے۔ اصل میں پیچھے ایک رسہ گیر بیٹھا ہوتا ہے' اُسے سانجھی کہتے ہیں یعنی سنبھالنے والا۔ وہ جو چرا کر لے آتے ہیں تو یہ سنبھالتا ہے۔ یہ ان کی اصل طاقت ہوتی ہے۔ اور اُن کی روایت یہ چلی آتی ہے کہ رسہ گیر یا جو سانجھو ہوتا ہے' اِس جرم کے بعد وہ اُن کی پوری پشت پناہی کرتا ہے' اُن کی مدد کرتا ہے' اُن کی حفاظت کرتا ہے' پولیس کے ہاتھ میں نہیں جانے دیتا۔ اگر کہیں ایسا ہو جاتا ہے' اُن کو سزا ہو جاتی ہے تو اُس کی بھی مدد کرتا ہے' اُس کے بال بچوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ یعنی یہ مجرمین کا پشت پناہ ہوتا ہے۔ اور اِدھر کے معاشرے کو بھی آپ دیکھیں گے کہ یہ مجرمین کی پشت پناہی ہے جو حقیقت میں جرائم کو فروغ دیتی ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو' مجرم کو اپنے جرم کی سزا خود بھگتنی پڑے تو بڑی حد تک جرائم کم ہو جاتے ہیں۔ چلتے چلتے قرآن ایک بات کہہ گیا ہے کہ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ (28:17) نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ تو ہے ظھیرًا للمجرمین ہونا۔

وکلا کا کردار

ہمارے ہاں تو اُس کی ایک ایسی مستند شکل ہے اور اتنی عام ہے جسے یہ پیشہ عدالت کہتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے کہ جب وکیل کسی کا مقدمہ لیتا ہے تو پہلے وہ ملزم ہی ہوتا ہے لیکن وکیل اتنی گہری نگاہ سے واقعات کو دیکھتا ہے کہ اُسے اصلیت کا پہلے ہی علم ہو جاتا ہے۔ دونوں فریق ہوتے ہیں اور دونوں فریق وکالت کرتے ہیں۔ اِن میں سے ایک تو مجرم ہوتا ہی ہے' جو جھوٹا ہوتا ہے۔ دونوں کو وکیل مل جاتے ہیں۔ اور وہ دونوں وکیل ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں حالانکہ اِن میں سے ایک مجرم ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں یا آپ شروع میں نہ پہچان سکیں کہ یہ جھوٹا ہے یا سچا ہے لیکن وکیل تو بھانپ لیتا ہے کہ میرا موکل جھوٹا ہے یا سچا ہے' مجرم ہے یا معصوم ہے لیکن وہ آخر تک اُس مجرم کو چھڑانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ یہ ایک Recognized (معروف) چیز ہے ہمارے معاشرے کی۔ ایسے ایسے وکلا کے قصے ہمارے سامنے ہیں' اُن کی سیرتیں ہمارے سامنے ہیں کہ اُنہیں جس وقت معلوم ہوا' اگر شروع میں معلوم ہوا کہ میرا یہ موکل جو میرے پاس آیا ہے' یہ جھوٹا ہے تو اُنہوں نے مقدمہ لینے سے انکار کر دیا۔ اگر مقدمے کے دوران کسی وقت اِس کا علم ہو گیا تو اُسے فیس واپس کر دی اور اُس سے ہاتھ اٹھا لیا۔ کہا کہ مجھے اب اِس کا علم ہو گیا ہے کہ تم مجرم ہو' تم جھوٹے ہو' تو میں تمہاری پشت پناہی' مدد نہیں کر سکتا۔ یہ اصول اگر

معاشرے کے اندر ہو جائے کہ مجرم یا جھوٹے کو بھگتنا پڑے جو کچھ اُس نے کیا ہے اور اُس کی پشت پناہی کوئی نہ کرے تو بڑی حد تک جرائم میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ چلتے چلتے قرآن یہ کہہ گیا ہے کہ **فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ** (28:17)۔ یہ مومن کی خصوصیت بتائی ہے کہ وہ مجرم کی پشت پناہی نہیں کرتا۔ وہ مظلوم کی پشت پناہی کرتا ہے' اُس کے لیے تو وہ جان بھی دیدیتا ہے۔

حاکم قوم کی ذہنیت

اب بات آگے بڑھتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ **فَاَصْبَحَ فِى الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ** (28:18) اگلے دن حضرت موسیٰ ڈرتے ہوئے یہ معلوم کرنے کے لیے ادھر آئے کہ میرا قصور کیا ہے' ذرا پتہ تو لے لیجیے کہ شہر میں اس قتل کے متعلق چرچا کیا ہے' اُس دن میں جھگڑ رہا تھا۔ آپ نے دیکھا تھا کہ حق پر تھا اور زیادتی ہو رہی تھی۔ اب بھی یہی کیفیت ہے۔ اور بات یہ صحیح ہے' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ حاکم قوم کے افراد اور حکومت بھی فرعونیت کی سی ہوتی ہے۔ وہ جو اکبر[1] نے کہا تھا کہ تم نے اگر آرام سے رہنا ہو تو ہر گورے کو لیفٹننٹ گورنر سمجھو۔ وہ یہ بڑی ہی پتے کی بات کہہ گیا تھا کہ ہر گورے کو لیفٹننٹ سمجھو تو جب ملک میں چین سے رہ سکو گے۔ تو وہاں یہ کچھ ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ اب کیا کیا جائے اِن میں ہم رہ رہے ہیں اور ان کی صورت یہ ہے؟ قرآن نے بتایا کہ **فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِىْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا** (28:19) اُس نے پھر اُس کو پکڑنا چاہا' چھڑانے کے لیے ہی سہی۔ وہ جو دشمن تھا وہ اُس مظلوم کا بھی اور موسیٰ کی قوم کا بھی دشمن تھا۔ یہاں **عَدُوٌّ لَّهُمَا** (28:19) آیا ہے۔ اس میں ہی قرآن نے یہ بات بتادی کہ وہ حاکم قوم کا فرد تھا جو پوری کی پوری بنی اسرائیل کی قوم کے دشمن تھے۔ اُس نے پہچان لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بات نکل گئی تھی۔ شہر کے بازار میں ایک قتل ہوتا ہے تو چرچا تو ہو ہی جانا تھا۔ **قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا ۢ بِالْاَمْسِ** (28:19) اُس نے کہا کہ تم وہی ہو نا جنہوں نے اگلے دنوں یہاں مکا مار کے ایک شخص کو مار دیا تھا۔ تو کیا آج بھی تمہارا یہی ارادہ ہو رہا ہے کہ وہی کچھ میرے ساتھ بھی کرو؟

جبار کا قرآنی مفہوم ایک فرق کے ساتھ

اور وہ کہتا ہے کہ **اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ** (28:19) معلوم یہ ہوتا ہے کہ تم یہاں ہڈیاں توڑنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ اور ملک میں اصلاح نہیں چاہیے۔ یاد رکھیے! جبار کے دوسرے معنی ہڈیاں توڑ دینے والا ہوتا ہے۔ یہ جبر جو ہے اِس کے معنی تو ہوتا ہے کہ کسی کی نقل و حرکت پر اس قدر سختی سے پابندی عائد کر دینا کہ وہ ہل

---

[1] اکبر (1556-1605)۔

جل نہ سکے، یہ جبر ہوتا ہے۔ جابر اِس کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اسی کا ایک صیغہ ہے جسے جبار کہا جاتا ہے۔ تو یہ جبر اور جابر ہونا تو بہت بڑا مذموم فعل ہے، استبداد ہے، ظلم ہے لیکن خدا کی ایک صفت جبار ہے۔ **الجبار المتکبر** (59:23) ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ قرآن ہے۔ یہ جو چیز میں نے کہی ہے کہ اِس قسم کی سختی کرنے والا کہ دوسرے کی نقل وحرکت کو وہ ساکن کردے، ہلنے نہ دے۔ یہ جو ہڈی ٹوٹتی ہے تو اب تو اُس پہ پلستر لگاتے ہیں، اُس سے پیشتر اور اب بھی ہمارے ہاں وہ دو لکڑیاں لے کر اُن کو اوپر نیچے باندھتے ہیں اور پھر اتنا سخت باندھتے ہیں کہ وہ ذرا سی بھی ہل نہ سکے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑنے کا ایک طریق یہ بھی ہے۔ اِن لکڑیوں کو اجبائر کہتے ہیں اور اس طریقے سے ان ہڈیوں کے جوڑنے والے کو بھی جابر یا جبار کہتے ہیں۔ جب خدا کے لیے یہ صفت آئے گی تو اُس کا معنی یہ ہوگا کہ مظلوم کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والا اور جب یہ لفظ فرعون کے لیے آئے گا تو پھر یہ ہوگا کہ کسی مظلوم کی سالم ہڈیوں کو توڑنے والا۔ لفظ ایک ہی ہے، مادہ ایک ہی ہے لیکن آپ دیکھیے کہ یہ دونوں چیزیں جو ہیں تو یہ نہیں کہ ہم نے آج یہ دونوں کے معنوں میں فرق کیا۔ عربوں کے ہاں یہ استعمال ہوتا تھا۔ جبر اور جابر اُس معنی میں بھی ہوتا تھا اور پھر میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو دو لکڑیاں ہوتی تھیں اِن کو الجبائر کہتے تھے۔ اور یہ جو اِس طرح سے ان ہڈیوں کو جوڑنے والے ہوتے تھے یہ جابر اور جبار کہلاتے تھے۔ ایک جبر خدا کی طرف سے بھی ہے کہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑنے کا طریقہ یہ بھی ہے۔ اور وہ تو پھر اِس قسم کا مظلوم کہ جس کی ہڈی ٹوٹے وہ تو اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں کہ

شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

ہڈیاں جوڑنے والے کی نگاہ میں یہ شخص مستحقِ ہمدردی ہو جاتا ہے۔ تو یہ جو اُس کے ساتھ کر رہا ہے کہ لکڑیاں لگا کے اور پلستر لگا کے اور مضبوطی سے باندھتا ہے تو عربوں کے اِس لفظ کے اعتبار سے وہ جبار کہلائے گا۔ اِس کے جبر اور ہڈیاں توڑنے والے کے جبر میں بڑا فرق ہے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ حاکم قوم کا فرد ہے۔ اور اُسے معلوم ہے کہ یہ محکوم کا ایک فرد ہے۔ اور محکوم قوم کی اِس طرح سے حمایت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ تم اِس ملک میں مصلحین کا Role (کردار) ادا نہیں کرنا چاہتے بلکہ جبارین کا Role (کردار) ادا کرنا چاہتے ہو۔ اُن کے نزدیک تو مصلح وہ ہوسکتا تھا جو حاکم قوم کی ہر طرح سے تائید اور حمایت کرے اور محکوموں کے اوپر جور اور جبر کرے۔ اُن کا تو مصلح کا معیار ہی یہ ہوسکتا تھا۔ حاکم قوم کے جور و جبر کے خلاف کچھ کرنا اُن کے نزدیک فساد تھا۔ قرآن دو لفظوں میں بات کہہ گیا ہے کہ یہ زاویہء نگاہ کی تبدیلی ہے کہ محکوم قوم کے نزدیک مصلح کون ہوتا ہے اور حاکم قوم کے لوگ کسے مصلح قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک بات پہنچ گئی۔ **وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ یَسۡعٰی** (28:20)۔ یہاں سے نظر آتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ کا مقام بہت اونچا تھا۔ اور وہ ٹھیک ہے فرعون کے محلات میں شہزادوں کی طرح پرورش ہوتی تھی۔ کہا کہ ایک شخص بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا موسیٰ کی طرف آیا۔ اب یہاں قرآن پھر ایک لفظ کہہ گیا ہے **اقصا المدینة**. یعنی سیدھی سی بات تھی کہ ایک شخص آیا یا شہر میں سے کوئی شخص آیا۔

حاکم قوم کے حکمرانوں کے حکومتی نظم ونسق کا ایک طریق

عزیزانِ من! اب تو وہ تفریق ختم ہوگئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہ جو افسران تھے وہ شہر سے دور آبادی سے الگ رہتے تھے۔ اُس علاقے کو وہ Civil Lines کہتے ہی اس لیے تھے کہ وہ جگہیں شہر سے باہر ہوتی تھیں۔ حکومت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ افسران عوام میں خلا ملا نہ رکھیں۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اِس سے رعب کم ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے بچپن کے زمانے میں دیکھا ہے۔ تین حاکم گنے جاتے تھے۔ آپ تیسرا حاکم سن کر حیران ہونگے۔ ایک تو ڈپٹی کمشنر' ایک پولیس کپتان' اور تیسرا سول سرجن تھا۔ یہ تینوں انگریز ہوتے تھے' ان میں کبھی کوئی دیسی نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ ضلع میں ہوتے تھے' تحصیلوں میں نہیں ہوتے تھے۔ ہم نے دیکھا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی کہیں شہر میں آ جاتا تھا خواہ وہ سول سرجن ہی کیوں نہ ہو' تو ہر دوکاندار اٹھ کر اسے سلام کرتا تھا۔ آپ حیران ہونگے کہ یہ جس کو Salvation Army کہتے ہیں' یہ لوگ بھی ہوتے تھے۔ اُن کے ہاں کی خواہ وہ نرس ہو' وہ شہر میں آ جاتی تھی تو لوگ اٹھ کر کھڑے ہو کر سلام کیا کرتے تھے۔ حاکم قوم کے افراد تھے۔ اور وہ ہمیشہ آبادی سے دور رہتے تھے اور راز یہ تھا کہ خلا ملا سے حاکم قوم کا رعب جاتا رہتا ہے۔ اور وہ اِسی لیے اُس زمانے کی سول لائنز میں ان کی جو کوٹھیاں تھیں وہ شہر سے بہت دور باہر ہوا کرتی تھیں۔ میں نے یہ اتنا لمبا قصہ کیوں بیان کیا ہے جس کا اِس سے کچھ تعلق نہیں ہے؟ اِس لیے کیا ہے کہ قرآن جاتے جاتے ایک بات کہہ گیا ہے: **من اقصا المدینة** (28:20)۔ شہر میں سے وہ شخص نہیں آیا' بلکہ شہر سے دور آبادی' جو سول لائنز تھی' وہاں سے ایک فرد دوڑتا ہوا موسیٰ کے پاس آیا۔ گویا نظر آیا کہ موسیٰ کی پوزیشن بھی بڑی تھی اور وہ جو آنے والا تھا وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ان کے Civilians Officer میں سے کوئی ہوگا جو شہر سے دور آبادی سول لائنز سے دوڑتا آیا۔ **قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِکَ لِیَقْتُلُوْکَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ** (28:20) اُس نے کہا کہ اے موسیٰ! اندر مشورے ہو رہے ہیں۔ ان کو زعم یہ تھا کہ میں شہزادہ ہوں' مجھ پہ کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ بات آگے بڑھ گئی ہے۔ معلوم ہوگیا ہے کہ تُو بنی اسرائیل کی قوم میں سے ہے۔ محلات میں پرورش کے باوجود تیری رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے۔ اور اِس واقعے نے یہ بات پہنچا دی ہے کہ تُو اب تک بنی اسرائیل کی حمایت ہی کرے گا اس لیے تجھ سے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ کیبنٹ میں یہ بات چل پڑی ہے۔ فیصلہ ہوگیا ہے کہ تمہیں گرفتار کر لیا جائے۔ میں تمہیں یہ اطلاع دینے کے لیے آیا ہوں کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدین کی طرف نقلِ مکانی

اب قرآن کہتا ہے کہ **فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ** (28:21)۔ یہاں پھر وہی لفظ آیا ہے کہ موسیٰ وہاں سے کچھ ڈرتے

ہوئے نکل گئے' پھر وہی گردن اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہ کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (28:21) یہ کہتے ہوئے کہ یا اللہ! یہ جو ظالم قوم ہے مجھے اس کی دستبرد سے محفوظ رکھنا۔ یاد رکھیے کہ دوسرے مذاہب میں تو نجات کے معنی یہ ہیں کہ کسی عذاب میں گرفتار ہونے والوں کو اُس عذاب سے نکال لینا لیکن بات دوسری طرف چلی جائے گی' قرآنِ کریم کی رو سے نجات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عذاب میں ڈال کے وہاں سے نکال لینا بلکہ اُس سے سرے سے محفوظ رکھنے کا نام ہی نجات ہوتا ہے۔ یہاں وہ بات کہی ہے کہ یہ جو ظالم قوم ہے اِس کی گرفت سے مجھے محفوظ رکھنا' اس کی دست برد سے محفوظ رکھنا۔ یہاں نجات کا لفظ اس معنی میں ہے۔ اور مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (28:21) کہہ کے تو بات واضح کر دی کہ پوری کی پوری وہ قوم' جو قومِ ظٰلمین ہے' اُس سے نجات کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہاں سے نکل جائے' اگر کہیں اور اُسے پناہ گاہ مل سکتی ہے تو وہاں چلا جائے۔ وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ (28:22) وہاں سے نکل کر وہ مدین کی طرف چلے گئے۔ مصر سے نکلے تو صحرائے سینا کی طرف جو مدین واقع ہے وہ اُس طرف آ گئے۔ قَالَ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (28:22) کہا کہ ہاں امید ہے کہ خدا مجھے کوئی ایسا راستہ دکھا دے گا جہاں امن سے رہ سکوں۔

نبی کی قبل از نبوت زندگی کے خدوخال کی ایک جھلک

یہاں اب ایک اور بات آئی۔ یاد رکھیے! یہ زمانہ وہ ہے جب حضرتِ موسیٰ کو ابھی نبوت نہیں ملی تھی۔ یہ نبی کی قبل از نبوت کی زندگی ہے۔ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ آپ دیکھیے کہ وہ جو ہونے والا نبی ہے اُس کی قبل از نبوت کی زندگی بھی کیسی ہوتی ہے۔ کہا کہ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ (28:23) مدین کے چشمے پہ آئے' وہاں اُنہوں نے دیکھا کہ کچھ چرواہے اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اِس سے پہلے حضرتِ صالحؑ کے قصے میں یہ بات آئی ہے کہ جو معیشت تھی' جو معاشی زندگی تھی' وہ زیادہ تر مویشی پالنے کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دولت مویشی ہوتے تھے اور مویشی پالنا سب سے بڑا کام تھا۔ تو دیکھا کہ ایک چشمہ ہے' اُس میں سے محدود مقدار کا پانی نکل رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں بھی قرآن کا انداز دیکھیے کہ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ (28:23) اُنہوں نے دیکھا کہ وہ تو اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اِن سے دور دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ عزیزانِ من! ایک لفظ آیا ہے: تَذُوْدٰنِ (28:23)۔ اور پھر اس زبان کا بھی اعجاز ہے' اسی لیے تو قرآن کے لیے اس زبان کا انتخاب ہوا تھا۔ ایک لفظ میں ساری بات کہہ جاتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اِن کی بکریاں یا بھیڑیں بڑی پیاسی تھیں' وہ پانی کی طرف دوڑ کر جا رہی تھیں اور یہ لپک کر اُن کو پیچھے کی طرف روک رہی تھیں۔ یہ دونوں

چیزیں ایک لفظ کے اندر ہیں۔ اب اندازہ لگائیے کہ پانی موجود ہے اور مویشی وہاں پی رہے ہیں۔ یہ دُور کھڑی ہیں' ان کی بھیڑوں کی بھی سخت پیاس ہے۔ پانی وہاں موجود ہے لیکن یہ اپنی بھیڑوں کو روک رہی ہیں کہ وہ اُس طرف نہ جائیں۔ اب ان کی اس ایک حرکت سے یہ جو حضرتِ موسیٰ دور بیٹھے تھے یہ آ گئے ہے۔ وہ درخت کے سائے کے نیچے ذرا ستانے کے لیے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اِس نقشے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ ہونے والے نبی کی آنکھ ہے۔ عام نظر ہوتی تو وہ کبھی اِس کو اہمیت ہی نہ دیتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے قرآن بتاتا ہے کہ **قَالَ مَا خَطْبُكُمَا** (28:23)۔ اُنہوں نے اُن سے پوچھا کہ بچیو! یہ کیا معاملہ ہے' کیا بات ہے؟ یعنی اسی ایک بات کے اندر قرآن ساری بات کہہ گیا ہے کہ انہوں نے کیا محسوس کیا۔ پوچھا کہ یہ کیوں ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ یہ کیا بات ہے؟ **قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ** (28:23) کہا بات یہ ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر چلے نہیں جائیں گے' ہم اپنی بھیڑوں کو پانی نہیں پلا سکتے۔

غیر قرآنی معاشی نظام کی روشِ زندگی

عزیزانِ من! بات کہنے کا انداز دیکھیے۔ میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ قرآن کا عجیب اسلوب ہے۔ کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ ایک لفظ آگے کہا۔ یہ ہیں دو لڑکیاں۔ اور کہا کہ **وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ** (28:23) گھر میں کوئی جوان مرد نہیں' ایک بوڑھا باپ ہے' ہم بچیاں ہیں۔ ہم اِن کے مقابلے میں اپنے مویشیوں کو کیسے پانی پلا سکتی ہیں؟ قرآن ایک لفظ میں ساری بات کہہ گیا ہے کہ یہاں تو زور چلتا ہے۔ وہی جو حضرتِ صالح کا واقعہ تھا' یہاں بھی یہ ہوتا تھا کہ جو کمزور اور غریب تھے' اُن کے مویشی چراہ گاہوں میں اور چشموں پہ نہیں جا سکتے تھے۔ جب تک کہ سردارانِ قوم کے مویشی چارہ چگ کے' پانی پی کے' الگ نہ ہو جائیں' اُس وقت تک ان غریبوں کے مویشیوں کو اُن چراہ گاہوں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کا غیر متبدل اصول

حضرتِ صالح علیہ السلام نے پھر انقلاب برپا کیا ہے۔ اُن کی ان کے ساتھ جو مصالحت ہوئی تھی' اُس مصالحت' مفاہمت یا معاہدہ یا Agreement کی ایک ہی شق تھی' ایک ہی فقرہ تھا۔ اور فقرہ یہ تھا کہ یہ مویشی خدا کی مخلوق ہیں' یہ چشمے اللہ کے جاری کردہ ہیں' اللہ کی تخلیق کو اللہ کی مخلوق کے لیے کھلا رہنا چاہیے۔ یہ واقعہ قومِ ثمود اور حضرت صالحؑ کا ہی نہیں ہے بلکہ ابدی طور پر قیامت تک کے لیے ایک عظیم اصول بیان کر دیا ہے کہ خدا نے جو سامانِ نشوونما دیا ہے اُسے تمام نوعِ انسانی کے لیے یکساں طور پہ کھلا رہنا چاہیے۔ جسے قرآن نے **سوآء للسآئلین** (41:10) کہہ دیا ہے۔ ہر صاحبِ احتیاج کی ضرورت پوری کرنے کے لیے برابر کھلا رہنا چاہیے۔

ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی ایک حدیث مبارک: خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے رکھو

اِسے نبی اکرم ﷺ نے اس چمکتے ہوئے ہیرے کی طرح حدیث میں بیان کر دیا ہے کہ یہ **عباد**، **عباد اللہ** ہیں اور یہ ارض **ارض اللہ** ہے یعنی زمین خدا کی زمین اور بندے خدا کے بندے۔ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے رہنی چاہیے' تم درمیان میں کون ہوتے ہو اِس طرح سے قبضہ کرنے والے!! خدا کے بندے اور خدا کی زمین ہے' تم ہوتے کون ہو!! کیا بات ہے' عزیزانِ من! چار لفظ ہیں جن میں یہ سارا مسئلہ جو اکنامکس ہے' جو معیشت کا ہے' جو اقتصادیات کا ہے جس کے لیے آج الجھاؤ میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سارا مسئلہ دو لفظوں میں حل ہو جاتا ہے۔ وہ کتاب ہے جس میں حضرت صالحؑ سے یہ کہا گیا ہے۔ اور یہ سنت ہے نبی اکرم ﷺ نے جو فرما دیا ہے۔ اور اسی لیے حضورؐ کا یہ فرمان ہے کہ جس بستی میں رات کو کوئی ایک شخص بھی بھوکا سو گیا اور باقیوں نے کھانا کھا لیا ہو' تو اُس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہے نظامِ خداوندی۔ یہ ہے سنتِ رسول اللہ ﷺ۔ یہ ہے جو کہا گیا ہے کہ ہم کیسے پانی پلا سکتی ہیں؟ کہا یہ گیا ہے کہ جس ارض کو' جس زمین کو' جن چشموں کو' خدا نے بلا مزد و معاوضہ' مفت بلا قیمت' نوعِ انسان کے لیے دیا ہے' کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اِس کے اوپر ذاتی ملکیت بنا لے۔ یہ تو اللہ کی ملکیت ہے' تم اسے وراثت میں کیسے لے سکتے ہو' کیا تم اللہ کے بیٹے ہو (معاذ اللہ) کہ خدا نے تمہیں یہ ورثے میں بخش دیا ہے؟ کیا تم نے اُس سے قیمتاً خریدا ہے؟ یہی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ملکیت کی۔ تو یہ تو شکل ہی نہیں ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ قرآن گزشتہ قوموں کی داستانیں تاریخ کے واقعات کی طرح بیان نہیں کرتا۔ وہ جو انسانیت کو قیامت تک آنے والے پرابلم اور مسائل ہوتے ہیں اُن کا حل بتاتا جاتا ہے۔ قومِ ثمود کے قصے میں بھی یہ بتایا ہے کہ جو کمزور رہ جاتے تھے اُن کی بھیڑوں بکریوں کو چرنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اُس نبی نے بھی یہ کہا تھا کہ خدا کی زمین اور خدا کے مویشی ہیں۔ تم کون ہوتے ہو درمیان میں آنے والے!! حضور ﷺ نے بھی آخر میں آ کر جو نظام متشکل کیا ہے وہ یہی نظام تھا: ارض اللہ اور عباد اللہ۔ تم کون ہوتے ہو درمیان میں آنے والے!! یہاں بھی وہی باطل کا نظام ہے' وہی استبداد کا نظام ہے کہ ہم نہیں پانی پلا سکتیں۔

ظلم واستبداد کے راج کا پیدا کردہ ماحصل

قرآن دو لفظوں میں وجہ بیان کر گیا ہے کہ ہم لڑکیاں ہیں اور مرد کوئی ہے نہیں جو اِن کا مقابلہ کرے۔ ایک بوڑھا باپ ہے۔ ہمیں کیسے جرأت ہو سکتی ہے کہ ہم ان کے مویشیوں کے ساتھ اپنے مویشیوں کو پانی پلا سکیں؟ ہمیں تو بھیک کا ٹکڑا ملے گا۔ یہ پی جائیں گے' کچھ بچ جائے گا' تو ہمارے حصے میں کچھ آ جائے گا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ کہتا کہ ٹھیک ہے ان کا معاملہ ہے اور میں راہگیر مسافر ہوں' دو منٹ کے لیے یہاں درخت کے نیچے بیٹھا ہوں' مجھے کیا پڑی ہے کہ اس جھگڑے کے اندر پڑ جاؤں۔ نظر آ رہا ہے کہ وہ بتا رہی ہیں کہ یہ طاقتور مستبد

ہیں' یہ ہمارے مویشیوں کو پاس نہیں آنے دیں گے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہم آپ میں سے کوئی ہوتا تو یہی کہتا کہ بابا! اپنا سر سلامت رکھنا چاہیے' پتہ نہیں یہ کیا کر دیں' مجھے کیا پڑی ہے۔ یہ ہونے والا نبی تھا۔ کچھ کہے بغیر اٹھا' اُن کو ہٹایا اور اِن کے مویشیوں کو آگے لے کر گیا اور انہیں پانی پلایا۔ اُس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ **ثُمَّ تَوَلّٰى اِلَى الظِّلِّ** (28:24) اُس کے بعد خاموشی سے آ کر پھر اُسی درخت کے سائے میں بیٹھ گئے اور سوچا کہ یا اللہ! اُس سرزمین سے بھاگا تھا کہ طاقتور ظالم متبد انسان کمزوروں پر اس قدر ظلم کرتے تھے' وہاں سے بھاگا کہ کسی ایسی سرزمین میں جاؤں جہاں یہ کچھ تو نہ ہو۔ یہاں آ کر دیکھ رہا ہوں کہ وہی نقشہ یہاں ہے:

بہرِ زمینِ کہ رفعتِ ایں آسماں بیا

یہاں بھی غریبوں کے اوپر وہی ظلم' وہی جبر' وہی قوت کے مظاہرے' ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ عجیب چیز ہے۔ **فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ** (28:24) کہا کہ یا اللہ! میری سمجھ میں تو کچھ بات آتی نہیں ہے کہ اس زمین پر' اس آسمان کے نیچے اس نظام کے تابع' میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ گزارہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ شاعر کیا خوب کہہ گیا ہے:

چڑیاں ترسیں بوند کو' دھرتی دھول اڑائے

تم رہو اس دیس میں' ہم سے رہا نہ جائے

کہا کہ اے میرے مولا! میری سمجھ میں بات نہیں آتی۔ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ تو اپنی طرف سے کوئی بات بتا تو میں اُس کے لیے تھوڑی بھیک مانگ رہا ہوں۔ یہ اس بارگاہ کا فقیر ہے۔ فقیر سے بات یاد آ گئی' کیا بات کہہ گیا ہے!

وہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں

آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

یہ اُس کا فقیر تھا۔ کیا لفظ یہاں آیا ہے کہ میری سمجھ میں تو بات نہیں آتی۔ یا اللہ! جھولی پھیلائے ہوئے بھیک مانگ رہا ہوں۔ تو ہی بتا دے کہ اب یہ کہاں جائیں۔ اب تُو ہی بتا کہ تیرا مسلمان کدھر جائے۔ بیٹھ گئے۔ میں عرض کروں اس چیز کو؟ میں ذرا آگے بڑھ کے عرض کرونگا۔ تھوڑی سی معافی چاہتا ہوں کہ وہ جو آجکل عام ہوا چلی ہے' مجھ پہ بھی اُس کا اثر ہے۔ درمیان کا ٹکڑا پھر نہیں ہے۔

نبی کے گھرانے کی تعلیم و تربیت کی ایک جھلک

وہ اپنی بھیڑوں کو لے کر چلی گئیں۔ یہ وہاں بیٹھ گئے۔ **فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ** (28:25) وہ کیا دیکھتے ہیں کہ اُن لڑکیوں میں سے ایک لڑکی چلی آ رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اتنا ہی لکھنا کافی تھا کہ وہ ادھر آ رہی ہے لیکن یہ قرآن ہے اور

ایک نبی کے گھرانے کی بیٹیاں ہیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ حضرتِ شعیبؑ کی بیٹیاں تھیں۔ نبی کے گھرانے کی بیٹی آ رہی ہے۔ تمثیل سے بات پوری ہو جاتی کہ چلی آ رہی ہے لیکن قرآن ہے۔ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ (28:25) سمٹے سمٹائے ہوئے حیا سے آنکھیں جھکائے ہوئے چلی آ رہی ہے۔ ایسے ہی آنا چاہیے۔ پہلے تھا کہ وہ پانی کے لیے کھڑی تھیں۔ اور وہ اپنے ہی قبیلے کے لوگ تھے۔ آج بھی ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ گاؤں کے جتنے لوگ ہوتے ہیں وہ اُن کے نزدیک باپ، چچا، ماموں وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اُن کے نزدیک بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ ہوتی ہیں یا کہوں کہ ہوتی تھیں۔ اب تو فرق کرنا پڑ رہا ہے۔ ہوتی تھیں۔ عزیزانِ من! بات سمجھانے کے لیے کہنا پڑتا ہے اور کوئی بات نہیں۔

گزرے ہوئے زمانے کی ایک یاد کا ذکر

یہ جو راجپوت تھے تو یہ لوگ بیٹی کے ہاں کا کھاتے نہیں تھے، پانی تک نہیں پیتے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ گاؤں کی لڑکی کی شادی دوسرے گاؤں میں ہوتی تھی۔ میں نے بچپن میں اپنوں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا ہے کہ راستے سے گزر رہے تھے، راستے میں وہ گاؤں پڑتا تھا۔ گاؤں تو ذرا ہٹ کر تھا۔ وہ سڑک پہ گاؤں کی ''جوع'' [1] کہلاتی ہے، جہاں تک اُس گاؤں کی زمین ہوتی ہے۔ تو وہاں سے ہم جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے، وہاں کنواں تھا، وہاں پانی پینے لگے تو اُنہوں نے ہمارے ماموں کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ نہیں، اس گاؤں میں ہمارے گاؤں کی لڑکی بیاہی ہوئی ہے، اس جوع کا پانی ہم نہیں پی سکتے۔ عزیزانِ من! اُس زمانے میں یہ تھی بیٹیوں کی عزت۔ گاؤں کی لڑکی ہماری کوئی عزیزہ نہیں تھی، وہ صرف ہمارے گاؤں کی تھی۔ اس لیے وہ ہماری لڑکی ہے۔ ہم بیٹیوں کے ہاں کا کھانا نہیں کھایا کرتے تھے اس لیے اس جوع کا پانی ہم نہیں پی سکتے۔ عزیزانِ من! یہ کل کی بات ہے۔ اور اب وہی بیٹیاں بیچی جاتی ہیں۔ تو اب بات اس لڑکی کی ہو رہی تھی اب یہ جو عَلَى اسْتِحْيَآءٍ (28:25) ہے، اسے ہم کہاں سے ڈھونڈیں۔ حیا سے سمٹی سمٹائی ہوئی وہ چلی آ رہی ہے۔ وہ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ دونوں بہنیں وہاں تو اپنی بھیڑوں کو لے کر کھڑی تھی کیونکہ وہ ان کے اپنے گاؤں کے لوگ تھے۔

لفظ حیا کا قرآنی مفہوم

اب وہ ان دونوں بہنوں میں سے ایک بہن ایک نو وارد کی طرف آ رہی ہیں۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز۔ وہاں یہ نہیں کہا کہ وہ اِس طرح سے سمٹی سمٹائی ہوئی کھڑی تھیں۔ یہاں کہا ہے کہ جب یہ اِس کی طرف آ رہی ہیں تو حیا سے سمٹی سمٹائی ہوئی آ رہی ہیں۔ جی نہیں چاہتا

---

[1] علاقہ۔

قرآن کے ان الفاظ کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کو۔ کیا بلا کی قوم تھی اور کیا زبان انہوں نے بنائی تھی! یہ ''حیات'' جس کو ہم زندگی کہتے ہیں' یہ لفظ یہیں سے آیا ہے۔ زندگی کے متعلق عام طور پہ ان لوگوں کے ہاں پہچان یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو چھیڑیئے۔ یہ فیصلہ ہے کہ زندگی جہاں بھی ہے' وہ اپنا تحفظ (Preservation of Self) کرتی ہے۔ اور اِنہوں نے تجربے سے یہ دیکھا ہے کہ اگر کسی چیز کو یوں ذرا سا چھیڑیں' اگر اُس میں زندگی ہے' تو وہ سمٹے گی۔ یعنی کسی جاندار کے اوپر تحفظ کا پہلا Reaction جو ہوتا ہے وہ سمٹنا ہوتا ہے۔ اور جب اِس سے کام نہ چلے تو پھر اُس کے بعد وہ Agressive ہوتا ہے' حملہ کرتی ہے۔ کسی چیز کو چھیڑنے کے بعد پہلا اُس کا جو ردِعمل ہوتا ہے' Reaction ہوتا ہے' وہ سمٹنا ہوتا ہے۔ اور یہ جو سانپ میں سمٹنا ہے' یہ انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے' وہ جو کنڈلی مار لیتا ہے' بے حد سمٹتا ہے۔ سانپ کو عربی زبان میں حیۃً کہتے تھے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ ان لوگوں نے زبان کیسے بنائی تھی! ڈیڑھ ہزار سال کا پہلا زمانہ ہے' کوئی پڑھا لکھا تک وہاں نہیں ہے' علم وہاں نہیں ہے لیکن زبان کی کیفیت یہ ہے۔ وہ دیکھا کہ جس چیز کو ہم چھیڑتے ہیں اُس میں سمٹنے کی چیز ہے۔

غلط نگہی یا بدنگاہی کے ردِعمل کا اظہار ہی تو زندگی ہے

یہ لفظ سمٹنا جو تھا' یہ سانپ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہاں سے اُنہوں نے لفظ حیات زندگی کے لیے لیا۔ اور یہی سمٹنا جب وہ جوان لڑکی یا عورت میں آیا ہے تو اُس نے لفظِ حیا لیا کہ زندگی اس کے اندر ہے جو یہ سمٹ رہی ہے۔ جو سمٹتی نہیں ہے وہ زندہ نہیں ہے' مردہ ہے' لاش چلی جا رہی ہے۔ کیا بات ہے اِس قوم کی! اور کیا بات ہے اُس خدا کی جس نے اس قوم کی زبان کو قرآن کے لیے چنا تھا! عزیزانِ من! دوسرے کی غلط نگاہ پڑتی ہے تو اُس سے اگر وہ سمٹتی نہیں ہے تو وہ زندہ نہیں ہے' وہ لاش ہے کیونکہ مردہ نہیں سمٹتا' زندہ تو سمٹے گا۔ اور اِس لیے ''حیا'' کو انہوں نے زندگی کی نشانی بتایا ہے۔ اب اس ''حیا'' کو کہاں ڈھونڈیں!! ہم ان شاعروں کے بس میں پڑ گئے' بہت بڑی خوبیاں ہیں' چلے جا رہے ہیں: محبوبہ کی چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ کہاں یہ سمٹنا اور کہاں یہ کیفیت کہ کڑی کمان کا تیر۔ اور اگر اِس چال کے متعلق' اس معشوق کے اٹھنے اور بیٹھنے کے متعلق میں آپ کے سامنے اشعار پیش کروں تو یہ تو بزم کا مشاعرہ ہی ہو جائے۔ اتنا کچھ ہمارے ہاں ان لوگوں نے یہ گند لکھا ہوا ہے جو کچھ شاعری کے اندر کہا ہوا ہے۔

اِن کی تو کیفیت یہ ہے کہ اُس کا اٹھنا' بیٹھنا' چلنا پھرنا:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ان کو کیا بتایا جائے کہ یہ حیا کیا چیز ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ **عَلَی اسْتِحْیَآءٍ** (28:25) سمٹتی سمٹاتی، اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیتی ہوئی چلی آئی۔ **قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ** (28:25) کہا کہ میرے ابا جان آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ **لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا** (28:25) تم نے جو کچھ ہمارے لیے کیا تھا، ہماری مدد کی تھی، وہ چاہتے ہیں کہ اِس کا کچھ تو صلہ تم کو دیدیا جائے۔ یہ بغیر صلہ کے اٹھ کر پانی پلانے والا ہے۔ نہ کسی ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی امید ہے۔ خاموشی سے اٹھا اور چلا آیا۔ پوچھا بھی نہیں کہ تم کس گھرانے کی ہو، تمہارے باپ کا نام کیا ہے، محلّہ کونسا ہے۔ وہ بھی خاموشی سے گھر چلی گئیں اور باپ سے کہا کہ یہ واقعہ آج ہوا ہے۔ اُنہوں نے بھی سمجھ لیا کہ یہ اس بستی اور اس وطن کے لوگوں میں سے نہیں ہوسکتا۔ کہا کہ جاؤ بیٹی! اُن کو بلا لاؤ۔ مجھے اُس میں امانت اور دیانت کا جوہر نظر آتا ہے۔ اُسے بلاؤ، ہم مفت میں اُس سے یہ خدمت نہیں لینا چاہتے، میں اُس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔ **فَلَمَّا جَآءَہٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ** (28:25) یہ گئے اور انہوں نے اپنا ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا کہ **لا تخف** (28:25)۔ خدا کا ایک نبی دوسرے کو اپنی Protection (حفاظت) میں لے رہا ہے حالانکہ وہ خود غریب ہے، بوڑھا ہے لیکن ایک نووارد ہے جس کا کوئی اور نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ مت خوف کھاؤ۔ ابھی چار قدم آگے چلیں گے تو خود خدا بھی ان سے کہے گا کہ **لَا تَخَفْ** (28:31)۔ جو خدا کہتا ہے خدا کا نبی بھی وہی کچھ کہتا ہے۔ **نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ** (28:25) تم نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! مجھے قومِ ظالمین سے محفوظ رکھنا یہاں تم قومِ ظالمین سے محفوظ رہو گے خدا کے بندے تو ہر اُس شخص کو جو مظلوم ہو اور ظالم کے خلاف مدد کا مستحق ہو تو اُس کو وہ Protection (حفاظت) دیتے ہیں، حفاظت دیتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی صلہ کے، بغیر کسی جزا کے۔ کہانی تو اتنی ہی ہونی چاہیے تھی مگر **قَالَتْ اِحْدٰهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ** (28:26) اُن میں سے ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان! ہم لڑکیاں ہیں، آپ بوڑھے ہیں، بھائی ہمارا کوئی نہیں ہے، یہ کسی اور دیس کا مسافر ہے، یہاں کا نہیں ہے تو اِس کو گھر میں ملازم کیوں نہ رکھ لیں، ہمیں ضرورت بھی ہے۔

فکرِ قرآنی کے ایک اور گوشے کی نشاندہی

عزیزانِ من! کہانی کے نقطہ نگاہ سے تو بات اتنی ہی کافی تھی لیکن قرآن پھر ایک اصول بیان کر گیا، بڑا بلند اصول بیان کر گیا ہے۔ کہا کہ ملازم کے لیے دو ہی خوبیاں ہونی چاہئیں کہ وہ مضبوط و طاقتور ہو اور ساتھ ہی امین بھی ہو۔ عزیزانِ من! طاقتور اور امین ہو۔ ''جنوں

کینڈے نیں کہ تت کڈ کے رکھ دتا''۔ (1) سارا نچوڑ بیان کر دیا کہ اُس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ یہ نبی کے گھرانے کی بیٹیاں ہیں۔ کہا کہ اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (28:26)۔ یہ ''ال'' ہے: مضبوط ہونا چاہیے' امین ہونا چاہیے۔ قوی تو یہ نظر آ رہا ہے۔ اِس کی شہادت کی گواہی ہم دیدیتی ہیں کہ بغیر کسی صلے کے اور بغیر کسی امید کے اِس نے وہ کچھ کام کیا' اُن سے لڑائی تک لے لی۔ خاموشی سے جا بیٹھا اور ہم نے دیکھا کہ ہماری طرف اِس نے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اِس سے زیادہ اِس کی امانت کا اور کیا ثبوت ہوگا۔ یہ تو قوی بھی ہے اور امین بھی ہے۔ یہی اصول نظامِ حکومت میں آتے ہیں۔

نوعِ انسانی کے لیے حضرت عمرؓ فاروق کا عہد خلافت ایک روشنی کا مینار ہے

آج جب ہم تاریخوں سے ورق گردانی کرتے ہیں کہ صدرِ اول میں' خلافتِ راشدہ (11-40AH/ 632-661AD) میں' حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45ء) میں' یہ نظام کس طرح سے اتنی تیزی سے بڑھا پھولا اور آگے بڑھا۔ خدا توفیق دے تو کم از کم حضرتِ عمرؓ کے زمانے (13-24AH) کے نظام کی جوجزئیات اور واقعات ہیں اُن کو ذرا گہری نظر سے دیکھا کریں۔ عجیب شخصیتؓ پیدا ہوئی تھی۔ اسی لیے میں نے اُن کو ''شاہکارِ رسالت'' (2) لکھا ہے۔ یہ کسی عقیدت کی بنا پر نہیں ہے' وہ واقعی شاہکارِ رسالتؐ ہیں۔ اُن کا ایک ایک قول آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اصولوں کی تفسیر ہے۔ یہاں اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (28:26) ملازم کے لیے' خدمتگار کے لیے کہا ہے۔ وہ حکومت کے متعلق کہتے تھے کہ یہ اصول یاد رکھو کہ اپنے ہاں حکومت کرنا ہو تو دو باتیں یاد رکھنا کہ ''طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں خطرناک ہوتے ہیں''۔ یہ تھی نگاہ اِنؓ کی! قرآن کی تعلیم و تربیتِ نبویؐ۔ یعنی جس قوم نے صدیوں تک کبھی حکومت دیکھی نہیں تھی' پہلی دفعہ اُن میں حکومت آ رہی ہے اور حکمران کی نگاہ یہ ہے۔ حضرت عمرؓ (13-24AH/ 632-644/45 AD) کا ایک اور قول ہے کہ جب ان سے کسی نے کہا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہیں دیتا' آپؓ نے کہا کہ تم نے ٹھیک کہا ہے لیکن آدھی بات کہی ہے' فقرہ پورا کرو۔ کہنے لگے کہ پورا کیسے کروں۔ کہنے لگے کہ ''مومن وہ ہے جو نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے اور نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔'' کہا کہ یہ صفتِ خداوندی ہے جو مومن میں ہونی چاہیے۔ خدا بھی اگر کسی کو دھوکا دیتا نہیں تو دھوکا کھاتا بھی نہیں ہے۔ اب یہ فقرہ جو پورا ہو رہا ہے تو آپ دیکھیے کہ قیامت تک کے لیے اصول بن گیا۔ دھوکا دیتا نہیں تو ہر ایک کہے گا لیکن اصل یہ ہے کہ دھوکا دیتا نہیں تو دھوکا کھاتا بھی نہیں۔ یہ چیز کہ ''طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں حکومت کے لیے خطرناک ہوتے ہیں''۔ ایک بڑا اہم اصول ہے۔ اُنؓ کا ایک اور قول ہے

---

(1) یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ بات کا نچوڑ نکال کر رکھ دیا۔

(2) یہ پرویزؒ کی ایک کتاب کا نام ہے۔ اُس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو- زندگی کتنی خوبصورت ہے!

کہ ''حکومت وہی قائم رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں' سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں''۔قول ہے کہ جو''شر کے ذریعے غالب آیا اُسے غالب نہ سمجھو' اُسے مغلوب سمجھو کیونکہ وہ تو اپنے جذبات کا مغلوب ہے''۔ایک دفعہ اُنہوں نے کہا ہے کہ''جو ناجائز طریقے سے کامیاب ہو' اُسے کامیاب نہ کہو' اُسے ناکام کہا کرو۔جس دن کوئی جائز طریقے والا آ گیا' اُسی دن اُس کو شکست دیدیگا''۔کیسی نگاہ تھی حالانکہ اُس زمانے میں ابھی Psychologists (ماہرینِ نفسیات) وغیرہ تو تھے ہی نہیں۔اُنہوں نے کہا تھا کہ یاد رکھو کہ ''جس شخص میں تکبر ہو تو سمجھو کہ وہ احساسِ کمتری (Inferriority Complex) کا شکار ہے''۔اور ان لوگوں کے متعلق اُنہوں نے کہا تھا کہ ''ان کو شریکِ حکم نہ کرنا ورنہ یہ حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کر جائیں گے''۔یہ ہے تصور القوی الامین کا۔عزیزانِ من! اور یہ دو جوہر پیدا ہو جائیں تو سلطنت میں کبھی کمزوری نہیں آ سکتی۔

لفظ امین کا قرآنی مفہوم

القوی کے معنی اُس زمانے میں تو Physical (طبعی) قوت ہی ہوتی ہوگی' وہ جسمانی قوت ہی تھی لیکن اِس میں تو صلاحیت' دیانت' قابلیت' یہ ساری خوبیاں آ جاتی ہیں۔توانا دماغ بھی تو ایک قوت ہوتی ہے۔اور شرط اُس میں وہی ہے کہ وہ امین ہو۔اور پھر بات آ گئی کسی قوم کی ایک زبان کی۔امین کو ہم سمجھتے ہیں کہ امانتدار ہو' دیانتدار ہو۔بس اتنے سے ہی معنی لے لیتے ہیں۔یہ جو لفظ ہے اِس کا تو مادہ ہی ''امن''[1] ہے۔اس کے معنی ہیں کہ ''جس شخص سے معاملہ کرنے کے بعد تم اپنے آپ کو بالکل امن میں محسوس رکھو''امانت یہی نہیں کہ کسی کے پاس تم نے ایک روپیہ رکھا ہے اور ہمارے ہاں تو اتنی سی ہی امانت سمجھی جاتی ہے۔اصل میں یہ ہے کہ جس شخص سے تم کوئی بھی معاملہ کرو تو معاملہ کرنے کے بعد تم اپنے آپ کو امن میں محسوس کرو۔وہ امین ہوتا ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ لفظ ایمان تو اسی امن ہے۔مومن وہ ہے کہ جس سے ساری دنیا امن میں رہے۔

خدا تعالیٰ کی ایک صفت المؤمن بھی ہے

آپ کو معلوم ہے کہ خدا کی ایک صفت المؤمن بھی ہے۔اگر مومن کے معنی' جیسا ہم کرتے ہیں کہ ایمان لانے والا' تو خدا کے لیے جو المؤمن ہے' وہ کس چیز پہ ایمان لا کے مومن بنا۔اِس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ ''وہ جو تمام کائنات کو امن میں رکھنے والا ہے' ان کے امن کی حفاظت کی ذمہ داری لیے ہوئے ہے' وہ المؤمن ہے۔''اسی لیے خدا نے اس جماعت کو جماعتِ مومنین کہا ہے۔وہ جو خدا کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کے مظلوموں' مقہوروں اور کمزوروں کو امن دینے کی' یہ ذمہ داری دنیا میں اس جماعت کے ہاتھوں سے پوری ہوگی۔اسے

---

[1] ا م ن

جماعتِ مومنین کہتے ہیں۔ ''تے اک اَسی آں' جیہڑے اپنی حفاظت واسطے دوسریاں دے دروازے کھڑ کاندے پھرنے آں''۔ [1]

عزیزانِ من! ایمان' امن' اور امین۔ یہ ہیں لفظ۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کے لیے قرآن کی آیت اور ایک ایک لفظ کے اوپر کھڑے ہو جایا کرو کہ یہ بات کیا کہہ رہا ہے۔ کہا ہے کہ اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (28:26)۔ اب اِس بوڑھے کی ذہانت دیکھیے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ایک کام کرنے والے کی ضرورت ہے۔ یہ قوی بھی ہے اور امین بھی ہے لیکن بہر حال گھر میں رکھنا ہے۔ وہ نوجوان ہے اور گھر میں جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ وہ کیا تدبیر نکال رہے ہیں: قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ (28:27) کہا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بہتر یہ ہوگا کہ ان لڑکیوں میں سے ایک کے ساتھ تمہاری شادی کردی جائے۔ بیٹی کے ساتھ نکاح کر دیا جائے۔ آپ نے دیکھا کہ امن کی کیسی حسین شکل پیدا کی۔ اب یہ خاندان کا فرد بن گیا۔ ایک بیٹی کا خاوند بن گیا۔ اُس کے دل میں بھی یہ بات نہ رہی کہ میں اس گھر کا ملازم ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے یہ حضرات معاملات کو سلجھاتے تھے۔ اس کے دل سے وہ Complexes (الجھاؤ) نکال دیئے۔ گھر میں امن کی صورت پیدا کردی۔ کام کرانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ ہوتا چلا گیا۔ نہ یہ ملازم ہیں' نہ تم آقا ہو' نہ گھر میں کسی طرح کا بھی' غیر محسوس سا بھی' ایک خطرہ ہو سکتا تھا تو اُس کے امن کی صورت پیدا کردی۔

سابقہ دور میں معاشرتی رسم ورواج اور ان کی افادیت

یہ جو دور تھا اِس میں ایک عجیب چیز تھی۔ وہ دور ہے اس کو Matriarchal (عورت کی سربراہی کے متعلق۔ شاہ مادری) کہتے ہیں۔ اُس دور میں عورتوں کی بالا دستی ہوتی تھی۔ یہ Semitic Race (سامی النسل) تھی' اس میں بھی اِس کا اثر تھا لیکن جو باقی علاقے تھے' یہ جو اُس زمانے کے قبائل ہیں اُن کی اب جو تاریخیں مدون ہو رہی ہیں' تو نظر آ رہا ہے کہ وہاں قبیلوں کی حکمران عورت ہوتی تھی۔ Matriarchal (شاہ مادری) کے معنی ہیں ''ماں کی حکومت''۔ Patriarchal کے معنی ہیں ''باپ کی حکومت''۔ تو یہ پہلا دور تھا کہ جس کے اندر ایک قبیلے کی بہو حکمران ہوتی تھیں۔ اُسی کے اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اب تو لڑکی بیاہی جاتی ہے' سسرال میں جاتی ہے۔ اُس زمانے میں لڑکا بیاہا جاتا تھا اور اِدھر لڑکی کے گھر آتا تھا۔ ''یعنی منڈے دا ڈولا ایدھر آندا سی''۔ [2] بات لمبی چلی جائے گی۔ بہر حال دور تو وہ تھا جسے آپ کہیے کہ جاہلیت کا دور تھا لیکن اب جو ہم اِدھر آئیں گے تو نظر آئے گا کہ وہ اِس کے مقابلے میں نہایت اچھا انداز تھا۔ عورت ہمیشہ مظلوم سمجھی جاتی ہے۔ عورت کو وہاں بھیج دیجیے تو وہ اتنے غیر ہوتے ہیں جن کے اندر وہ ایک جنس بیچاری کمزور سی

---

1. ایک ہم ہیں کہ امن کے لیے دوسروں کے دروازوں پر دستک دیتے پھر رہے ہیں۔

2. لڑکے کا ڈولا یہاں آتا تھا۔

وہاں چلی جاتی ہے۔ اگر وہ لڑکا ادھر آ جاتا ہے تو لڑکے کی اپنے سسرال کے ہاں یہ کیفیت نہیں ہوگی۔ اُس جہالت میں بھی آپ دیکھیے گا کہ ایک بڑی عقلمندی کی اور دانشمندی کی بات تھی جو اُنہوں نے اپنے ہاں سوچی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کو مظلوم و مقہور اور دوسروں کے محتاج نہیں بناتے تھے۔ لڑکے کو بیاہتے تھے اور لڑکے پہ یہ کیفیت طاری نہیں ہوسکتی۔ اُس دور میں یہ جو عائلی زندگی تھی وہ بڑی خوشگوار رہتی تھی۔ اُس کے بعد جب یہ دور آیا ہے تو مرد نے پھر عورت سے انتقام لینا شروع کیا۔ اس کے بعد انتقام کا دور شروع ہوا۔ اور اِس میں جہاں اور چیزیں الٹی ہیں وہاں یہ چیز بھی الٹی ہے کہ اب لڑکی وہاں سے اِدھر اپنے سسرال کے ہاں آئے گی۔ ان Bases (بنیادوں) میں یہ چیز پھر بھی کسی حد تک لائقِ گوارا تھی۔ سامی النسل میں بھی یہ بات تھی کہ لڑکی سسرال میں نہیں آتی تھی۔ لڑکی اور لڑکے کی شادی ہوتی تھی اور یہ دونوں میاں بیوی ایک نیا خاندان بنا کے الگ رہتے تھے۔ اِس میں بھی اس لڑکی کی کیفیت محتاجی اور دست نگری کی نہیں ہوتی تھی بلکہ رفاقت کی ہوتی تھی۔ اپنے گھر میں آزاد ہوتی تھی' اپنے گھر کی مالکہ ہوتی تھی۔ میاں بیوی میں اگر صحیح نباہ ہو رہا ہے تو وہ کوئی بڑا خوشگوار گھر ہوتا ہے۔

آج ہمارا سارا اسلام ہندوانہ ہے

ہمارا بیڑہ غرق ان ہندوؤں نے کر دیا جو ہم ان کے ساتھ اتنی صدیوں تک رہے۔ اُنہوں نے ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ اور باتیں تو چھوڑیئے ہمارا سارا اسلام ہی ہندوانہ ہے۔ ہماری رسوم و رواج ہندوانہ ہیں۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ ہماری یہ گھریلو زندگی ساری ہندوانہ ہے۔ ہندو تو بنیا تھا۔ اُس کے ہاں Joint Family System تھا' یعنی وہ لڑکوں کو اپنے سے الگ ہونے ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ اُن لڑکوں کے نام کچھ نہیں رکھتا تھا' خواہ کتنا ہی کاروبار بڑا کیوں نہ ہو' دولت کیوں نہ ہو۔ وہ سب کچھ باپ کے نام ہی ہوتا تھا۔ لڑکے وہاں ساتھ رہنے پہ مجبور ہوتے تھے۔ جب لڑکوں کی شادی ہوتی تھی تو یہ جو آتی تھی یہ تو اُس نے لازماً اُسی گھر کے اندر آنا ہے' یہ اُس طرح سے مجبور تھی۔ اب وہ باپ یا بڑے کا دست نگر ایک لڑکا ہے' اُس لڑکے کی ایک بیوی اس گھر کے اندر ہے۔ اب سوچیے کہ اِس کا حشر کیا ہوگا۔

ہندو کی تنگ نظری اور بدذوقی کی کیفیت

ایک بات پر تو ہماری اگلی نسل کچھ بہتر ہی ہے کہ اُنہوں نے وہ اُن کے ہاں کے گھر نہیں دیکھے۔ دوسرے اعتبار سے یہ بہت ہی زیادہ محروم ہیں۔ اگر یہ دیکھ لیتے کہ ہندو کیا ہے تو پھر یہ بات کبھی نہ ہوتی کہ قائداعظمؒ نے پاکستان بنا کے کیا کیا۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ ہندو ہے کیا۔ ہندو کی تنگ نظری کی تو یہ کیفیت ہے کہ کرکٹ کا میچ جیتنے کے اوپر اپنے گھر میں یہاں انہوں نے چھٹی کر دی۔ وہاں پارلیمنٹ میں

سوال ہو رہا ہے کہ صاحب! ان کو بتایئے کہ جی! اتنے شادیانے بج رہے ہیں' چھٹی کر دی ہے۔ یہ بڑی بری بات ہے' ہمیں معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں ہمارے خلاف کیا ہے' ہم کشمیر نہیں لینے دیں گے۔ اس سے زیادہ تنگ نظر یہودی تھا' یا اُس کے بعد یہ بنیا ہے۔ آپ نے تو دیکھا نہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپیہ کا مکان بناتے تھے۔ اتنے اتنے سے دروازے' اتنا اتنا سا روشندان یعنی وہ اتنا سمٹا ہوا' اتنی اتنی سی کوٹھڑیاں' کشادہ ہی نہیں تھی۔ ان کے مندر میں جا کے دیکھیے لاکھوں روپیہ اُس پہ لگا ہوا ہو گا لیکن اندر وہ اتنی سی جگہ ہوتی ہے جس میں وہ مٹی کا مادھوا یک ہوتا ہے اور اُس میں کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی' تاریکی' اندھیرا۔ اور کیفیت تو یہ ہے کہ بابر ❶ وہاں سے چار آدمی لے کر آیا۔ وہاں سے ایک دوست نے لکھا کہ کیا خیال ہے تمہارا' چار آدمی لے کر گئے ہو' یہاں تو ان کی بادشاہتیں ہیں' کیا تم اِن کو فتح کر لو گے؟ کہنے لگے کہ میں نے چند دن میں اِس قوم کو دیکھ لیا ہے' اِس کو فتح کرنا کچھ مشکل ہی نہیں ہے۔ کہنے لگا: او دیکھ کیا لیا ہے؟ کہنے لگے کہ دیکھ میں نے یہ لیا ہے کہ اِس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ دریا کے کنارے مکان بناتی ہے اور مکان کی پشت دریا کی طرف رکھتی ہے۔ جس قوم کی بدذوقی کی یہ کیفیت ہو' اُس کو فتح کرنا کیا مشکل ہے۔ کیا بات ہے ان لوگوں کی۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ انسانیت کی سطح پہ ہی نہیں آئی ہوئی۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو قربت تھی' یہ شاہین بچوں کو بھی سفید رنگ کا کوا بنا کر چھوڑ گئی ہے۔ وہ بدترین قسم کا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے گھرانے کی زندگی ہے۔

سسرال کے ہاں بیچاری عورت کی حالت زار

یہ اُن کے ہاں یہ کیفیت تھی کہ وہ لڑکی آتی اور جائنٹ فیملی سسٹم ہوتا تھا اور اُس کے اندر وہ بیچاری آتی تھی۔ یعنی وہ ایک ایک پیسے کے لیے ترس جاتی تھی۔ ہم نے ہندوؤں کو دیکھا ہے' ہم تو اِن کے اندر رہ کر آئے ہوئے ہیں۔ یہ خربوزہ گھر والے کھا لیتے تھے اور اُس کے جو بیج ہوتے تھے' بہو اُسے دھوتی تھی اور اُس کے بعد اُن کو سکھاتی تھی۔ وہ سارا دن بیٹھی ہوئی خربوزوں کے بیج کی گریاں نکالتی رہتی تھی۔ ''لاہوریو! تسی اے گول باغ دیکھیا اے نا''۔ ❷ یہ شام کو یہاں باہر آ کر یہ گول باغ اچھے ہوتے تھے' شہر کی فصیل کے پاس اردگرد' شام کے وقت' یہاں جتنی نو بیاہتیاں تھیں' وہ بیٹھی ہوئی ہوتی تھیں اور خربوزوں وغیرہ کے بیج نکالا کرتی تھیں۔ یہ گریاں نکال کے بیچتی تھیں۔ اِس سے اُن کو کچھ چار پیسے ملتے تھے تو اِس کا صابن خریدتی تھی۔ وہ لالہ جگت ناتھ کی بہو تھی' اُس کے پاس ڈھیر ہوتے تھے۔ اُن کو گھر میں سے پیسہ نہیں ملتا تھا۔ وہ میاں کے پاس نہیں ہوتا تھا تو اِس کو کس نے دینا ہے!!

---

❶ ظہیر الدین محمد بابر (1530-1483) ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی۔

❷ اے اہل لاہور! آپ نے یہ گول باغ دیکھا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک میاں بیوی کا گھر آزاد ہونا چاہیے

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ کیا زندگی تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ ورنہ اگرچہ قرآن نے یہ بات تصریحاً تو نہیں کی' ایک آیت میں ایک بات ہے۔ قرآن چاہتا یہ تھا کہ میاں بیوی کا Independent (آزاد) گھر ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے بہت پہلے لکھا تھا' غالباً طاہرہ کے نام خط میں لکھا تھا کہ کسی نے کہا تھا کہ بیٹا جوان ہو گیا ہے اور شادی کرنی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ایک اصول یاد رکھنا جس دن یہ معاشی طور پہ آزاد ہو جائے گا' اپنی کمائی آپ کرنے لگے گا' اُس دن اُس کی شادی کرنا' اُن کو الگ کر دینا' بڑی خوشگوار زندگی رہے گی۔ قرآن میں ایک مقام پہ یہ آتا ہے۔ وہاں یہ ہے کہ فلاں کے گھر سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں' فلاں کے گھر سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اُس میں یہ بات ہے کہ اپنے ماں باپ کے گھر سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ گویا یہ وہ زندگی ہے ورنہ بچے کی حیثیت سے تو وہ گھر میں سے کھائے گا۔ اور جب شادی ہو گئی اُس کی اپنی زندگی بن گئی ہے تو ویسے وہ ماں باپ کو اور سسرال کے ماں باپ کو دونوں کو ماں باپ قرار دیتا ہے' وہ رشتہ جوڑتا ہے لیکن وہ معاشی طور پہ اُن کو آزاد رکھتا ہے۔ اور اِسی لیے وہ زندگی بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ اُن کے تعلقات ساس بہو وغیرہ کے آپس میں بڑے خوشگوار ہوتے ہیں لیکن جہاں یہ صورت ہو کہ لڑکی وہاں رہنے پہ مجبور ہو اور پیسہ اوپر والوں کے ہاتھ میں ہو' وہ میاں بھی مجبور ہو یا اگر وہ کماتا ہے تو وہاں آ کر وہ خرچہ دیتا ہے' اُس سے زیادہ مجبور تو یہ جو گھٹن کی زندگی ہے اُس میں کشادہ نہیں پیدا ہو سکتی۔

گھریلو زندگی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی تعلیم

یہ چیز تھی جو وہاں پہ اُنہوں نے کہا تھا۔ اُس دور میں کہا کہ اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِکَ (28:27) بھئی! بات یوں رہے گی کہ آٹھ سال تک تمہیں یہاں میرے ہاں رہنا ہوگا' کام کرنا ہوگا۔ اگر تم آٹھ کی بجائے دس پورے کر دو تو یہ تمہاری خوشی ہے۔ وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْکَ (28:27) اور یاد رکھو! میں اُن میں سے نہیں ہوں کہ تمہاری مجبوری سے کوئی فائدہ اٹھاؤں' تم پہ کوئی سختی کروں' تمہیں کسی طرح سے مشقت میں ڈالوں۔ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (28:27)۔ یہ لفظ صالحین پھر یہاں آ گیا۔ صالحین وہ ہے جو کسی کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھائے۔ وہ تمہاری مرضی ہے کہ آٹھ کے دس کر دو لیکن میں اُس میں تمہیں کچھ دونگا یعنی تمہارے کام کی اجرت بھی دونگا۔ اور تم مجھے ان شاء اللہ صالحین میں سے پاؤ گے۔ قَالَ ذٰلِکَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکَ (28:28) موسیٰ نے کہا کہ تمہارے اور میرے درمیان معاملہ ٹھیک ہے۔ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ (28:28) ان میں سے جونسی بھی مدت میں چاہوں پورا کرونگا' مجھ پہ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

وَ اللّٰہُ عَلٰی مَانَقُوْلُ وَکِیْلٌ (28:28)۔ یہ بات دونوں میں ہورہی ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ہم نے بات کی ہے' اب شہادت ہونی چاہیے۔ کہنے لگے اور تو کوئی ہے نہیں' وہ اوپر ایک شاہد ہے یہاں علٰی ما نقول کہا۔ یہ نہیں کہا کہ جو میں کہتا ہوں اُس پہ خدا شاہد ہے بلکہ یہ کہا کہ جو ہم کہتے ہیں اُس پہ خدا شاہد ہے۔ دونوں کا مشترکہ گواہ بنا دیا۔ اور مشترکہ گواہ ہی عادل ہوسکتا ہے ورنہ میرا گواہ اور ہو' دوسرے کا گواہ اور ہو تو پھر وہ میری کہے گا' وہ اُس کی کہے گا۔ وَ اللّٰہُ عَلٰی مَانَقُوْلُ وَکِیْلٌ (28:28)۔ ایک مشترکہ شاہد ہے۔ فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ (28:29)۔ اب یہ بات آگے آ گئی۔ یہ مدت پوری ہوگئی۔ یہ اُس دوران میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔ مویشی چرایا کرتے تھے۔ حضرتِ شعیبؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ وہی تھے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے بڑا صحیح کہا ہے:

اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

چرواہے کی شکل میں نبوت کی ابتدائی زندگی

عزیزانِ من! یہ بکریاں چرانے والی بات بڑی عجیب ہے۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے' بڑا ہمت طلب مرحلہ ہوتا ہے۔ پوچھو نہیں' کہیں باہر جا کے دیکھیے وہ جو بڑے میاں وہاں ہوتا ہے' اُس بیچارے کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اِدھر بھاگے' اُس کو لایا ہے' وہ اوپر چڑھ گئی۔ یہ ٹھیک ہے لاٹھی اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن کسی کو زور سے مارتا نہیں ہے ورنہ ہر لٹھ والا جو ہے اُس کی مرضی کے خلاف کوئی نکل جائے تو ٹانگ توڑ کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ بکری کی ٹانگ نہیں توڑتا۔ وہ جانتا ہے کہ اِس کی ٹانگ ٹوٹی تو میرا ہی نقصان ہوگا۔ بکریاں چرانے والا اس لیے صحیح راستے پہ چلتا ہے کہ وہ اپنے لٹھ کا استعمال بھیڑیئے کے لیے رکھتا ہے لیکن اپنی بکریوں کے لیے لٹھ استعمال نہیں کرتا۔ یہ اُس سے صرف اُن کو دھمکاتا ہے لیکن دن بھر وہ جو کہا ہے کہ بکری اگر بیس میل چلتی ہے تو وہ چالیس میل چلتا ہے۔ تنگ نہیں پڑتا' زچ نہیں ہوتا' کبھی یہ نہیں ہوتا کہ اچھا تم اگر ادھر بھاگنا چاہتی ہو تو جاؤ مجھے کیا سیاپا! ختم!! مجھے کیا!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت سے مصر کے گورنر کی سزا کی نوعیت

عزیزانِ من! بکریاں پالنے کی بات میں بڑی تربیت ہوتی ہے۔ مصر کے گورنر سے ایک ہی دفعہ تھوڑی سی کوتاہی یا سرکشی ہوئی تھی تو حضرتِ عمرؓ (581-644/45 AD) نے اُسے بلا لیا تھا۔ معلوم ہے کیا سزا دی تھی؟ کہا تھا کہ یہ لے لیجیے: یہ سو بکریاں ہیں' تین مہینے تک ان کو ذرا چرا کے آیئے پھر میں دیکھونگا کہ آپ میں اتنی برداشت' ہمت اور صبر کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں کہ ذرا سی کسی نے خلاف ورزی کی اور آپ نے لٹھ چلا دی۔ میں دیکھونگا' بکریاں پوری کی پوری لونگا۔

مملکت کے حاکم کے لیے راعی کے لفظ کا استعمال

عزیزانِ من! یہ تربیت تھی۔ بکریاں چروانی چاہئیں۔ اسی لیے تو ان کے لیے لفظ ہی رعایا ہے۔ رعایا کے معنی ہی بکریاں ہیں۔ حاکم کو راعی کہتے ہیں یعنی بکریوں کا گڈریا کہتے ہیں' رکھوالا کہتے ہیں۔ بھیڑیا نہیں کہتے۔ تو اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر۔ کیا بات ہے اِس شخص کی! وہ ہر گڈریا نہیں' وہ تو دوسروں کی بکریاں چرا کر لے آئے گا۔

اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اور وہ جو پہلا قدم تھا' وہ بکریاں چرانے والا شبانی کا' وہ ختم ہوتا ہے اور اب ہمارے سامنے اگلا قدم آ جاتا ہے۔ وہ ایک اندھیری رات میں ٹھنڈ تھی' بکریاں لیے ہوئے' بال بچوں کو ساتھ لیے ہوئے آ رہا تھا۔ رات تاریک تھی' راستہ بھول گئے' راستہ دکھانے والا کوئی نہیں تھا' بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ موسیٰ نے کہا کہ ٹھہریئے' مجھے وہاں دور ایک آگ سی روشن نظر آتی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں۔ اگر آگ ہے تو آدمی ہوگا تو اُس سے پتہ پوچھ لونگا' یا کم از کم وہاں سے کچھ آگ کا شعلہ ہی لے آونگا تا کہ تم لوگ جو یہاں سردی میں ٹھٹھر رہے ہو' آگ تو بنا لیں گے۔ آدمی نہ ملا تو آگ تو مل جائے گی۔ کہا کہ میں جاتا ہوں۔

ہم ذرا اگلے درس تک توقف کرتے ہیں کہ وہاں پھر کیا ماجرا پیش آیا کیونکہ آج وقت ہو گیا ہے۔ ہم سورۃ القصص کی آیت 28 تک آ گئے' 29 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: سورۃ القصص (آیات 29 تا 30)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1978ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 29 سے ہو رہا ہے: (28:29)۔

طور کے دامن میں حضرت موسیٰ کے احوال

حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کی داستان مسلسل چلی آ رہی ہے۔ یہ بڑی ولولہ انگیز، بڑی بصیرت افروز داستان ہے۔ یہ حضرتِ موسیٰ کی نبوت سے پہلے کی زندگی ہے۔ اُس میں ہم اُس مقام پہ پہنچ گئے تھے کہ جہاں حضرتِ موسیٰ مدین میں اپنے معاہدہ کے مطابق آٹھ سال یا دس سال کی مدت پوری کرنے کے بعد پھر وہاں سے چل پڑے۔ رات کا وقت ہے، تاریکی ہے، سردی ہے۔ اپنے اہل کے ساتھ کوہِ طور کے دامن میں وہ پہنچے ہوئے ہیں، وہاں فروکش ہیں۔ کوئی راستہ بتانے والا نہیں ہے اور سردی ہے اُس کے لیے بھی کچھ تاپنے کا سامان نہیں ہے۔ تو اِس مقام پہ ہم پہنچتے ہیں اور بات شروع ہوتی ہے۔ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا [1] (28:29)۔ میں ان آیات کے عام مروجہ معنی پہلے بتاتا جاؤنگا اور پھر عرض کرونگا کہ کونسا مقام ہے جہاں اب ہم پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ مقام اقبالؒ ((1877-1938) نے لکھا ہے

---

[1] جب موسیٰ نے اپنی مدتِ ملازمت پوری کر لی تو اپنے اہل کو ساتھ لے کر مدین سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے (رات کے وقت) طور (پہاڑ) کی جانب دور سے آگ دیکھی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔890)۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و با یزید ایں جا

بڑا مقامِ ادب ہے۔ عرش سے بھی نازک مقام کہ جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ بھی آتے ہیں، سو دم بخود آتے ہیں۔ اُس مقام پہ ہم پہنچے ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰ کو مقام نبوت سے سرفراز کردیا گیا

عزیزانِ من! یہ حضرتِ موسیٰ کو پہلی دفعہ وحی ملنے کا مقام ہے، نبوت کا مقام ہے۔ وحی کے متعلق جستہ جستہ تو سینکڑوں [1] مرتبہ بات ہوئی ہے۔ یہ داستان بھی پہلے آ چکی ہے، لیکن اِس کی اہمیت اتنی ہے کہ جہاں جہاں بھی یہ قرآن میں آئے یا آئے گی، میں سمجھتا ہوں کہ وہاں اس حقیقت کا دہرا دینا مفید رہے گا۔ جن کے سامنے پہلے بات آ چکی ہے اُن کے لیے مزید توثیق و تجدید ہو جائے گی۔ جو پہلی دفعہ سنیں گے اُن کے ذہن میں بات آ جائے گی کہ یہ وحی ہوتی کیا تھی، اس کی اہمیت کیا تھی، یہ ملتی کیسے تھے، صاحبِ وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ یہ بڑے اہم مقام ہیں۔

اُن آیات کا تو میں نے عرض کیا ہے کہ میں مروجہ ترجمہ ہی پیش کرونگا اور اُس کے بعد یہ عرض کرونگا کہ یہ کتنی گہری بلند عمیق حقائق پر مشتمل آیات ہیں۔ کہا کہ "جب حضرتِ موسیٰ اپنی میعاد کو وہاں پورا کر چکے، تو اپنے اہل کے ساتھ وہ طور کی وادیوں میں آئے اور وہاں اُنہوں نے اوپر پہاڑ کی چوٹی پر آگ کا کچھ نشان دیکھا"۔ **قَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ** (28:29)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ چیز ہے کہ جہاں آگ ہو، وہ ہوتی تو آگ ہی ہے لیکن وہ اِس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہاں کہیں کوئی انسان ہوگا، حیوانات آگ نہیں جلا سکتے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم بچے ہوئے ہیں کہ وہ آگ نہیں جلا سکتے۔ یہ جو چیز تھی جو میں نے کہا ہے کہ آگ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کہ وہاں کوئی آدمی ہوگا، یہ کسی اور چیز کی علامت ہوتی ہے، اِسی کو عربی زبان میں آیت کہتے ہیں۔ کہا کہ میں جاتا ہوں یا تو وہاں کوئی آدمی مل جائے گا، اُس سے میں راستے کا پتہ نشان پوچھونگا اور اگر آدمی نہ ہوا، آگ ہوئی تو پھر تھوڑی سی آگ ہی لے آؤنگا کہ تم اُسے تاپ کر رات تو کاٹو۔ اِس غرض کے لیے وہ وہاں گئے۔ **فَلَمَّاۤ اَتٰٮهَا نُوۡدِىَ مِنۡ شَاطِیٴِ الۡوَادِ الۡاَيۡمَنِ فِى الۡبُقۡعَةِ الۡمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنۡ يّٰمُوۡسٰۤى اِنِّىۡۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ** (28:30)۔ وہاں جب پہنچے تو اُنہیں وادی کے دائیں طرف سے یا مبارک طرف سے ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، رب العلمین۔

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005۔

حضرت موسیٰ کی طرف وحی کے سلسلہ میں پیش کیے جانے والے عام مروجہ تراجم کی نوعیت

جو عام بات ہے وہ میں عرض کرتا ہوں۔ آواز آئی کہ اے موسیٰ ! اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ (28:30)۔عربی جاننے والے جانیں گے کہ یہ ''انی'' اور اُس کے بعد ''انـا اللـه'' کے اندر کیا چیز ہے۔ آواز آئی کہ ''میں اللہ ہوں'' اور پہلی ہی صفت وہی ہے جہاں سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے یعنی ''ربوبیتِ عالمینی''۔ رب العلمین ہوں۔ تو اپنے پہلے تعارف میں ہی بتا دیا کہ یہ کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ یہ اُس کی آواز ہے جو کائنات کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ تمہیں بھی ہم نے اسی لیے بلایا ہے کہ ربوبیت کے راستے میں کچھ روڑے اٹکے ہوئے ہیں' اُنہیں صاف کرنا ہے۔ ربوبیتِ عالمینی پہلے کہا کہ میں وہ ہوں۔ تو اب جو یہ بات ذہن میں ہو اور یقین ہو جائے کہ یہ میری پرورش کرنے والا ہے' نشو ونما دینے والا ہے' ربوبیت کرنے والا ہے اُس سے خوانخواہ ایک پیار پیدا ہو جائے گا' اُنس پیدا ہو جائے گا' محبت پیدا ہو جائے گی' تو رب العلمین کہہ کے اپنا پہلا ہی تعارف کرایا ہے۔ اب یہاں یہ بات ہوئی ہے کہ وہ وہاں پہنچے ہیں تو ایک آواز آتی ہے۔

خدا کی طرف سے آواز آنے کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے

تو یہ جو چیز ہے جسے ہم کہہ رہے ہیں کہ ''آواز آتی ہے''۔ قرآنِ کریم نے خود ہی اسے کہا ہے کہ ''یہ ہماری وحی تھی''۔ جب وحی کی بات ہوگی تو اُس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جسے ہم آواز کہتے ہیں وہ بالکل ہی وہی ہے جیسے ہماری یہ Physical (طبعی) آواز ہوتی ہے جیسے میری آواز ہے جو آپ تک پہنچ رہی ہے۔ اس آواز کے لیے تو بہرحال ایک حلق کا ہونا' ایک زبان کا ہونا ضروری ہے' دوسری طرف ایک کان کا ہونا ضروری ہے' کان بھی سننے والا ہونا چاہیے۔ اسی طرح سے جب اللہ کہتا ہے کہ میں کلام کرتا ہوں یا قال اللہ تعالیٰ' اللہ نے کہا تو اُس کے لیے ہمارے ذہنوں میں تو یہی ہے کہ کہنے والے کا ایک حلق ہوتا ہے' زبان ہوتی ہے' الفاظ ہوتے ہیں' وہ باہر آتے ہیں اور دوسرا اُن کو سنتا ہے۔ وحی کی کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ جسے ہم Physical یا طبعی چیز کہتے ہیں وہ یہ بات نہیں ہوتی۔ خود عربوں کے ہاں یہ جو لفظ وحی کا ہے اُس کے معنی ہیں ''خفیف سا اشارہ''۔ بات کچھ اشارے کی ہوتی ہے اور اشارہ بھی ایسا کہ کوئی دوسرا غیر از نبی اُس کو بھانپ نہ سکے' سمجھ نہ سکے۔ اُن دونوں کے مابین کوئی بات ہوتی ہے۔ نہ تو وہ آواز ہوتی ہے جو زبان سے نکلتی ہے' نہ وہ کانوں میں آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ کہا ہے کہ وحی ہے جسے جبریل محمد ﷺ کے قلب پر نازل کرتا ہے۔ یہ بات بڑی صاف ہے۔ جو چیز براہِ راست قلب پر نازل ہوتی ہے' اُس میں اس قسم کے الفاظ یا سننے والے کان کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ تو قلب پر نازل ہوتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی کہ جہاں یہ کہا ہے کہ آواز آئی اور ہم نے کہا کہ ہم اللہ ہیں' رب العلمین ہیں' تو اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ

اِس قسم کی آواز تھی جیسے انسانوں کی آواز ہوتی ہے اور حضرتِ موسیٰ کے کان میں یہ آواز آئی تھی۔ یہ وحی تھی۔ انداز کہنے کا یہ ہے کہ یہ حضرتِ موسیٰ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا۔ اب یہ جو ساری چیزیں ہیں کہ وہاں آگ کا لشکارا دیکھا' وہ ایک جلوہ تھا اور اُسے دیکھ کر موسیٰ بیہوش ہو گئے' خدا سے ہمکلامی ہوئی' اِدھر سے یہ باتیں کرتے ہیں۔ وہ تو ہمارے ذہنوں میں یوں آتا ہے جو آمنے سامنے دو آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہیں اور اگر آمنے سامنے نہ ہوں' وہ پسِ پردہ ہوں' یہ سامنے کھڑے ہوں اور آپس میں اس قسم کی باتیں ہو رہی ہوں۔ ہمارے ذہنوں میں یہی کچھ آتا ہے۔

انسانی علم از خود حاصل کیا جاتا ہے جب کہ وحی عطا ہوتی ہے

یاد رکھیے! وحی کے متعلق میں کئی دفعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انسان کے علم حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں' وہ ہیں: تجربہ' مشاہدہ' مطالعہ' تعلیم۔ ان چیزوں سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ پھر اُس علم سے جو معلومات اِس کو ملتی ہیں جن کو ہم Information کہتے ہیں' ان سے وہ اپنے ذہن کی رو سے نتائج پہ پہنچتا ہے۔ انسانی علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ خارج سے یہ معلومات حاصل کرے' اپنے ذہن سے اُن پہ غور و فکر کرے اور پھر کسی نتیجے پر پہنچے۔ یہ ہیں ذرائع علم۔ ان میں کہیں استثنا نہیں ہوتی۔ پہلے انسان کو بھی اِس کی ضرورت تھی' آج آخری انسان کو بھی ان ذرائع کی ضرورت ہے۔ کوئی دوسرا ذریعہ علم کا ہوتا ہی نہیں ہے لیکن اِس میں صرف ایک استثنا کی گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ خدا کی طرف سے براہِ راست کسی ایک انسان کو علم دیا جاتا تھا' جس میں نہ تو اُس کے یہ حواسِ خمسہ کام دیتے تھے کہ اُس کو انفرمیشن یا اطلاعات یا خبریں باہر سے ملتی تھیں' نہ ہی اُس کی اپنی فکر کا کوئی دخل ہوتا تھا کہ اُس کے بعد وہ خود کسی نتیجہ پہ پہنچے۔ وہ براہِ راست علم خدا کی طرف سے ملتا تھا۔ یہ کیسے ملتا تھا؟ غیر از نبی اس چیز کے متعلق سمجھ نہیں سکتا۔ ہمارے لیے تو ذرائع علم یہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ اگر اُس میں معلومات نہ آئیں' ہمارے حواس یعنی سننا دیکھنا بولنا چھونا سونگھنا کام نہ کرے تو ہمیں معلومات حاصل ہی نہیں ہو سکتیں اور اُس کے بعد اگر ہماری فکر کام نہ کرے' شعور کام نہ کرے' دماغ کام نہ کرے' ہوش کام نہ کرے تو ہم ان اطلاعات کے باوجود کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ سکتے۔ انسانوں کے لیے کوئی اور ذریعہ علم ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ ایک علم تھا جس میں اِن میں سے کسی چیز کو دخل نہیں تھا اور براہِ راست خدا کی طرف سے علم ملتا تھا۔ اب اِس کے متعلق کچھ زیادہ بحث کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو ملتا تھا وہ مل چکا۔ آخری مرتبہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعے خدا کے علم دینے کا جو طریق تھا وہ ختم کر دیا۔ آخری مرتبہ جو علم دیا اُسے محفوظ طریقے پر قرآنِ کریم کے اندر مندرج کر دیا اور وہ قرآن قیامت تک کے لیے اب ہمارے پاس وحی کا ضابطہ ہے جو آخری مرتبہ انسانوں کی طرف کی گئی۔ لہٰذا آج یہ بحث تو کوئی عملی حیثیت نہیں رکھتی کہ وہ وحی کیسے ملتی تھی اور اُس کی کنہ و حقیقت کیا تھی لیکن یہ بات سمجھنے کی ہے کہ غیر از نبی سمجھ نہیں سکتا کہ وہ کیسے

ملتی تھی اور کس طرح سے وہ آتی تھی۔

وحی کرتی کیا تھی؟ سمجھنے والی یہ ایک اہم چیز ہے۔ انسان نے اس دنیا میں رہنا ہے' اُس نے اس رہنے سہنے کا کوئی طریق اپنے لیے وضع کرنا ہے کہ وہ مطمئن رہے' پرامن رہے' اُس کے حالات خوشگوار ہوں۔ پہلے دن سے انسان اس تلاش میں چلا آ رہا ہے کہ اِس قسم کی زندگی کیسے بسر کی جائے۔ اُس نظام کو اُس طریق کو' تلاش کرنے کے لیے عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہن سے ایک بات کو سوچتا ہے کہ یہ طریق ٹھیک ہے۔ اُس پہ وہ چلتا ہے۔ سالوں ہی نہیں بلکہ صدیوں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد' خون کی ندیاں تیرنے کے بعد' آگ کی خندقیں پھلانگنے کے بعد' اتنی اتنی عظیم لڑائیاں لڑنے کے بعد' انسانیت کی ساری تاریخ اسی چیز کی ہے کہ وہ سب کچھ کرنے کے بعد اِس نتیجے پہ پہنچتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ طریقہ غلط ہے۔ جو ہم نے سوچا ہے وہ حل غلط ہے۔ پھر اُس کے بعد وہ عقل کسی دوسرے طریق کو لیتی ہے اور پھر اُس پہ چل نکلتی ہے اور اِسی طرح سے یہ سارے جتنے مراحل ہیں' طے کرتی ہے' مشکلات سے گزرتی ہے۔ آخر پھر کہتی ہے کہ نہیں صاحب! یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ پھر وہ ناکام رہ جاتی ہے۔

انسانیت کی پوری تاریخ عقلِ انسانی کے تجرباتی طریق کی داستان ہے

پوری انسانیت کی تاریخ اگر وہ چھ ہزار سال بھی لے لیں جیسا کہا جاتا ہے' عقلِ انسانی کے انہی Trial & Error (سعی وخطا) یا تجرباتی طریق کی داستان ہے۔ ایک طریق یہی لے لیجیے کہ صاحب! حکومت کس انداز کی ہونی چاہیے۔ پہلے دور کے انسان نے آپس میں وہ پروہت یا پنچائیت کا سسٹم ایجاد کیا' پھر اُس نے خاندانی سسٹم ایجاد کیا' پھر بزرگ خاندان کو اپنے میں سے بڑا بنایا۔ آگے بڑھے تو پھر راجا یا بادشاہ کا تصور آیا۔ یہ کہنے کو تو میں یونہی کہے چلا جاتا ہوں' ایک ایک مرحلے سے اگلے مرحلے میں پہنچنے تک کئی صدیاں گزر جاتی تھیں۔ پچھلا مرحلہ ناکام ثابت ہوتا تھا' پھر اگلے مرحلے تک ذہن پہنچتا تھا۔ پہنچتا رہا۔ بادشاہت کا زمانہ آیا' ڈکٹیٹروں کا زمانہ آیا' انسان کے مار کھاتے کھاتے دوسو سال پہلے فرانس میں انقلاب [1] آیا' جمہوریت کا ایک تصور پیدا ہوا۔ آج دنیا میں جمہوریت کا تصور چلا آ رہا ہے اور ساری دنیا اِس جمہوریت کے ہاتھوں تنگ آئی ہوئی ہے۔ ذہنِ انسانی پھر کسی اور راستے کو تلاش کر رہا ہے۔ عقل کا تجرباتی طریقہ یہ ہے۔ اس کا یہ بنیادی مسئلہ ہے اور اہم ترین مسئلہ ہے۔ عقلِ انسانی آج تک اس کا کوئی اطمینان بخش حل تجویز نہیں کر سکی۔ یہ طریقِ انسانی بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے' اِس میں بڑی لمبی لمبی مسافتیں ہوتی ہیں۔

---

[1] انقلابِ فرانس 1789

وحی انسانی مشکلات کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے: اقبالؒ

وحی کیا کرتی ہے؟ وہ پہلے ہی دن صحیح طریق بتا دیتی ہے۔ وحی نے یہ بتا دیا کہ حکومت کا انداز کیا ہونا چاہیئے' اُس کی شکل کیا ہونی چاہیے۔ اُس نے کہا کہ سوال یہ ہے ہی نہیں کہ اِس کی شکل اور اِس کی Form (ہیئت) کیا ہونی چاہیے۔ سارا سوال یہ ہے کہ کچھ غیر متبدل ابدی اقدار (Permanent Values) ہیں۔ اُن اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا اور دوسروں سے زندگی بسر کرانا' اِسے حکومت کہتے ہیں۔ جس طریق سے بھی یہ ہو جائے وہی طریق صحیح ہے۔ چار فقروں میں سارا مسئلہ حل کر کے بتا دیا کہ سوال یہ نہیں ہے کہ کس طریق سے یہ ہو۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ ایک انسان کو یا انسانوں کی کسی جماعت کو قانون سازی کا حق نہیں کہ وہ دوسروں سے اپنے بنائے ہوئے قوانین کو منوائے۔ اُس نے کہا کہ یہ بھی انسانوں کی اطاعت ہے' یہ بھی غلط ہے۔ کچھ اصول ہیں' کچھ اقدار ہیں جو خدا نے دیئے ہیں۔ وہ غیر متبدل ہیں' ابدی ہیں' تمام انسانوں پہ یکساں طور پہ لاگو ہونگے۔ اُس میں نہ بادشاہ بچے گا' نہ President (صدر) بچے گا' نہ وزیرِ اعظم بچے گا۔ سب پہ یکساں طور پہ اُن کا اطلاق ہوگا۔ یہ اقدار Permanent (مستقل) ہونگی' کوئی بدل نہیں سکے گا' اضافہ نہیں کر سکے گا' منسوخ نہیں کر سکے گا۔ اور وہ اقدار وحی کے ذریعے دیدیئے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنا اور دوسروں سے زندگی بسر کرانا' یہ ہے مقصد انسانوں کے اجتماعی زندگی بسر کرنے کا۔ جس طریق سے بھی تم یہ کر لو' وہ ٹھیک ہے۔ وہ بات جو چھ ہزار سال میں آج تک طے نہیں پائی' وحی نے حل کر دی۔

وحی کا ماحصل یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں

ہمیں تو خیر چھوڑ دیجیے' ہم تو اُس دنیا میں شامل نہیں' ہم تو قبرستانوں میں بسے ہوئے ہیں' مُردوں کی ہماری زندگی ہے' وہ جو زندہ قومیں ہیں وہ آج چلا رہی ہیں کہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ یہ طریقہ تلاش کر رہے ہیں کہ یہ کیسے ہو۔ حضرتِ نوحؑ کا بھی زمانہ اگر لے لیجیے تو چھ ہی ہزار سال پہلے بتا دیا تھا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ پہلے ہی دن وحی نے یہ بات بتا دی جو عقل چھ ہزار سال میں ابھی تک وہاں نہیں پہنچی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ Trial & Error (سعی وخطا) سے مار کھا کھا کر' اِس طرح سے ہڈیاں تڑوا کر عقل بھی ایک دن یہاں پہنچ جائے لیکن کتنا لمبا عرصہ' کتنی قربانیاں' کتنی مشقتیں' کتنی محنتیں انسانیت کو اٹھانا پڑیں۔ قرآن یہی بات کہتا ہے کہ اگر یہ اتنی سی بات آج مان لو جو ہم کہہ رہے ہیں تو یہ سارا جو کچھ تم نے اتنا لمبا بکھیڑا کر رکھا ہے' اِس کی تمہیں ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہیں آخر الامر بھی یہیں آنا ہے تو پہلے ہی دن کیوں نہ آ جاؤ۔

آنچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

پہنچنا تو عقل نے بھی یہیں ہے لیکن اتنی خرابی کے بعد جو پہنچنا چاہتے ہو تو پہلے ہی دن کیوں نہیں پہنچ جاتے۔ وحی کرتی یہ ہے۔

فرمودۂ اقبالؒ: انسانی کوششوں اور وحی کے متعلق

اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں وحی کا طریقِ کار یہ کام کرتا ہے:

It economises human efforts.

یہ بڑا عمدہ فقرہ ہے۔ یہ انسانی Efforts (کوششوں) کو Economise (کفایت شعار) کر دیتی ہے۔ اُس میں وقت کی بچت ہو جاتی ہے' اس میں غایت ہو جاتی ہے۔ وہ جو بچوں کے حساب کی کتاب کے پیچھے جواب لکھا ہوا ہوتا ہے' وہ بچوں کی محنت کو بچا دیتا ہے۔ وہ سوال کو حل کرتے ہیں اور اُس کے بعد وہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ جواب اُس کے مطابق مل گیا ہے۔ اگر مل گیا ہے تو پھر اگلا سوال۔ اور اگر کوئی کتاب ایسی ہو جس میں سوالات تو دیئے ہوں اور وہ جوابات کا Chapter (باب) اُس میں نہ ہو تو بچہ کبھی یقینی طور پہ کہہ نہیں سکتا کہ میرا سوال صحیح ہے یا غلط ہے۔ وہ تذبذب میں رہے گا' بار بار سوال نکالے گا' کوئی جگہ ایسی نہیں ہوگی جو بتا سکے کہ جواب صحیح ہے' اب آگے چلو۔

وحیٔ خداوندی ہر انسانی سوال کا جواب اپنے اندر لیے ہوئے ہے

وحی انسانی زندگی سے متعلق سوالات کی کتاب کے جوابات اپنے ہاں رکھتی ہے۔ یہ ہے وحی کا مقصد۔ یہ ہے جو وحی دیتی ہے۔ یہ ہے جو وحی کا مقصد ہے۔ جس انسان کے ذریعے سے وحی ملتی تھی' یہ بڑی اہم بات ہے' اُس کی زمانۂ قبل از نبوت کی کچھ خصوصیات ہیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
آگ لینے کو جائیں' پیغمبری مل جائے

یعنی ایسا رکھا ہوا تھا کہ یونہی وہ اللہ میاں بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے تھے۔ پیغمبری کا تاج ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کوئی ملتا نہیں۔ ''او جیہڑا پہلاں چلا گیا اوہدے سر دے اُتے رکھ دتا' چلو میرے گلوں بھار تے لتھا''۔[1] (معاذ اللہ) اندازہ لگائیے کہ ایک تو یہ ہستی'

---

[1] جو پہلے پہنچ گیا اسی کے سر پہ (تاج پیغمبری) رکھ دیا' چلو میرا بوجھ تو کم ہوا (معاذ اللہ)۔

یہ شخصیت، اُس دور کی پوری انسانیت میں کتنی برگزیدہ تھی کہ باقی تمام انسانوں کے ذرائع علم سے الگ مستثنیٰ اُس کو اس کے لیے مختص کیا جاتا تھا۔ اور پھر یہ بات نہیں تھی کہ اُس کو وحی مل گئی اور اُنہوں نے کہا کہ موج ہوگئی۔ اُس سے ایک تو عظیم انقلابی کام لینا ہوتا تھا۔ کیا اتنے بڑے عظیم منصب اور اتنے بڑے انقلابی مقصد کے لیے ایسے ہوتا تھا کہ جو پہلے آجائے اُس کے سر کے اوپر تاج رکھ دیا جائے؟ نگاہِ خداوندی نے انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ بڑا لمبا وقت لگتا تھا۔ ہم اپنی زبان میں بات کرتے ہیں۔ خدا کے لیے لمبا وقت اور تھوڑا وقت تو کچھ بات نہیں ہوتی لیکن اُس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ مجھے انتخاب کرتے ہوئے کتنا وقت لگتا تھا۔ یہی جو حضرتِ موسیٰ کے متعلق ہے، ذہن میں یہ ہے کہ وہ بکریاں چراتے چراتے وہاں گئے، بیوی بچے ساتھ تھے۔ ''پالا لگدا سی، ٹھرٹھر کردے سن، رات تو ہنیرا ہویا ہیگا سی، راہ کتھے لبھدا نہیں سی، اوتاں چڑھے۔ اوتھوں آواز آئی کہ پئی ٹھہر جا آگ بعد اچ لئیں پہلاں نبوت لیندا جا۔ اوناں کیہا ہونا کہ مینوں پالا لگن ڈیا اے، تہانوں نبوت دی پئی ہوئی اے''۔ [1] (معاذ اللہ)

منصبِ نبوت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! سورۃ طٰہٰ میں وہاں بھی یہی بات آئی ہے کہ جب اُنہوں نے کہا کہ موسیٰؑ! یہ ایک نبوت کا منصب ہے۔ موسیٰؑ جانتے تو تھے کہ نبوت کیا ہے۔ یہ تو اُس خاندان حضرت ابراہیم علیہ السلام میں سے چلے آرہے تھے۔ نبوت تو ان کو معلوم تھا کہ کیا ہوتی ہے۔ تو نبوت جیسا شرف، شکریئے کے لیے سجدے میں گر گئے کہ اتنا بڑا احسان مجھ پہ کیا جارہا ہے۔ کہا: موسیٰؑ! احسان کی بات کر رہے ہو تو یہ آج کی بات نہیں ہے، یہ تو تمہاری پیدائش کے زمانے سے شروع ہوئے تھے، تمہیں پتہ ہی نہیں تھا۔

حضرت موسیٰؑ کی تربیت اور آپ کا کردار خدا تعالیٰ کی نگاہوں میں تھا

حضرت موسیٰ جتنے ادوار اور منازل میں سے گزرے ہیں، وہ ساری گنائی گئیں۔ وقت نہیں اس لیے میں اُن کو نہیں دہراتا [2]: ساری منازل، پیدائش کے وقت سے لے کر یہاں پہنچنے تک کہ یہاں یہ کیا، یہاں یہ ہوا۔ ہر زندگی میں ہم تمہیں دیکھ رہے تھے کہ تمہارا Reaction (ردِّ عمل)، تمہارا کردار کیا ہے۔ ہم تمہارے Character (کردار) پہ نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر گوشے میں یونہی نہیں تھا کہ تم چلتے چلتے نکل آئے اور ہم نے تمہارے سر پہ تاج رکھ دیا ہے۔ یہ ہیں الفاظ: وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (20:40) موسیٰ! تم

---

1. سردی لگ رہی تھی تھر تھر کانپ رہے تھے، رات اندھیری تھی، کہیں راستہ ملتا نہیں تھا۔ وہ اوپر چڑھے۔ وہاں سے آواز آئی کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ آگ بعد میں لینا، پہلے نبوت لیتے جاؤ۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے آپ کو نبوت کی پڑی ہوئی ہے (معاذ اللہ)۔
2. اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء۔

تو بڑی کٹھالیوں میں سے نکل کے کندن بنے ہو۔ کیا بات ہے ان دو لفظوں کی! بار بار آگ میں ڈالنا اور بار بار نکالنا۔ کندن بنانے کے لیے جو کٹھالیاں ہوتی ہیں اُس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ کہا کہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد اگلی بات ہے کہ **ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی** (20:40) اے موسیٰ! اس طرح سے تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے ہو۔ ان کٹھالیوں میں سے گزر کر تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے ہو۔ **وَ اصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ** (20:41) اور پھر کہیں جا کر ہم نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے چنا ہے۔ آپ سوچیے کہ خدا کا اتنا بڑا کام، کیا وہ یونہی راہ چلتے کے سپرد کر دے گا؟ کیا الفاظ ہیں! موسیٰ! اتنی کٹھالیوں میں سے نکلے ہو، تمہیں تو پتہ ہی نہیں تھا۔ اُس کے بعد کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے تو پھر ہم نے تمہیں چن لیا۔ یہاں لنفسی کی کیا بات ہے! یعنی اپنے لیے چن لیا۔

انسانوں کی معاشرتی زندگی کا کنٹرول انسانوں کے ہاتھوں میں ہی ہوتا ہے

وہ خدا جو غنی عن العٰلمین ہے، اُسے کسی کی کیا احتیاج ہے لیکن وہ انسانوں کی دنیا میں اپنے کام انسانوں کے ہاتھوں سے کراتا ہے۔ اور اِس مقصد کے لیے نبی کو چنا جاتا تھا۔ یہ ہماری اپنی زبان میں بھی کہ کچھ اُس کا کام اٹکا ہوا ہوتا تھا، اُس کے لیے ایک نبی کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ ''ایہہ ساڈا کام کر جا''[1] لنفسی. کتنی پیاری چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ موسیٰ! پھر ہم نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے چنا۔ کام کیا تھا؟ یہ کہ **اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ وَ لَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ o اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی** (20:42-43) جاؤ، وہاں جا کے دیکھو کہ فرعون نے استبداد سے انسانیت کو کس طرح کچل کے رکھ دیا ہوا ہے۔ انسانیت تڑپ رہی ہے، پھڑک رہی ہے، بلک رہی ہے۔ کوئی اُس کی مدد کو نہیں پہنچ رہا۔ موسیٰ! یہ ہمارا ایک اٹکا ہوا کام تھا جس کے لیے ہم نے تمہیں تیار کیا تھا۔ جاؤ وہاں جا کے انسانیت کو اُس استبداد سے چھڑاؤ۔ یہ میرا کام ہے۔ خدا کا کام ہے۔ اُس کے لیے اِس کو تیار کیا جا رہا ہے۔ آپ نے سوچا کہ جو اتنا عظیم منصب ہوگا اور اُس کے لیے پروگرام خدا خود وضع کرے گا! یہ نبی اسے Carry out کرے گا، Execute کرے گا۔ پروگرام وہ دے گا۔ یہ ہوتے تھے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام۔ وہ وعظ کہنے والے نہیں ہوتے تھے۔ اب صورت یہ ہے کہ جس کو اس مقصد کے لیے چنا جاتا تھا، اُس کی نبوت سے پہلے کی زندگی جس میں وہ کٹھالیوں سے نکل رہا ہے، اُسے کچھ علم نہیں ہوتا۔

نبوت سے پہلے نبی کی زندگی کا کیریکٹر

نبوت کے بعد کی زندگی کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ احکام و اصول ملتے تھے اور وہ اِن کے اوپر عمل کرتا تھا اور رسول! کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا کے کسی حکم کی معصیت نہیں کرتا تھا۔ نبوت ملنے کے بعد کی زندگی تو یہ ہے۔ پہلی زندگی میں تو اُس کو

---

[1] یہ ہمارا کام کر جاؤ۔

کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ اے رسول! تم کل تک نہیں جانتے تھے کہ نبوت کیا ہوتی ہے' کتاب کسے کہتے ہیں لیکن اُس دور کی زندگی اُس کی کیسی ہوتی تھی۔ زندگی کے متعلق تو میں کئی بار دہرا چکا ہوں اور ہزار بار دہراؤں گا۔ عزیزانِ من! ایک ہی معیار ہے کہ جب ابھی وہ ہنوز بڑے نہیں بنے ہوتے اور عام انسانوں کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں تو وہ کیریکٹر ماپنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب انسان ذرا بڑا ہوتا ہے تو پھر تو بڑا محتاط ہو جاتا ہے۔ اُسے پتہ ہوتا ہے کہ ایک ایک شخص کی نگاہ مجھ پر ہے لیکن جب وہ ابھی عام انسانوں میں ہوتا ہے تو اُس زمانے میں اُس کو اس احتیاط کی ضرورت نہیں ہوتی' اُس کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اُس زمانے کا جو اُس کا کیریکٹر ہے' وہ ہے صحیح معیار انسان کے کیریکٹر کا کہ اُس دور میں کیسا تھا۔

آپ ﷺ نے اپنی چالیس سالہ زندگی بطور ثبوت پیش کی

یہ وہ چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ میں تھی۔ اپنے تمام مخالفین کے ہجوم میں جب وہ اتنی شدت پر اترے ہوئے تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ تم اپنے اس دعوے کا کوئی ثبوت پیش کرو کہ تمہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے' ثبوت پیش کرو کہ تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو، وہ مخالفین کا ہجوم یہ کہہ رہا تھا کہ بتاؤ' کیا ثبوت ہے؟ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے کیا ثبوت پیش کیا تھا۔ کوئی معجزہ نہیں دکھا دیا تھا۔ ثبوت پیش کیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) میں کوئی باہر سے نہیں آیا' اجنبی نہیں ہوں' میں نے تمہارے اندر چالیس سال کی زندگی بسر کی ہے۔ تم خود فیصلہ کر لو کہ یہ زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ نبی یہی بن سکتا ہے جو مخالفین کے ہجوم میں چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کہے کہ اس سے پہلے کی میری چالیس سال کی زندگی تمہارے اندر گزری ہے۔ دیکھو کہ وہ زندگی کیسی ہے۔ عزیزانِ من! جاتے جاتے یہ بات عرض کر دوں کہ آپ نے کسی کو بھی پرِ اعتماد سمجھنا ہو' دیکھنا ہو کہ وہ قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے یا نہیں تو اُس کی پہلی زندگی دیکھو کہ کس قسم کی گزری ہے۔ یہاں سے بات چلے گی۔ جو چالیس سال تک جھوٹا نہیں ہے' دغا باز نہیں ہے' فریب کار نہیں ہے تو اُس کے بعد بھی وہ ایسا نہیں ہوگا۔

نبی انسان کی افتادِ طبع زندگی کا انمول زیور ہوتا ہے

ہم جو روز مار کھاتے ہیں تو وہ اس لیے ہے کہ اس پیمانے سے ہم نہیں پرکھتے۔ اس پہلی زندگی میں یہ کیریکٹر تو ہمارے سامنے آ گیا لیکن اس شخص کی خود افتادِ طبیعت کیا ہوتی تھی جس کو یہ چنا جا رہا ہے۔ باقیوں میں سے وہ الگ کیسے ہوتا تھا۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ یعنی یہ بات کہ اُس کا کیریکٹر ایسا ہوتا تھا' وہ تو اُس کی ذات تک ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ ہوتا کس قسم کا انسان تھا۔ یہ وہ چیز ہے جس سے ہم خود دیکھ لیں گے کہ وہ چیز ہمارے اندر ہے بھی یا نہیں۔ اور یہی ہے وہ بڑی اہم چیز ہے۔ کہا یہ ہے کہ نبی کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وحی کیا ہوتی

ہے' کتاب کیا ہوتی ہے۔ یعنی وہ اِس کے لیے کچھ کوشش نہیں کر رہا ہوتا تھا کہ محنت سے' مشقت سے' مراقبوں سے' ریاضتوں سے' یہ چیز حاصل ہو جائے لیکن اُس کی طبیعت کی افتاد کیا ہوتی تھی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اور وہ یہ ہے جو قرآنِ کریم نے حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق بتایا ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (93:7)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ اور یہی ہے وہ معیار اور کسوٹی پر کھنے کی کہ انسان حقیقت تک پہنچ جائے گا یا جس راستے پہ چلا جا رہا ہے' اُسی پہ چلا جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ مروجہ تراجم کے آئینہ میں

اس آیت (93:7) کا ترجمہ ہمارے ہاں ہوتا ہے' اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ان ترجموں نے کیا کر دیا ہے: ''ہم نے تجھے گمراہ پایا اور تمہیں راستہ دکھا دیا''۔ یہ ترجمہ کر دیا کہ گمراہ پایا۔ یہ بڑا غلط ترجمہ ہے۔ اسی ایک لفظ کے اندر تو سارا راز پنہاں ہے۔ نبی بھی باقی انسانوں کی طرح اپنے معاشرے میں پیدا ہوتا تھا' اپنے ماحول کے اندر پرورش پاتا تھا۔

انسانی سیرت پر مختلف قسم کے اثرات کا وارد ہونا

یہ جسے جینز (Genes) کہتے ہیں' جو ماں باپ کے جرثومے ہوتے ہیں' جن سے یہ بچہ یعنی جنین بنتا ہے' اُن پر بھی اب تحقیق یہ کہہ رہی ہے کہ اِس بچے کے اندر اُن کے اثرات بھی موجود ہوتے ہیں۔ جہاں تک بچے کی طبعی افتاد یا Temperament یا طبیعت کا تعلق ہے' مزاج کا تعلق ہے' وہ تو آسانی سے یہ ڈاکٹر پہچان لیتے ہیں۔ کئی امراض ہوتے ہیں جو بچے میں ماں باپ کی طرف سے آتے ہیں۔ مزاج بھی وہاں سے آتا ہے۔ اب تو وہ یہ کہتے ہیں کہ کیریکٹر کے کئی Traits (خواص' گوشے) بھی اُسی سے آتے ہیں۔ اُس سے اگر نہ بھی آئیں تو جو ماحول ہوتا ہے' جس میں بچہ تعلیم حاصل کرتا ہے' پرورش پاتا ہے' تربیت حاصل کرتا ہے' اس سے بھی آتے ہیں۔ یہ جو اِن کے ہاں کے عمرانیات کے ماہر (Sociologists) ہیں وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے تین سال کی عمر میں جو کچھ بچے نے باقی ساری عمر میں بننا ہوتا ہے' وہ بن چکا ہوتا ہے۔ اس ابتدا کا یہاں تک اثر ہوتا ہے۔ پھر اُس کے بعد وہ آگے چلتا ہے تو اِسی ماحول میں چلتا ہے' اُنہی کے اثرات ہوتے ہیں' وہی اُس کے عقائد ہوتے ہیں' وہی اُس کے تصورات ہوتے ہیں' جس ماحول میں وہ پرورش پاتا ہے۔ سب انسانوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

نبی کی شخصیت اپنے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے

کسی ماحول میں ایک ایسا انسان پیدا ہوتا ہے جو کچھ اُس ماحول میں ہو رہا ہوتا ہے' جو عقائد متوارث آ رہے ہوتے ہیں' جو تصورات رائج ہوتے ہیں' وہ اُن سے مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ وہ اُن سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے' وہ کونسا

راستہ ہے' وہ کونسی حقیقت ہے' جس سے اطمینان حاصل ہوگا' وہ اُسے معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ہے خصوصیت اس انسان کی۔

ضــآلّا کے معنی ہوتے ہیں ''تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھرنے والا''۔ یہ ہے اُس شخص کی بنیادی شرط جس کو آخر میں جا کر حقیقت ملے گی کہ جو کچھ موجود ہے' وہ اُس موجود سے مطمئن نہ ہو' وہ اُسے ایسے ہی نہ قبول کرلے۔ ایسے ہی' اُسی طرح سے ہی' قبول کرنے کو تقلید کہا جاتا ہے اور یہ حیوانات کا شیوہ ہے۔ حیوان اپنے ماحول کا پیدا کردہ ہوتا ہے' ماحول سے باہر جا نہیں سکتا۔ انسان کی بھی اگر یہ کیفیت ہے کہ جو کچھ اُس کو وراثت میں ملتا ہے' ماحول میں ملتا ہے' ابتدائی تعلیم میں ملتا ہے' وعظ و نصیحت سے سنتا ہے' اُس پہ وہ مگن ہوجاتا ہے' مطمئن ہوجاتا ہے تو یہ حیوان کی زندگی ہے' تقلید کی زندگی ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اُسے ضــآلّا ہونا چاہیے کہ جو ہو رہا ہے' حاضر و موجود ہے' وہ اُس پہ مطمئن نہ ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ اب دو چیزیں میرے سامنے آتی ہیں: جو ہو رہا ہے وہ اس سے مطمئن نہیں اور کیا ہونا چاہیے یہ اس کے سامنے نہیں' اس لیے وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہے۔

ذہنی جمود اَن گنت تصوراتی خداؤں کو جنم دیتا ہے

Whitehead ہمارے دورِ حاضر کا ایک بہت بڑا فلاسفر ہے۔ اُس کی کتاب Adventures of Ideas ہے۔ خود یہ کتاب کا ٹائٹل بتا رہا ہے کہ کیا چیز ہے۔ وہ اُس میں یہ کہتا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ بت پرستی (Idolatory) کسے کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! دیکھیے' یہ لوگ تنہا اپنی فکر کے زور سے کہاں پہنچتے ہیں۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں:

The key note of idolatry is contentment with the prevelant gods.

''مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا' اسے بت پرستی کہا جاتا ہے''۔ اور gods جمع کے صیغے میں کہا ہے۔ پتہ نہیں کتنے مروجہ خدا ہوتے ہیں۔ مروجہ خداؤں کے اوپر مطمئن ہو کر بیٹھے رہنا' اِسی کو تو بت پرستی کہا جاتا ہے۔ اور اُدھر میرے سامنے یہ عرب آجاتے ہیں' جو جاہل ہیں' بے علم ہیں' ان پڑھ ہیں۔ اُنہوں نے بت کے لیے لفظ عربی زبان میں ''وثن'' لیا ہے۔ اور اِس لفظ کے بنیادی معنی ''ذہنی جمود'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی اس زبان کا انتخاب قرآن کے لیے نہیں کیا تھا۔ اندازہ لگایئے یہ شخص[1] آج یہ کہہ رہا ہے کہ بت پرستی اِس کو کہتے ہیں۔ اس کے لیے لفظ ہی جمود ہوگا' جسے Contenment کہا جاتا ہے۔ یہ اطمینان نہیں ہے بلکہ یہ فریبِ نفس ہے۔

---

[1] White-head (1861-1974), a British philosopher and mathematician, one of the founders of mathematical logic.

فریب نفس اور اطمینان میں بنیادی فرق ہے

فریب نفس میں اور اطمینان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ فریب یہ ہے کہ کچھ تحقیق نہ کیا جائے اور جو چیز ہو رہی ہے اُس کے متعلق یہ ہو کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہے۔ یہ جو انداز ہے' قرآن اس انداز کی بڑی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ تقلید کے خلاف اتنی آیات ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بابا! جو میں تمہیں دے رہا ہوں' اِس پہ غور وفکر کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! جو کچھ ہمیں آبا وٴاجداد کی طرف سے ملتا چلا آرہا ہے' وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ ہم اُس پہ مطمئن ہیں' ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' دہائی مچا دی جاتی ہے کہ او کبھی غور وفکر نہ کرنا' ''ایمان تہاڈا جاندا رہوے گا''۔ [1] Prevelant Gods یعنی مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا' اِسے بت پرستی کہا جاتا ہے۔ ہونے والے نبی کی پہلی چیز جو خصوصیت بتائی ہے جس کا انتخاب عمل میں آنے والا ہے' وہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول' اپنے زمانے کے Prevelant gods (مروجہ خداؤں) کے اوپر مطمئن نہیں ہوتا۔ جو مطمئن ہوتا ہے وہ ضـــآلًا کی بات ہی نہیں ہوتی۔ اس کے اندر تلاشِ حقیقت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو یہ فرمایا کہ **وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی** (93:7)۔

ذہنی اضطراب کے سلسلہ میں ''معراج انسانیت'' کے چند ایک اقتباسات

''معراجِ انسانیت'' میری کتاب ہے۔ اس کا ایک باب ہے **وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا** اجازت چاہتا ہوں کہ اس کے کچھ تھوڑے سے اقتباس پیش کر دوں کہ اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ میں نے اِس میں لکھا ہے: ''قلب وادیٔ فاران یعنی ام القریٰ مکہ' اپنی تمام جاذبیتوں کے ساتھ' ہر عاکف و باد کے لیے مرکزِ قلب ونظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریم کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے' اس لیے طفلک و برنا وٴپیر' نزدو دور سے کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپنے والے سجدوں کے نذرانے لیے رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجع انام کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے مامور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز' جذبہ ہائے تعبّد وتذلّل سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ وتاز بہر نوہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو علم نہیں کہ اِس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اُس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے' جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کیے ہوئے ہے۔ اس کیف ومستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے' کوئی سیٹیاں بجاتا ہے' کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر (گھوم گھوم کو ذہن میں رکھیے یہ وہی ہے جسے طواف کہتے ہیں) سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے اُس کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زم زم کے کنارے بیٹھا جام اور

---

[1] تمہارا ایمان جاتا رہے گا۔

سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو اپنے صبرِ گریز پا اور رنجِ گراں نشین کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ اُدھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیان اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو مٹھی میں لیے ہوئے ہے۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرہ سے اُس کے طرۂ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اُس کی رگوں میں آتشیں انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے لیکن محفلِ عیش وطرب ہے یا میدانِ جنگ وجدل، ہر شخص پورے جذب وانہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر یوں مستغرق ہو جاتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جاسکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں گویا یہ چیزیں اُن کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں لیکن مکہ کی ان پُر ہجوم گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو اِن میں سے ہوتے ہوئے بھی، ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، خراش تراش، سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے، اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریق احسن کرتا ہے وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کوئی خلا محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے۔ اور کس طرح پُر ہوسکتا ہے۔ وہ مشاغل ومشارب جو اُس کی قوم کا جزوِ زندگی بن چکے ہیں، اس کے لیے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجودِ رقصاں لے کر حریمِ کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہ ان تابندہ گوہروں کو اُسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اُسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی چوکھٹ اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتی۔''

عزیزانِ من! یہی کیفیت مجھ پہ طاری ہوتی ہے جب میں نے یہ ''معراجِ انسانیت'' لکھی تھی۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ اقدس میرے جیسا انسان جب لکھتا ہے تو وہ یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ ''وہ جب ان محافل ومجالس میں اپنے لیے کوئی سامانِ تسکین نہیں پایا تو کبھی عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لیے ان علما اور مشائخ سے پوچھتا ہے کہ اُن کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اُسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے ایسے رنگین فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ آتا ہے''۔ اور میں نے لکھا ہے کہ ہر جگہ جاتا ہے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ ''اُسے کوئی دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش وخلش اور سوز وگداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر''❶

خدا سے یہ کہتا ہے کہ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ میں کسی دوسری دنیا کا پہلا آدم ہوں۔ اس قدر تنہا ہوتا ہے۔ میں اسی انداز میں لکھتا چلا گیا ہوں۔

رموزِ حیات کی جستجو کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق کارلائل کا بیان

اُس کے بعد میں نے کہا ہے کہ کارلائل (1795-1881) اپنی کتاب Heroes & Hero Worship میں جب وہ نبی اکرم ﷺ پر پہنچتا ہے تو وہ حضورؐ کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ اور وہ یہی کیفیت ہے: ''شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے: میں کیا ہوں؟ کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حرا اور سینا کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ چرخ چنبریں اور اس کے درخشندہ ستارے بھی کچھ جواب نہیں دیتے تھے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ ان کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی اُس وحی سے ملنا تھا جو اُس روح کو اپنا مسکن بنالے''۔ اور یہ وحی ابھی اِس کے پاس نہیں تھی۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا (93:7)۔ یہ عرب لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔

علامہ اقبال کی سوچ جمود کا شکار نہ تھی

عزیزانِ من! بات چھڑ گئی ہے تو عرض کردوں۔ اقبالؒ (1877-1938) تو پھر مجھے بھولتا نہیں۔ ''پیامِ مشرق'' میں اُس کی ایک نظم ہے۔ یہ نبی جیسی جو کیفیت ہے وہ تو خیر کیا پیدا ہوگی لیکن بہرحال میں نے عرض کیا ہے کہ غیرِ نبی بھی جو چاہتا ہے کہ حقیقت اُس کے سامنے آئے، اُس کی یہ کیفیت ہونی چاہیے۔ اگر یہ کیفیت نہیں ہے، اگر وہ مروجہ خداؤں سے مطمئن ہو کر بیٹھا ہوا ہے، تو کبھی حقیقت تک نہیں پہنچتا۔ اِس فَهَدٰى (93:7) میں جو ''ف'' ہے وہ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ ضَآلًّا ہوگا تو پھر ہدایت ملے گی۔ یہ ''ف'' بڑی چیز ہے۔ جو مطمئن ہو کر بیٹھ گیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صحیح ہے اور اسی طرح سے چلا جا رہا ہے، اُسے حقیقت نہیں مل سکتی۔ یہاں آیا ہے ضَآلًّا اور اس کے بعد ہے فَهَدٰى (93:7)۔ ''ف'' کا مطلب ہے کہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے جو آگے آتا ہے۔ میں تو یہ عرض کرونگا کہ جتنی زیادہ شدت سے، یہ تڑپ، یہ خلش، یہ تپش اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، کہہ لینے دیجیے کہ اس

---

❶ پرویزؒ: معراج انسانیت (معارف القرآن، جلد چہارم)، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، 1949، ص ص۔ 185 تا 187۔

تڑپ اور خلش کے بعد عروسِ حقیقت کو خود ہی اِس کے اوپر پیار آ جاتا ہے:

کام آخر جذبہء بے اختیار آ ہی گیا

دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا

اس ہونے والے نبی کا دل' حقیقت کی تلاش میں' خلش اور تڑپ سے اس صورت تڑپتا ہے کہ اِس کو پیار آ جاتا ہے: **ضَـآلًّا فَهَـدٰى** (93:7)۔اقبالؒ کے شعر میرے سامنے ہیں کہ یہی کیفیت ہونی چاہیے۔وہ اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔''شاعر'' بڑی عجیب نظم ہے لیکن کیا کروں فارسی میں ہے۔

بادِ صبا کا پیغام کہ جمود تو موت کا دوسرا نام ہے

شاعر اُسے کہتے ہیں کہ تُو تھوڑے وقت کے لیے بیٹھ جا۔ یہاں ہر قسم کی چیز میسر ہے' سکون ہے' سکوت ہے' حوریں ہیں' یہ نعمتیں ہیں۔اس کے باوجود تیری کیفیت یہ ہے کہ کسی ایک جگہ ایک دم کے لیے تجھے قرار نہیں ملتا' تُو بیٹھتا نہیں ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہتا ہے:

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد

تُو جو کہہ رہی ہے ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن میں کیا کروں کہ میری فطرت کو کسی ایک مقام کے ساتھ چین ہی نہیں پڑتا۔ میں کیسے ایک جگہ رک جاؤں' میرے لیے جمود موت ہے۔

دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

کیا پیاری تشبیہ ہے! صبا کسی ایک پھول کے اوپر مطمئن نہیں ہوتی۔اس کا منہ چومتی ہے' اُس کو گلے سے لگاتی ہے' اُس کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے' یوں کرتی ہوئی گلستاں کے اندر سے گزر جاتی ہے۔کسی ایک مقام پہ صبا نہیں ٹھہرتی۔ کیا بات ہے!

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے

تپد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے

جنابِ پرویزؒ: کے دل کی دھڑکن کی وہ آواز جسے ہم سن نہ سکے' پا نہ سکے

وہ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جاتا۔ایک نئی تپش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی اور اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہونا چاہیے۔

عزیزانِ من! سنیے یہ مقام جو تڑپ کے ہیں وہ ہیں کیا!

ز شرر ستارہ جویم زستارہ آفتا بے ❶

میرے عزیزو! زندگی کے اس مرحلے میں، میں کیا کروں؟ کہیں مجھے نصاب (Curriculum) مل جاتا، کہیں نوجوان مل جاتے، تو انہیں قرآن پڑھاتا، انہیں اقبالؒ سمجھاتا۔

ز شرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

یہ سوال ہی نہیں ہے کہ منزل آ گئی ہے۔ اگر قرار کہیں ہو تو وہ میرے لیے موت ہے۔ اور اُس کے بعد ہے کہ یہ جو میری تلاش ہے، اس تلاش میں کہیں تو منزل آ جانی چاہیے۔ کہتا ہے کہ تم جانتے ہی نہیں ہو کہ میری تلاش کا مقصود کیا ہے:

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہِ نا شکیبے بہ دلِ امید دارے

میں تو اُس کا ''آخر'' ڈھونڈتا پھر رہا ہوں کہ جس کی نہایت ہی کوئی نہیں ہے۔ میں اُس کی نہایت کا طلب گار ہوں۔ عزیزانِ من! میں کیا سمجھاؤں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ مقصد اس قسم کا سامنے رکھنا ہے کہ اُس تک پہنچے تو اور آگے چلا جائے۔

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد ❷

اتنا بلند مقصد ہے کہ وہ تو اُس کے پیچھے رہے مگر ہاتھ نہ پہنچ سکے۔

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد
خوشا کسے کہ بدنبالِ محمل است ہنوز

تڑپنا، تپنا، خلش پیدا ہونا، پیچھے دوڑنا لیکن نہ رسیدن یعنی وہاں تک نہ پہنچنا، محمل کے پیچھے پیچھے دوڑنے والا بڑا ہی خوش قسمت ہے۔ اگر اِس کے ہاتھ میں وہ آ جائے گی تو اُس کے بعد تو سفر ہی ختم ہو گیا۔

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

منزل پہ پہنچ گیا تو وہ مُردہ ہے۔

---

❶ میں چنگاری سے ستارہ اور ستارہ سے سورج کی تلاش میں نکلتا ہوں۔

❷ میں اس ''نہایت'' کی آرزو رکھتا ہوں جس کی کوئی انتہا نہیں۔

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد

قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے۔ قرآن نے مومن کی منزل لکھی ہے: اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (53:42)

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

میری شکارگاہ کے اندر جبریل ایسا شکار ہوتا ہے جو ہاتھ میں آ جائے تو پھینک دے۔ یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانا۔ شکار کھیلنا ہے تو اُس کا شکار کھیلو۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (53:42) اپنا مقصد اتنا آگے رکھ۔ مجھے پھر وائٹ ہیڈ (1861-1974) یاد آ گیا۔ عجیب شخص ہے۔ وہ اِسی مقصد کی بات کرتا ہوا کہتا ہے۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے:

The perfection of life resides in aims beyond the individual person in question.[1]

زندگی کی تکمیل ان مقاصد سے ہوتی ہے جن تک آدمی پہنچ نہیں پاتا اور اُن کے پیچھے رہتا ہے۔ اس طرح زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد

بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امید دارے

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

امید اُس کی ہے کہ ایک دن بدل دونگا۔ نگاہ ہے کہ کسی طرح اُس کو صبر نہیں ہے کہ یہ ٹھیک ہے لیکن اُس کے ساتھ قلب کے اندر ایک امید بڑی ضروری ہے کہ پکڑ لونگا۔ اس لیے اُس حور سے کہہ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو کہ اس بہشت میں بیٹھو۔

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے

نہ نوائے دردمندے نہ غمے، نہ غمگسارے[2]

نہ تڑپ، نہ خلش، نہ غم، نہ غمگسار تو سوال کیا ہے؟ اسی لیے قرآن میں بہشت کو آخری منزل نہیں کہا۔

---

[1] Whitehead A.N.: Adventures of Ideas, p.373.

[2] اقبالؒ: شاعر (پیامِ مشرق) کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور (سالِ اشاعت درج نہیں)، ص 134۔

انسانی تگ وتاز کے لیے بہشت بھی آخری منزل نہیں

بہشت کے متعلق بھی یہ ہے کہ مومنوں کے پیشانی کا نور اُن کو اگلے راستوں کو دکھاتا چلا جائے گا۔ وہ تو اُس کے آگے بھی راستے بتا رہا ہے۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَھٰی (53:42)۔ طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد۔ عزیزانِ من! نبی کی کیفیت جو قبل از نبوت ہوتی ہے وہ یہ کیفیت ہوتی ہے۔ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا (93:7) اور جب ضآلًّا کی یہ جو کیفیت ہے یعنی ناشکیبی کی، صبر آزمائی کی، بے قراری کی، حسین سے حسین تر تک پہنچنے کی، جب یہ شدت اختیار کر جاتی ہے۔ فَھَدٰی (93:7) تو پھر ہم تمہیں صحیح راستے کا جلوہ دکھا دیتے ہیں۔ نبی حقیقت کو منکشف نہیں کرتا بلکہ حقیقت خود اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔

کشف والہام کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ یہ ایک گہری سازش ہے

یہ ہمارے ہاں جو دین کے خلاف سازشیں ہوئی ہیں، اُن میں سے یہ سازش بھی تھی کہ یہ ہمارے اولیائے کرام، صوفیائے عظام، یہ سارے جتنے بھی ہیں، یہ کشفِ حقیقت جو نبی بھی نہیں کر پاتا، وہ یہ کر لیتے ہیں۔ مراقبوں سے، ریاضتوں سے، چلوں سے کر لیتے ہیں۔ یعنی یہ کچھ کر کر کے اللہ کو مجبور کر دیتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیے۔ یہ کتنا ظلم ہے، کبھی کسی نے اِس پہ غور نہیں کیا۔ انہوں نے کشف کا اور وحی کا کچھ Quantitative (مقداری) سا فرق بتایا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ انہیں خدا سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے، اس طریقے سے ہوتا ہے۔ یعنی حقیقت میں کشف اور وحی Qualitatively (خواصی لحاظ سے) ایک ہی چیز ہے۔ یہ اس کے باوجود ختمِ نبوت کو بھی مانتے ہیں، اس کے بھی قائل ہیں لیکن پھر بھی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں سے ہمیں براہِ راست علم ملتا ہے جبکہ وحی کی تو Definition (تعریف) ہی یہ ہے کہ انسان کی اپنی فکر کو دخل نہ ہو اور براہِ راست خدا کی طرف سے علم ملے۔ اب اپنے طریقوں کا نام تم کشف رکھو یا الہام رکھو کچھ ہی رکھ لو، اِس سے فرق کیا پڑتا ہے!

حضور نبی اکرم ﷺ کا غارِ حرا میں مراقبوں کے تصورات کی حقیقت

اب یہ چیز بھی انہوں نے کی کہ وہ کشف ہے اور الہام ہے، خدا سے براہِ راست علم ملتا ہے۔ یہ باہر جنگلوں میں، غاروں میں، خانقاہوں میں، وادیوں میں، کمروں میں، حجروں میں، تپسیا سے، ریاضتوں سے، مراقبوں سے، چلوں سے یہ کچھ کرتے ہیں۔ اب اُنہوں نے کہا کہ وہ نبی کے متعلق بھی تو کچھ اِس قسم کی بات ہونی چاہیے کہ اُس نے بھی اسی طرح سے کچھ حاصل کیا تھا۔ حضور ﷺ کو یہ غارِ حرا میں بھیج دیتے ہیں کہ وہ نبوت سے پہلے مہینے مہینے بھر کا پانی اور ستو لے لیتے تھے اور وہاں غار میں چلے جاتے تھے اور مراقبے کرتے تھے۔ تو گویا (معاذ اللہ) بات یہ بتا دی کہ حضور ﷺ نے بھی اسی طرح سے، مراقبوں سے، یہ بات پالی تھی جس طرح سے ہم مراقبوں سے یہ پا لیتے ہیں

(معاذ اللہ)۔ دیکھا کہ ہم کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ خدا' وہ وحی دینے والا' نبی کے متعلق کہتا ہے کہ تُو کل تک نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے' وحی کسے کہتے ہیں چہ جائیکہ وہ اتنے سالوں تک وہاں محنت کر کر کے مراقبوں اور چلّوں سے وحی کو اس طرح سے اپنے ہاں لے آئے۔

مقام نبوت اور وحی کا نزول اس قسم کے افسانوں کی تردید کرتا ہے اور ان سے بہت بلند ہے

عربوں کی تاریخ میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ اِس طرح سے خانقاہوں میں جایا کرتے تھے اور اس طرح مراقبے کیا کرتے تھے۔ وہ تو بڑی کھلی ہوئی قوم تھی۔ یہ تو ہمارے ہاں یہودیوں' عیسائیوں اور ہندووٗں کے ہاں سے یہ بات آئی ہے۔ نبی خانقاہوں میں جا کر مراقبوں کے ذریعے سے وحی نہیں پاتا۔ وحی نبی کے اپنے اکتساب' ہنر' محنت' کوشش' مراقبوں کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو خدا کا انتخاب ہوتا تھا۔ البتہ جسے منتخب کیا جاتا تھا تو اُس کی کیفیت یہ ہوتی تھی: ضَـــآلًّا ۔ وہ اپنے موجودہ ماحول کے تمام عقائد اور افکار سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اُس کو تلاشِ حقیقت ہوتی تھی۔

قرآنِ حکیم میں خضر کا لفظ ہی نہیں

وہ تلاشِ حقیقت ہی تو تھی جس کو حضرتِ موسیٰ اور خضر کی ملاقات کہا گیا ہے۔ ایک شخص کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ اُس کو کچھ حقیقت کا علم ہے۔ حضرتِ موسیٰ اُس کی طرف گئے تھے۔ یہ وہی بات ہے کہ انہیں حقیقت کی تلاش تھی۔ قرآن میں خضر کا لفظ نہیں آیا' یہ ہم نے دوسروں سے لیا ہوا ہے۔ قرآن نے اُن کا نام بھی نہیں بتایا جس کے پاس وہ گئے تھے۔ قرآن نے تو یہ بتانا تھا کہ نبوت سے پہلے نبی کی زندگی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے Prevelant gods (مروجہ خداوٗں) سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت کی تلاش میں جہاں جہاں اُس کو کہیں کچھ پتہ ملتا ہے کہ وہاں مل جائے گی وہ وہاں جاتا ہے۔ ناکام لوٹتا ہے' مایوس لوٹتا ہے۔ اور اُس کے بعد مایوس نہیں ہوتا اور تلاش پھر بھی جاری رکھتا ہے۔ یہ ہوتی ہے نبی کی قبل از نبوت کی زندگی۔ کیریکٹر کے اعتبار سے ایسی کہ دشمن سے دشمن بھی کہیں اس کے کیریکٹر پر انگلی نہ اٹھا سکیں۔ اور تلاشِ حقیقت میں کیفیت یہ ہے کہ کہیں اُس کو قرار نہ ملے' کہیں مطمئن ہو کے نہ بیٹھ جائے تاوقتیکہ The reality, The truth حقیقتِ مطلقہ' خود اُس کے سامنے اپنے آپ کو بے نقاب نہ کر دے۔ اسے نبوت کہا جاتا ہے۔ اور پھر اُسے ایک عظیم مقصد کے لیے چنا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضرتِ موسیٰ کو کہا کہ وَ اصْـطَـنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (20:41) ہم نے' اے موسیٰ! تجھے ایک خاص کام کے لیے بنایا اور تیار کیا ہے۔ اِذْهَبْ (20:42) جاوٗ فرعون کی طرف۔ یہ نبوت' یہ انتخاب' اُس کے ذمے یہ کام لگانا' یہ بھی At Random (اتفاقیہ) نہیں ہوتا کہ کسی وقت یہ کر دیا جائے۔ وہ مشیت کا ایک عظیم پروگرام ہوتا ہے۔ بات میں سے بات نکل

آئی' یوں آ گے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ حضرتِ موسیٰ کو یہ کہا گیا کہ میں تمہارا رب ہوں یعنی وہاں پہلی وحی مل رہی ہے۔ اس وحی نے کیا کیا تھا؟ یہ کیا کہ وہ جو تلاشِ حقیقت میں اس کی لمبی لمبی مسافتیں تھیں' اُن کو ختم کر دیا تھا۔ منزلوں کو سمٹا اور لپٹا دیا تھا۔ ہماری زبان میں یوں کہیں گے۔ خود عربوں کی زبان میں بھی یہی کہتے تھے۔

وادیٔ طویٰ کے سلسلے میں ہمارے ہاں کے تراجم کی نوعیت

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اُس کا ملخص یہی ہے کہ تلاشِ حقیقت میں سرگردانی سے یہ جو مسافتیں تھیں' یہ جو لمبے لمبے سفر تھے' وحی اُس کو سمٹا دیتی ہے' وہاں جب گئے ہیں' یہی سورۃ طٰہٰ کی آیات ہیں' یہ بڑے غور سے سننے کے مقام [1] ہیں۔ کہا کہ وہاں آواز آئی: **اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ** (20:12) یہ آواز تیرے رب کی ہے۔ **فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی** (20:12)۔ آپ کہیں ترجمہ دیکھ لیجیے' یہ آپ کو ملے گا کہ ''اے موسیٰؑ! یہ بڑی مقدس وادی ہے جس میں تُو آ گیا ہے' جوتا اتار کے آ''۔ یہ وادی پہاڑ کی چوٹی ہے۔ یہاں اِدھر اُدھر مویشی جانور پھرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ بڑی مقدس وادی ہے اور اُس کی تقدیس کے لیے جوتا اتار کے آ۔ **اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی** (20:12)۔ طوٰی اُس وادی کا نام تھا۔ کہا کہ تو طوٰی کی ایک مقدس وادی میں آ گیا ہے اس لیے جوتا اتار کے آ۔ یہ ہے ترجمہ جو ہمارے ہاں کیا جاتا ہے۔

یہاں سے اب سوال یہ ہے صاحب! کہ وہ مقدس کیسے ہوئی۔ کہنے لگے کہ انوارِ تجلیاتِ خداوندی جو تھیں اُس کی وجہ سے وہ مقدس ہو گئی۔ اور جو مقدس ہو گئی تو وہاں جوتا نہیں پہن کے جانا چاہیے۔ آپ حضرت داتا [2] صاحب کے مزار پہ گئے ہونگے۔ وہ جو چوکھٹا لگا ہوا ہے' وہاں مرکزِ انوارِ تجلیات لکھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ یہی چیز ہے کہ جلوۂ انوارِ خداوندی کا لشکارا ہے۔ وہاں یہ لکھا ہے یعنی ان کے جو مقبرے ہیں' ان کی جو قبریں ہیں' وہ اس طرح سے ہیں۔ اور اِس چیز سے یہ سند لاتے ہیں کہ یہ مقدس ہو گئیں۔ اور اسی لیے کہتے ہیں کہ جوتی باہر اتارو۔ یہ آپ کے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تُو مقدس وادیٔ طویٰ میں آ گیا ہے جوتا اتار دے۔ اُن سے پوچھو تو سہی کہ جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا وہ اِس کو کیا کہتے ہیں۔

وحی انسانی زندگی کے طویل تجرباتی سفر کو لپیٹ کر اس میں آسانی پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! پھر سن لیجیے کہ تلاشِ حقیقت میں لمبی لمبی منزلیں' لمبی لمبی مسافتیں' لمبے لمبے سفر ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ موسیٰ! اب تیری

---

[1] ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 31 تا 56۔

[2] یہ مشہور مزار لاہور پاکستان میں واقع ہے۔

وہ مسافتیں، وہ سفر ختم ہو گئے ہیں، اب چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے جوتا اتار دے۔ کوئی مسافر یعنی جو پیدل چلنے والے ہوتے تھے، آپ نے تو دیکھے نہیں، ہم گاؤں والے جانتے ہیں، جہاں کہیں وہ سفر کے بعد منزل پہ آتے تھے ٹھنڈی چھاؤں یا کنواں آتا تھا "تے پہلی گل اے ہوندی سی کہ جوتی لاہ کے تے اونوں جھاڑ کے، رکھ دے سن اک پاسے۔"❶ سفر کے ختم ہونے کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے۔ یہ مجازی سفر کے ختم ہونے کا محاورہ ہے۔ موسیٰ! اب وہ لمبی مسافتیں ختم ہو گئیں، اب اس طرح سے اتنا لمبا چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اب جوتے اتارے دے۔ عربوں سے پوچھیے کہ طوٰی کو کیا کہتے تھے؟ طوٰی کے معنی ہی لپیٹنا ہے۔ موسیٰ! تیری مسافتوں کے راستے ہم نے لپیٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ وحی انسانی مسافتوں کو لپیٹ کر رکھ دیتی ہے۔❷

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

یہ "طے" یہی ہے جہاں سے طوٰی ہے:

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

یہ "طے" کرنا تو اپنے ہاں ہم بھی بولتے ہیں۔ طوٰی لفظ وہیں سے ہے۔ عزیزانِ من! اب دیکھیے چار لفظوں میں قرآن کتنی عظیم حقیقت بیان کر گیا کہ موسیٰ! ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا۔ اتنا لمبا عرصہ تو اس طرح سے مارا مارا پھرتا رہا۔ بڑی مسافتیں تم نے طے کیں، بڑے سفر تم نے طے کیے۔ بالآخر تم اب اس مقام پہ آ پہنچے ہو جہاں تمہارے سفر ختم ہو گئے، تمہاری مسافتیں طے ہو گئیں۔ اب سفر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جوتا اتار دے۔ اس وادی میں تُو پہنچ گیا، اُس مقام پہ تُو پہنچ گیا ہے جہاں مسافتیں لپیٹ کے رکھ دی گئی ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ وحی ہے جو خدا نے آواز دی ہے: وَ اَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی (20:13) سن ہماری بات۔ یہ وحی ہے۔ ایک تو یونہی سن لینا ہوتا ہے بلکہ دل کے کانوں سے سن۔ جسے ہم اپنے ہاں کان کھول کر سن کہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ سن کی ہے۔ اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ (20:14)۔ یہ چیز کتنے زور سے ہے کہ اس کائنات میں ہمارے سوا محکومیت اور اطاعت کسی کی نہیں ہے۔ اگلی بات ہے وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (20:14)۔ اب اگر میں اِس میں چلا جاؤں تو کہیں اور چلا جاؤں گا۔

---

❶ پہلا ہی کام یہ ہوتا تھا کہ وہ جوتا اتار کر، جھاڑ کر، اسے ایک طرف رکھ دیتے تھے۔

❷ It economises human efforts

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا پہلا حکم ایک انقلاب پیدا کرنا تھا

پہلا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت نہیں ہے' اقامتِ صلوٰۃ کر۔ اب سوال یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا ہے کے لیے کر۔ یہ اگلے فقرے میں ہے اور اُس فقرے کے الفاظ عظیم ہیں۔ کہا کہ **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15) ایک انقلاب اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا۔ یہ **اخفیها** کا لفظ عربی زبان کا عجیب لفظ ہے۔ ایک چیز جو پہلے اندر ہی اندر پرورش پا رہی ہو' پک رہی ہو اور اُس کے بعد ایک وقت آ جائے' جس میں وہ اُبھر کر اوپر آ جائے' اُس کے لیے اُن کے ہاں یہ ایک لفظ ہوتا ہے **الساعة**۔ کے معنی انقلاب کے ہیں۔ ایک عظیم انقلاب جو اِس سے پیشتر اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا' وقت آ گیا ہے کہ اب وہ ابھر کر سامنے آ جائے۔ وہ جو فرعون نے یہ کچھ اس قوم کے ساتھ کر رکھا تھا' استبدادِ ملوکیت کے خلاف' ایک ردِعمل' محکوم قوم کا ایک ردِعمل تھا کہ یہ ابھی تک انقلاب خاموش تھا' یہ اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اُبھر کر سامنے آ جائے۔

عزیزانِ من! سنیے کہ انقلاب کا مقصد کیا ہے؟ یہ کہا تھا کہ میں نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے چن لیا ہے' جا کر یہ کام کر۔ وہ انقلاب جو اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا' اب وہ سطح کے اوپر آ جائے گا' ابھر کے نمایاں طور پہ آ جائے گا۔ یہ انقلاب کا ہے کے لیے ہے؟ **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى** (20:15) تاکہ کسی محنت کرنے والے کی محنت کو کوئی Exploit (سلب) کر کے نہ لے جائے۔ خدا نے کہا تھا کہ میں نے اپنے ایک کام کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ اپنا کام کہ ہر محنت کرنے والا محنت کے معاوضے کا مالک ہو' کوئی دوسرا نہ لے جائے۔ اس مقصد کے لیے یہ جو انقلاب ابھی تک نیچے نیچے پرورش پا رہا تھا' اب وہ اُبھر کر سامنے آئے گا۔ یہ ہے وہ میرا کام جو رکا ہوا تھا۔ اس کے لیے پہلے دن سے' پیدائش سے اب تک' اس نے تمہیں مختلف بھٹیوں میں سے گزارا' کٹھالیوں میں سے گزارا' کندن بنایا' یہاں تک پہنچایا' تمہاری مسافتیں لپیٹیں' وحی دی۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو دی جانے والی آواز کا مقصدِ عظیم

یہ ہے وہ پروگرام جس کے لیے ہم یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ اب فرعون کی طرف جا۔ اس انقلاب سے مقصد یہ ہے: **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى** [1] (20:15)۔ عزیزانِ من! یہ ہے دین کا ملخص' جس کے لیے اتنا عظیم جلیل القدر پیغمبر ہے۔ ایک پیغمبر نہیں بلکہ حضرتِ ہارونؑ بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ اور پھر مدین میں تو حضرتِ شعیبؑ بھی ساتھ ہیں۔ یہ انقلاب بھی بہت عظیم تھا۔ کہا کہ **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى** (20:15)۔ اس مقصد کے لیے جا۔ عزیزانِ من! یہ تھی وہ آواز۔

---

[1] تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل سکے۔

اب پھر آ جایئے سورۃ القصص کی طرف۔ اپنے اہل سے، ساتھیوں سے اُنہوں نے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ وہاں جا کر دیکھتا ہوں کہ کوئی آدمی ہوگا تو اُس سے راستہ پوچھونگا، ورنہ کوئی آگ کا انگارہ لے کر آتا ہوں۔ وہاں پہنچے تو آواز آئی کہ **اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (28:30) میں تمہارا رب ہوں۔ کان لگا کر بات سن! ہم نے تمہیں ایک عظیم مقصد کے لیے چنا ہے۔ تجھے نہیں پتہ تھا۔ اپنے کام کے لیے چنا ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کتنے عرصے سے یہ یہاں ہو رہا ہے کہ غریبوں، مسکینوں، محنت کشوں کی محنت کا اُن کو معاوضہ نہیں مل رہا۔ یہ کچلے جا رہے ہیں۔ ان کا استحصال ہو رہا ہے، Exploitation (سلب ونہب) ہو رہی ہے۔

لفظ طغٰی کا قرآنی مفہوم

کہا کہ **اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ** (20:43) فرعون کی طرف جاؤ کیونکہ **اِنَّهٗ طَغٰی** (20:43) وہ تو حدود فراموش ہوگیا ہے، وہ سیلاب بن گیا ہے۔ طـغـی کیا عجیب لفظ ہے! طغیانی اسی کو کہتے ہیں۔ پانی تو زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے بشرطیکہ وہ دریا کے ساحلوں کے اندر رہے۔ ساحلوں کو توڑ کر جب وہ اِدھر اُدھر بے مہار ہو جائے تو وہ تو سیلاب ہو جاتا ہے۔ کہا کہ وہ سیلاب بن رہا ہے۔ جاؤ، اُسے ساحلوں کے اندر محصور کرو۔ اور اِس کے لیے پھر آگے بات ہے۔ پروگرام دیا۔ آگے وہ آتا ہے جو ہمارے ہاں عام مشہور ہے۔ پوچھا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ کہ جی سوٹا [1] ہے، سوٹا سپ [2] بن گیا۔ یہ سارا جتنا قصہ ہے، یہ ہمارے ہاں مشہور ہے۔ داستان کے اس عظیم ٹکڑے تک پہنچنے کے بعد کیا وہاں آگے بات یہ ہوگی کہ ہاتھ میں تمہارے سوٹا یا لٹھ ہے اِس کو پھینک دے۔ یہ سانپ بن گیا۔ پکڑ لے، کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ یہ کیا چیز ہوگی؟ وہ اسی کے تسلسل میں ساری بحث ہو رہی ہے۔ جو کچھ پیچھے کہا جا رہا ہے وہ اِسی کے تسلسل میں آگے بات ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! اب وقت ہوگیا ہے، ہم سورۃ القصص کی آیت 30 تک آئے ہیں۔ 31 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

---

[1] لاٹھی

[2] سانپ۔ اژدہا

پانچواں باب: سورۃ القصص (آیات 31 تا 43)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا
تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ
اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ
مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۫ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ
بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا
الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا
فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ
عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ
مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا
يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ
هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ
بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1979ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 31 سے ہو رہا ہے: (28:31)۔

کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کا آغاز

پچھلے جمعہ چونکہ قائداعظمؒ ❶ کی پیدائش کی تقریب کے سلسلے میں خصوصی درس تھا اس لیے یہ مسلسل درس نہیں ہو سکا تھا۔ آج پھر اُسی تسلسل میں ہم آگے چل رہے ہیں۔ اس سے پہلے سابقہ آیات میں بات حضرتِ موسیٰ کے طور کی چوٹی تک پہنچنے تک پہنچی تھی۔ اور وہاں اُنہیں نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اُنہیں کچھ احکام دیئے گئے تھے۔ اُن کے ذمے ایک کام لگایا گیا تھا۔ میں نے اُس درس میں بھی بتایا تھا کہ اُس سے پہلے بھی متعدد بار یہ داستان سامنے آ چکی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کی بعثت اور وحی کا ماحصل تین گوشوں پر محیط ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش ہے' اِسے قرآنِ کریم نے بار بار دہرایا ہے۔ اور اس لیے دہرایا ہے کہ یہ جو انبیائے کرامؑ کا مشن تھا یا جو مشیتِ خداوندی کا پروگرام تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ باطل نظام کے خلاف ایک جدوجہد اور جہاد کیا جائے' اُس کی جگہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں انسانیت برومند ہو اور کوئی شخص نہ کسی دوسرے کا محتاج ہو اور نہ کسی دوسرے کا محکوم رہے۔ یہ ہے دین کی ساری غایت' یہ ہے اس سلسلہء رشد و ہدایت کا سارا مقصد' یہ تھا انبیائے کرامؑ کا مشن۔ تو یہ جو انسانوں کے خود ساختہ استبداد پر مبنی نظام ہیں اُس کی تین شقیں یا بنیادی ستون قرآن نے گنائے ہیں۔ ایک تو ملوکیت ہے: انسانوں کو حکومت کا حق' خواہ وہ شہنشاہیت کے رنگ میں ہو یا آج کی جمہوریت کے انداز میں ہو۔ ایک فرد ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ ہو' اُسے یہ حق حاصل ہونا کہ اپنے فیصلے دوسروں سے منوائے۔ دھاندلی اور استبداد سے منوائے تو اُسے آپ شہنشاہیت' ملوکیت' ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں۔ اُس کو قانون کی شکل دیدے کہ 51 فی صد کا فیصلہ ہے' یہ وہی شہنشاہیت ہوتا ہے' وہی ڈکٹیٹر شپ ہوتا ہے کیونکہ وہ اقلیت سے منوالیتا ہے۔ پہلی چیز ملوکیت ہے جس کے خلاف دنیا میں یہ انقلابی نظام آتا تھا۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ لا الہ الا اللہ کے معنی ہی یہ ہیں۔ اور اس نظام کا دوسرا ستون نظامِ سرمایہ داری ہوتا تھا۔ دوسروں کی محنت کا استحصال کر کے خود عیش کی زندگی بسر کرنا۔

انسانوں کے نظام میں مذہبی پیشوائیت کے ستون کا کردار

یہ دونوں ستون مذہبی پیشوائیت کے زور پہ قائم رہتے تھے۔ وہ لوگوں کو یہ افیون دیتے رہتے تھے کہ یہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا

---

❶ قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)

ہے، تمہیں اِس کے خلاف لب کشائی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اگر تم نے احتجاج بھی کیا' دل کی گہرائیوں میں بھی اِس کے خلاف تمہارے دل میں کوئی ردِعمل اٹھا تو خدا کے فیصلے کے خلاف یہ بغاوت ہوجائے گی۔ یہ جنگ خدا کے خلاف ہوگی۔ یہ مذہبی پیشوائیت لوگوں کو یہ سبق پڑھاتی رہتی تھی اور اِس طرح سے یہ باطل کا نظام قائم رہتا تھا۔ دوسرے انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں تو اِس نظام کی کوئی ایک آدھ شق سامنے آتی تھی لیکن یہ جو کشمکش حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی ہے' اس میں اس باطل کے انسانیت سوز نظام کے یہ تینوں ستون بیک وقت ایک جگہ قائم تھے۔ فرعون ملوکیت کا نمائندہ تھا' قارون نظامِ سرمایہ داری کا سربراہ تھا اوران دونوں میں ہامان مذہبی پیشوائیت کا ترجمان تھا۔ یہ تینوں انسانیت کش لعنتیں بیک جا جمع تھیں اوران کے نیچے بنی اسرائیل کی محکوم اور مقہور قوم تڑپتی بلکتی تھی۔ اس مقصد کے لیے حضرتِ موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ حضرتِ موسیٰ خود قومِ بنی اسرائیل کے فرد تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرعون کے محلات میں انہوں نے پرورش پائی تھی اس لیے یہ جتنی بھی ملوکیت کی سازشیں تھیں جسے آج کی اصطلاح میں محلاتی سیاست کہتے ہیں' یہ اُن سے واقف تھے لیکن وہاں سے بھاگے ہوئے تھے۔ ان سے نادانستہ ایک قتل ہوگیا تھا۔ اور اُس کے بعد پھر انہوں نے جوامت کی پرورش کا انداز سیکھا ہے وہ انداز بکریاں چرانے سے آتا ہے۔ آٹھ یا دس برس تک وہ بھی کیا۔ اور اُس کے بعد یہ نبوت مل رہی ہے۔ یہ پہلے ہی سے نہیں مل گئی تھی۔ اور اُس نبوت میں یہ کہا گیا تھا کہ جاؤ' فرعون کی طرف' اُس کا استبداد حدود فراموش ہو چکا ہے۔ انسانیت اُس کے پاؤں کے نیچے تڑپ اور بلک رہی ہے۔ وہ اُس کو کچل رہا ہے۔ اُس کی طرف جاؤ۔

فرعون کے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت

اب ذرا دونوں میں موازنہ کیجیے۔ فرعون کی سلطنت مصر ہی نہیں' یہاں فلسطین تک پھیلی ہوئی تھی' یہ حصہ اِنہوں نے اُس سے چھینا تھا۔ فرعون اتنا بڑا استبداد کا مجسمہ کہ اُس کا نام محاورہ بن گیا ہوا ہے اور اُس کے مقابلے میں یہ محکوم قوم کا ایک فرد' بکریاں چرانے والا' بے دست و پا' اُس کے ساتھ کچھ نہیں ہے۔ اُسے حکم دیا جاتا ہے کہ جاؤ فرعون کی طرف' اُس کے پنجۂ استبداد سے انسانیت کو چھڑاؤ۔ تو ظاہر ہے کہ یہ جو مشن ان کے سپرد کیا جا رہا تھا' یہ بڑا صبر آزما اور ہمت شکن تھا۔ اور پھر یہ بھی چیز تھی کہ میں تو وہاں سے ایک قتل کر کے بھاگا ہوا ہوں' میرے ذمے ایک قتل کا الزام ہے۔ میں تو یوں کہیے کہ وہاں کا مفرور ہوں' جسے آج کی اصطلاح میں اشتہاری مجرم کہتے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ بے دست و پا ہوں' بکریاں چرانے والا ہوں۔ کہا کہ فرعون کی طرف جاؤ۔ الفاظ یہ ہیں کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ سارا عرصہ ہم تمہیں اپنے ایک کام کے لیے تیار کرتے رہے ہیں۔

خدا کے کام کی تکمیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں

عزیزانِ من! یہ ہے اصل نکتہ۔ انسانیت کو دستِ استبداد سے چھڑانے کو خدا نے کہا ہے کہ میرا ایک کام رکا ہوا ہے۔ کیا بات ہے! یہ رکا ہوا کیوں ہے؟ خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ فرعون اور اُس کے یہ سارے ساتھیوں کو ایک اشارے میں پتھر بنا دیتا۔ خدا کے لیے مشکل کیا تھا کہ وہیں وہ دم گھٹ کے مرجاتا لیکن یہ تو قرآن کا خدا ہے، ذہنِ انسانی کا تراشیدہ بت نہیں ہے۔ یہ قاعدے اور قانون کا خدا ہے۔ خدا اتنی لامنتہٰی قوتوں کا مالک ہے۔ اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کبھی ان کو نہیں توڑونگا۔ دیکھ رہا ہے کہ انسانیت کچلی جارہی ہے۔ یہ نہیں کرتا ہے کہ یونہی اُس نے ایک کو گھمایا اور اِن کو فنا کرکے رکھ دیا۔

دنیائے انسانیت میں انقلاب انسانوں کے ہاتھوں ہی وقوع پذیر ہوتا ہے

انسانوں کی دنیا میں جو تبدیلیاں اور انقلابات آئیں گے وہ انسانوں کے ہاتھوں سے آئیں گے، قاعدے قانون کے مطابق آئیں گے۔ یہ انقلاب برپا کرنے والا بھی کہیں غلطی کرے گا تو اُس کا خمیازہ اٹھائے گا، شکست کھائے گا، نقصان اٹھائے گا، زخمی ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اِن کو بھیج دیا کہ جاؤ تم ایک دفعہ کھڑے تو ہوجاؤ، باقی سب کچھ ہمارے فرشتے کرلیں گے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ انہی کو کرنا ہوگا۔ یہ ہے نظامِ خداوندی۔ اس کے لیے کہا یہ گیا کہ ہم نے اپنے ایک کام کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔ اور اپنا کام یہ ہے کہ جاؤ اور فرعون کے دستِ استبداد سے، قارون کی خون آشامیوں کے ہاتھوں سے اور یہ جو ہامان کی فریب کاریاں ہیں، ان سے قوم بنی اسرائیل کو چھڑاؤ۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ دونوں کا تقابل کیا ہے۔ اس انداز سے یہ گئے ہیں۔ نبی کو تو ایک دن پہلے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کل کو نبوت ملنے والی ہے۔ اچانک یکا یک وہاں کھڑے ہوئے جو یہ حکم دیدیا جائے تو کیا کیفیت ہوگی۔ یہاں سے یہ بات ہے اور بار بار یہ بات آچکی ہوئی ہے کہ جب یہ حکم دیا گیا تو حضرتِ موسیٰ کو ایسے معلوم ہوا کہ کہا مجھ سے گیا ہے کہ ایک اژدھا کو جاکے پکڑلو۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں بات کرنے کے لیے محاکاتی انداز کو بھی اپنایا ہے

یہ محاکاتی انداز ہے۔ یہ ہے مجازی چیز جو کہا جارہا ہے۔ اُن سے کہا کہ اپنا عصا پھینک دو اور وہ سانپ بن گیا۔ کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، پکڑلو۔ پکڑلیا تو پھر وہ عصا بن گیا۔ عزیزانِ من! یہ طلسم ہوشربا کی بات نہیں ہے۔ جب ایک انسان کو اس مقصد کے لیے چنا جاتا ہے کہ جاؤ تم انسانوں کی طرح، قاعدے قانون کے مطابق جاکے یہ انقلاب برپا کرو۔ انسان کو چنا جاتا ہے خدا خود براہِ راست کچھ نہیں کرتا۔ تو کیا یہ اُس انسان کے لیے یہ کچھ کرے گا کہ جاؤ تمہاری لاٹھی سانپ بن جائے گی اور اُن کو ڈس لیا کرے گی۔ تو اِس کے ہاتھوں سے لاٹھی کو سانپ بنانے کی کیا ضرورت تھی، وہاں سانپ بنا کے خود ہی خدا چھوڑ دیتا۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ یہ معجزانہ طور پہ یہ سب چیزیں

ہو جاتی تھیں تو اگر یہ کرنا تھا تو اُس کے لیے درمیان میں ایک انسان کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بڑی غور طلب چیزیں ہیں۔ اس لیے جہاں یہ چیزیں ہمارے ہاں کی یہ تفسیر ترجموں کے اندر آ جاتی ہیں کہ جی اُنہوں نے سوٹا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا اور وہ ڈر کے بھاگے تو اُن سے کہا کہ نہیں نہیں، ڈرو نہیں، اسے جا کے پکڑو اور پھر ایسے ہاتھ کیا اور نکالا تو وہ چاند جیسا بن گیا۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ تم تو اتنے عرصے تک تیار ہوتے رہے تھے، پھر ہم نے تمہیں اپنے ایک مشن کے لیے چنا ہے۔ تو یہ ایک انسان کو جو اتنے عرصے سے تیاریوں کے بعد چنا اور پھر اُس کے ہاتھ سے یہ کرایا کہ سوٹے ❶ کو سانپ بنا دیا، اِس میں یہ کیا تُک ہے؟ یہ جو انسان کی تربیت کی ہے، اُس کے جوہروں کی جو نمود ہوئی ہے، اس مشن کے لیے اُس کا جو انتخاب کیا گیا ہے، تو یہ تو کوئی شخص بھی ہوتا تو وہیں اُس کو سوٹا دیا جاتا اور کہتا کہ پھینک دو اور وہ سانپ بن جاتا۔ یہ بات نہیں ہے پھر قرآنِ کریم خود بتا دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے محاکاتی انداز کا مفہوم لسانِ عربی مبین سے ہی سمجھنا چاہیے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ عربی زبان کا یہ قرآن ہے۔ عرب اپنے ہاں ان الفاظ کو کن معنی میں استعمال کرتے تھے۔ ہر زبان میں Literary Meaning (لغوی معنی) ہوتے ہیں۔ پانی کے معنی پانی ہوتا ہے، یہ جو پینے والا ہوتا ہے لیکن جب آپ کہیں گے کہ

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو یہ بات نہیں ہے کہ میں سر سے پاؤں تک پانی پانی ہو گیا ''تے اک بالٹی اچ جا پیا''۔ ❷ اب اگر کہیں یہ مصرعہ لکھا ہوا ہو اور کوئی اِس کے بعد اس کا ترجمہ کرے کہ صاحب! اُس نے اُس کے اوپر جو نگاہ ڈالی ہے تو وہ سر سے پاؤں تک نلکے کے اندر سے نکلتا ہوا پانی بالٹی کے اندر جا گرا کیونکہ اُس نے کہا ہے کہ پانی پانی کر گئی مجھ کو اُس کی بات۔ یہ ہوتی ہے چیز۔ کسی چیز کے ایک حقیقی معنی ہوتے ہیں اور ایک اُس چیز کے مجازی معنی ہوتے ہیں۔ قرآن جو بار بار کہتا ہے کہ یہ لسانِ عربی مبین میں نازل کیا ہے، تو وہ عربی مبین سے پوچھیے کہ وہ اِن کی معنی کیا لیتے تھے تو بات صاف ہو جائے گی۔ اہلِ زبان سے پوچھنا چاہیے کہ ''پانی پانی کر گئی'' کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ نہ کہ ہم خود ہی یہ کہہ دیں کہ صاحب! وہ پانی ہو گیا۔ ان معنی کے اعتبار سے میں نے اس سے پہلے بھی یہ جتنے مقام آتے ہیں، وہاں میں وضاحت کر چکا ہوں، بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ❸

---

❶ لاٹھی

❷ کہ ایک بالٹی میں جا گرا۔

❸ اس وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورہ طٰہٰ، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005۔

احکام ملنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نفسیاتی کیفیت اور خدا کی طرف سے ثابت قدمی کی ترغیب

خدا نے احکام دیئے تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو یوں نظر آیا کہ میں بالکل نہتا ہوں اور ایک اژدھا سے لڑنے کے لیے مجھے کہا جا رہا ہے۔ تو یہ جو اتنا بڑا پروگرام تھا اُس سے وہ سہم گئے' ڈر گئے۔ فرعون سامنے تھا' اور یہ وہاں سے بھاگے ہوئے ہیں' بے سروسامان ہیں۔ اور کہا یہ جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے ایک انسان ہیں' اتنا بڑا مشن ہے۔ کہا کہ میں اسے کس طرح سرانجام دونگا۔ یہ جو قرآن نے ان کا سہم جانا کہا ہے یہ بالکل Natural (فطری) ہے لیکن کہا یہ گیا کہ یٰمُوۡسٰۤی اَقۡبِلۡ وَ لَا تَخَفۡ (28:31) موسیٰ! آگے بڑھ جا' اس پروگرام سے پیچھے نہ ہٹ۔ اقبل خود کہہ رہا ہے کہ اِس کے معنی کیا ہوئے۔ وَلّٰی مُدۡبِرًا وَّ لَمۡ یُعَقِّبۡ (28:31) وہ اس سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ موسیٰ! ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ اقبل۔ آگے بڑھ جا۔ اِنَّکَ مِنَ الۡاٰمِنِیۡنَ (28:31) کوئی بات نہیں۔ اس پروگرام سے ڈرو نہیں' تم امن میں رہو گے۔ تو یہ احکام دو قسم کے تھے جو وہاں ملے۔

میدانِ عمل میں ہر نبی منذر بھی ہوتا ہے اور مبشر بھی

قرآن نے بار بار انبیاء کے متعلق یہ کہا ہے کہ نبی منذرین بھی ہوتے تھے اور مبشرین بھی ہوتے تھے۔ یہ جو نبی کی تنذیر ہے' وہ جلالی پہلو ہے کہ یاد رکھو! اگر تم اِس سے باز نہ آئے تو اتنی بڑی گرفت تمہاری ہوگی کہ دنیا سے تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کتنا جلال ہے۔ اور اگر تم نے ان قوانین کی پابندی کر لی تو دنیا جہان کی خوشگواریاں تمہارے پاؤں چومیں گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر کتنی خوشگواری ہے' کتنی بشارتیں ہیں' کتنی نورانیت ہے! یہ کتنا جمالی پہلو ہے! انبیاء کے متعلق قرآن نے ہر جگہ بتایا ہے کہ اُن کا ایک جلالی پہلو ہوتا تھا اور ایک جمالی پہلو ہوتا تھا۔ حضرتِ موسیٰ کے متعلق بھی یہ ہے کہ ایک پہلو تو یہ تھا کہ جس میں واقعی یوں نظر آئے گا کہ جیسے ایک اژدھا کے ساتھ لڑائی لڑی جا رہی ہے۔

ہاتھوں کی نورانیت کا مفہوم

اُس کے بعد یہ کہا کہ جو دوسری چیز ہے وہ اتنی ہی نہیں ہے کہ بس جلال ہی جلال ہے۔ اُن سے یہ بھی بات کہنے کی ہے کہ اگر تم اب بھی قوانینِ خداوندی کا اتباع کر لو تو دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں تمہارے ہاتھ آ جائیں گی۔ اس کو قرآن نے یہ کہا ہے کہ نورانیت جو ہاتھوں کے اندر آ جاتی ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا' باہر نکالا اور دیکھا کہ وہ چاند کی طرح تھا۔ تو اِس سے کیا فائدہ ہوا۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم خود بتا رہا ہے کہ یہ کیا چیز تھی جو وہ لے کر چلے تھے۔ کہا کہ یہ جو چیز فَذٰنِکَ بُرۡهَانٰنِ مِنۡ رَّبِّکَ (28:32) ہے۔ برہان تو دلیل کو کہتے ہیں۔ یہ جو ہے کہ عصا پھینکو اور سانپ بن جائے تو یہ دلیل تو نہیں ہے' یہ برہان تو نہیں

ہے۔ حالانکہ قرآن یہ ذکر کرنے کے بعد کہہ رہا ہے کہ یہ برہان ہے۔

ہر نبی کی ہر بات دلیل و برہان پر مبنی ہوتی تھی

ہر نبی کا پہلا انداز برہان کا ہوتا تھا۔ وہ بینات پیش کرتا تھا' کھلے ہوئے دلائل پیش کرتا تھا۔ مخالفین سے کہتا تھا **هَاتُوا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ** (2:111) تم سچے ہو تو اِس کے خلاف دلیل لاؤ۔ وہ کہتا تھا کہ تم دیکھو گے کہ یہ دلیل نہیں لا سکیں گے۔ (23:117)

شعبدہ بازی کا انسانی نفسیات پر اثر

نبی دھاندلی سے کچھ نہیں منواتا تھا اور جسے آپ خارقِ عادات (Super Natural) چیز کہتے ہیں' یہ سب سے بڑی دھاندلی ہوتی ہے۔ یہ عقل کو ماؤف کر دینا ہے۔ یہ جتنے سڑک کے کنارے بابا جی بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' وہ ذرا شعبدہ دکھاتے ہیں' وہ کتنی بڑی دھاندلی ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا جابر بھی آپ سے کچھ نہیں منوا سکتا۔ آپ کہیں گے کہ کر لے جو کچھ تُو نے کرنا ہے لیکن یہ بابا کا جو کہنا ہے کہ بیٹا! رکھ دے یہاں' یہ کچھ' ورنہ تباہ کر دونگا' آگ لگا دونگا' بڑے بڑے خوف سے زمین پہ گر جاتے ہیں۔ اس سے بڑا استبداد اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہاں کہا ہے کہ برھان۔ یہ دلائل ہیں' براہین ہیں جن کو تم لے کے جاؤ۔ اور وہاں جا کر بھی یہی چیز تھی۔ اِنہوں نے جاتے ہی' چھوٹتے ہی' یہ نہیں کہا کہ یاد رکھو! اگر یہ نہ کرو گے تو میں پھر اژدھا چھوڑ دونگا اور تم سب کو نگل جائے گا۔ ایسا بالکل نہیں تھا۔ وہ تو برہان تھی کہ **رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰى مِنۡ عِنۡدِهٖ** (28:37) جو اپنے خدا کی طرف صحیح راستہ دکھانے کے لیے تمہارے پاس آیا ہو' کیا تم اُس کی مخالفت کرتے ہو؟

ساحرین کی اصل حقیقت اور مناظروں کی اصلیت

عصا کو سانپ بنانا تو صحیح راستہ نہیں ہے۔ خدا تو یہ کہلا ہی نہیں سکتا۔ وہ **بِالۡهُدٰى** (28:37) کہتا ہے۔ اور یہی آیات ہیں 31 سے 43 تک' انہی میں یہ ساری بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خدا ہے۔ اور پھر آگے ہے کہ جب ساحرین کا وہاں مقابلہ ہوا' اِنہوں نے ساحرین کے معنی جادوگر کیا ہے جبکہ اس کے معنی ''پروہت'' ہیں۔ اِن کو History (تاریخ) معلوم نہیں ہے۔ یہ جن کو آج ہم Magician کہتے ہیں' یہ سارے مندروں کے پروہت ہوتے تھے' پادری ہوتے تھے۔ جن کو منتری کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ ہمارے ہاں منتر کیا جاتا ہے۔ یہ منتری جو ہیں یہ مندروں کے پجاری برہمن ہوتے تھے۔ اور آج کی سیاست کی اصطلاح میں تو سیکرٹری کو کہتے ہیں۔ یہ چیزیں بعد میں ہمارے ہاں وہ جادو' منتر اور شعبدہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگ گئیں۔ یہ وہاں گئے۔ آگے بات آئے گی

کہ یہ مناظرہ تھا' یہ مقابلہ تھا۔ اسی لیے فرعون نے اپنے ہاں کے مذہبی پیشواؤں کو بلایا تھا کہ یہ جو دلائل پیش کر رہا ہے' یہ بات سیاست کی نہیں' میرے بس کی نہیں ہے۔ تم آؤ۔ وہ آئے اور وہاں کچھ ہوا جسے مناظرہ کہا جائے گا۔ وہاں دلیل طلبی ہے۔ اُس کے جواب میں وہ یہ کہتے ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ جو چیز ہے کہ وہ سوٹا [1] تھا' وہ ڈال دیا اور وہ سانپ بن گیا اور اُن کی چھوٹی چھوٹی رسیاں تھیں' یہ سانپ اُن کو نگل گیا تو یہ تو سارا کچھ جو تھا' وہ اگر ایسا ہوتا تو یہ دیکھنے کی بات تھی۔ جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ **مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ** (28:36) تم جو کہتے ہو تو ہم نے اپنے آباؤاجداد سے ایسی کوئی بات نہیں سنی ہے۔ یعنی کوئی بات ایسی تھی کہ جس کا تعلق سننے سے تھا' ورنہ وہ کہتے کہ صاحب! یہ جو تماشہ تم دکھا رہے ہو' ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہوا ہے یا ہم نے نہیں دیکھا' جبکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے آباؤاجداد سے سنی ہی نہیں ہے گویا وہ جو اُن کے ہاں آباؤاجداد کا مسلک تھا وہ اُس کے اوپر قائم تھے۔ یہ اُس مسلک کے خلاف کوئی نئی چیز پیش کر رہے تھے۔ اور وہ یہ جواب دے رہے تھے کہ ہم نے تو اِس قسم کی بات اپنے آباؤاجداد سے سنی ہی نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ یہ لے کر گئے تھے وہ برہان تھی' وہ ہدایت تھی' جسے الفاظ میں پیش کیا گیا تھا اور اُنہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ ہم نے تو اِس قسم کی کوئی بات اپنے آباؤاجداد سے سنی ہی نہیں۔ اس لیے ہم اسے نہیں مان رہے۔

خالقِ کائنات کی تعلیم اور نبوت کا مقام اس قسم کی توہم پرستوں سے کہیں بلند تر ہے

لہٰذا یہ بات نہیں ہے کہ وہاں بھی حضرتِ موسیٰ سے کہا گیا کہ اپنا عصا پھینکو' وہ سانپ بن گیا اور وہ بھاگے اور اللہ میاں نے آواز دی کہ چلے آؤ' چلے آؤ' کچھ نہیں ہوگا' اسے پکڑ لو' ہم دیکھ رہے ہیں۔ پھر پکڑ لیا تو وہ عصا بن گیا۔ پھر ہاتھ نکالا تو وہ سفید ہو گیا۔ جاؤ فرعون کی طرف اور اِس کو جا کے یہ سانپ اور ہاتھ دکھاؤ۔ یہ بات بالکل نہیں ہے۔ اور اگر یہی چیز تھی تو ہمارے آپ کے لیے یہ ایک مثال کیسے بن سکتی ہے۔ یہ تو وہیں بات ختم ہو گئی۔ قرآن نے جو بار بار دہرایا ہے اور ہم سے یہ کہا ہے کہ اربابِ فکر کے لیے ان واقعات میں بہت بڑی عبرت کا سامان ہے' بڑی موعظت کا سامان ہے' بڑی ہدایت کا سامان ہے' تو ہمارے لیے یہ موعظت' عبرت اور ہدایت کیسے بن سکتی ہے کہ اُن کا جو سوٹا ہے وہ سانپ بن گیا تھا۔ اس لیے قرآن کے ان مقامات کو ہمیشہ اس انداز سے سمجھنا چاہیے اور قرآن خود دوسرے مقامات میں سمجھاتا ہے۔ اِسے پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ یہ جو بلند سطح کا لٹریچر ہوتا ہے اُس میں محاکات اور مجازات ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اُن کے جو Meanings (معانی) ہیں وہ Literary (لغوی) کے علاوہ مجازی معنی ہیں' جو لیے جاتے ہیں۔ اہلِ زبان سے پوچھنا چاہیے کہ تم

---

[1] لاٹھی

اِس کے کیا معنی لیتے ہو۔ یعنی یہ جو محاکات کی چیز ہے' یہی جو سانپ کی بات ہے۔ تم ان کے لیے کیا معنی لیتے ہو

خیالِ عشقِ بتاں میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

قرآنِ حکیم کے محاکاتی اندازکوانہی تصورات کے تحت سمجھنا ہوگا

اب وہ جو عشق بتاں ہے تو ایک تو وہ بت ہی نہیں ہوتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صاحب! وہ بت اُس کا بنا ہوا تھا۔ تو بتاں کے معنی آپ کو معلوم ہیں کہ محبوب ہے۔ اب یہ جو سانپ نکل گیا ہے تو وہ معشوق یا محبوب تو چلا گیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ سانپ نکل گیا ہے تو اب لکیر پیٹا کر۔ اہلِ زبان سے پوچھو کہ اس محاورے کے تمہارے ہاں معنی کیا ہوتے ہیں۔ یہ ہے جو قرآن بار بار زور دیتا ہے کہ بابا! یہ لسانِ عربیء مبین کی کتاب ہے' اُن عربوں سے پوچھو کہ تم اِس کے معنی کیا لیتے تھے۔ اب اس کا کوئی ترجمہ جو کردے کہ ہاں صاحب! اِس نے کہا یہ ہے کہ میرے گھر میں ایک سانپ تھا' وہ چلا گیا ہے' اب اُس کے بعد اُس کی لکیر ہے' اُس کے سرہانے میں کھڑا ہوا پیٹ رہا ہوں: یا سانپ یا سانپ۔ ترجمہ اس کا انگریزی زبان میں کرلو اور پھر اس کے معنی سمجھ لو کہ کیا بات نصیر کہہ گیا ہے۔ نصیر سے پوچھو' پوچھو اہلِ زبان سے کہ تمہارے ہاں اس محاورے کے معنی کیا ہیں۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن تب سمجھ آتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے کا عرب جو کچھ عربی زبان سے مفہوم لیتا تھا' اُس سے بات صاف ہوجاتی ہے۔ یہ چیستاں نہیں ہے' یہ طلسمِ ہوشربا نہیں ہے۔ یہ برہان دیتا ہے۔ یہ دلیل دیتا ہے' قرآنِ کریم دلیل مانگتا ہے۔ یہاں دھاندلی نہیں ہے' یہاں استبداد نہیں ہے۔ یہ ایک اور محاورے کی بات اِس میں ہے۔ وَ اضۡمُمۡ اِلَیۡکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّہۡبِ (28:32)۔ اب اُس میں کہا ہے کہ اگر وہاں تمہیں خوف نظر آئے تو اپنے ہاتھ کو یوں کرلیا کرنا۔ یعنی اگر یہ وہاں فرعون کے دربار میں گئے اور وہاں تمہیں کسی چیز سے خوف نظر آئے تو اُس سے یوں کرلیا کرنا۔ تو اِس کے کیا معنی ہوئے صاحب؟ یہ قرآنِ کریم میں ہے۔ جناح ''پرندے کے پر'' کو کہتے ہیں۔ ہر پرندہ خوف کے وقت پھڑ پھڑاتا ہے۔ اور اگر اُس کو امن ہوتا ہے تو وہ اطمینان سے اپنے بازو سمیٹتا ہے۔ یہ زبان کا محاورہ ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے اور اطمینان میں ہوتا ہے تو پروں کو سمیٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔ کہا کہ اگر تمہیں وہاں کوئی ایسی چیز نظر آئے جس سے خوف والی بات ہو تو پھڑ پھڑانے کی بات نہیں ہے۔ اطمینانِ قلب رکھو' وہاں جمعیتِ خاطر رکھو' وہاں سکون سے رہنا۔ بڑے صبر آزما مرحلے آئیں گے۔ یہ صبرِ گریزپا کی بات نہیں ہے۔ جمعیتِ خاطر کی بات ہے' اطمینانِ قلب کی بات ہے۔

اس طرح سے وہاں اپنا حوصلہ قائم رکھنا' پھڑ پھڑانا نہیں۔ اس محاورے میں بات صاف ہو جاتی ہے۔ اور پھر بہت دور کی کڑیاں لاتے ہیں کہ وہ یہ کہا صاحب! کہ وہ اپنے ہاتھ یوں رکھنا۔

اہل قرآن کے نزدیک ہاتھ کو یوں کر لیا کرو کے محاورے کا استعمال

اب ہمارے ہاں کی ایک نئی جماعت اہلِ قرآن اٹھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جی' نماز میں قرآن کی ساری جزئیات تک دی ہوئی ہیں' ہاتھ باندھنے کے متعلق بھی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لکھا ہوا ہے کہ اپنے جو ہاتھ ہیں وہ یوں رکھنا۔ تو اس لیے نماز میں چھاتی پہ ہاتھ باندھنا قرآن کا فریضہ ہے۔ عزیزانِ من! ان سے کیا کہا جائے!!! یہاں کہا ہے کہ اطمینان سے جاؤ۔ **فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ** (28:32)۔ یہ برہان ہے' یہ تیرے رب کی طرف سے دلائل ہیں۔ جاؤ کہ **اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ o قَالَ رَبِّ اِنِّىْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ** (28:32-33) کہنے لگے کہ ایک تو بات یہ ہے کہ میں وہاں سے جو بھاگا ہوا ہوں' مجھ سے ایک قتل ہو گیا تھا۔ میں نے وہیں بتایا تھا کہ یہ ایک چیز سہواً ہوئی تھی By chance (اتفاقیہ) ہو گئی تھی لیکن اُنہوں نے ان کے خلاف یہ الزام نہیں بلکہ جرم عائد کیا تھا۔ اور انہیں پہلے سے اِن کے ایک ہمدرد نے اطلاع دی تھی کہ یہاں سے نکل جاؤ' تمہیں گرفتار کرنے کے لیے مشورے ہو رہے ہیں' تمہیں بے گناہ پھانسی پہ چڑھا دیں گے۔ کہا کہ ایک تو یہ چیز آ گئی ہے۔

قتل کے الزام کے علاوہ زبان کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی مجبوری کی وجہ

دوسرے یہ کہ مجھے ایک عرصہ یہاں مدین کے کھیتوں میں' چراہ گاہوں میں' بکریاں چراتے ہوئے ہو گیا ہے۔ کہا کہ یہ جو آپ کی برہان ہے وہاں مجھے ان معاملات کو پیش کرنا ہوگا۔ میری زبان میں وہ فصاحت نہیں رہی۔ یہاں زبان کی فصاحت کی بات ہے' ورنہ عصا کے سانپ بننے میں اِس کی زبان کا کیا تعلق تھا۔ وہاں کہا کہ **وَ اَخِىْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا** (28:34) میرا بھائی ہارون علیہ السلام ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے۔ اس لیے اُس کو میرے ساتھ بھیج دے: **فَاَرْسِلْهُ مَعِىَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِىْٓ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ** (28:34)۔ باتیں صاف ہوتی جا رہی ہیں کہ وہاں جا کر مکالمہ ہے' مناظرہ ہے' باتیں ہونی ہیں' دلیلیں پیش کرنی ہیں۔ کہا کہ مجھے یہ نظر آتا ہے کہ وہ ہر بات میں مجھے جھٹلائیں گے اور بات وہاں لسان کی ہوگی' بات وہاں بات کرنے کی ہوگی اور اُس کے لیے فصاحت اور بلاغت نہایت ضروری ہے۔ میں بکریاں چراتے چراتے بھول ہی گیا ہوں کہ محاورہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے اگر وہاں زبان کی غلطی کر دی تو اِسی پہ گرفت ہو جائے گی' مذاق اڑ جائے گا۔ اس لیے ایک تو میری یہ کمزوری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ باتیں

کرنے کا معاملہ آ رہا ہے۔ یہ سوٹے [1] پھینکنے کی بات نہیں ہے۔ بھائی کو کیوں مانگا جا رہا ہے کہ اُسے میرے ساتھ کر دیجیے۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے، اُس میں فصاحت ہے، ورنہ اگر وہ یہی سانپ بنا کے اور ہاتھ دکھا کے جیتنے والی بات تھی تو کسی دوسرے کے ساتھ جانے کا سوال ہی نہیں تھا، نہ فصاحت کی ضرورت تھی، نہ بلاغت کی ضرورت تھی۔ کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ دلائل کے اعتبار سے قدم قدم پہ وہ جھٹلائیں گے۔ میرے بھائی کو میرے ساتھ کر دیں۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَاۤ (28:35) ہمارے یہ قوانین اُن کے سامنے لے جاؤ، پیش کرو، ڈرو نہیں۔ ان کا جواب اُن سے نہیں بن پڑے گا، تمہی غالب رہو گے۔ تمہارا بھائی تمہارے ساتھ دیدیتے ہیں۔ ٹھیک ہے اِس کی ضرورت بھی ہے کہ وہاں زبان تھوڑی سی صاف ہونی چاہیے، فصاحت ہونی چاہیے۔ وہ شہر کے رہنے والے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تم یہاں اتنا عرصے تک بکریاں چراتے رہے ہو۔ ٹھیک ہے بھائی کو لے جاؤ۔

فصاحتِ زباں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تاریخی افسانے

اب ہمارے ہاں جو افسانے چلے کہ جی وہ حضرتِ موسیٰ نے کیوں بھائی کو مانگا تھا؟ اس لیے کہ وہ ہکلاتے تھے کیونکہ وہ بچپن میں فرعون کے محل میں پہنچے ہیں تو وہ ان کو گود میں کھلا رہا تھا، انہوں نے کھیلتے کھیلتے اُس کی داڑھی پکڑ لی۔ اور اُس کو غصہ آ گیا۔ کہا کہ اِس کو قتل کر دو۔ وہ درباری تھے، وہ کچھ اِن کی طرف کے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ جان کی امان پائیں تو عرض کریں کہ شہنشاہِ پناہ! یہ بچہ ہے اِس کو کیا پتہ ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگا کہ نہیں، یہ بچہ والی بات نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ابھی بات صاف ہو جاتی ہے۔ اُنہوں نے آگ کے کچھ انگارے رکھے۔ حضرتِ موسیٰ نے آگ کا انگارہ اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ اس طرح اُن کی زبان جل گئی اور اُس کے بعد یہ ہکلاتے رہے۔

آپ دیکھیے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ (28:34)۔ ارے بابا! لفظ دیکھو کہ فصاحت ہے۔ کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ ہکلاتے ہیں اور ہکلانا تو پھر محاورہ یاد آ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں والے تو محبوب کی، معشوق کی ہر ادا میں ایک انداز دیکھتے ہیں۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں۔ ہکلانے والا محبوب ہو تو وہ تو آدھی سی بات کرتا ہے۔

بات آدھی مگر اثر دونا
کیسی لکنت زبان میں پائی

---

[1] لاٹھی

وہ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ کہہ رہے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ ہکلاتے ہیں بلکہ افصح منی کی بات ہے۔ اور قرآن کو تو دیکھو وہ بات فصاحت کی کرتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے پاس یہ عصا کتاب مبین کے قوانین ہی تھے

بہر حال کہا کہ کوئی بات نہیں۔ غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔ پھر بـاٰیٰتِنـا کہا ہے۔ قوانین کی بات ہو رہی ہے کہ جاؤ' ان قوانین کو پیش تو کرو۔ تم دیکھو گے کہ تم ہی وہاں غالب آؤ گے۔ اَنۡتُمَـا وَ مَـنِ اتَّبَـعَـكُـمَـا الۡغٰلِبُوۡنَ (28:35) تم بھی اور تمہارے Followers (متبعین) بھی غالب آؤ گے فَـلَـمَّـا جَـآءَ هُمۡ مُّوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ (28:36)۔ سوچو تو سہی کہ یہ جو اس طرح سے ایک جادو کے زور کے اوپر عصا کو سانپ بنا دیا جائے' اول تو وہ بینات' محکم واضح دلائل کو کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے قرآن کو کہا ہے کہ یہ بین ہے' یہ ہماری آیات مبین ہیں' واضح ہیں' غیر مبہم ہیں۔ موسیٰؑ اُن کے پاس جو کچھ لے کر گئے تھے وہ خدا کے بیِّنٰت تھے' قوانین تھے۔ یہ تمام رسولوں کے متعلق ہے کہ لَـقَـدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ (57:25) ہم نے اپنے رسولوں کو بیِّنٰت کے ساتھ بھیجا ہے۔ باقی رسولوں کو سانپ کے ساتھ تو نہیں بھیجا تھا۔

کسی رسول نے کسی سانپ کے ذریعے کامیابی حاصل نہیں کی

بیِّنٰت واضح دلائل کو کہتے ہیں۔ قَـالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًى (28:36) کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے' یہ فریب ہے جو تم کہتے ہو کہ میں خدا کی طرف سے تمہاری طرف احکام لے کر آیا ہوں۔ اور تم جو یہ قوانین' یہ احکام پیش کر رہے ہو وَ مَـا سَـمِعۡنَا بِهٰذَا فِىۡۤ اٰبَـآئِـنَا الۡاَوَّلِيۡنَ (28:36) یہ اس قسم کی تعلیم ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے کبھی آج تک سنی ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! وہی ایک دلیل ہے جو مذہب پرست طبقے کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ایک ہی دلیل ہوتی ہے کہ یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔

ہمارے ہاں اسلاف کا معیار

آپ کو پتہ ہے کہ اسلاف کون ہوتے ہیں؟ یہ جو اِس وقت کے ہمارے ہاں کے علمائے کرام ہیں' ان کی آپس میں جس قدر مخالفت ہوتی ہے' گالی گلوچ' سبّ وشتم' جو تم پیزار ہوتا ہے۔ یہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔ جب تک وہ جیتا ہے یہ اُس کو ہدفِ طعن وملامت بناتے ہیں اور کفر کے فتوے لگاتے ہیں اور جب وہ مرجاتا ہے تو ایک ہی سانس کے رکنے سے وہ اسلاف کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کی ہر بات سند ہو جاتی ہے۔ یعنی اسلاف وہی ہیں جو اِس سے پیشتر فوت ہو گئے ہوئے علماء ہیں۔ ان کے ہاں جو زندہ ہوتا ہے وہ تو سند نہیں ہوتا۔ جب وہ مرجاتا ہے تو سند ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی موت کے اوپر جتنا زیادہ

عرصہ گزرتا جاتا ہے وہ سند اتنی ہی زیادہ پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ دلیل ہی یہ ہے۔ اور قرآن نے بار بار دہرایا ہے کہ ہم جب بھی ان کے سامنے دلائل پیش کرتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ نہیں صاحب! ہمارے اسلاف نے یہ بات نہیں کہی' یہ اُن کے مسلک کے خلاف ہے۔ اور قرآن کہتا ہے کہ خواہ وہ اسلاف جہنم کی طرف ہی کیوں نہ ان کو بلا رہے ہوں' پھر بھی ان کے لیے سند وہ اسلاف ہی ہیں۔ تو یہ آج کی بات نہیں ہے۔ جب بھی کسی نبی نے اپنا انقلابی پروگرام پیش کیا ہے' اُنہوں نے جواب میں کہا کہ یہ اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔

ہمارے نزدیک تو حجت قرآنِ حکیم ہے' اسلاف کے اقوال نہیں

آج بھی آپ کسی کے سامنے کوئی قرآن کی چیز پیش کر دیجیے تو جواب یہ ہوگا کہ صاحب! یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔ پہلی چیز جو پیش کیجیے تو یہ کہا جائے گا کہ کسی نے یہ پہلے بھی کہا تھا؟ خدا کی کتاب ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہی دلیل ہے' یہ حجت ہے۔ اس پہ ایمان لانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اسلاف کے اقوال کے اوپر ایمان لانے کو تو نہیں کہا گیا۔ قرآن کی بات پیش کیجیے اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمارے اسلاف کا مسلک اس کے خلاف ہے۔ اور جب کہیے کہ یہ تو قرآن میں یوں ہے تو کہیں گے کہ وہ بھی تو قرآن سمجھتے تھے' ہم سے بہتر قرآن سمجھتے تھے تو کیا اب یہ ہمارے لیے بیکار ہو گیا؟ کیا اللہ میاں نے اس کو قیامت تک کے لیے بیکار محفوظ رکھا؟ کہا کہ ہم نے تو اپنے اسلاف سے یہ نہیں سنا۔ **وَ قَالَ مُوۡسٰی رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡہُدٰی مِنۡ عِنۡدِہٖ وَ مَنۡ تَکُوۡنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ** (28:37) کہنے لگے کہ یہ جو کچھ تم مقابلے میں کہہ رہے ہو کہ یہ ہمارے آباؤاجداد کے مسلک کے خلاف ہے تو کہا کہ بہرحال میں تو خدا کی طرف سے یہ بات لایا ہوں اور وہ جانتا ہے کہ کون ہدایت کا راستہ لے کر آیا ہے۔ یہ ہدایت کا راستہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ اس میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ دعویٰ کیا ہے۔

قانون کی Defintion (تعریف)

اب قبل اس کے کہ میں یہ دعویٰ عرض کروں' قانون کی Definition (تعریف) میں پیش کروں تو اُس سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ قانون یہ ہوتا ہے کہ ''اگر یہ کرو گے تو اِس کا نتیجہ یہ ہوگا۔'' اور ہمیشہ یہ ہوگا۔ اسے قانون کہا جاتا ہے۔ اگر آگ میں انگلی ڈالو گے تو انگلی جل جائے گی۔ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاکت ہو جائے گی' پانی پیؤ گے تو پیاس بجھ جائے گی۔ اگر یہ چیز ایک ہی دفعہ کسی سے کہی جائے تو وہ حکم ہوتا ہے۔ کہ جاؤ میاں! میری چٹھی وہاں چھوڑ آؤ' چھوڑ آؤ گے تو تمہیں ایک روپیہ دے دیا جائے گا۔ اور اگر یہ ہو کہ جب بھی چٹھی چھوڑو تو تمہیں ایک روپیہ مل جائے گا تو یہ قانون ہو جاتا ہے۔ قانون کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ

''If-Then-Always'' قوانینِ فطرت جو ہیں وہ سارے اس Definition (تعریف) پہ پورے اترتے ہیں۔ اور انسانوں کی زندگی کے لیے جو قرآن نے قوانین دیئے ہیں وہ بھی سب اس Definition (تعریف) کے اوپر پورے اترتے ہیں۔ ''اگر یہ کرو گے تو یہ ہوگا اور ہمیشہ یہ ہوگا۔'' کہا کہ ٹھیک ہے اس وقت تو تمہارے پاس قوت بھی ہے، شوکت بھی ہے، حشمت بھی ہے۔ اس کے بل بوتے کے اوپر تم یہ سب من مانی کر رہے ہو، میرے متعلق تم کہہ رہے ہو کہ ایک محکوم قوم کا غریب سا انسان ہے۔ تمہارے پاس ہے کیا؟ صاحبِ قوت یہی کچھ کہا کرتے ہیں۔ لیکن کہا کہ یہ نظر آ جائے گا کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (28:37) آخرالامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے، یہ معلوم ہو جائے گا۔ اور کہا کہ اِس کے لیے خدا کا ایک قانون ہے، وہ سن لو۔ یعنی یہ نہیں کہا ہے کہ میں دھاندلی سے کچھ سوٹا[1] پھینکوں گا، وہ عصا سانپ بن جائے گا، اُس کے بعد پھر دیکھو کامیابی کس کی ہے بلکہ یہ کہا کہ یہ خدا کا قانون ہے۔

عزیزانِ من! قانون قیامت تک کے لیے قانون ہوتا ہے۔ سورج حضرت موسیٰ کے وقت بھی مشرق سے طلوع ہوتا تھا، مغرب میں غرب ہوتا تھا، آج بھی اُسی طرح سے ہو رہا ہے۔ یہ قانون ہے۔ قانون بتایا یہ جا رہا ہے۔ حضرتِ موسیٰ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں کہ تم دیکھنا کہ انجامِ کار کامیابی کس کی ہوتی ہے۔ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں، کس بنا پہ کہہ رہا ہوں؟ اس بنا پر کہہ رہا ہوں کہ قانون یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (28:37) قانون یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ فرعون کے سامنے جا کر یہ کچھ کہا۔ کہا کہ یہ نہ دیکھو کہ میں ایک غریب چرواہا آ گیا ہوں اور یہ باتیں تمہارے ساتھ کر رہا ہوں۔ یہ میری باتیں نہیں ہیں۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ سنکھیا کھانے والوں کی انجام کار ہلاکت ہوگی۔ یہ غریب کہے، امیر کہے، باہر کا کہے، یہاں کا کہے، ہوتا یہی ہے۔ اور میں جو سنکھیا کھانے والے سے کہہ رہا ہوں کہ مر جاؤ گے تو یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ قانون یہ ہے کہ سنکھیا کھانے والا مر جائے گا۔ میں تو ایک قانون تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

قانون کیا ہے؟ عزیزانِ من! قانون یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (28:37)۔ یہ ابدی قانون ہے، قیامت تک کے لیے ہے کہ ''ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی'' لیکن اگر اُس نے ''جو'' کا بیج ڈالا تھا، چھ مہینے اُس کی پرورش کرتا رہے تو اُس کے خوشوں اور بالوں میں گیہوں تو نہیں آ جائے گا۔ جو جی میں آئے کرلو اُس میں تو ''جو'' ہی لگے گا۔ کیونکہ یہ قانون ہے۔ تو میں جو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ ''جو'' ہوگا اور تم کہتے جا رہے ہو کہ ''گیہوں'' ہوگا۔ وہ کہے گا کہ کیا تم یہ پیشن گوئی کر رہے ہو۔ وہ کہیں گے کہ نہیں، یہ پیشن گوئی نہیں ہے بلکہ قانون یہ ہے کہ ''جو'' بوؤ گے تو ''جو'' ہی اگیں گے۔ یہ قانون ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (28:37)۔ عزیزانِ من! یہ ابدی قانون ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ اور یہاں پھر ظلم کا لفظ آیا ہے۔

---

[1] لاٹھی

ظلم کا مفہوم

یہ بھی اپنے ذہن میں ہمیں تصور نہیں کر لینا چاہیے کہ ظلم کسے کہتے ہیں۔ یہ عربوں سے پوچھو۔ اُن کے ہاں ظلم کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''جس چیز کا جس مقام پہ ہونا چاہیے' اُس کا وہاں نہ ہونا'' کسی نااہل کا اہلیت کی جگہ پہ ہونا یہ بھی ظلم ہے' کسی اہل کا وہاں نہ ہونا یہ بھی ظلم ہے۔ کیا بات تھی اِس قوم کی! میں کہتا کہ یہ اس قدر جامع الفاظ بنا کے لے آئے تھے۔ ویسے آپ ظلم کے معنی بیان کرتے جایئے' اُس کے اندر جتنی جزئیات چاہیں لیتے آیئے' لیکن بات اُس کے اندر جامع یہی ہوگی کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔ اور جس نظام میں یہ بات ہو جائے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ نظام پنپ نہیں سکتا۔ تو فرعون! میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انجام کار تمہاری تباہی ہے۔ اُس کا قانون یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپا نہیں کرتی۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے نزدیک اصل سوال حقِ حکومت کا تھا یعنی الٰہ خدا کو تسلیم کروانا تھا

سوال یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ فرعون سے کیا بات کر رہے تھے؟ کیا پیش کر رہے تھے' کیا دعویٰ کر رہے تھے؟ کیا بات تھی جس سے اُس کو اتنی چڑ آ رہی تھی؟ یہ الفاظ اُس کے سامنے آ گئے کہ بات کیا ہو رہی ہے۔ آج کی اصطلاح میں یہ کوئی مذہبی جھگڑا نہیں تھا' مسئلے مسائل کی بات نہیں تھی۔ یہ تو سوال یہ تھا کہ حقِ حکومت کس کو حاصل ہے۔ انبیائے کرام یہ بات کہنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ **وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ** (28:38)۔ اہلِ دربار کی طرف منہ کر کے کہا۔ پہلے یہی لفظ اِلٰہ لے لیجیے تو وہاں سے بات سمجھ میں آ جائے گی کہ وہاں بات ہو کیا رہی تھی۔ اب یہاں اِلٰہ کا لفظ آیا ہے۔ فرعون نے کہا کہ تم جانتے اور میرا دعویٰ بھی یہ ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ میرے سوا تو کوئی دوسرا اِلٰہ نہیں ہے۔ تو گویا نظر آیا کہ حضرتِ موسیٰ اُسے کہتے تھے کہ تُو اِلٰہ نہیں ہے' اِلٰہ اور ہے۔ اُس نے اہلِ دربار سے کہا اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہاں تو کوئی اور اِلٰہ نہیں ہے۔ اب ہمارے ہاں اِلٰہ کے معنی ''پرستش کے لائق'' کے ہو گئے۔ فرعون کی پرستش تو وہ کرتے ہی نہیں تھے' یہ تو خود سورج دیوتا کی پرستش کرتے تھے [1] ''رع'' سورج دیوتا کو کہتے ہیں۔ اسی لیے ان کو فرعون کہتے تھے۔ وہ سورج دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ یہ تو خود اپنی پرستش نہیں کراتا تھا۔ تو اِلٰہ کے معنی انہوں نے یہ کر دیئے

---

[1] فرعون کسی خاص بادشاہ کا نہیں' بلکہ شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ''آمن رع'' (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال (ق م) سے لے کر سکندر کا زمانہ (332 ق م) تک فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسرِ حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961' ص ص۔ 1568 تا 1569۔

کہ جس کی پرستش کی جائے۔ اب اگر یہ بات ہوتو وہ اہلِ دربار سے یہ کہہ رہا ہے کہ بھئی! یہاں تو سارے میری پرستش کرتے ہیں۔ اور یہ کہہ رہا ہے کہ کسی اور کی پرستش کرو۔ تو کیا بات پرستش کی تھی؟

قرآنِ حکیم تفسیروں اور ترجموں سے سمجھ میں نہیں آ سکتا

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی طرف واپس آ ؤ' تفسیروں اور تراجم کے ذریعے سے نہیں' تو بات ساری واضح ہوجائے گی۔ قرآن سے پوچھو کہ اِلٰہ کس کو کہتے ہیں۔ یہاں فرعون نے کہا ہے کہ اس مصر میں میرے سوا تو کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ دوسری جگہ اُس نے پھر اس کی وضاحت کی کہ وَنَادٰی فِرۡعَوۡنُ فِیۡ قَوۡمِهٖ (43:51) وہاں (28:38) میں تو صرف اہلِ دربار سے کہا تھا' یہاں یہ ہے کہ اُس نے سارے ملک میں منادی کرادی' اُس نے ڈھنڈورا پٹوادیا' اعلان کرادیا۔ آج کی اصطلاح میں ریڈیو ٹیلیویژن کے اوپر دکھادیا۔ گویا نظر آتا ہے کہ یہ خطرہ کوئی اتنا بڑا تھا کہ اُس کو سارے ملک میں اپنے Defence (دفاع) میں' اپنی مدافعت میں' یہ Publicity (تشہیر) کرنا پڑی' یہ پروپیگنڈہ کرنا پڑا کہ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ گویا یہ بات تھی کہ حضرتِ موسیٰ کہہ رہے تھے کہ تُو اِلٰہ نہیں ہوسکتا بلکہ اِلٰہ خدا ہے۔ وہاں تو صرف اپنے درباریوں سے کہا ہے۔ یہاں اُس نے سارے ملک میں پروپیگنڈہ کردیا کہ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَيۡسَ لِیۡ مُلۡكُ مِصۡرَ (43:51) قوم سے اس نے کہا کہ کیا اس مصر کی سرزمین کی ملکیت میری نہیں ہے؟ یعنی میری ہے۔ یہاں اِلٰہ کے معنی آ گئے۔ دیکھا قرآن کس طرح اپنے معنی واضح کرتا ہے۔ وہاں اِلٰہ کہا تھا کہ میرے سوا اِلٰہ نہیں ہے۔ یہاں یہ بتایا کہ اِلٰہ کے معنی کیا ہیں۔ اَلَيۡسَ لِیۡ مُلۡكُ مِصۡرَ (43:51) یہ اس مصر کی مملکت' یہ سرزمین' یہ خطہ' کیا میری ملکیت نہیں ہے۔ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ (43:51) اور یہ دریا' یہ پانی کے چشمے' یہ نہریں' جن کے اوپر تمہاری کھیتی کا دارومدار ہے' کیا یہ میری ملکیت نہیں ہے۔ تو اگر میری ملکیت ہے تو پھر تو اِلٰہ میں ہوں۔ اور یہ مجھے کہتا ہے کہ تُو یہاں کا' اِلٰہ نہیں ہے' اِلٰہ کوئی اور ہے۔ یعنی یہ کسی اور کی ملکیت ہیں' یہ میری ملکیت ہی نہیں ہیں۔

الٰہ کا مفہوم لا اِلٰہ کے الفاظ میں مضمر ہے

عزیزانِ من! یہی بات تو تھی جو مجھ سے اور آپ سے اور قرآن کے ماننے والوں سے کہا تھا۔ پہلا فقرہ تھا کہ کہو: لا الٰہ. ساری دنیا کے جو' اِلٰہ تھے ان کی نفی تھی۔ وسائلِ رزق کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے: لا الـــــٰـــہ. یہ تو نفی ہے کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے' اس سے تو Anarchy (انتشار) کی پھیل جائے گی۔ ساتھ کہا کہ الا اللہ. اِلٰہ اللہ ہے۔ عزیزانِ من! کیا ہمارا ایمان یہ ہے جو ہم لا الـہ الا اللہ پکارتے ہیں؟ اِلٰہ کے معنی ہیں صاحبِ اقتدار' صاحبِ حکومت' جس کی ملکیت سب کچھ ہو۔ ایک لفظِ ملکیت میں وہ ساری بات کہہ گیا کہ

جب یہ زمین میری ہے' یہ پانی میرا ہے' یہ نہریں میری ہیں' یہ کھیتیاں میری ہیں' سامانِ رزق میرا ہے' تو یہاں اقتدار کسی اور کا کیسے ہوسکتا ہے؟ جس کی ملکیت میں روٹی ہے وہی صاحبِ اقتدار ہے۔

فرعون نے اپنے آپ کو رب کہا تھا

اسی لیے اُس نے کہا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) اُس نے اپنے آپ کو رب کہا تھا۔ رب کے معنی ''روٹی دینے والا ہی'' تو ہے۔ روٹی تو تمہیں میں دیتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ اِلٰہ کوئی اور ہے۔ یہ زمینیں میری ہیں' یہ پانی میرے ہیں' یہ کھیتیاں میری ہیں' یہ اناج میرا ہے۔ میں ہوں رب۔ اب بھی دکھایا جاتا ہے وہ جو مغلیہ دور کا' اَن داتا ہے۔ یعنی بادشاہ کو کہتے تھے' راجوں کو کہتے تھے۔ ان کے لیے لفظ ہی اَن داتا تھا۔ اصل چیز ''اَن'' ہے۔ یہ ہے ترجمہ جو اُس نے کر کے بتا دیا۔ یہ کہتا ہے کہ تُو اِلٰہ نہیں ہے۔ کہو کہ کیا تمہارا ''اَن'' میرے ہاتھ میں ہے یا نہیں؟ اور جس کے ہاتھ میں ''اَن'' ہے' اِلٰہ وہی ہے۔ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ (28:38) میں تو اپنے مملکت کے اندر کسی کو بھی نہیں جانتا کہ یہ کسی اور کی ملکیت میں ہوں۔ اُس نے سارے ملک میں پروپیگنڈہ کرا دیا کہ کیا یہ میری ملکیت نہیں ہیں؟ نظر آیا کہ حضرتِ موسیٰ وہاں اِس بنا پہ بغاوت پھیلا رہے تھے کہ یہ شخص باطل پر ہے' یہ فریب کار ہے۔ یہ ملکیت اِس کی ہو نہیں سکتی۔ یہ اُس کی ملکیت ہے جو رب العٰلمین ہے۔ اِس فرعون کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ قبطیوں [1] کو تو ''اَن'' ملتا ہے اور ساری بنی اسرائیل کو اِس نے محکوم اور محتاج بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ اِلٰہ ہوگا جو قبطیوں اور بنی اسرائیل سب کا اِلٰہ ہوگا۔ تو جب اس کی الوہیت کو یوں ختم کیا جا رہا ہے تو کیا وہ آرام سے بیٹھتا۔ بات یہ ہو رہی تھی۔ یہ مذہب کا مناظرہ نہیں تھا۔ سوچیے تو سہی کہ کیا وہ سوٹے کو سانپ بنا کے دکھانے سے یہ باتیں سامنے آتیں۔

اب وہ آگے بات آتی ہے۔ دلائل ختم ہو جاتے ہیں۔ ظالم کے پاس دلیل نہیں ہوتی۔ حساب کے قاعدے سے' دلیل و برہان سے' اُس کو قائل کرتے رہیے لیکن وہ کہے گا کہ ''ستیں ویہہ سو ہدنداے''۔ [2] اُس کے پاس دلیل نہیں ہوتی بلکہ دھاندلی ہوتی ہے' استبداد ہوتا ہے۔

اگر دلیل نہ ہو تو انسان استہزا پہ اتر آتا ہے: استہزا اور غصہ میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے

قرآن نے ایک عجیب بات کہی ہے۔ کہتا ہے کہ استبداد کے پاس جب دلیل نہیں ہوتی تو وہ پھر استہزا پہ اتر آتا ہے' مذاق کرتا ہے'

---

[1] مصر کا پرانا نام ''قبط'' تھا۔ اس کے باشندے ''قبطی'' کہلاتے تھے۔

[2] سات بیس کا ایک سو بنتا ہے یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

تمسخر کرتا ہے' منہ چڑاتا ہے۔

عزیزانِ من! استہزا کمینگی کی انتہا ہوتی ہے۔ جب دلیل ختم ہوتی ہے تو دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یا تو غصہ آتا ہے یا استہزا لیکن غصے میں پروپیگنڈہ نہیں ہوسکتا' یہ جو استہزا ہے' اگلے کا مذاق اڑانا ہے' تمسخر اڑا دینا ہے۔ اس سے بڑا پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔ اگر مذاق کا ایک فقرہ کسی کے خلاف کہہ دیا جائے تو وہ عام ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ جس کے پاس دلیل نہیں ہوتی قرآن نے کہا ہے کہ وہ پھر استہزا پہ اتر آتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کمینگی کی انتہا ہوتی ہے اور واقعی یہ بڑی انتہا ہوتی ہے۔ فرعون کی یہ کیفیت ہوگئی کہ سامنے سے جواب نہیں بن پڑا۔ تو کیا کہا؟ یہ کہ **فَاَوۡقِدۡ لِیۡ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیۡنِ فَاجۡعَلۡ لِّیۡ صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوۡسٰی وَ اِنِّیۡ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ** (28:38)۔ یہ بار بار کہہ رہا ہے کہ الٰہ جو ہے وہ تو خدا ہی ہوسکتا ہے اور فرعون دلیل کا جواب دلیل سے نہ دے سکا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ جتنا ملوکیت کا' سرمایہ داری کا نظام ہے' یہ مذہبی پیشوائیت کے سر پہ قائم ہوتا ہے۔ یہاں دیکھئے قرآن ایک لفظ میں ساری بات کہہ جاتا ہے۔ فرعون نے اہلِ دربار سے تو یہ کہا کہ تم بتاؤ یہ مملکت کس کی ملکیت ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ حضور آپ کی ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی زبانی فرعون کی طرف سے تمسخر کی ایک جھلک

اِدھر جب فرعون تمسخر پہ اترا ہے تو وہ جو ہامان ہے' جو مذہبی پیشوائیت کا سربراہ ہے' اس سے کہہ رہا ہے کہ ہامان! یہ بہت خدا کی باتیں کہہ رہا ہے اور کہتا ہے کہ وہ آسمان پہ ہے' ذرا پکی اینٹوں کا ایک تھوڑا سا منارہ بنوایئے' میں ذرا اُس منارے پہ چڑھ کر جھانک کے تو دیکھوں کہ جس کو یہ خدا کہتا ہے وہ ہے کہاں۔ یہ کچھ ہامان سے کہہ رہا ہے۔ گویا یہ جو چیز ہے کہ دوسرے کے مذہب کے خلاف مذاق یا استہزا اڑانا' وہ مذہبی پیشوائیت کی زبان سے کرایا جاتا ہے۔ وسائلِ رزق کی ملکیت کا سوال تو جو اپنے سردار اور اہلِ دربار تھے' وہ اُن کی وساطت سے بات کروائی کہ بتاؤ کہ یہ کس کی ملکیت ہے لیکن یہ جو مذہب کی دنیا کے اندر دوسرے کا مذاق اڑانا ہے وہ مذہبی پیشوائیت ہی کے Through (ذریعے) کروایا جاسکتا ہے۔ اس لیے قرآن نے یہاں بتایا ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ ہامان! ذرا ایک منارہ سا بنایئے' میں جھانکوں تو سہی کہ اس کا خدا کیسا ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پہ اس استہزا کا کہا ہے کہ وہ استہزا پہ اتر آتے ہیں۔ **اَللّٰهُ یَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ** (2:15) یہ مذاق اڑاتے ہیں لیکن ان کا مذاق اڑتا ہے۔ **وَ یَمُدُّهُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ** (2:15) یہ مذاق اپنی قوت کے نشے میں کرتے ہیں۔ اور نشے کی کیفیت یہ ہے کہ جب وہ اترنے لگے تو وہ اور پی لیتا ہے' وہ اور چڑھتا ہے حتّٰی کہ وہ ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ یوں کرتے ہیں۔ اور ہم ان نشے بازوں کی یہ درگت بنایا کرتے ہیں کہ **یَمُدُّهُمۡ** (2:15)۔ بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ آج ایک پیگ پینے سے نشہ ہوا ہے تو کل ایک سے نہیں ہوتا پھر دو پینے پڑتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ یہ نشے کی حالت

میں یہ مذاق کرتا ہے تو نشے والا تو بہت مذاق کرتا ہے: نشہ خواہ شراب کا ہو، خواہ قوت کا ہو۔ کیا باتیں قرآن کہہ جاتا ہے کہ نشے کی تو کیفیت یہ ہے: **یَمُدُّهُمْ** اور پینا پڑتا ہے، پھر اور پیتا ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ **فِیْ طُغْیَانِهِمْ** (2:15) طغیان کے معنی سرکش ہیں، مدہوشی کے اندر بڑھتے چلے جانا۔ یہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ **یعمهون** کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس طرح سے بڑھتے چلے جانا کہ راستہ گم ہوا ہوا اور بڑھتا چلا جائے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں اِس کو استہزا کر لینے دیجیے۔ **وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ** (28:39) یہ سارا کچھ وہ کر رہا تھا: وہ استکبار تھا، غرور تھا، تکبر تھا۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ بات تو اتنی ہی کہنے کی تھی کہ تکبر و استکبار تھا۔ استکبار کبریائی قوت حاصل کرنا غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے تو گویا یہ چیز جو ہے یہ بجائے خویش غلط چیز ہے، قابلِ ملامت ہے۔

تکبر کا قرآنی مفہوم کبریائی ہے

کیا قرآن نے اس استکبار کو حرام قرار دیا ہے؟ ہمارے ہاں تو تکبر کا ہی لفظ بولا جاتا ہے۔ تکبر کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کی بات ہے۔ تو تکبر تو بڑی بری چیز بولی جاتی ہے۔ یہ وہیں سے استکبار ہے۔ اور یہ جو تکبر کو اتنا بُرا کہنے والے ہیں، اُن سے کہو کہ خدا کی ایک صفت ''المتکبر'' (59:23) ہے۔ تو اگر یہ اتنی ہی بری چیز ہے (معاذ اللہ) تو یہ خدا اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ المتکبر ہے۔ اگر یہ ابلیس ہی کی چیز ہے تو یہ تو خدا اپنے متعلق کہہ رہا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ کبریائی ہے، غلبہ ہے، قوت ہے۔ یہ جو نظامِ خداوندی ہے اُس میں یہ ہوتا ہے کہ اُس کے نظام کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ تو وہ غلبہ ہی تو ہے جسے آپ حکومت کہتے ہیں، قانون کو نافذ کرنا کہتے ہیں، جسے آپ قانون کی حکومت کہتے ہیں۔ اسی کا نام کبریائی ہے۔ خدا المتکبر ہے کے معنی یہ ہیں کہ جو غلبہ اور حکمرانی ہے وہ صرف خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ کائنات کے اندر اُسی کے قانون کی ہے اور کائنات جو انسانوں کی کائنات ہے تو اِس میں یہ نظام انسانوں کے ہاتھوں سے عمل میں بھی آئے گا اور قائم بھی رہے گا۔ اس اعتبار سے یہ جو خداوندی کبریائی ہے یہ انسانوں کے ہاتھوں سے مسلط ہوتی ہے۔ دیکھیے ایک لفظ میں قرآن کیا بات کہہ گیا ہے۔

استکبر کے معنی تو یہ ہو گئے کہ اُس نے ''تکبر'' اختیار کیا، غلبہ اختیار کیا، قوت اختیار کی۔ تو کیا یہ بری بات تھی؟ حق کے لیے غلبہ حاصل کرنا عین صفتِ خداوندی ہے۔ جو **بغیر الحق** کرنا ہے، یہ فرعونیت ہے۔ استکبار، قوت اور غلبہ بجائے خویش کوئی حرام چیز یا ناجائز یا مذمت والی چیز نہیں ہے، بجائے خویش قوت، دولت، استکبار نہ تو حرام ہوتے ہیں، نہ حلال ہوتے ہیں۔ یہ تو تلوار ہوتی ہے۔ اس کا جو استعمال ہے وہ اِس کو حلال اور حرام بناتا ہے۔ تلوار، قوت ہے وہ قابلِ مذمت یا قابلِ تعریف چیز نہیں ہے۔ تلوار اگر مظلوم کے سینے میں گھونپ دی جائے تو اس کا استعمال حرام ہے، اگر ظالم کا ہاتھ کاٹ دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے تو یہ نہ صرف جائز ہو گیا بلکہ عینِ فرض ہو گیا۔ اسی لیے

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ہم نے کتابیں نازل کیں، انبیاء بھیجے۔ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ (57:25) اور اُس کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی بھیجی۔ اگر یہ انبیائے کرام کے ہاتھ کے اندر ہے تو خدا کی صفتِ متکبر کی نمود کے لیے ہے اور اگر فرعون کے ہاتھ میں ہے تو ابلیس والا تکبر ہے، استکبار بغیر الحق ہے۔ کہتا ہے کہ یہ استکبار انسانوں کو کیوں پاگل کر دیتا ہے؟ کیوں اُس کی سمجھ میں بات نہیں آتی؟ وہ اس لیے کہ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ اِلَیۡنَا لَا یُرۡجَعُوۡنَ (28:39) انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون پوچھ سکتا ہے، مجھ پہ کون گرفت کر سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بھول جاتا ہے، اُس کو نظر تو نہیں آتا لیکن اُس کا ہر قدم ہمارے قانون کی طرف اٹھتا چلا آ رہا ہوتا ہے۔ اُسے یہ نظر نہیں آتا، وہ بھول جاتا ہے۔ یہ ہے اِلَیۡنَا لَا یُرۡجَعُوۡنَ ۔

اناللہ وانا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں ہر موت پہ کہتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ (2:56)۔ اُس کے معنی ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی طرف جانا۔ یعنی اللہ میاں کہیں ہے اور آدمی مرنے کے بعد اُس کی طرف جاتا ہے۔ اگر میں عرض کروں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''خدا کے قانونِ مکافات کی طرف انسان کا قدم اٹھتا ہے''۔ ہر قدم اُس کی طرف اٹھتا ہے۔ اپنی دانست میں وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مجھے کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے، پکڑنے والا نہیں ہے، مواخذہ کرنے والا نہیں ہے۔ یہ مجرم مفرور ہوتا ہے اور مطمئن ہوتا ہے کہ کوئی پولیس والا مجھے پکڑ نہیں سکتا۔ کہا کہ ٹھیک ہے اپنے ذہن میں یہ یہی سمجھتا ہے لیکن اِس کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ اس ناواقفیت میں اس کا ہر قدم تھانے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ رات بھر اس وہم میں مبتلا چلا جا رہا ہے کہ میں پولیس کی دستبرد سے بہت دور ہوں لیکن اِس کو پتہ نہیں ہے کہ نشے کی حالت میں اِس کا ہر قدم تھانے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اب دیکھا کہ جو قوت کا نشہ ہے اُس نے بتایا گیا ہے۔ واقعی شرابی کو کہاں ہوش ہوتا ہے۔ فَاَخَذۡنٰہُ وَ جُنُوۡدَہٗ فَنَبَذۡنٰہُمۡ فِی الۡیَمِّ (28:40)۔ دیکھیے الینا لا یرجعون کا خود ہی صحیح مطلب بیان کر دیا۔ اب یہ جو ہمارے ہاں معنی لیے جاتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان وہاں خدا کی طرف جائے گا، وہاں باز پرس ہوگی، یہ سب کچھ ٹھیک ہے، ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی برحق ہے مگر یہ مرنے کے بعد ہی کی بات نہیں ہے۔

انسان کا ایک ایک قدم خدا کے قانونِ مکافات کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے

قرآن بتا رہا ہے کہ یہ بھول گئے کہ ہمارا ہر قدم تو اُس کے قانونِ مکافات (Law of Requital) کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ بڑھتے چلے جا رہے تھے اور آگے جب گئے ہیں تو سمندر میں غرق ہو گئے۔ وہ خود ہی ہلاکت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ یہیں کی بات ہے، مرنے کے بعد والی قیامت کی بات تو نہیں ہے۔ یہ یہیں کی جو قیامت ہے، اُس کی بات ہو رہی ہے۔

انسان کے ہر عمل کا نتیجہ جانور کی دم کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہوتا ہے

قرآن نے اگلی آیت میں خود یہ کہہ دیا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم پہ کس کی گرفت ہوگی۔ ہر ظالم یہی سمجھتا ہے، ہر متکبر، صاحبِ قوت، نشے میں مدہوش یہی سمجھتا ہے کہ مجھے کون پکڑ سکتا ہے لیکن اُس کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ شرابی کا ہر قدم نادانستہ تھانے کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے اور **اِلَيۡنَا لَا يُرۡجَعُوۡنَ** جو کہا ہے اُس کے آگے یہ کہا کہ **فَاَخَذۡنٰهُ** (28:40) ہم نے اُس کو پکڑا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ کوئی پکڑنے والا نہیں ہے۔ ہم نے اُس کو پکڑا ہے۔ **وَ جُنُوۡدَهٗ** (28:40) اور اُس کے لشکر کو بھی پکڑا۔ عجیب بات ہے۔ قرآن نے تو ایک فرعون کا لشکر بتایا ہے اور دوسرا قرآن نے ہامان کا لشکر بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ جو سفید کپڑوں میں ہوتے ہیں انہوں نے وردی نہیں پہنی ہوئی ہوتی، یہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ تمہیں پتہ لگتا ہی نہیں۔ سپاہی کا تو دور سے ہی پتہ لگ جاتا ہے۔ یہ جو سفید کپڑوں میں آتے ہیں، ان کا پتہ نہیں لگتا۔ قرآن یہاں فرعون کے جنود کہتا ہے، وہاں ہامان کے جنود کہتا ہے۔ دونوں کے لشکر بتاتا ہے۔ **فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ** (28:40) انہیں سمندر میں غرق کر دیا۔ کہا تھا کہ **اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ** (28:37) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ **فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ** (28:40) اس داستان کے سننے والو! دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ دیکھا ہمارا قانون! کیفیت یہ ہے کہ اپنے ذہن میں سمجھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ مجھ پہ کسی کی گرفت نہیں: **اِلَيۡنَا لَا يُرۡجَعُوۡنَ** (28:39):

صید خود صیاد را گوید بگیر

پرندہ خود شکاری کی طرف چلا آ رہا ہے کہ مجھ کو پکڑ لے۔ اس کا ہر قدم ہماری طرف اٹھ رہا تھا۔ فاخذنٰہ (28:40)۔ ہم نے اُس کو پکڑا، جو کہتا تھا کہ کوئی پکڑنے والا نہیں ہے۔ یہ اُس کا انجام ہوا۔ **فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ** (28:40) دیکھو کیا انجام ہوا! اس بات کے لیے یہ ساری داستان دہرائی جا رہی تھی۔ ہمیں یہ بتانے کے لیے کہ دیکھو! **كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ** (28:40) ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی! وہ تباہ ہوئے۔ **وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ** (28:41)۔ ان کا مقام کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ جہنم کی طرف جانے والوں کے لیڈر رہے، یہ جہنم کی طرف لے جانے والے اُن کے امام تھے۔ یہ لیڈری بھی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ یہ جہنم کی طرف لے جانے والوں کے لیڈر تھے۔ اور یہ تو آج کی بات تمہارے سامنے ہوئی۔ **وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ لَا يُنۡصَرُوۡنَ** (28:41) قیامت خواہ یہاں والی ہو، یا وہاں والی ہو، کہ اُس وقت جب ان کے اوپر گرفت ہوتی ہے تو ان کا کوئی ضمانت دینے والا بھی تھانے میں نہیں آتا۔ وہ ظالم تو اپنی قوت کے نشے میں لوگوں کو دبائے ہوئے ہوتا ہے۔ جب وہ قوت چھنتی ہے، وہ گرفت میں آتا ہے تو کوئی بھی اس کا نہیں ہوتا۔ **وَ اَتۡبَعۡنٰهُمۡ فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً** (28:42)۔

لعنت کا قرآنی مفہوم گالی نہیں بلکہ خدا کی نعمتوں سے محروم ہو جانا ہے

جس نے کسی کے ساتھ کوئی نیک سلوک کیا ہوا ہو' تو اُس کا کوئی بُرے وقت میں بھی ساتھی ہوتا ہے لیکن جس نے اپنی اس قوت کے نشے کو اس طرح استعمال کیا ہو کہ ظلم میں بڑھتا چلا جا رہا ہو' قرآن کہتا ہے کہ جب اُس کے اوپر پھر گرفت ہوتی ہے تو کوئی بھی اُس کا ساتھی نہیں ہوتا: وَ اَتۡبَعۡنٰهُمۡ فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا لَعۡنَةً (28:42) اور اِس طرح سے جب ظالم کی گرفت ہوتی ہے تو اسی دنیا کے اندر ہوتی ہے۔فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا قرآن نے لکھا ہے۔''لعنت'' ان کا پیچھا کرتی ہے۔ یہ لعنت ہمارے ہاں تو کوئی گالی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ جو مرزا تھا وہ ساری دنیا کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ اُسے کہا کہ تم گالیاں دیتے ہو۔ کہنے لگا کہ میں گالیاں دیتا ہوں' یہ کونسی نئی بات کرتا ہوں۔ خدا بھی تو گالیاں دیتا ہے' ہر ایک کو کہتا ہے لعنت اللہ۔ وہ لعنتیں ڈالتا ہے۔ میں نے لعنتیں ڈال دیں تو کیا ہوا۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کی صفت کا بھی اس نے اتباع کیا تو کونسی صفت اُس میں سے چنی۔ یہ اپنے اپنے ذوق ہیں۔

عزیزانِ من! عربی زبان میں "لَعۡنَةً" کے معنی ''محروم ہو جانا'' ہوتا ہے جسے انگریزی زبان میں Deprived of all blessings.[1] کہتے ہیں۔ ظالم کی جب گرفت ہوتی ہے تو وہ زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز اُس کے پیچھے لگی ہوئی ہوتی ہے۔ فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا. اسی دنیاوی زندگی میں اُس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو محرومیاں ہیں اُس کا پیچھا کر رہی ہوتی ہیں۔ کہا یہ تھا کہ یہ لیڈر تھا تو تیس تیس میل لمبے جلوس نکلتے تھے' پیچھے زندہ باد کی آوازیں آتی تھیں' پھول نچھاور ہوتے تھے۔ کہا کہ آ ؤ آج اس کا یہ بھی جلوس دیکھو۔ اب یہ ان کا امام (Leader) ہے جو جہنم کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ ہر قسم کی محرومیاں اِس کے پیچھے چلی جا رہی ہیں۔ کیا نقشہ ہے! فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا لَعۡنَةً وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ هُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِیۡنَ (28:42) اور اِس کے بعد کی زندگی میں بھی جس کی یہاں کی زندگی یہ ہے' وہاں کی زندگی بھی اس کی یہی ہوگی۔ یہ جلوس چلتا چلتا سیدھا جہنم کی طرف جانا ہے۔ یہاں نہیں تو ذرا آگے پل کے پار سہی' وہاں چلا جائے گا۔ جانا تو اس نے جہنم میں ہی ہے۔ اور اِس انجام کے بعد ایک فقرے میں یہ کہا کہ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَهۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ الۡاُوۡلٰی (28:43) موسیٰ کو ضابطہ قوانین دیا گیا۔ تو بات ساری ہوگئی کہ یہ سب کچھ الکتاب کی رو سے ہو رہا تھا۔ کہا کہ پہلی نسلوں کے ساتھ بھی یہ ہوتا چلا آ رہا تھا' پہلی قوموں کے ساتھ بھی یہ ہوتا چلا آ رہا تھا: نبی آتا تھا' کتاب دیتا تھا' اُس کی خلاف ورزی کرتے تھے تو انجام یہ ہوتا تھا۔ ظالم کا انجام ہر جگہ یہی ہے جو ہم نے یہاں بتایا ہے۔ یہی ہوتا چلا آ رہا تھا اور یہ الکتاب کی رو سے ہوتا چلا آ رہا تھا' قانون کی رو سے یہ ہوتا چلا آ رہا تھا۔

---

[1] تمام نُعما سے محروم

عزیزانِ من! سارا کچھ کرنے کے بعد اب ہم سے سنیے' آپ سے' نوعِ انسانی سے' تخاطب ہوتا ہے کہ بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ (28:43) یہ آنکھیں کھول دینے والی چیز ہے۔ قیامت تک کے لیے نوعِ انسانی کے لیے بتایا ہے۔ ہمارا قانون ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ تاریخی شہادتیں دیکھ لیجیے گا۔ بِصَآئِرَ لِلنَّاسِ ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے آنکھیں کھول دینے والے واقعات ہیں۔

داستان موسیٰ علیہ السلام میں نوع انسانی کے لیے ایک سبق آموز پیغام ہے

عزیزانِ من! سنیے اگلا فقرہ اور جھوم جایئے! تمام نوعِ انسانی کے لیے ہم نے کھول کر باتیں بتا دیں' آنکھیں کھولو سورج کی روشنی آ گئی ہے۔ یہ تو تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ کہا کہ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (28:43) واضح راستہ' سامانِ نشو ونما' جو رحمت ہے' یہ سارا کچھ اس لیے ہے کہ ان قوانین کو یہ لوگ اپنے سامنے رکھیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اس لیے ہم نے یہ کہانی بیان کی ہے۔

عزیزانِ من! اب آگے رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ چیز آتی ہے۔ کہا کہ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ (28:44) اے رسول! تم اُس وقت طور کی چوٹی کے پیچھے تو نہیں کھڑے تھے جو یہ ساری باتیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے سے یہ بتائی ہیں۔ بتائی اس لیے ہیں کہ نوعِ انسانی کے لیے بصائر بن جائیں' ھدٰی بن جائیں' رحمت بن جائیں۔ اس لیے یہ واقعات دیئے گئے ہیں۔ یہ قرآن کی تلاوت (ناظرہ) ثواب کے لیے نہیں ہے۔ یہ نوعِ انسانی کے لیے بصائر ہے' ھدٰی ہے' رحمت ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ القصص کی آیت 43 تک آ گئے۔ 44 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

چھٹا باب: سورۃ القصص (آیات 44 تا 47)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٤٤﴾ وَلَٰكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿٤٥﴾ وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٤٦﴾ وَلَوْلَا أَن تُصِيبَهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1979ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 44 سے ہو رہا ہے: (28:44)۔

قرآنِ حکیم کے اندر بیان کردہ واقعات کا مقصد

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ میں ابتدا سے اس وقت تک حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کی داستان بیان ہو رہی تھی۔ آج کی اصطلاح میں یا قرآن کی اصطلاح میں انسانوں کے خود ساختہ باطل نظام کے خلاف قوانینِ خداوندی کی روشنی میں ایک نئے نظام کی تشکیل کی بات ہو رہی تھی۔ ان دونوں میں یہ کشمکش تھی۔ تاریخی واقعات بیان ہو رہے تھے۔ حضرتِ موسیٰ کے زمانے کے واقعات تھے۔ ہزاروں سال پہلے کی بات تھی لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُس داستان کے بیان کرنے میں ہر ٹکڑے کے بعد یہ کہا جاتا تھا کہ تم دیکھو کہ اس میں تمہارے لیے کتنی بڑی راہنمائی ہے۔ یعنی وہ مقصد کوئی Historical Event (تاریخی واقعہ) کا بیان کرنا نہیں تھا بلکہ اُنہیں بیان کر کے بتانا یہ تھا کہ یہ دیکھیے تمہارے لیے اس میں کتنی بڑی ابدی راہنمائی ہے۔ قرآن نے جو تاریخی شواہد پیش کیے ہیں ان کا یہ مقصد ہے۔ اسی لیے ہم انہیں شواہد کہتے ہیں کہ وہ اس بات کی شہادت ہوتی ہے کہ اگر یہ چیز آج بھی اس طرح کی جائے تو اُس کے یہی نتائج مرتب ہوں گے۔ یہ ہے Past یا ماضی کے متعلق جو کچھ ہے۔

عزیزانِ من! یہاں اس سورۃ کی 43 ویں آیت کے اس مقام پہ آ کر یہ داستان ختم ہوگئی تھی۔ اگر تاریخی اعتبار سے ہی یہ بیان ہوتا تو پھر اس داستان کا اگلا Chapter (باب) شروع ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہاں قرآن کھڑا ہو گیا۔ یہاں ایک اور حقیقت کی طرف اُس نے توجہ منعطف کرائی ہے اور وہ بھی بڑی عظیم حقیقت ہے۔

یہ داستان جو بیان ہو رہی تھی آپ نے دیکھا تھا اور میں قدم قدم پر آپ کو کہتا تھا جیسے ایک شخص آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو یا واقعہ اُس کے سامنے رونما ہو رہا ہو یا آج کی اصطلاح میں کہیے کہ سینما کی ایک تصویر سامنے سے گزر رہی ہو اور ایک شخص اُسے آنکھوں سے دیکھ کر کہتا چلا جائے کہ یہ دیکھئے' یہ ہو رہا ہے اور یہ ہو رہا ہے۔ گویا آنکھوں دیکھا حال جیسے بیان کیا جاتا ہے' ایسے وہ داستان بیان ہوئی تھی۔ اب وہ داستان کم از کم ڈیڑھ ہزار [1] سال قبل مسیح کی تھی۔ نبی اکرم ﷺ عرب کے خطہ زمین میں جہاں علم کی کرنیں ابھی نہیں پھوٹی تھیں' جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ خود مکے میں جو ام القریٰ تھا' تمام عرب کا مرکز تھا' اُس شہر کے اندر بھی سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نبی اکرم ﷺ تو دعویٰ نبوت سے پہلے اتنا بھی نہیں جانتے تھے۔ اب اُس شخص کی زبانی یہ سارے واقعات یوں بیان ہو رہے ہیں جیسے وہ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا چلا جا رہا ہو۔

قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے واقعات کا بیان کرنا کیونکر ممکن ہوا

یہاں پہنچنے کے بعد یہ بات ہے جو کہی گئی ہے: **وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَ لٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا** (28:44-46) یہ جتنی باتیں تم نے بیان کی ہیں' تم نہ تو وادیٔ سینا میں تھے' نہ طور کی چوٹی میں تھے' نہ مصر کے ملک میں تھے' نہ تم ان کے ہمعصر تھے۔ یہ جتنی چیزیں تم نے بیان کی ہیں'

---

[1] حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ آپ کے بیٹے حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسف کی وجہ سے ان کی یہاں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی' چار سو سال تک مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے' پھولے پھلے اور جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ حضرت یوسف کا زمانہ قریب 2100 ق م تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ قریب 700/1600 ق م قیاس کرنا چاہیے۔ قریب تین ہزار ق م سے لے کر سکندر (332 B C) تک' فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ حضرت یوسف کے زمانہ میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسر حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی یہی خاندان مصر پر حکمران تھا۔ عام اندازہ یہی ہے کہ یہ زمانہ 1500 ق م سے پہلے کا ہے۔ یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآن بحث نہیں کرتا اس لیے کہ اس کا کام ان حقائق کو پیش کرنا ہے' جو ان واقعات میں مضمر ہیں نہ کہ وقائع نگاری۔

یہ ایک انسان کیسے بیان کر سکتا ہے؟ ابھی یہ ماضی کی بات ہو رہی ہے جب اُس کے پاس کوئی علم کا ذریعہ ہی نہ تھا‘ تاریخ اُس دور کی کوئی مرتب نہیں ہوئی تھی‘ علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے‘ مگر بیانات اس تعین وتیقن کے ساتھ ہو رہے ہیں جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جا رہا ہو۔ کہا کہ ان سے کہو کہ میں تو وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اتنا عرصہ پہلے کی بات اِن جزئیات تک کی چیزیں وہ بیان کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ ان واقعات کے بیان کرنے یا قرآنِ مجید کے وحی من اللہ ہونے کے لیے یہ چیز ایک دلیل کے طور پہ بیان کی کہ تم تو کر نہیں سکتے تھے۔ دنیا کا کوئی انسان بھی اُس دور میں یہ نہیں بتا سکتا تھا۔ تو تم نے یہ کیسے بتا دیا؟ تو یہ اہم بات ہے۔ یعنی ایک تاریخی شواہد کا‘ جزئیات کا‘ واقعات کا‘ Chapter (باب) ختم ہوتا ہے اور اُس کے بعد توجہ ادھر منعطف کرائی جا رہی ہے کہ ذرا سوچو تو سہی اور ان سے پوچھو تو سہی کہ یہ سب کچھ بتانا کیسے ممکن تھا! یہ کتنی اہم بات ہے!

بائیبل‘ قرآن اور سائنس کے حوالے سے ایک پیدا ہونے والا سوال اور الجھن

آپ کو یاد ہے کہ میں نے ایک دو درسوں میں بھی اور خاص طور پہ‘ جو وہ جوبلی تھی‘ اُس میں‘ میں نے ایک کتاب کا تعارف کرایا تھا۔ وہ فرانسیسی سائنسدان ❶ تھا‘ جس کی حال ہی میں وہ کتاب شائع ❷ ہوئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ کتاب پاکستان میں نہیں پہنچی ❸ اس کتاب کا نام ہے ❹ The Bible, The Quran & Science وہ سائنسدان ہے مذہبی آدمی نہیں ہے‘ مسلمان نہیں بلکہ کرسچن (عیسائی) تھا۔ میں نے ان درسوں میں بتایا تھا کہ اُس کتاب کا موضوع کیا تھا۔ اسے چند الفاظ میں پھر دہرا دوں۔ اُس نے یہ کہا کہ میں نے بائبل کو بڑی توجہ سے‘ ایک سائنٹسٹ (سائنسدان) کے نقطۂ نگاہ سے‘ پڑھا۔ اُس میں جو چیزیں ایسی آئی ہیں جن کا تعلق سائنس کے انکشافات سے ہے‘ تو دیکھا کہ اُن کے متعلق اُس میں کیا بیان ہوا ہے‘ اُس نے وہ مقامات اکٹھے کیے اور اُس کے بعد بتایا کہ اِن میں ہر چیز جو سائنس نے آج تک منکشف (Discover) کی ہے‘ یہ جو کچھ اِس میں لکھا ہوا ہے اُس کے خلاف ہے۔ اُس نے جرأت کی۔ وہاں تو ابھی جرأت کر سکتے ہیں۔

عزیزانِ من! پھر اس نے اپنے ہاں کے پادریوں سے پوچھا کہ بھائی صاحب! بات ذرا صاف کر کے مجھے بتا دیجیے۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اگر خدا نے یہ کچھ کہا ہے‘ مثلاً یہی چیز کہ زمین گول نہیں چپٹی ہے‘ ساکن ہے‘ اس قسم کی چیزیں اُس نے بہت سی

---

❶ Maurice Bucaille (1911-1989)

❷ اس کتاب کا پہلا فرانسیسی نسخہ 1976 میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔

❸ مگر ایک دوست کے توسط سے میرے ہاں موجود ہے (پرویزؒ)

❹ بائیبل‘ قرآن اور سائنس۔

لکھی ہیں اور اُس نے کہا ہے کہ اگر جیسا تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے تو معاف رکھیے تو پھر وہ خدا تمہارا بڑا ہی بے خبر اور جاہل ہے اور وہ خالقِ کائنات ہو نہیں سکتا' اُسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ جو زمین میں نے بنائی ہے وہ گول ہے کہ چپٹی ہے۔ اور اگر وہ خدا اِس قسم کا ہے کہ اُسے ان تمام چیزوں کا علم ہے وہ خالقِ کائنات ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب وہ کیا دے سکتے تھے!! اُس نے کہا کہ یہ دو مذہب عیسائیت اور یہودیت تو یوں چھوٹ گئے۔ وہ دونوں بائبل کو مانتے ہیں۔

اُس نے کہا کہ دنیا کا ایک تیسرا مذہب بھی ہے۔ اِس کی بھی ایک کتاب [1] ہمارے ہاں متداول ہے۔ اِسے بھی ذرا دیکھ لوں کہ اس میں کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ حقیقت میں محقق یعنی ریسرچ اسکالر انہیں کہا جا سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں نے اِس کتاب [1] کے ترجمے دیکھے تو وہ ایک دوسرے سے ملتے ہی نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ ان میں سے کسی ایک ترجمے کو لے کر اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اس میں سے قرآن کی بات سمجھی ہے تو بڑا غلط ہوگا۔ میں دوسرے ترجمے کو دیکھونگا تو اُس میں دوسری بات ہوگی۔ تو کیا ایک کتاب اتنی متضاد ہو سکتی ہے؟ اِس کا طریقہ کیا ہے کہ میں بات کی تہہ تک پہنچ سکوں؟

ڈاکٹر مورس بوکائے کا تحقیقی طریقِ کار

عزیزانِ من! سوچیے' یہ لوگ ایک بات پر بالتحقیق پہنچنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ وہ تو سائنٹسٹ تھا۔ اُس نے کہا کہ عربی زبان خود سیکھنی چاہیے۔ مجھے اس کا بھی علم ہے کہ نزولِ قرآن کو تو ڈیڑھ ہزار سال ہو گیا اور زبان پر ڈیڑھ ہزار سال میں جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' اُس میں معنی کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں۔ آج کی عربی اگر میں نے سیکھ بھی لی تو وہ قرآن کے زمانے کی عربی تو نہیں ہوگی' اُس سے میں کیسے مفہوم کو سمجھ سکونگا۔ عربی وہ سیکھنی چاہیے جو نزولِ قرآن کے زمانے میں تھی اور وہ ان بدوؤں سے سیکھی جا سکتی ہے۔ وہ شخص عرب میں آ کر ان کے اندر رہا۔ یہاں سے اُس نے ایسی عربی سیکھی جو میں نے کہا تھا کہ جس طرح میرے ''لغات القرآن'' میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ مجھے اُس نے توفیق عطا فرمائی کہ اوریجنل مادے سے لے کر عرب ان الفاظ کو جس طرح اپنے زمانے میں استعمال کرتے تھے' یہ کچھ میں نے وہاں جا کر سیکھا۔

قرآنی حقائق تک پہنچنے میں ڈاکٹر مورس بوکائے کی تگ و تاز اور اس کا ماحصل

وہ کہتا ہے کہ زبان بھی سیکھ لی۔ اب خیال یہ پیدا ہوا کہ یہ کتاب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پیغمبر نبی اکرم ﷺ نے کوئی کتاب دی ہو' مگر بعد میں آنے والے' اُس کے جو بڑے بڑے علما' بڑے بڑے سائنٹسٹ' مسلمانوں میں گزرے ہیں' اُنہوں نے یہ چیزیں اِس میں

---

[1] یعنی قرآنِ حکیم

داخل کر دی ہوں تو مجھے یہ بھی ریسرچ کرنی چاہیے کہ یہ کتاب واقعی اُسی طرح سے ہے جیسی رسول اللہ ﷺ نے دی تھی یا بعد میں یہ کچھ اِس میں ہوا۔ پھر اُس نے یہ ریسرچ شروع کر دی۔ اِس ریسرچ کے بعد وہ اِس نتیجے پہ پہنچا کہ یہ کتاب لفظاً لفظاً وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دنیا کو دی تھی۔ اندازہ لگائیے کہ وہ شخص مذہب کا مبلغ نہیں ہے اُسے صرف تحقیق کا شوق ہے، علمی تحقیق کا ایک ذوق ہے جس کے لیے وہ یہ کچھ کر رہا ہے۔ کہتا ہے اِس کے بعد پھر میں نے قرآن کو دیکھا تو اُس کا انداز ہی مختلف تھا۔ عام کتابوں کا انداز تو یہ ہے کہ وہ ایک بات لیتا ہے تو ایک جگہ سارا کچھ اُس کا بیان کرتا ہے، پھر اگلا Chapter (باب) لیتا ہے اور دوسری بات لیتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے اِس میں دیکھا کہ ایک بات یہاں کہی گئی ہے، اُس کے متعلق اُس کا جو کچھ ٹکڑا ہے وہ کہیں چار سورتیں بعد میں آیا ہے، اِستثنٰی کہیں اور آئی ہے، Explanation (وضاحت) کہیں اور آیا ہے۔ تو بہرحال یہ اس کتاب کا انداز ہے۔ سمجھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام مقامات کو بیک وقت سامنے رکھے۔ جسے قرآن نے تصریفِ آیات کہا ہے۔

عزیزانِ من! جو ''تبویب القرآن'' میں نے مرتب کیا ہے، وہ اِسی طریق پر ہے۔ اُس نے اُس کے بعد پھر اُس قرآن کو Codify (مدوّن) کیا۔ یہ کچھ کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ اب میں نے سمجھ لیا کہ جن چیزوں کے متعلق میں معلوم کرنا چاہتا ہوں، قرآن کی وہ چیزیں، قرآن کے الفاظ میں، میرے سامنے آ گئیں۔ عزیزانِ من! پھر اُس نے اپنے سائنس کے انکشافات کی رو سے ایک ایک چیز کو لیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ آج سائنس اخلاقیات کے متعلق، ارضیات کے متعلق، بائیالوجی کے متعلق، زوآلوجی کے متعلق یہ کہہ رہی ہے، ایک ایک چیز کے متعلق وہ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ آج کی سائنس یہ کہہ رہی ہے۔ بائبل نے جو کہا وہ بالکل اِس کے خلاف ہے اور قرآن کی یہ ایک آیت ہے اُس کے معنی اگر اُس زبان کی رو سے متعین کر لیے جائیں تو بعینہٖ وہ ہے جو آج کا سائنسدان کہہ رہا ہے۔ عجیب شخص ہے۔ وہ جھوم کے کہتا ہے کہ او دنیا کے دانشورو! میں کسی مذہب کا مبلغ نہیں، میں صرف ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا میں کسی انسان کے لیے ممکن تھا کہ وہ یہ بات اس کے متعلق کہہ دے جو ہمارے پاس ابھی سو سال پہلے بھی نہیں تھی اور اُس دور کے جو بڑے بڑے مفکر اور سائنٹسٹ تھے پھر اُن کے اقوال دیئے کہ اُس دور میں یہ جو لوگ تھے وہ بھی یہ بات نہیں کہہ رہے تھے کہ کہیں انہوں نے اُن سے پوچھ کے یہ درج کر لیا ہو۔ کیا انداز ہے! اُس نے یہ کچھ جو کیا تو قرآن نے یہ کچھ کرنے کے لیے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا۔

ہم قرآنی حقائق کو آفاق اور انفس میں دکھاتے رہیں گے

یہ جو سورۃ حٰم السجدۃ کی آیت (41:53) ہے، ہم تو تلاوت، ثواب کے لیے پڑھ کر، آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اُس نے اس

آیت پہ غور کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اِس میں یہ لکھا ہے کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) ہم تمہیں اپنی نشانیاں خارجی کائنات میں، خود انسانوں کی دنیا کے اندر دکھاتے چلے جائیں گے۔ عنقریب ان پر سے پردہ اٹھتا چلا جائے گا۔ تمہیں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح سامنے آجائے کہ قرآن واقعی بالحق کتاب ہے۔ یہ ہے طریقہ۔ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ (41:53) میں بَيُّنَ کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی چیز کا یوں سامنے آجانا کہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔'' سوئچ دبایئے اور بلب کی طرف دیکھیے کہ کرنٹ ہے یا نہیں۔ یہ ہوتا ہے بیان جو بَيَّـن سے ہے۔ قرآن کے متعلق اس نتیجے پہ پہنچنے کے لیے کہ اَنَّـهُ الْـحَقُّ، یہ حقیقت پر مبنی ہے، اُس کا طریقہ ہے کہ انفس اور آفاق کے اندر یہ جو ہماری نشانیاں ہیں وہ جوں جوں Discover (منکشف) ہوتی چلی جائیں گی، ہر Discovery (انکشاف) ہونے کے بعد جو حقیقت سامنے آئے گی، وہ قرآن کے اس دعوے کی شہادت ہوگی کہ یہ کتاب واقعی بالحق ہے۔ .Based on the truth (مبنی برحق) ہے، الحق ہے۔ اس فرانسیسی سائنسدان کا نام تھا Maurice Bucaille ہے۔ میں نے کہا تھا کہ معاف رکھیے گا کہ ان فرانسیسیوں کے نام کا تلفظ مشکل ہے۔ اُس نے جو یہ چیز کہی تھی کہ بائبل کے اندر ان واقعات کی جو تفصیلات ملتی ہیں، وہ جس قسم کی چیزیں ہیں اُس سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ بائبل والا خدا خالقِ کائنات ہو نہیں سکتا۔ اُس کو اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ میں نے جو زمین بنائی ہے وہ گول ہے یا چپٹی ہے۔ تو گویا اُس نے خدا کی ہستی کے اوپر یہ ایک دلیل دی تھی۔ سنیے قرآن کیا کہتا ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) جوں جوں یہ پردے اٹھتے چلے جائیں گے، یہ حقیقت سامنے آتی چلی جائے گی کہ قرآن The Truth (بالحق) ہے۔

مورس بوکائے کی بائبل کو مسترد کردینے کی وجہ جواز

اس نے کہا کہ یہ بات ہم کیسے کہہ رہے ہیں اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (41:53) کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ جس نے کائنات کو بنایا ہے، وہ اس سے ناواقف ہوگا کہ یہ کیسی ہے۔ عزیزانِ من! اندازہ لگایئے وہ جو کہتا تھا۔ جس بات پہ اُس نے بائبل کو مسترد کیا ہے وہ یہ چیز ہے کہ اگر یہ کتاب خالقِ کائنات کی طرف سے ہے تو خالقِ کائنات اپنی کائنات کے متعلق اتنا بے خبر تو نہیں ہوسکتا۔ قرآن یہ دلیل دے رہا ہے۔ اور دلیل ہے اَوَلَمْ يَكْفِ (41:53)۔ کہنے لگا کہ ایک مشین کے خالق کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ اُس مشین کا بنانے والا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ واقعی صحیح ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ایک مشین کا بنانے والا آپ کو بتاتا ہے کہ اس مشین کے اندر کیا کیا ہے اور یہ کیا کیا کرے گی۔ کیا اس کی شہادت کافی نہیں ہے کہ وہ مشین کا بنانے والا ہے۔

ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنے کا طریق

عزیزانِ من! اگلی آیت ہے' میں کہتا ہوں جھوم جانے والی بات ہے' ساری عمر تلاش میں رہتے ہیں کہ خدا سامنے بے نقاب ہو کر آ جائے۔ اُس نے تو یہ کہا ہے لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ (6:103)۔ یوں اگر چاہو کہ محسوس شکل میں تمہارے سامنے خدا آ جائے تو تم تو ایک طرف' اس کے متعلق تو ہم نے نبی موسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ نہ بابا! یوں بات نہیں ہوتی۔ اُس کی تو شہادات' اُس کی تو علامات' اُس کے تو مظاہر' اُس کی قدرت' اُس کے قوانین' اگر تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائیں تو یہی چیز ہے جس کا خدا کا سامنے بے نقاب ہونا کہتے ہیں۔ یوں ہے جو خدا سامنے آ سکتا ہے۔ یہ لفظ ہیں اُس کے۔ عزیزانِ من! سنیے اگلی آیت اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِیۡ مِرۡیَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ (41:54) یہ لوگ شک وشبہ میں ہیں کہ معلوم نہیں خدا ہے بھی یا نہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ وہ سامنے آ جائے۔ کہا کہ ان سے کہو کہ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ (41:54) خدا کہیں عرش پہ نہیں بیٹھا ہوا کہ تم اُس کو دیکھ نہ سکو۔ کائنات کی جس شے کے متعلق بھی تم تحقیق کرو گے تو خدا تمہیں سامنے نظر آ جائے گا: بِكُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ (41:54)۔ یہ لوگ جانتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے کائناتی حقائق کو اس طرح بالمشافہ دیکھنے والوں کو علما کہا ہے

اِس سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن جو کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ علما کن کو کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ جو علومِ سائنس کو لے کر مظاہر کائنات کے اوپر ریسرچ کر کے اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ یہ بھی حق ہے' یہ بھی حق ہے' کہا کہ یہ لوگ ہیں جو خدا کے قانون کی قدرت اور ہیبت کے سامنے تھرتھراتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) او ہمارے نشوونما دینے والے! تُو نے اس سلسلہ کائنات کو یونہی بیکار نہیں پیدا کر دیا۔ علما کا لفظ قرآن میں یہاں (35:28) میں آیا ہے۔ یہ ہے کیفیت جس کو وہ علما کہتا ہے۔ ''تے اک ساڈے علما نیں جیہڑے سوئی اچ دھاگہ نہیں پاسکدے''۔ [1] اَنَّهُ الۡحَقُّ. عزیزانِ من! عجیب دعوے ہیں۔

این کتابے نیست چیزے دیگر است

دیکھتے ہیں کہ لِقَآءِ رَبِّهِمۡ (41:54) کے لیے صوفی بھی مارا مارا پھرتا ہے۔ حجروں کے اندر' غاروں کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ فقیرِ گوشہ نشین [2] بھی برسوں رہا ہے۔ حجروں کے اندر وہ اتنا سا دروازہ جو تھا اُس کو بھی بند کر دیتے تھے کہ کہیں باہر کی روشنی نہ آئے۔ اندر بھی کڑوے تیل کا دیا جلایا' وہ بھی کبھی بند کر دیتے تھے۔ یعنی وہ جو عیسائیت میں ہے کہ جتنی تاریکیاں بڑھیں گی اتنی اندر کی روشنی بڑھ جائے

---

1. ایک ہمارے علما ہیں جو سوئی میں دھاگا نہیں ڈال سکتے۔
2. یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

گی۔تاریکیاں بڑھانے کے بعد خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ (29:20) اس کائنات کے اندر چلو پھرو اور ہماری نشانیاں دیکھو۔ایک ہی نشانی کے اوپر سے پردہ اٹھاؤ تو خدا سامنے نظر آ جائے گا۔لِقَاءَ رَبِّهِمْ: یہ بات تو ہوئی۔

اب میں درس کی آیت کی طرف آ رہا ہوں۔میں نے پھر دہرا دیا ہے کہ ایک حصہ تو یہ ہے۔دوسرا حصہ ماضی کے متعلق ہے۔پہلا حصہ تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ کیا بتایا کہ کائنات کے اندر یہ چیزیں مستور یہ حقائق کیا ہیں۔جوں جوں پردے اٹھتے چلے جائیں گے تو یہ چیزیں قرآن کی صداقت کی شہادت بنتی جائیں گی۔اور میں نے عرض کیا ہے کہ اِس کی شہادت ہم کیا دیں گے۔اس کی شہادت ایک غیر مسلم سائنٹسٹ وہاں بیٹھا ہوا یوں دے رہا ہے۔

مورس بوکائے کے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں بائبل کا تذکرہ اور تاریخی شواہد

اگلی چیز یہ ہے کہ ماضی کے متعلق جو چیزیں قرآن میں آئی ہیں اُن کی کیفیت کیا ہے؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔قرآن نے یہ سارا کچھ بیان کیا۔حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کی داستان بیان کی' جزئیات تک بیان کیں۔یہ بات ماضی سے متعلق ہے۔تاریخ میں اُس وقت کہیں کچھ نہیں تھا۔سوال یہ ہے کہ یہ جو کچھ بیان کیا ہے' کیا یہ بھی حقیقت پر مبنی ہے یا محض (معاذ اللہ) طلسمِ ہوشربا ہے یا افسانہ ہے؟ اُس شخص [1] نے کہا ہے کہ اگرچہ یہ میرا موضوع تو نہیں ہے لیکن لگتے ہاتھوں میں کچھ تھوڑا سا اِس کے متعلق بھی بیان کروں کہ جو ماضی میں بیان کی گئی تاریخ ہے وہ بائبل میں کیا ہے اور قرآن نے جو بیان کی ہے وہ کیا ہے۔اور اتفاق یہ ہے کہ اُس نے اِس میں سے باب یہی حضرتِ موسیٰ اور فرعون والا لیا ہے۔وہ کتاب عجیب چیز ہے۔وہ اُس میں سے ایک ایک بڑے ٹکڑے کو لیتا ہے۔جو کچھ اُس بائبل میں لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ آپ اسے دیکھیے' یہ حقائق کا ساتھ نہیں دیتی۔

اب تو اُس دور کی تاریخ ہمارے سامنے ایسی ہوگئی ہے کہ گویا ہمارے سامنے مرتب ہوئی ہے۔شواہد آ گئے ہیں۔آرکیالوجی والوں نے مصر کے ایک ایک ٹیلے' ایک ایک چپہ بھر صحرا' کو کھود کے دیکھا ہے۔وہ جو قرآن نے سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ کہا تھا اور کہا تھا کہ ان برباد شدہ بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں کو جا کر پڑھو' انہوں نے اُن اینٹوں کو پڑھ کر جو مرتب کی ہے' انہوں نے اُس دور کی جو زبان تھی اُس زبان کو مرتب کیا ہے' وہ تو اُس دور کی زبان ہی کچھ اور تھی۔یہ ہیں یہ لوگ ریسرچ کرنے والے۔انہوں نے پہلے اُس زبان کو نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔پھر اُس کی رو سے' اُس کے کتبوں کو جا کر پڑھا ہے' وہاں سے تاریخ مرتب کی ہے۔اِس تاریخ کی رو سے وہ ایک ایک واقعہ کو لیتا ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور جو بائبل میں ہے۔وہ کہتا ہے کہ بائبل کے اندر نرا افسانہ ہے۔حقیقت وہ ہے جو

---

[1] مورس بوکائے (1911-1989)

ہمارے سامنے موجودہ تاریخ سے' جو اس طرح ہم نے مرتب کی ہے' بے نقاب ہو کر آئی ہے اور جو قرآن کہتا ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو اُس کے اندر آیا ہے۔ تو دوسری شہادت ماضی کی یہ ہے۔

قرآنی حقائق کے سلسلہ میں فرعون کی لاش کا ذکر

ایک ہی واقعہ فرعون کی لاش کا ہے۔ یہ چیزیں میں نے کئی دفعہ آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ فرعون کی لاش کے متعلق ہزار بارہ سو سال تک ہمارے اوپر اعتراض ہی ہوتے رہے کہ قرآن نے کہا تھا کہ غرق تو ہوا لیکن لاش کو ہم نے آنے والوں کے لیے آیہ عبرت بنانے کے لیے محفوظ کر کے رکھ لیا تھا۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے قرآن یہ بات کہتا ہے۔ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ صاحب! یہ کیا کہہ رہا ہے کہ فرعون کی لاش کو ہم نے محفوظ کر کے رکھ لیا ہے۔ اور اب جو وہاں مصر کے اندر اہرام کے نیچے' یا اُن کے تہ خانوں کے نیچے' جو ان کی حنوط شدہ لاشیں (Mummies) نکلی ہیں' کسی کے ذہن میں نہیں تھا کہ اُس دور کے اندر انہوں نے اپنے بڑے بڑوں کی لاشوں کو ممی بنا کے یوں محفوظ کر لیا تھا۔ اُن لاشوں کی دریافت جو انہوں نے شروع کی تو جو قرآن نے کہا تھا کہ فرعون کی لاش کو ہم نے محفوظ کیا ہے تو اُن کے اندر فرعون کی یہ لاش محفوظ شدہ نکلی ہے۔

ہمارے ہاں کی افسانہ نگاری تورات کی رہین منت ہے

یہ جو چیز تھی کہ اُنہوں نے سمندر کو پار کیا اور وہ تو دریا یوں پھٹ گیا اور راستہ دیدیا اور حضرتِ موسیٰ اُس میں سے نکل گئے' فرعون کے جنود آئے اور وہ اُس میں غرق ہو گئے۔ قرآن نے اِس کے متعلق کہا تھا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ ساری باتیں ہمارے ہاں بھی تو مشہور ہیں۔ سارے قصے ان لوگوں نے تورات سے لیے ہیں۔ انہوں نے ریسرچ کہاں کرنی تھی۔ وہاں سے یہ قصے لیے اور چونکہ زیبِ داستان کے لیے افسانہ تو بڑا دلکش ہوتا ہے' پھر ان افسانوں کو اپنی طرف سے کچھ اور بڑھایا۔ اور آپ جا کر مسجدوں میں محراب و منبر پر دیکھ لیجیے وہ خود بھی جھوم رہے ہیں اور لوگ بھی جھوم رہے ہیں۔ یہ جہالت پہ جھومنے والی قوم ہے۔ جیسے بچے نانی اماں کو کہتے ہیں کہ انارکلی والی بات نہیں' انار کلی [1] میں تو ہم ہو کر آئے ہیں۔ وہ جو نیلی پری اور سبز دیو ہے اُس کی بات سناؤ۔ بچپن کا ذہن افسانوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے' حقائق میں دلچسپی نہیں لیتا۔ ہمیں تو اُس بچپن کے ذہن میں رکھا گیا ہے۔

---

[1] شہر لاہور (پاکستان) کا ایک قدیم بازار۔

قرآنی حقائق کی روشنی میں فرعون کے ڈوبنے کی وضاحت

قرآن میں یہ ہے کہ وہ وہاں سے گزرے۔ وہ ذرا سی درمیان میں پٹی ہے۔ مصر کی طرف سے صحرائے سینا کی طرف آتے ہوئے اب نظر آیا کہ وہ ایک مثلث نما سی بنتی ہے۔ یہ اُس زمانے میں نہر سویز ❶ تو ابھی کھودی نہیں تھی یہ تو خشکی تھی۔ تو خشکی کا جو شروع کا حصہ تھا یعنی جدھر پانی جا کر ٹکراتا تھا' قرآن نے یہ کہا تھا کہ وہ مقام تھا جہاں سے پانی جا کر ہٹ جاتا ہے اور وہاں خشکی ہو جاتی ہے۔ اور جلدی سے پھر دوبارہ پانی آ جاتا ہے۔ تو ہوا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ تو اُس خشکی کے راستے سے نکل گئے اور جب اُس راستے سے فرعون کی فوج یا لشکر آیا تو اُتنے میں پانی آ چکا تھا اور یہ ڈوب گئے۔ ❶

آخر کار تورات کو بھی یہی کچھ تسلیم کرنا پڑا

قرآن کی یہ چیز ہمارے ہاں کسی نے بیان نہیں کی۔ آپ حیران ہونگے کہ اب جو تحقیق ہوئی ہے' خود تورات کا نیا نسخہ جو یہودیوں کی طرف سے امریکن سوسائٹی نے شائع کیا ہے' اس کے اندر یہی لکھا ہے جو قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ وہ قرآن کے الفاظ سے اپنی تورات کی تصحیح کر رہے ہیں۔ یہی چیز یہ شخص ❷ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھئے! یہ چیز قرآن نے لکھی ہے جو آج ثابت ہو رہی ہے۔ تاریخی انکشافات ہیں کہ یوں وہاں ہوا تھا۔ اور اُس کے بعد وہ بڑی دلچسپ بات لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہودیوں نے تو اپنے ہاں کی تورات تک کو اس کے مطابق کر لیا ہے جو واقعہ ہے۔ ان مسلمانوں کے ان مفسرین کو اور ترجمہ کرنے والوں کو دیکھو کہ وہ آج بیسویں صدی میں بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو اُس زمانے کی تورات نے کہا تھا۔ اور اِس کے بعد وہ اُس بات پہ پہنچا ہے۔ اگر یہاں کہتا تو پرویز کی طرح کفر کا فتویٰ لگ جاتا۔

قال رسول اللہ ﷺ کی بنا پر ہمارے ہاں کے تفسیری بیان

وہ ❷ کہتا ہے کہ اِس کی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ کہا کہ ان کے ہاں مشکل یہ ہوئی کہ ان کی کتاب قرآن تو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں جو روایات' احادیث تھیں وہ بنائی گئیں' وضع کی گئیں' جیسے تورات بنائی گئی تھی۔ یہ ساری چیزیں ان بنانے والے لوگوں نے تورات وغیرہ سے لیں اور اپنے ہاں ان کے اندر داخل کر دیں اور قال رسول اللہ کہہ دیا۔ یہ وہ لکھ

---

❶ اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورة طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 214 تا 216 نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

❷ یعنی مورس بوکائے (1911-1989)

رہا ہے۔ اب ان کے لیے دشواری یہ ہے کہ جب یہ کہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو اُس سے اِدھر اُدھر کیسے ہٹیں۔ اُنہوں نے اپنے ہاں یہ لکھا ہوا ہے۔ اب یہ اُس کے مطابق تفسیریں بھی کرتے چلے جا رہے ہیں' اُسی کے مطابق ترجمے بھی کیے چلے جا رہے ہیں۔ اُنہیں تو یہ جرأت ہوگئی ہے کہ ایک حقیقت جو سامنے آ گئی ہے' اُنہوں نے اپنی کتاب' جس کو وہ خدا کی کتاب کہتے ہیں میں اس کے مطابق تصحیح کر لی۔ ان کے لیے دشواری یہ ہے کہ یہ نہیں کر سکتے۔

مورس بوکائے کی مسلمانوں سے اپیل

اُس کے بعد اُس نے کہا ہے کہ میں اِن سے مخاطب ہو کر بھی کہونگا کہ دنیا اب علومِ سائنس میں اور ان واقعات میں بہت آگے چلی گئی ہے۔ اسلام کو حقیقتِ ثابتہ کے طور پہ پیش کرنا ہے تو ان حقائق کی روشنی میں کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی کتاب قرآن میں تحریف کرو۔ او تمہاری کتاب قرآن نے ہی تو ہم کو ماضی کے واقعات کے متعلق بتایا ہے۔ اب بات آپ کی سمجھ میں آئے گی کہ قرآنِ کریم نے یہ ساری داستان بیان کرنے کے بعد آگے یہ کہا ہے کہ اے رسول! تُو تو وہاں کھڑا نہیں تھا جب ہم نے موسیٰ سے باتیں کی ہیں۔ تُو تو نہ سینا کی وادی میں تھا' نہ طور کی چوٹی پر تھا' نہ تو فرعون کے دربار میں تھا۔ یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟

دورِ نبوتؐ میں انسانی ذہن کی رسائی کی کیفیت

یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ یہ پوچھیے پیرس کے سائنٹسٹ سے جو کہتا ہے کہ اُس دور کے اندر دنیا کا کوئی انسان' اُس کی فکر اور تحقیق اس پہ نہیں پہنچ سکتی تھی جو قرآن نے کہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے نہ کوئی دعویٰ ہے' نہ میرا کوئی اس طرح سے مذہب ہے' میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا کے سائنٹسٹ اور مفکر مجھے یہ بتا دیں کہ اُس دور میں جب کوئی انسانی دماغ' فکر' خیال' تحقیق' یہ نہیں کہہ سکتی تھی جو حقیقت سے ثابت ہوگئی ہے تو پھر یہ کیوں نہ مانا جائے کہ یہ Super Natural (مافوق الفطرت) کوئی Source of knowledge (ذریعہ علم) ہے جس سے یہ چیزیں آئی ہیں۔ اسی کو تو وحی کہا جاتا ہے۔

مقامِ نبوت سے خدا کو نکال دینے کا نتیجہ

اب میں بتاؤں کہ یہ لوگ کہاں تک پہنچے ہیں۔ کہا کہ یہ کتاب خدا کی کتاب ہے' یہ اِن کا دین خدا کا دین ہے۔ عجیب بات ہے وہ جو کہہ گیا ہے۔ کہنے لگا کہ ہم لوگوں نے یہ جو مستشرقین ہیں' ان کے خلاف ایک سازش کی۔ ہماری عیسائیت کا تعلق حضرتِ عیسیٰؑ سے ہے۔ یعنی نبی یا رسول کہیے بہرحال وہ ایک انسان ہی ہے۔ اُس کا دیا ہوا ایک مذہب ہے۔ اِس میں سے خدا بیچ میں سے نکل گیا۔ اُس شخص کا یہ مذہب بن گیا۔ کہنے لگا کہ ہم نے ان کے ساتھ یہ کیا کہ اسلام کی جگہ محمڈن ازم (Muhammadanism) کا لفظ لے لیا اور مسلمان

کی جگہ محمڈنز (Muhammadans) ان کو کہنا شروع کر دیا۔ ہم نے بیچ میں سے خدا نکال دیا۔ اُسی سطح پہ لے آئے جہاں عیسائیت تھی۔ تو ٹھیک ہے وہ بھی اپنے نبی کی طرف منسوب ہوتا ہے' یہ بھی نبی کی طرف۔ کتاب کو نبی کی طرف منسوب کر دیجیے تو وہ خدا کی کتاب نہیں رہتی۔ وہ شخص کہتا ہے کہ اِن کو دیکھیے۔ یہ بھی اِس فریب کے اندر آ گئے اور یہ بھی اپنے آپ کو یہ کچھ کہنے لگ گئے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے لیے یہ نہ کرو۔ یہ دین اللہ ہے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے

آخر یہ سائیٹسٹ مسلمان کیوں نہ ہوا؟

کسی دوست نے مجھے کہا تھا کہ اگر وہ ایسا شخص ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا۔ میں نے کہا کہ اُس بیچارے کو چار دن کے لیے جینے دو' ہم اُس کے خلاف بھی کفر کے فتوے لگائیں گے۔

کیوں مرے جاتے ہو ناسخ تمہیں جلدی کیا ہے
تم کو ہونا ہے تو کھا پی کے مسلماں ہونا

میں نے کہا ہے کہ اُسے ابھی چار دن آزادی دیدو کہ وہ یہ چیزیں جو اُس کی آنکھ دیکھتی ہے' انہیں وہ اِس طرح سے بیان کر دے۔ اور پھر میں نے کہا ہے کہ جب وہ تمہیں کہتا ہے کہ تمہیں اتنا بھی پتہ نہ چلا اور یہ فریب کھا گئے کہ خدا کے دین کو محمڈن ازم کہنے لگ گئے تو کیا وہ تمہاری قوم کے اندر شامل ہو جائے گا؟ یعنی وہ اِس زمرے میں اپنے آپ کو شامل کر لے گا؟ میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ اب دیکھیے کہ قرآن داستان کی وہ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد آگے نہیں چلا گیا کہ چلو ورق الٹیے تو آگے اب حضرتِ سلیمان علیہ السلام یا حضرتِ داؤد علیہ السلام یا بنی اسرائیل کا باقی حصہ لے آئے بلکہ درمیان میں کھڑا ہو کر رسول ﷺ سے کہا جن کی طرف وحی کی جا رہی ہے کہ بتاؤ تم تو وہاں کھڑے نہیں تھے' یہ چیزیں کیسے آ گئیں۔ گویا یہ قرآن کے متعلق یہ بتانے کے لیے ہے کہ یہ محمد ﷺ کی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے کہ تُو تو وہاں کھڑا نہیں تھا تو تیری زبان سے یہ باتیں کیسے نکل رہی ہیں' تیرے علم میں تو یہ ہو نہیں سکتا۔ خود رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے۔ تو اِس کے بعد یہ بات ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ جن پہ وحی نازل ہو رہی ہے اُن سے کہا جا رہا ہے کہ یہ تیری فکر نہیں ہو سکتی۔ اور خود حضور ﷺ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ میری فکر نہیں ہے۔ میں تو اِس سے پہلے اَن پڑھ تھا۔ **اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ** (18:110) تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى** (53:3) رسول اپنے طور پر اپنی فکر سے کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ تو خدا کی طرف سے وحی ہے' ایک علم ہے جو اِسے دیا جاتا ہے' یہ حضور ﷺ کی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ ہے اِس کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت۔

اسبابِ زوالِ امت کی وجہ جواز

میں کیا کیا عرض کروں کہ ہمارے ساتھ پھر کیا ہوا؟ یہ لوگ جانتے ہیں جو سازشیں ہمارے ساتھ ہوئیں۔ سوچیے کہ آخری باب [1] میں وہ [2] کہتا ہے کہ یہ اس لیے اس میں پھنس گئے اور ابھی تک اُس پہ مُصر ہیں کہ انہیں احادیث دیدی گئیں' اور ساتھ وہ کہہ دیا گیا جو آپ کے ہاں کہا جارہا ہے کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی قرآن میں آ گئی اور جو دوسری وحی ہے وہ احادیث میں آ گئی۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن کے اندر جو وحی آ گئی ہے وہ تو اُن حقائق کی تصدیق کر رہی ہے جو آج بے پردہ' بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ اور جو ان کے ہاں وحی کی دوسری قسم ہے' وہ آج بھی ان کی تردید کر رہی ہے۔ یہ بڑے عمدہ زاویئے سے تنقید ہے۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ بابا! کس قدر تم خوش بخت تھے کہ تمہارے پاس اس قسم کی ایک کتاب تھی۔ اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں کہ یہ جو چیز تھی' یہ Conflict between Science & Religion (سائنس اور مذہب میں کشمکش) تھی' ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) کو تو اس کا ڈر ہوگا' ہمیں تو اس کا کوئی خوف نہیں ہے۔ ہم تو قرآن کی رو سے سائنس کو چیلنج دے سکتے ہیں کہ آؤ بتاؤ کہ کیا کوئی چیز ہے جو تمہارے سائنس کے انکشافات میں حق تک پہنچ گئی ہو اور قرآن اُس کے خلاف ہو۔ کوئی ایک واقعہ تو بتاؤ۔ ہم نے تو تحقیق نہیں کی۔ یہ دنیا کے غیر مسلم تحقیق کر رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ** (28:45) ان واقعات کو کتنی صدیاں گزر گئی ہیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ یہ وحی ہے جس نے یہ بات بتائی ہے۔

نوعِ انسانی پر خدائے رحیم کی طرف سے رحمت کی بارش

وَلَٰكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ (28:46) یہ خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ کیا لفظ ہیں! میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں۔ یہ اندازِ پرورش جیسا رحم میں ہوتا ہے وہاں سے یہ لفظ رحمت ہے۔ ماں کے رحم کے اندر بچے کی پرورش جس طرح ہوتی ہے' اُس میں اُس کے کسب و ہنر کا' ماں کی فکر کا' باہر والے کا' کسی کا' کوئی دخل' نہیں ہوتا۔ بچے کے پیدا ہونے کے بعد تو یہ ہے کہ بچہ روتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بھوک لگی ہے اِس کو دودھ دو۔ اُس میں تو یہ ہے کہ ماں کی اپنی فکر بھی آ جاتی ہے اور کوشش بھی آ جاتی ہے۔ رحم کے اندر یہ بات نہیں ہوتی۔ نہ بچہ وہاں روتا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے' نہ کچھ وہ محنت کرتا ہے' نہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے' نہ کہیں باہر سے ڈبہ جاتا ہے کہ لوریڈی میڈ بنالو۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی وہ چیز جس میں انسان کی کاوش' کوشش' فکر کا کوئی دخل نہیں۔ اس طرح سے جو پرورش ہوتی ہے اُس کو رحمت کہا جاتا ہے۔ اللہ نے

---

[1] اس باب کا نام Qur'an, Hadiths and Modern Science ہے۔

[2] یہ اشارہ مورس بوکائے (1989-1911) کی طرف ہے۔

قرآنِ کریم کو رحمت کہا ہے۔ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے دیا؟ (معاذ اللہ) کیا یونہی تماشہ تھا؟ کہا کہ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ (28:46) تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے پاس اس سے پہلے اس قسم کا آگاہ کرنے والا نہیں آیا' ان کو آگاہ کرو جو عرب بنی اسماعیل تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے: حضرتِ اسحٰق علیہ السلام اور حضرتِ اسماعیل علیہ السلام۔ حضرتِ اسحٰق علیہ السلام کو تو شام اور فلسطین کے ملک عظیم' جسے قرآن نے کہا ہے' دیئے گئے۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا گیا' جہاں نہ پانی ہوتا ہے' نہ کچھ کھانے کو ملتا ہے۔ یہ بنی اسماعیل یہاں رہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ قرآن سے پہلے اس دوران میں اِن کی طرف کوئی رسول بھی نہیں آیا تھا۔ اور وہاں انبیائے بنی اسرائیل کا تو ایک تانتا بندھا ہوا ہمیں نظر آتا ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے اگر لے لیجیے تو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام تک مسلسل چلے آتے ہیں۔ یہاں تو ایک بھی نظر نہیں آتا۔ اِس قوم کے لیے کہا کہ اِن کو بھی آگاہ کیا جائے۔ ہم نے تمہیںؐ یہاں مبعوث کیا اور یہ وحی تمہاری طرف نازل کی۔ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ (28:46) تاکہ یہ ان حقائق کو اپنے سامنے رکھیں اور اس کی روشنی میں زندگی کا راستہ طے کریں' اس لیے یہ ضروری ہے۔ کہا کہ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ان کی طرف بھی رسول بھیجا جاتا۔ ان کو بھی راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کیا جاتا کہ بچ کر چلنا' یہاں کنواں ہے' ادھر سے درندے آیا کرتے ہیں۔ کسی کو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ صحیح راستے پہ چلنا یا نہ چلنا اُس کے بس کی بات ہے۔ چلنے کے بعد کونسا راستہ اختیار کرنا ہے' یہ اُس کے اختیار کی بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم زبردستی یہ کچھ نہیں کر سکتے کہ ان کو صحیح راستے پہ چلاؤ۔ ہم اتنا ہی کرتے ہیں کہ غلط اور صحیح راستہ سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

آگاہ کرنے کی ذمہ داری ادا کرنے کی نوعیت اور اہمیت

کہا کہ ہم نے یہ کیوں کہا کہ ان کو آگاہ کر دیا جائے؟ یہ بڑی اہم آیت ہے کہ وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡ لَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِکَ وَ نَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (28:47) یہ اس لیے ضروری ہو گیا کہ یہ ہمارے اوپر الزام نہ دھر دیں۔ اس لیے ان کو آگاہ کر دیا کہ یہ مصیبتوں سے بچ جائیں۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن تو چلتے چلتے اپنا بنیادی اصول بیان کر جاتا ہے۔ مُصِيۡبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ (28:47) تقدیر کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ کوئی مصیبت جو ان کے اوپر آتی ہے' وہ مصیبت تو ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں آتی ہے۔ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ میں قدمَ (28:47) کے معنی ''پہلے بھیج دینا'' ہوتا ہے۔ انسان کا جو عمل ہے' جو کام ہے یا جو ایکشن ہے یہ پہلے ہوتا ہے' اُس کا

نتیجہ بعد میں برآمد ہوتا ہے۔ پہلے سنکھیا کھاتا ہے بعد میں ہلاکت ہوتی ہے۔ اس لفظ قَــــدمَ کا کیسا عجیب قرآن نے کہا ہے کہ پہلے تم یہ کر چکے ہوتے ہو ایــــدیھــم اپنے ہاتھوں سے یہ کر چکے ہوتے ہو۔ بس اتنا ہی ہے کہ وہ مصیبت اُس کے بعد آتی ہے۔ جو کچھ تم اپنے ہاتھوں سے کر چکے ہوتے ہو اُس کا نتیجہ بعد میں آتا ہے۔ اور جب یہ نتیجہ بعد میں آتا ہے تو تم یہ کہتے ہو کہ یا اللہ! تُو نے یہ کیا کر دیا' مجھ پہ ظلم ہو گیا' اللہ کی طرف سے مصیبت آ پڑی۔ وہ کہتا ہے کہ **قدمت ایدیھم** اُو ابھی تو تم نے یہ اپنے ہاتھوں کیا تھا۔

انسانوں کے مستقبل کا فیصلہ انسانوں کے ہاتھ میں ہے

عزیزانِ من! آپ نے قرآن کا انداز دیکھا۔ کہتا ہے کہ ہم نے یہ اس لیے بھیجا کہ جب ان کے اوپر ان کے اپنے ہاتھوں کی کی ہوئی کوئی تباہیاں یا مصیبتیں آئیں' تو اُس وقت یہ ایک بات کہہ سکتے تھے کہ ہمارے پروردگار! اگر ہمیں پہلے سے آگاہ کر دیا جاتا کہ یہ سنکھیا ہے' یہ مصری کی ڈلی ہے' یا پسی ہوئی شوگر ہے' تو پھر ہم سنکھیے سے مجتنب رہتے۔ اب ہمیں تو اس کا علم نہیں تھا۔ دو پسی ہوئی چیزیں ہمارے سامنے آئی تھیں تو ہمیں تو معلوم نہیں تھا۔ اگر ہمیں پہلے سے بتا دیا جاتا کہ یہ سنکھیا ہے' اِس کے کھانے سے ہلاکت ہو گی تو پھر اِس سے احتیاط برتتے۔ کہتا ہے کہ ان کا یہ جو اعتراض ہے اِس کو Meet کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی بھیج دیا جاتا جو انہیں بتاتا کہ یہ سنکھیا ہے' یہ مصری ہے تا کہ یہ سمجھنے سوچنے کے بعد' دیکھنے بھالنے کے بعد' معلوم ہونے کے بعد' کہ یہ سنکھیا ہے' پھر سنکھیا پھانک لیتے اور ہلاکت آتی تو یہ ہمیں ذمہ دار نہیں قرار دیتے۔ آپ نے دیکھا کہ تقدیر کا مسئلہ کیسے حل ہو گیا۔ ہم قدم قدم پہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ایسا منظور تھا' اللہ نے یہ کر دیا تھا۔ وہ اِس بات کے لیے کہ کہیں تم بعد میں ایسا نہ کہو۔ **بِـمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ** (28:47) کیا ہوا تو تمہارا اپنا ہوتا ہے' منسوب ہماری طرف کر دیتے ہو۔ اِس اعتراض سے بچنے کے لیے ہم نے انتظام یہ کیا ہے کہ یہ سارا کچھ تمہاری طرف بھیج دیا کہ دیکھ لو بھئی۔ ہر شیشی کے اوپر لکھ دیا: Poison, with care بچوں کے ہاتھ سے اوپر رکھنا' زہر ہے۔ یہ سب کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے' یہ سائنس کے دور کی چیز ہے کہ لکھا ہوا ہوتا ہے ورنہ اس سے پہلے تو کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے کہی کہ اُس میں تو یہ کہہ سکتے تھے کہ صاحب! ہمیں پتہ نہیں تھا لیکن اب تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ اب تو شیشی کے اوپر لکھا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی چیز ہے اور بڑی اہم بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ مختلف مقامات ہیں جہاں اُس نے کہا ہے کہ جب تک ہم کسی قوم کو پہلے سے آگاہ نہ کر دیں کہ کن باتوں سے ہلاکت ہوتی ہے' اُس وقت تک ہم اُس قوم کو تباہ نہیں کرتے۔ واقعی اسے خدا ہونا زیب دیتا ہے۔ اتنے بڑے اختیارات کا مالک ہے اور یہ جو انسانوں کو آگاہ کر دینا ہے' کتنی بڑی رعایت ہے اس بات کی کہ یہ نہ کہیں کہ ہمیں بتایا نہیں گیا۔ ہلاکت تو ان کے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہوگی لیکن اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ ہمیں بتا تو دیا ہوتا۔

آ گاہ کیے بغیر یا پیغام پہنچائے بغیر کسی پر تباہی نہیں آتی

قرآن نے متعدد مقامات میں یہ کہا ہے کہ جب تک ہم بتا نہیں دیتے' اُس وقت تک ہلاکت نہیں ہوتی۔ بہت سے مقامات ہیں جن میں' میں نے عرض کیا ہے۔ اور میری کتاب ''جہانِ فردا'' ہے' جس میں میں نے تفصیل دی ہے۔ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (17:15) ہماری طرف سے اُس وقت تک تباہی نہیں آتی جب تک کہ ہم وہاں ایک پیغام پہنچانے والا نہ بھیج دیں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہاں رسولاً ہے۔ اسے پیغام پہنچانے والا کہتے ہیں۔ نبی وہ ہے جس کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ خدا نے وحی دی اور اُس کے ساتھ آ گئے تو ہمیں اِس سے کیا فائدہ؟ اُس کے بعد نبی سے کہا جاتا ہے کہ اب تُو رسالت کا فریضہ ادا کر۔ اس وحی کو ہم نے تمہیں دیا ہے' اُسے آگے پہنچا' اسے رسول کہتے ہیں۔ تو ہمیں تو وحی اسی صورت میں فائدہ دے گی کہ وہ رسالت ساتھ ہو۔ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (17:15) جب تک ہم وہاں رسول نہ بھیج دیں' تباہی نہیں آتی۔ ایک اور ریفرنس لے لیجیے۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (26:208)۔ یہاں لفظ منذرون ہے کہ ہم ہلاکت نہیں کرتے تاوقتیکہ ہم وہاں پہلے آ گاہ کرنے والے نہ بھیج دیں کہ کن چیزوں سے' کس روش سے' کس نظام سے' کن باتوں سے' تباہی و ہلاکت ہو جائے گی۔

قوموں کی ہلاکت کا قرآنی مفہوم

وہ ہلاکت بھی یہ نہ سمجھو کہ گلے پہ چھری پھر جاتی ہے بلکہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے' یہ قوموں کی ہلاکت ہے' زندگی کے مقابے میں قوموں کی موت ہے اور قوموں کی موت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہاں سانس لینے والا کوئی نہیں رہتا۔ قرآن کے اعتبار سے قوموں کی موت اور حیات وہ بات ہے جو آج ہم محاورے میں کہتے ہیں کہ زندہ قوموں کی علامت یہ ہے' مردہ قوموں کی یہ ہے۔ انہی معنوں میں قرآن نے یہ بات کہی ہے: زندہ قومیں' مردہ قومیں۔ کیا انداز ہے قرآن کا! يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا (8:24) اے ایمان والو! تو یہ زندہ انسان ہوئے اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24) اس اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں اُس چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندہ کر دے گی۔ زندہ انسانوں کو تو کہہ رہا ہے۔ اُس نے یہ بتا دیا کہ یہ جو سانس لینا ہے یہی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو طبعی زندگی ہے اس طرح سے تو ہر حیوان زندہ ہوتا ہے۔ ان زندہ انسانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اس دعوت کے اوپر لبیک کرو جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی۔ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (26:208) آ گاہ کرنے والے آتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کا محاکاتی اور تمثیلی انداز بڑا پُر مغز اور بامعنی ہوتا ہے

یہیں تک نہیں ہے بلکہ بات آگے بھی چلتی ہے۔ محاکات کے انداز سے جہنم سامنے موجود ہے۔ یہ سارے تمثیلی انداز میں قرآن

نے بیان کیے ہیں۔مثل الجنة قرآن نے خود کہا ہے۔کہ یہ مثال ہے جو ہم دے کر بیان کرتے ہیں۔ یہ ہلاکت ہونے والے جہنم کے دروازے پہ پہنچ رہے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیوں بھئی! تمہاری طرف کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا' تمہیں بتانے والا نہیں آیا تھا کہ جس راستے پہ جارہے ہو یہ جہنم کی طرف جاتا ہے؟ تم جو یہاں آ پہنچے تو کیا کسی نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ اس راستے پہ نہ جانا' یہ جہنم کی طرف جاتا ہے؟ میرے بس میں تو ہے نہیں کہ میں تمہیں یہاں سے کہیں لوٹا دونگا' وہ تو اب تمہیں گرنا ہی ہے۔

آ گہی مل جانے کے باوجود انسان اپنے جذبات کا غلام بنا رہتا ہے

میں پوچھتا ہوں کہ راستے بھر میں تمہیں کوئی بتانے والا ہی نہیں ملا تھا؟ قَالُوْا بَلٰی (67:9) کہیں گے ہاں ملا تھا قَدْ جَآءَ نَا نَذِیْرٌ (67:9) کہیں گے ہاں ہماری طرف آئے تھے' اُنہوں نے ہمیں آگاہ کیا تھا۔ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ (67:9) ہم نے کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو' کیا تمہیں معلوم ہے کہ کیا کہہ رہے ہو' سنو! ہمارے پاس بڑی قوت ہے' ہمارے پاس مملکت ہے' فوج ہمارے پاس ہے۔ہمیں کون تباہ کرسکتا ہے' ہمارا بال بیکا نہیں ہوسکتا۔ جاؤ جاؤ' تم کیا کہتے ہو!! بس یونہی کہتے ہو: فَکَذَّبْنَا (76:9) ہم نے کہا کہ جھوٹ بول رہے ہو جو کہہ رہے ہو کہ اس روش کا نتیجہ جہنم ہوگا' تباہی ہوگا۔ ہم نے اُن سے یہ کہہ دیا تھا۔ وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (67:10) اُنہوں نے تو بات صاف صاف کہدی تھی۔ اگر ہم اُن کی سن لیتے اور عقل وفکر سے کام لے لیتے' قوت کے مدہوش شرابیوں کی باتیں نہ کرتے' یا حیوانات کی طرح تقلیداً کسی روش کے اوپر نہ چلے جاتے تو ہم کبھی بھی جہنم میں نہ ہوتے۔

انسان کے لیے غور وفکر کی اہمیت

کہا کہ نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ (67:10)۔جہنم سے بچنے کی دو شرطیں ہوگئیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ تمہاری طرف آگاہ کرنے والا آئے' وہ جو بات کہے' دل کے کانوں سے اُس کو سنتے اور سننے کے بعد اُس پر غور وفکر کرتے۔ یعنی یہ بات نہیں کہ تقلیداً مان لیتے یا اس لیے مان لیتے کہ یہ بڑا آدمی ہے بلکہ نعقل غور کرتے۔ کیا نتیجہ ہوتا؟ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (67:10) تو ہم کبھی بھی جہنم میں نہ آتے۔ یہاں نسمع او نعقل آیا ہے جسے آج ہم پہ حرام قرار دیدیا گیا ہے۔ اپنی عقل سے کام لینا تو کفر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم اُس کی سن لیتے۔ یہ پہلی بات بڑی عجیب ہے۔ سننے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہوگئے تھے' وہ بات تو کان تک پہنچ رہی تھی۔ سننا اور بھی بات ہے: یہ ''گوشِ نصیحت نیوش'' ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

قرآن یہ کہتا ہے کہ تمہاری مجلسوں میں آ کر بیٹھتے ہیں نظر آتا ہے کہ دیکھ رہے ہیں۔ عربی زبان میں ایک لفظ نظر ہے اور دوسرا بصر ہے۔ یہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ نظر ہے، یہ بصر نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ سننا ہے اور اُس کے لیے ہے کہ اگر ہم دل کے کانوں سے سن لیتے اور پھر اُس کے بعد اُس پہ غور وفکر کرتے تو ہم کبھی جہنم میں نہ جاتے۔ تو یہ دو باتیں ہوگئیں کہ ایک تو وہ کوئی بتانے والا آگاہ کرنے والا ہو۔ پھر یہ کہ یہ غور سے اُس کی باتیں سن کر غور وفکر سے کام لیں اور نتیجے پہ پہنچیں۔ قرآن کہتا ہے کہ کبھی جہنم میں نہیں جا سکتے۔ جہنم میں کون جاتے ہیں؟ یہاں تو اتنی سی بات ان کی زبان سے کہلائی ہے کہ اگر ہم غور وفکر سے کام لیتے تو کبھی جہنم میں نہ جاتے۔

جن وانس کی ذہنی کیفیت اور ان کا اندازِ زیست

کہا کہ وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ (7:179) یہ شہروں کی آبادیاں ہوں یا یہ باہر کے بدو اعراب ہوں، پڑھے لکھے لوگ ہوں یا یہ جاہل قسم کے لوگ ہوں۔ قرآن نے جن و انس کہہ کر کیا خوب بات کہہ دی کہ بات اتنے پہ ہی نہیں ہیں کہ یہ سارے مہذب لوگ ہیں اِن میں دوسرے بھی ہیں۔ عربوں کے محاورے کے اندر جن بدوؤں کو کہتے تھے جو باہر رہتے تھے، جیسے یہ آج کل کے ہمارے ہاں کے ''پکھی واس'' [1] ہیں۔ یہ لوگ پرانے زمانے کی قبائلی زندگی بسر کرتے ہیں یہ۔ یہ تقلیداً آج وہیں کھڑے ہیں جہاں آج سے دو ہزار پہلے کا انسان کھڑا ہے۔ ہماری طرح!! قرآن نے یہ کہہ کر کہ یہ دیکھ لینا کہ ان کا طرزِ زندگی کس طرح سے ہے، یہ بات نہیں ہے، وہ یہ ہوں یا وہ ہوں جو بظاہر تمہارے ہاں مہذب متمدن نظر آتے ہیں۔ وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ (7:179) ان کا اندازِ زیست تمہیں بتا دے گا کہ یہ جہنمی لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ بات تو بڑی صاف سی ہے کہ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا (7:179) ہم نے اِن کو دل ودماغ دیا تھا کہ سمجھ سوچ سے کام لے لیکن یہ اُس سے سمجھ سوچ کا کام نہیں لیتے تھے۔ وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا (7:179) ہم نے آنکھیں دی تھیں لیکن دیکھیے یہ بصیرت سے کام نہیں لیتے تھے۔ دیکھیے یہاں یبصرون کا لفظ آیا ہے۔ وَ لَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا (7:179) ہم نے کان دیئے تھے لیکن دل کے کانوں سے بات سنتے نہیں تھے۔ کیا یہ تمہیں انسان دکھائی دیتے ہیں؟ کہا کہ اُولٰٓئِکَ كَالۡاَنۡعَامِ (7:179) انسان نہیں، یہ تو حیوانات کے درجے پہ ہیں۔

حیوانات کو سوچنے والی صلاحیت سے نوازا ہی نہیں گیا، یہ مخلوق تو تقلید پرست واقع ہوئی ہے

حیوان عقل وفکر سے کسی بات کے نتیجے پر پہنچنے کی اہلیت وصلاحیت نہیں رکھتا۔ اُسے یہ دیا ہی نہیں گیا۔ حیوانات کو یہ سوچنے والی بات نہیں دی گئی، وہ تقلیدی طور پہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ كَالۡاَنۡعَامِ (7:179)۔ یہاں کالانعام کہا ہے۔ کہا کہ حیوان نہیں

---

[1] خانہ بدوش

بلکہ حیوانات کی مثل ہیں کیونکہ آگے اُس نے بات اور کہی تھی۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) یہ حیوانات سے بھی گئے گزرے ہیں کہ حیوانات اپنی Natural Instinct (فطری جبلت) کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ Instinct (جبلت) ہے نہ عقل وفکر سے کام لیتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) یہ اپنے آپ کو بے خبر رکھتے ہیں، غافل رکھتے ہیں۔ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ (7:179) یوں نظر آئے گا کہ جیسے یہ پیدا ہی جہنم کے لیے کیے گئے ہیں۔ تو دیکھا وہ جو وہاں کہا تھا کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ (67:10) اگر ہم عقل وفکر سے کام لیتے تو جہنم میں نہ جاتے۔ یہاں اُس کی تفسیر بیان کردی کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ یہ ساری صلاحیتیں ہم نے اِن کو دی تھیں لیکن یہ اُن سے کام نہیں لیتے۔ یہ حیوانات کے درجے کے ہیں بلکہ یہ اُس سے بھی گئے گزرے ہیں۔ یہ ساری چیزیں، یہ جتنی بھی معلومات حاصل کرنے کی ہیں، یہ کان ہیں، آنکھیں ہیں جسے قرآن نے بصیرت کہا ہے، پھر سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہے، یہ ہر انسان کو دی گئی ہیں۔

دوسرے انسانوں کے مقابلے میں ایک شرابی کی کیفیت

یہ جو کہا ہے کہ یہ ان سے کام نہیں لیتے، ہمارے سامنے تو یہ ہے کہ شرابی دوسرے انسانوں جیسا انسان ہوتا ہے۔ نشے کی حالت سے پہلے ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سے، آپ سے، زیادہ سمجھدار ہو، زیادہ صاحبِ فکر ہو لیکن جب شراب کے نشے میں ہوتا ہے، تو یہ شرابی کیا ہوتا ہے یہ کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7:179) یہ چیزیں تو اُس وقت بھی شرابی کے پاس ہوتی ہیں لیکن وہ اِن سے وہ کام نہیں لے سکتا جس کے لیے یہ چیزیں عطا کی گئی تھیں۔ نشہ یہ کچھ کرتا ہے۔

شراب کے نشے کے بالمقابل قوت کا نشہ کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ یہ نشہ شراب کا ہی نشہ نہیں ہوتا۔ شراب کے لیے تو وہاں لفظ خمر آیا ہے یعنی پردہ ڈال دینے والی چیز۔ ان عقل وفکر وبصارت اور سمع کی چیزوں کے اوپر اگر یوں پردہ اوڑھا دیا جائے تو آنکھیں کان تو خیر گئے، وہ عقل کے اوپر بھی پردے پڑ جائیں گے۔ یہ ہے جسے اُس نے خمر کہا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہی ہے جسے آپ طبعی شراب کہتے ہیں، یہ اِس سے نہیں ہوتا بلکہ ہر اُس چیز سے ہوتا ہے جو پردہ ڈال دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس میں کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس کے لیے قومِ عاد کے متعلق کہا ہے کہ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً (46:26) یہ ساری چیزیں تو اُن کو حاصل تھیں تو معاملات خراب ہوئے قوت کا نشہ اُن کے اوپر غالب آ گیا اور اُنہوں نے اِن کے بجائے اپنے جذبات سے ہی کام لینا شروع کردیا۔ قوت، دولت اور حکومت کا نشہ، جب اُن پر غالب آ گیا، کہا کہ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ [1] (46:26)۔ جب صورت یہ ہوگئی

صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

یہ نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ شرابی کا نشہ تو پھر بھی ذرا عارضی سا ہوتا ہے۔ کم بخت اس نشے کے بعد تو سانپ نکل جائے تو لکیریں بھی اتنی زبردست ہوتی ہیں کہ آدمی مر جاتا ہے چھوڑتا نہیں۔ کہا کہ **ما اغنٰھم**۔ کیا لفظ ہے! اُن کی سمع نے' ان کے بصر نے' ان کی فکر نے' انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ ''متاں ماریاں گیاں' عقلاں دے اُتے پردے پے [2] گئے''۔ نظر آتا ہے کہ ایک تباہ ہونے والے معاشرے میں بھی جو لوگ اُس نشے سے مدہوش نہیں ہوتے' ذرا باہر کھڑے ہوتے ہیں' بس میں تو ان کے بھی نہیں ہوتا کہ کچھ کرلیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے ان لوگوں کو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی جو ہم جیسے عام ذہن کے بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جس نے نہیں پی ہوتی اُس میں یہی فرق ہوتا ہے۔ وہ اُس کے مقابلے میں کم درجے کی عقل والا انسان بھی ہو تو اُس کی سمجھ میں وہ بات آ جاتی ہے لیکن اُن کی سمجھ میں نہیں آتی کہا کہ یہ نشے میں مدہوش ہیں۔ ان کی عقل' فکر' سمع' گوش نے اُن کو کچھ کام نہ دیا۔ اور اُس کے بعد **اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** (46:26) جب اُنہوں نے قوانینِ خداوندی کے ساتھ جنگ چھیڑ لی۔ **وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ** (46:26) جب اُن سے کہا گیا تھا کہ صاحب! اِس کا نتیجہ تباہی ہوگا تو مذاق اڑاتے تھے' ہنستے تھے کہ کیا باتیں کر رہے ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہی اُن کی جو ہنسی تھی' یہی اُن کو لے ڈوبی۔

عزیزانِ من! بات یہ کہنی تھی۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ایک آگاہ کرنے والا' متنبہ کرنے والا' تنذیر والا' آتا ہے۔ وہ واضح طور پہ بتا دیتا ہے کہ غلط راستہ کونسا ہے اور صحیح راستہ کونسا ہے۔ اُس کے بعد بھی جو غلط راستے پہ چلتا ہے' وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔

نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد ایک آنے والے کا تصور قرآنی فکر کے خلاف ہے

ہمارے ہاں یہ جو آگے چلنے والے تھے' اُنہوں نے اِس کے عجیب معنی نکالے۔ قرآنِ کریم نے تو نبوت کو ختم کیا ہے۔ وہ خاتم النبین کا باریک نکتہ اب ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ خدا کی طرف سے جو وحی ملتی تھی' اُس کا سلسلہ تو ختم کر دیا گیا۔ جو وحی ملتی تھی اُس کے متعلق کہہ دیا **وَ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115) مکمل ہو گیا' غیر متبدل ہے اس میں تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ **اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ** (15:9) مکمل' غیر متبدل اور محفوظ کتاب دیدی گئی۔ اِس کے بعد نبوت کی تو ضرورت ہی

---

[1] وہ قوانین خداوندی کی مخالفت کرتے تھے، اس لیے ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئے (45:23)۔ اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1181)

[2] سمجھ بوجھ نہ رہی' عقل پہ پردے پڑ گئے۔

نہیں رہتی۔ نبوت نے تو اِس اعلان کے بعد اپنے اوپر خود ختم ہونے کا پردہ ڈال دیا ہے۔ ختمِ نبوت کا اس نے ہی اعلان کر دیا۔ نبی کے اوپر جو وحی آیات کی صورت میں خدا کی طرف سے آتی تھی' اگر وہ مکمل آ گئی ہیں' تبدیلی کی ضرورت نہ ہو' حفاظت کا ذمہ خدا لے لے تو پھر نبوت کا ہے کے لیے باقی رہے۔ یہ جسے Logical Conclusion (منطقی نتیجہ) کہتے ہیں تو ختمِ نبوت تو اِس کا Logical Conclusion (منطقی نتیجہ) ہے' اس کے بعد نبوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آگے چلیے کہ ٹھیک ہے جی' نبوت تو ختم ہوگئی لیکن وہ جو آنے والے ہیں اُن کو تو آنا چاہیے۔ قرآن نے جو کہا ہے وہ تو ٹھیک ہے کہ یہ تنذیر والے' وہ آگاہ کرنے والے' وہ آتے ہیں' وہ آگاہ کرتے ہیں۔ یہاں بات یوں ہوئی کہ نبوت جو ختم ہوئی تو نبی کا دوسرا منصب رسالت کا تھا یعنی بات کو پہنچانے کا تھا' وہ تو قیامت تک باقی رہا۔ بات کو پہنچانے والا جو ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ نبی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن دیا ہے' وہ صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف ملکوں میں گئے ہیں۔ وہ وہاں کیا کرتے تھے؟ وہ تبلیغِ رسالت کرتے تھے۔ نبی ﷺ کی زندگی میں بھی یہ لوگ' یہ رسالت کرتے تھے۔ عربوں کے ہاں آج بھی رسول ''قاصد'' کو کہتے ہیں۔ اُن کی زبان میں یہ جو Messengers ہیں' یہ جو قاصد ہیں اِن کو کہتے ہی رسول ہیں۔ خود حضور ﷺ کی زندگی میں بھی یہ قرآن کو لے کر جو دوسروں تک پہنچاتے تھے' وہ فریضہ رسالت ادا کرتے تھے۔ حضور ﷺ بھی کرتے تھے' یہ بھی کرتے تھے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ** (3:144) یہ محمد ﷺ جو اس قسم کا رسول تھا کہ وہ نبی بھی ہے اور رسول بھی ہے وہ تو ختم ہو گیا تو کیا اِس کی وفات کے بعد تم پھر اپنے پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے کہ معاملہ ختم ہو گیا؟ کہا کہ یہ بات غلط ہے۔

عزیزانِ من! سنیے کہ یہ اتنا بڑا فریب دیتے ہیں کہ آنے والوں کا سلسلہ ضرور جاری رہے گا۔ تم اُس کا نام کچھ رکھ لو' مامور من اللہ رکھ لو' محدث رکھ لو' کشف والا رکھ لو' الہام والا رکھ لو' یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں' یہ قرآن کے سراسر خلاف ہیں۔ کتاب مکمل' غیر متبدل' محفوظ موجود ہے۔ نبوت کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ رسالت کے متعلق قرآن نے رسول سے یہ کہا ہے کہ **بلغ ما انزل الیک** (5:67) جو تم پہ نازل کیا جاتا ہے وہ دوسروں تک پہنچاؤ تو یہ رسالت ہوگئی۔ اب حضور ﷺ کے بعد یہ فریضہ کس نے ادا کرنا ہے؟ یہ نبوت نہیں ہے' یہ صرف رسالت ہے کہا کہ **وَ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ** (35:31) اے رسول! ہم نے تیری طرف یہ کتاب وحی کی۔ یہ الحق ہے۔ یہ لوگ جتنے دعاوی کرتے تھے یہ اُن کو سچا کر کے دکھا دے گی۔ خدا اپنے بندوں کے تمام حالات سے باخبر ہے' دیکھتا ہے۔ قیامت تک کے لیے جو آنے والے انسان ہیں اُن کے حالات کے متعلق خدا نے قرآن میں یہ وحی دیدی اور یہ رسول اپنی طبعی زندگی پوری کر کے دنیا سے چلے گئے کہا کہ **اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ** (3:143)۔ قرآن نے کہا ہے کہ کل کو یہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

کتاب تو باقی رہی ہے، جس کی حفاظت کا ذمہ ہم نے لے لیا ہے، یہ غیر متبدل ہے، مکمل ہے۔ **ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا** (35:32) ہم نے اِس کتاب کا وارث اس امت کو بنا دیا ہے جو رسول کے بعد باقی رہے گی۔

نبوت کے بعد کتاب کے وارثوں کا فریضہ

یہ جو کتاب کے وارث ہیں، اور وہ جو رسول کا فریضہ رسالت تھا، وہ ان کے ذمے آ گیا۔ خدا کی وحی کو دوسروں کو پہنچانا رسالت تھا۔ اور یہ خدا کی وحی، قرآنِ کریم کی صورت میں مکمل شکل میں، غیر متبدل شکل میں، ہم لوگوں میں سے ہر ایک کے پاس موجود ہے۔ ہمیں اِس کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ یہ ہمارے ذمے ہے کہ اب اس قرآن کی تبلیغ کریں۔ یہ فریضہ رسالت ہم پورا کریں گے۔ اور قرآن نے تو رسول سے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے رسالت کا یہ فریضہ ادا نہ کیا، یہ دوسروں تک نہ پہنچایا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارے ذمے جو رسالت کا فریضہ لگایا تھا وہ تم نے پورا نہیں کیا۔ وہ تو حضور ﷺ کو بھی وارننگ تھی۔ وہ حضور ﷺ نے تو مکمل طور پہ پورا کیا۔ ہم پہ گرفت ہوگی، ہم پہ مواخذہ ہوگا کہ کتاب کے وارث تو بنے تھے اور جو تمہارے ذمے اِس کتاب کو آگے دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ لگایا تھا، وہ تم نے ادا نہیں کیا۔ یہ تھا وہ طریقہ۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ واضح کیا ہے۔ بعض مقامات ایسے عجیب وغریب آ جاتے ہیں۔ وہاں صرف رسول کے متعلق ہی نہیں کہا کہ وہ فریضہ رسالت ادا کرتا ہے بلکہ کہا ہے کہ **الَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخۡشَوۡنَہٗ وَ لَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا** (33:39) وہ لوگ یہ فریضہ رسالت ادا کریں۔ ایک نبی اکیلا نہیں بلکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام جو پہلے گزرے ہیں۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ جو وارثِ کتاب ہیں، وہ ہیں جو یہ فریضہ رسالت ادا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس ادا کرنے کے اندر ایک خصوصیت ہے کہ تمہارے دل میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو۔

رسالت کے فریضہ کی ادائیگی کے متعلق وارثانِ کتاب سے پوچھا جائے گا

عزیزانِ من! یہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن کے حق کو دوسرے تک پہنچانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو۔ **وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا** (4:6) یہ بات نہیں کہ ہم نے ایسے ہی کہہ دیا۔ ہم ان سے اس بات کا حساب لیں گے کہ یہ فریضہ تم نے کس حد ادا تک کیا تھا۔ ہم یہ حساب لیں گے۔ عزیزانِ من! یہ کہنے کے بعد اگلی آیت میں یہ کہا ہے **وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ** (33:40)۔ ختمِ نبوت کی آیت یہاں آئی ہے۔ حضور ﷺ کے بعد تبلیغِ رسالت کا پہلے انتظام کر لیا کہ یہ طریقہ ہوگا۔ یہاں نبوت کو ختم کرنے کی آیت دے دی کہ نبوت ختم ہوئی ہے، رسالت کا فریضہ ختم نہیں ہو گیا۔ یہ پوری امت ہے جس کو وارثِ کتاب قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ ساری امت کا فریضہ ہے کہ کتاب اللہ کی تبلیغ کریں، دوسروں تک پہنچائیں۔ اس کے لیے اب خدا کی طرف سے کوئی نہیں آئے گا۔ آنا تو نبی نے تھا۔ یعنی عجیب بات ہے میں اِن کو کیا سمجھاؤں۔ نام دوسرے رکھ لیے کہ صاحب! مامور من اللہ آئیں گے، محدث

آئیں گے' یہ کچھ کریں گے۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کے پاس نبیوں کا اسٹاک ختم ہوگیا کہ اب اُس نے اِس قسم کے جو نا پختہ تھے' اُن کو بھیجنا شروع کر دیا کہ پکا نبی تو نہیں' وہ تو اسٹاک ختم ہو گیا ''اے کچے پکے جیھڑے ہیگے نیں' چلاؤ تو سہی' مارکیٹ اچ' مانگ بڑی ہیگی اے'' [1] (معاذ اللہ)۔ قرآن کے ساتھ کیا مذاق ہو رہا ہے! یہ جتنے بھی مامور من اللہ آپ کہتے ہیں وہ انبیائے کرامؑ تھے' وہ نبی تھے۔ یہ جسے آپ الہام اور کشف کہتے ہیں' یہ کچھ نہیں ہے' صرف نام بدلے ہوئے ہیں۔ وہی ایک چیز ہے' باہر لیبل اور لگا دیا ہے۔ صرف اور صرف وحی ہے جو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتی تھی۔ جسے ملتی تھی وہ نبی ہوتا تھا۔ یہ دونوں اصطلاحیں خدا کی طرف سے ہیں۔ کوئی اور نہیں آنا۔ نہ خدا کی طرف سے کسی کو اِس کے بعد کوئی اور علم مل سکتا ہے' نہ کوئی خدا کی طرف اس کو آگے پہنچانے والا آ سکتا ہے۔ امتِ محمدیہ ﷺ وارثِ کتاب قرار دی گئی ہے۔ کتاب مکمل ہے۔ اس کتاب کا جو پہنچانا ہے' یہ رسالت ہے۔ کتاب کا ملنا نبوت تھی' وہ ختم ہوگئی۔

بات یہاں سے ہوئی کہ ہم نے اس لیے ان عربوں کی طرف اس رسول کو بھیج دیا تا کہ یہ کہیں کہ صاحب! اگر ہمیں بھی کوئی بتانے والا آتا تو ہم بھی اُس کا اتباع کرتے۔ فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ (28:47) اتباع خدا کے قانون کا ہے۔ اس شخص کا نہیں ہے جو پہنچا رہا ہے۔ چٹھی رساں ہمیں چٹھی دیتا ہے۔ ہم اُس تار اور چٹھی کے مطابق کام کرتے ہیں' نہ کہ وہ جو لانے والا ہوتا ہے اُس کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اتباعِ آیات اللہ تو خود نبی بھی کرتا تھا۔ وَ نَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (28:47) یوں ہے۔ اتباعِ آیاتِ خداوندی سے ایک شخص مومن ہوتا ہے۔ اور آگے بات یہ ہے کہ ہم نے ان کے اس اعتراض سے بچنے کے لیے یا اِن کے اس مطالبے کے متعلق یا ضرورت تھی اس بات کی کہ اِن کی طرف بھی ایک رسول آتا کیونکہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہماری طرف بھی ایسا کوئی آئے گا تو ہم قانونِ خداوندی کا اتباع کریں گے۔ اور آگے یہ بات ہوئی کہ پھر جب ہم نے بھیج دیا تو اِنہوں نے کیا کیا؟ وہی جو ہم کر رہے ہیں۔ ہماری طرف بھی تو وہ رسول آیا ہوا ہے۔ حضور ﷺ کی نبوت ہمارے پاس آج بھی زندہ جاوید موجود ہے۔ اُسی طرح سے برحق' بغیر کسی قسم کی تحریف کے' بغیر ردوبدل کے' مکمل ہے' محفوظ ہے۔ آگے جو کہا ہے کہ پھر رسول آ بھی گیا تو پھر اِنہوں نے کیا کیا؟ یہ اپنی ہی روش کے اوپر چلتے رہے' اپنے ہی جذبات کے تابع چلتے رہے۔ رسول کا تو صرف نام لیتے رہے۔ یہ تفصیل طلب بات ذرا آگے آ جائے گی' اسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ القصص کی آیت 47 تک آ گئے۔ 48 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀❀............❀❀............❀❀

---

[1] یہ جو کچے پکے ہیں انہی سے مارکیٹ (کا کاروبار) چلاؤ۔ (ان کی) بڑی مانگ ہے (معاذ اللہ)۔

ساتواں باب: سورۃ القصص (آیات 48 تا 49)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1979ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 48 سے ہو رہا ہے: (28:48)۔

بنی اسرائیل کی الزام تراشی اور اس کا جواب

اس سورۃ کے شروع سے ہی حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کی یا بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان چلی آ رہی تھی۔ اس سے پہلی آیت یہ تھی کہ وَ لَوْ لَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (28:47) جب ان پر کوئی مصیبت خود اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری طرف بھی کوئی رسول آتا اور ہمیں صحیح راہنمائی دیتا تو ہم غلط راستے پہ نہ چلتے۔ گویا یہ ان کی طرف سے اعتراض یا الزام تھا کہ صحیح راہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے ہم غلط راستے پر چلے ہیں۔ آگے کہا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا (28:48)۔ صورت یہ ہے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہماری طرف بھی اگر کوئی رسول آ جائے تو ہم صحیح راستے کے اوپر چلیں۔ کہا کہ جب ان کی طرف ایک رسول حق کو لے کر آ گیا، تو چاہیے تو یہ تھا کہ اُس رسول کا اتباع کرتے لیکن قَالُوْا لَوْ لَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى (28:48)۔ یہ ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ جب بھی کسی رسول نے آ کر کسی قوم کو اُن کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا ہے، تو وہ اُس کے جواب میں کہتے رہے کہ تم یونہی غلط کہتے ہو، ہماری روش کبھی ہمیں تباہ کن نتائج کی طرف نہیں لے جائے گی، ہم بالکل صحیح راستے پہ چل رہے ہیں۔ وہ اپنی

اپنی حالت میں تبدیلی کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ اور کہتے یہ تھے کہ جو کچھ تم کہتے ہو کہ اس سے تمہاری تباہی ہو جائے گی' وہ تباہی لاؤ' پھر اُس کے بعد ہم دیکھیں گے۔ اندازہ لگائیے کہ تباہ ہونے کے بعد دیکھیں گے کہ تباہی سے کیسے بچا جاتا ہے۔ اور یہ کچھ اُنہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہر غلط کار' غلط کوش اور غلط بین کا یہی وطیرہ ہوتا ہے کہ جب اُس کو اُس کی غلط روش کے نتائج سے متنبہ کیا جائے تو وہ کبھی مانتا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ایسا ہوگا تو پھر دیکھا جائے گا' اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ پہلے وہ ویرانیاں اور تباہیاں لاؤ جن سے تم ہمیں آگاہ کرتے ہو۔ تو پھر ہم سمجھیں گے کہ تم ٹھیک کہتے تھے۔ جب ویران ہو چکے' تباہ ہو چکے تو پھر اُس سمجھنے سے فائدہ کیا ہوگا۔ یہ عام روش چلی آ رہی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بروقت انتباہ سے سمجھ سوچ کر اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرلیں' ورنہ وہ اپنے جذبات کے تابع چلتے جاتے ہیں اور کہتے یہی ہیں کہ ہاں وہ دکھاؤ جو کچھ تم کہتے ہو۔ دیکھیے ہم تو اور پنپتے جا رہے ہیں' کہاں ہے وہ تباہی' کہاں ہے وہ خطرہ جس سے تم ہمیں اس طرح سے وارن کرتے ہو' آگاہ کرتے ہو؟ کہا کہ یہ بھی اِن سے یہ کہہ رہے ہیں جس طرح سے حضرتِ موسیٰ کے زمانے میں فرعون نے' جب اُن کی بات نہ مانی تو اُس پہ تباہیاں آئیں' کہا تھا کہ پہلے اُس قسم کی تباہیاں لا کر ہمیں دکھاؤ پھر ہم تمہاری بات مانیں گے۔ تباہیاں جب آ چکیں تو پھر بات ماننے' نہ ماننے میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

راہِ حق کو قبول کرنے کا طریق صرف علم و بصیرت کی راہ کو اختیار کرنے میں ہے

وہ روشِ کہن جو چلی آ رہی تھی' اُسی کو یہ بھی Repeat (دہرا) کر رہے تھے۔ وہی جواب یہ بھی دے رہے تھے۔ جواب دیا گیا کہ اَوَ لَمۡ یَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ (28:48) اُن تباہیوں کے باوجود کیا وہ قوم صحیح راستے پر آ گئی تھی؟ کچھ تو تباہ ہی ہو گئے تھے' جو باقی بچ گئے تھے اُنہوں نے بھی صحیح راستہ قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ صحیح راستہ قبول کرنے کا طریقہ اور ہے۔ میں تمہیں وہ طریقہ بتاتا ہوں جس سے تم غلط اور صحیح میں امتیاز کر سکو۔ اگر وہ طریق اختیار نہ کیا جائے اور تمہارے یہ تمام مطالبات اور تقاضے پورے بھی کر دیئے جائیں' تو پھر بھی تم صحیح راستے کے اوپر نہیں آؤ گے۔ اور آگے چل کر بتایا ہے کہ صحیح راستے پہ وہ آتا ہے جو غور و فکر اور علم و بصیرت کے تابع پہلے فیصلہ کرے کہ کونسا راستہ غلط ہے اور کونسا صحیح ہے پھر جذبات سے الگ ہٹ کر صحیح راستے کی طرف آئے۔ یہ تو ساری کٹ حجتیاں ہیں کہ وہ خطرہ لاؤ' وہ تباہی دکھاؤ' پھر ہم یہ کریں گے۔ یہ طریقہ صحیح ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہا کہ جب موسیٰ کے زمانے میں بھی اتنا کچھ اُن فرعون والوں کے ساتھ ہو گیا تھا تو اُس کے باوجود اُنہوں نے کہا یہ تھا کہ قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوۡنَ (28:48) اُنہوں نے کہا تھا کہ یہ حضرت موسیٰ اور حضرتِ ہارونؑ' یہ دونوں بھائی' جھوٹے ہیں۔ یونہی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی طرف سے یہ چیز ہمیں معلوم ہوئی ہے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ یہ غلط کہتے ہیں' یہ فریب دیتے ہیں۔

سحر کا حقیقی ترجمہ ''جادو'' نہیں بلکہ ''فریب دہی'' ہے

میں کہہ چکا ہوں کہ **سحر** کے معنی ''فریب دہی'' ہوتا ہے۔ یہ جادو کا جو لفظ ہے یہ تو ہم نے اِس کا ترجمہ یوں کرلیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ فریب ہے جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے یہ بات مجھے بتائی گئی ہے کہ تمہاری اِس غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ اس لیے **اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ** (28:48) جو کچھ بھی تم کہتے ہو ہم اُس سے انکار کرتے ہیں۔ ہم اُن میں سے ایک بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

سرزمین عرب میں یہودیوں کی کیفیت

نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے جو یہودی تھے، دیگر علاقے یا ممالک تو ایک طرف، خود عرب میں اور عرب میں بھی مدینے میں یہ بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ سب سے زیادہ مخالفت مکے میں تو قریش کی طرف سے ہوئی تھی اور مدینے میں آ کر ان یہودیوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہودیوں کی یہ عجیب روش شروع سے ہی ہے جب سے یہ ان کے ہاتھ سے مملکت اور حکومت اور اقتدار بلکہ گھر بار چھوٹا۔ ان کو Wandering Jews کہا جاتا تھا کہ یہ قریباً دو ہزار سال تک خانہ بدوش ہی رہے، کہیں ان کو چھت نصیب نہیں ہوئی، ٹھکانہ نصیب نہیں ہوا، گھر نصیب نہیں ہوا۔ 71ء عیسوی میں ان کی آخری تباہی ٹائٹس کے ہاتھوں ہوئی تھی، وہ رومی گورنر تھا، جب ان کو یروشلم سے بھی نکال دیا گیا تھا۔ اُس کے دو ہزار سال کے بعد ان کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہے کہ اسرائیل کی حکومت یہاں قائم ہوئی ہے۔ اور اُس کے لیے بھی قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ جہاں جائیں گے ان کے پیچھے پیچھے ذلت اور خواری لگی ہوگی: **اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ** (3:111) اس صورت میں ان کی بچت ہوسکے گی کہ یا تو یہ خدا کے قوانین کو تھام (بحبل اللہ) کر اپنی روش میں تبدیلی کریں یا کوئی انسانوں کی جماعت، کوئی قوم ان کو کوئی سہارا دیدے۔ یہ **حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ** ہے جس کی وجہ سے یہ اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی ہے، ورنہ اِس سے پیشتر تو یہ Wandering Jews تھے، خانہ بدوش تھے، ان کا گھر بار ہی کوئی نہیں تھا۔

آج یورپ اور امریکہ کی معاشی دنیا پر یہود کی اجارہ داری مسلط ہے

یہ عجیب قسم کی بنیا قوم تھی۔ یہ جس ملک میں بھی رہے اُس ملک کی معاشیات اور اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ یعنی سود یا ربوٰ تو ان کی معیشت یا معاشرت کا بنیادی جزو تھا۔ آج بھی آپ دیکھیے یورپ کی مختلف حکومتیں ہوں یا پورے کا پورا امریکہ ہو، وہ اتنی اتنی عظیم الشان مملکتیں ہیں لیکن اُن کی رگِ جان پنجۂ یہود میں ہے۔ ہر مملکت کی معیشت یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس معیشت کے زور پہ وہ ان کی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہیں۔ جدھر جی چاہتا ہے وہ اِن کو گھماتے رہتے ہیں۔ اُن کی سیاست ان کے تابع چلتی ہے۔ یہ چیز اِنہوں نے اختیار کر رکھی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کے دور میں مدینے کے اندر یہودیوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ

مدینے میں بھی جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے گئے ہیں تو مدینے کی معیشت بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہاں کے انصار بھی قریباً ان کے طفیل وہاں رہ رہے تھے۔ وہاں سب سے بڑی مخالفت ان کی طرف سے ہو رہی تھی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے جو بنی اسرائیل کے قصے کو بار بار دہرایا ہے اور پھر اُس کے انجام وعواقب سے انہیں آگاہ کیا ہے تو وہاں کے جو یہودی تھے وہ سب سے پہلے ان چیزوں کے مخاطب تھے کہ تمہارے ساتھ تو یہ چیز بیت چکی ہے' تم تو جانتے ہو کہ قوانینِ خداوندی کو چھوڑ دینے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب پھر وہی قوانین اپنی اصلی شکل میں آئے ہیں۔ اگر تم ان سے انکار کرو گے تو پہلے تو خیر Wandering Jews ہی تھے' اس کے بعد تو معلوم نہیں تمہارا حشر کیا ہو گا۔ اس ملک سے بھی تمہیں نکالنا پڑے گا چنانچہ یہ وہاں سے نکال دیئے گئے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کی کیفیت

غیر مسلم اس مملکت میں بڑے امن سے رہتے تھے۔ اُن کے حقوق کی پوری ضمانت اُن کو دی گئی تھی۔ آج ان کے حقوق کی باتیں ہوتی ہیں کہ جنہیں غیر مسلم اقلیت کہا جاتا ہے' بات تو لمبی ہو جائے گی' میں اُن کے حقوق کی صرف دو ٹکڑوں میں بات کرتا ہوں کہ اِن کو کتنا تحفظ حاصل تھا۔ حضرتِ عمرؓ (45AD/ 581-644) کے زمانے (634-644/45) میں مصر کے ایک گورنر تھے۔ وہاں اُنہوں نے کسی ذمی سے اور وہ یہودی تھا یعنی غیر مسلم جو اسلامی مملکت کے اندر رہتے تھے' اُنہیں ذمی کہا جاتا تھا' تو یہ آج تو ذمی کا لفظ کافر کی طرح بڑا قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے' ذمی کے معنی یہ ہیں کہ وہ جن کی ہر قسم کی پوری ذمہ داری اس حکومت نے لے رکھی ہو' کسی یہودی نے کوئی بات ایسی کی یا کہی کہ مصر کے اس گورنر نے اُسے کہا کہ خدا تجھے ذلیل کرے۔ یہ بات ہی کچھ نہیں ہے' یہ گالی بھی نہیں ہے۔ اس گورنر نے یہ کہہ دیا اور کہہ دینے کے بعد اپنا استعفیٰ بابِ خلافت میں بھیج دیا کہ میں نے ایک ذمی کی عزتِ نفس کے خلاف دو لفظ کہہ دیئے ہیں۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اسلامی مملکت کا گورنر رہ سکوں۔'' بابِ خلافت میں بلایا گیا۔ یہ بڑے دیانتدار اور بڑے قابل گورنر تھے۔ دیانت کا تو اِس سے اندازہ لگائیے کہ بے ساختہ ایک لفظ زبان سے نکل گیا تو اُس کے بعد اپنے اوپر خود یہ سزا وارد کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''میں اس قابل نہیں ہوں کہ اسلامی مملکت کے اندر کوئی منصب Hold (رکھ) کر سکوں کیونکہ میں اپنے اس قسم کے جذبات کے اوپر قابو نہیں رکھ سکا' میری زبان سے یہ بات نکل گئی اور ایک ذمی کی دل شکنی ہو گئی۔ میں نے اُس کو ذلت کا لفظ کہہ دیا ہے۔'' اُنہیں بڑا کہا اور سمجھایا کہ یہ کوئی بات نہیں ہے' اس سے تو کوئی ایسی خرابی واقع نہیں ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کہ ''نہیں' بات ایسی نہیں ہے۔ وہ ایک شخص کہ جس کی عزتِ نفس کی ذمہ داری ہم نے لے رکھی تھی' اگر میں اُس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتا تو میں اس منصب کو Hold (رکھ) کرنے

کے قابل نہیں ہوں۔'' پھر وہ واپس نہیں گئے۔ یہ ہوتا ہے ذمہ داری کا احساس۔

دورِ فاروقی رضی اللہ عنہ میں اسلامی مملکت سہولت فراہم کیے بغیر کسی سے ٹیکس وصول نہیں کرسکتی تھی

اور دوسرا واقعہ تو خود حضرتِ عمرؓ (581-644/45 AD) کا ہے۔ وہ یہودی بوڑھا جا رہا تھا۔ کہنےؓ لگے کہ کہاں جا رہے ہو۔ وہ کہنے لگا کہ مملکت کی طرف سے جو ٹیکس عائد ہوا ہے' وہ Pay (ادا) کرنے کے لیے خزانے کی طرف جا رہا ہوں۔ کہاؓ کہ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں ہے' لگتا ہے نئے نئے آئے ہو۔ کہنے لگا کہ ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں کہ میں یہاں آیا ہوں تو وہ جو ٹیکس عائد ہوا ہے اُسے Pay (ادا) کرنے کو جا رہا ہوں۔ کہنےؓ لگے کہ تمہیں تو ابھی آئے ہوئے تھوڑے دن ہوئے ہیں اور مملکت نے تو ابھی تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ جاؤ سال بھر گزارو۔ جب مملکت تمہارے لیے کچھ کرے گی تو پھر ٹیکس دینے کے لیے آنا' اس کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ یہ تھا ان یہودیوں کے ساتھ اسلامی سلطنت کا وطیرہ اور یہ تھی ان کی کیفیت۔

مملکت کے خلاف اہلِ یہود کا وطیرہ اور ان کی ذہنیت

یہ یہود اِس قسم کے لوگ تھے کہ ان میں جرأتیں مفقود ہو جاتی ہیں' کیریکٹر کی بلندیاں باقی نہیں رہتیں۔ دولت کے اعتبار سے کتنے ہی بڑھ جائیں لیکن یہ لوگ کمینہ فطرت ہوتے ہیں' سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ اِنہوں نے مدینے کی اس مملکت کے خلاف مسلسل سازشیں کیں۔ پہلے انہیں مدینے سے نکالنا پڑا اور اِن سے کہا کہ باہر کے علاقے میں جا کر بسیں۔ خیبر کے علاقے سے بھی ان کو نکال دیا گیا۔ وہاں بھی یہ سازشوں سے باز نہیں آئے۔ آخرالامر ان کو سرزمینِ عرب سے باہر نکال دینا پڑا۔ اُس زمانے میں بھی ان یہودیوں کی یہ کیفیت تھی اور ہمیشہ یہ یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ ہزار قسم کی کٹ حجتیاں روز کرتے رہتے تھے۔ انہیں قرآنِ کریم کی طرف دعوت دی جا رہی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں تورات اور عہد نامہ عتیق کی کیفیت

اب ایک بڑی اہم آیت آ رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ **قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (28:49) ان سے کہا کہ جو دین میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ کوئی نیا دین نہیں ہے۔ یہ وہی دین ہے جو تمام انبیائے کرامؑ کو دیا جاتا رہا۔ اور یہی دین تھا جو اصولی طور پر حضرتِ موسیٰؑ کو بھی دیا تھا۔ حضرتِ موسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی تھی وہ اب اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس ہوتی تو تم دیکھتے کہ وہ اسی طرح سے ہدایت دینے والی کتاب تھی جس طرح سے یہ قرآن ہدایت دینے والی کتاب ہے۔ اور جس طرح اس قرآن کے متعلق میرا دعویٰ ہے کہ اس کی مثل کوئی دوسری کتاب نہیں

پیش کر سکتا۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے! تورات حضرتِ موسیٰ کی طرف نازل کردہ کتاب کا نام نہیں ہے' بلکہ وہ جتنے بھی انبیائے بنی اسرائیل ہوئے ہیں' اُن کی طرف جو مختلف صحف یا اُن کی طرف جو وحی آتی رہی' پہلے تو شاید وہ اپنی شکل میں ہو' بہر حال اُن تمام کے مجموعے کا نام تورات❶ ہے۔ یہ وہی ہے جس کو انگریزی میں Old Testament کہتے ہیں۔ یعنی عہد نامہ عتیق۔ کہا گیا کہ اگر وہ کتاب جو حضرتِ موسیٰ کو ملی تھی اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس ہوتی تو تم دیکھتے کہ وہ قرآن ہی کی طرح بے مثل و بے نظیر ہوتی۔ وہ وہی ہدایت پیش کرتی جو خدا نے پیش کی تھی۔ بات تو یہ ہوئی ہے کہ وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔ اور اُس کا اعتراف تو خود اُن کے ہاں موجود تھا۔ وہ جو ان کتابوں کا مجموعہ ہے جسے آپ Old Testament❶ یا ہمارے عام الفاظ میں تورات کہہ کر پکارا جاتا ہے' اُس میں ایک اتنا سا حصہ ہے جسے صحفِ موسیٰ کہا جاتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ کی طرف جو منسوب کرتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰ کی طرف جو وحی نازل ہوئی تھی اِس حصے میں وہ وحی ہے۔ اور آپ سن کر حیران ہونگے کہ اُس حصے میں حضرتِ موسیٰ کی وفات کے بعد کے واقعات بھی درج ہیں۔ میں اُس کتاب کے متعلق صرف یہ بات کہہ رہا ہوں جس کے متعلق اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتابِ موسیٰؑ ہے۔

''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں'' اِن پر لکھی جانے والی ایک کتاب کا ذکر

اسلام ایک دین ہے۔ قرآن کو چھوڑ کر اس وقت دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں' وہ مدعی ہیں کہ ہمارے بانیٔ مذہب یا ہمارے پیغمبر کی طرف یہ کتاب نازل ہوئی تھی۔ میں نے اس پہ تحقیق کی اور میری ایک کتاب ہے: ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں''۔ تمام مذاہبِ عالم کی جتنی مبینہ آسمانی کتابیں ہیں اُن کی تاریخ اُس میں دی ہوئی ہے' میں نے اپنی طرف سے اُس میں کچھ نہیں لکھا۔ خود ان مذہب والوں کے مورخین کی طرف سے' اُن کے مذہبی پیشواؤں کے اعترافات اُس میں دیئے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ہمارے نبی کی اصلی کتاب نہیں ہے۔ دین کے متعلق یہ بات نہیں تھی کہ خدا نے حضرتِ موسیٰ کی طرف بھی ایک کتاب بھیجی' کچھ عرصے کے بعد اُنہوں نے حضرتِ داؤد علیہ السلام کی طرف بھیج دی' پھر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھیج دی' پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیج دی اور اُن میں بڑا باہمی اختلاف ہے۔ خدا کی طرف سے ایک ہی ضابطہء ہدایت ہے' اُسی کی طرف سے آنے والے رسول ہیں اور ان رسولوں کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ ایک کی تعلیم دوسرے سے نہیں ملتی۔

دین خداوندی کے متعلق قرآن حکیم کا فرمان

دین کے متعلق قرآن نے کہا تھا۔ اور آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم کی صداقتوں کی اِس میں کتنی شہادات پائی جاتی ہیں! کہا یہ تھا کہ

---

❶ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ص۔ 242 (فٹ نوٹ 1)

ساری دنیا کے متعلق یہ کہنا' ہر مذہب کے متعلق یہ کہنا کہ اِس کے بانی کی طرف جو خدا کی طرف سے وحی آئی تھی' وہ وہی ہے جو آج محمد رسول اللہ علیہ السلام کی طرف ہم بھیج رہے ہیں۔ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ (42:13) اے رسول! جو دین تمہیں خدا کی طرف سے دیا جا رہا ہے یہ اصولی طور پر وہی ہے جو اس سے پیشتر حضرتِ نوحؑ سے لے کر حضرتِ عیسیٰؑ تک کے انبیائے کرامؑ کو ہم دیتے چلے آ رہے تھے۔ اور اگلے دو الفاظ بھی کہہ دوں تو بات سمجھ میں آ جائے گی کہ پھر اُس کتاب کے ساتھ وہ لوگ کیا کرتے تھے اور ہم نے بھی کیا کیا ہے۔ کہا ہے کہ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ (42:13) الدین کو ہمیشہ قائم رکھو۔ اور اُس کا عملی ثبوت یہ ہو گا کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (42:13) آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تفرقہ پیدا ہو گیا تو الدین باقی نہیں رہتا اور ہم نے یہی کر لیا۔

ملت کے اندر فرقہ بندی دین خداوندی کے ساتھ بغاوت ہے' شرک ہے' ایسا کرنے والا مملکت کا باغی ہے

الدین تو تمام انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے' ایک عالمگیر برادری بنانے کے لیے آتا تھا اور اگر اُس کتاب کے مدعیوں کے اندر بھی فرقے پیدا ہو جائیں تو الدین رہ ہی نہیں سکتا۔ اگر ایک خدا کی طرف سے ایک کتاب' ایک ضابطہء ہدایت' پوری کی پوری ملت کے لیے ہو تو پھر تفرقہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں بھی ایک مملکت کے اندر مملکت کی طرف سے جو ضابطہء قانون دیا جاتا ہے' ساری مملکت میں کوئی ایک شخص' کوئی اور قانون اپنی طرف سے وضع کر کے اُس کی پیروی شروع کر دے تو وہ بغاوت کہلاتی ہے۔ الدین کو ماننے والی امت کے اندر مختلف فرقے پیدا ہو جانا دین کے خلاف بغاوت ہے۔ بغاوت کو قرآن نے شرک کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک سے زیادہ Authorities کو مان لینا' اسی کو بغاوت کہتے ہیں۔ ایک مملکت کے اندر ایک اتھارٹی ہوتی ہے۔ اور اگر اُسی مملکت کے اندر آپ دو چار دس بیس مختلف Authorities مان لیں اور Authorities قانون دینے والی ہوں اور آپ کے ہاں قوانین کے مختلف ضابطے آ جائیں تو کیا وہ مملکت قائم رہ سکتی ہے' کیا اُس مملکت کا کوئی دعویٰ چل سکتا ہے؟ عزیزانِ من! یہ مذہب کا سوال نہیں ہے۔ یہ الدین کا سوال ہے' یہ مملکت کا سوال ہے' یہ نظامِ مملکت کا سوال ہے۔ کبھی دنیا میں کسی مملکت کے اندر ایسا ہوا ہے کہ وہاں بیس قسم کے ضابطہء قوانین ہیں اور اُس کے بعد یہ کہے کہ ہاں ہاں جی ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' ہر ایک کو اجازت ہونی چاہیے کہ اپنے اپنے ضابطے کے مطابق چلتا جائے۔ مملکت کے قانون کا جو ضابطہ ہے اُس کے علاوہ دوسرا ایک اور ضابطہء قانون مملکت کے اندر چلا کے دیکھیے تو دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ دوسرے ضابطے کو مدوّن کرنے والا' ماننے والا' چلانے والا مملکت کا باغی قرار پاتا ہے۔ اور اِسے شرک کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (30:31)۔ یہ ہم قرآن ماننے والوں سے کہا جا رہا ہے

کہ ''دیکھنا کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا'' یعنی ذہن میں یہ تصور نہ ہو کہ کہیں بت پرستی کی بات ہے۔ بت پرستی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اور وہیں بات صاف کر دی۔ کہا کہ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (30:32) ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ شرک یہ ہے کہ نظامِ مملکت کے اندر تم دو Authorities ماننے لگ جاؤ۔ یہ شرک ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی دنیا کی حالت

عزیزانِ من! کبھی سوچیے تو سہی کہ اِس امت کے اندر کیا کچھ ہے؟ کہ صاحب! یہ فقہ حنفی ہے' یہ فقہ مالکی ہے' یہ فقہ شافعی ہے' اہلحدیث کی اپنی فقہ ہے' ایک فقہ جعفریہ ہے۔ فقہ کے معنی ہی ضابطہء قانون ہیں۔ ایک مملکت کے اندر کتنے قوانین ہیں۔ اور اُس کے باوجود دعویٰ ہے کہ صاحب! ہم اسلام کے اوپر ہیں' دین کے اوپر ہیں۔ قرآن سے پوچھو تو وہ کہتا ہے کہ یہ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ہیں۔ قرآن کی رو سے شرک یہی ہے۔ جب اُس نے کہا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. تو یہ کوئی نظری چیز نہیں ہے۔ اله کے معنی ہیں وہ اتھارٹی جو قانون دینے والی ہو۔ ایک کے سوا دوسرا نہیں ہے۔ یہاں دن میں ہر مسجد سے کم از کم پانچ دفعہ میناروں پہ کھڑے ہو کر چار چار لاؤڈ اسپیکروں کے ساتھ اعلان ہوتا ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. اعلان ہو رہا ہے کہ اس مملکت میں خدا کے سوا کوئی اتھارٹی ضابطہء قانون دینے والی نہیں ہے۔ اور اُس کے بعد یہ ہے کہ ان فرقوں کی اذان الگ الگ ہونے لگ گئی ہے۔ یعنی وہ اعلان بھی مختلف ہو رہا ہے۔ کہا یہ تھا کہ الدین تو وہی تھا۔ صرف اِسی امت کو نہیں کہا بلکہ کہا کہ ہم تو شروع سے آخر تک الدین وہی دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خدا ہے' ایک نوعِ انسانی ہے تو ایک ہی تو ضابطہء قانون ہونا چاہیے تھا۔ اور کہا یہ کہ یاد رکھو! ہر نبی سے یہ کہا تھا کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (42:13) اس میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔

مذہبی دنیا غیر مسلم کو تو برداشت کرتی ہے امت واحدہ کے تصور کو برداشت نہیں کرتی

کیا بات ہے! سنیے اگلا فقرہ کہا کہ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (42:13) یہ دعوت مشرکین پر بڑی گراں گزرے گی جو ہم کہہ رہے ہیں۔ عزیزانِ من! آج بھی غیر مسلم جہاں بستے ہیں' وہ ہندو' عیسائی' یہودی وہ تمام بستے ہیں' ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو خدا کو بھی نہیں مانتے ہیں۔ مذہب پرست طبقے کی طرف سے اُن سب کو برداشت کیا جاتا ہے لیکن جو یہ کہتا ہے کہ ضابطہء ہدایت صرف خدا کی ایک کتاب ہو سکتی ہے تو اُس کی مخالفت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ کہا کہ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (42:13) اُنہیں یہ بات جس کی طرف تم انہیں بلاتے ہو بڑی ہی گراں گزرتی ہے۔ پھر کہا کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (42:14) نبیوں نے تو کبھی یہ تفرقے والی بات نہیں کی تھی۔ سوال ہی یہ نہیں ہے۔ ایک مملکت کے اندر

جتنے بھی اتھارٹی والے ہیں یعنی مملکت اگر قائم رہتی ہے، تسلسل میں حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ دوسری حکومت اُسی مملکت کی حکومت ہو اور اُسی مملکت کی مخالفت کر رہی ہو۔ کہا یہ بات نہیں ہے۔ نبی تو ایسے کر ہی نہیں سکتے تھے۔ نبیوں کے بعد جو تفرقہ پیدا کیا ہے تو **بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ** (42:14) ہر ایک نے اپنی اپنی مملکت قائم کرنی چاہی۔ بغیًا تو بغاوت ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ہوا ورنہ الدین تو وہی تھا۔ یہودی یہ کہتے تھے کہ اگر آپ کہتے ہیں کہ دین وہی تھا تو جو ہمارے پاس یہ تورات یا ہمارے پاس نبیوں کی کتاب ہے، بہت سے احکام جو قرآن میں دیئے جا رہے ہیں، وہ اُس سے مختلف ہیں۔ اُن سے یہ کہا جا رہا تھا کہ **یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡہِمۡ ٭ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ** (2:79) تمہاری کیفیت یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے یہ لکھتے ہو اور اُس کے بعد کہتے ہو کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ یہ تمہاری کتاب ہی محرف ہے۔ ایک تو یہ چیز ہے۔

قرآنِ حکیم کے غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئیات کی تبدیلی کا معاملہ

دوسری چیز قرآنِ کریم نے بتائی ہے اور وہ بڑی اہم ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ الدین کے اصول اور حدود تو شروع سے آخر تک غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان حدود کے اندر آپ مملکت کے لیے اُن کو نافذ کرنے کے لیے جو جزئیات مرتب کرتے ہیں، جو طریقے اختیار کرتے ہیں، یہ جنہیں آپ احکامِ شریعت کہتے ہیں، یہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ الدین جو شروع سے آخر تک دیا گیا ہے اُس میں دین کے اصول تو وہی رہے تھے لیکن ہر زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے اُس دین کی جو جزئیات تھیں، جو اُس کے By laws تھے، اُن میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ کچھ تو ایسی صورت تھی کہ نئے رسول کے وقت میں پہلی کتاب میں انسانوں نے تحریف کر دی تھی، کچھ ایسا بھی ہوا کہ حوادثِ زمانہ نے اُن کو یا تو برباد ہی کر دیا، تلف کر دیا یا انسانوں نے اُسے فراموش کر دیا اور یہ بھی صورت ہوئی کہ بعض جزئیات میں تبدیلی بھی ضروری سمجھی گئی کیونکہ زمانے کے تقاضے بدل گئے تھے۔ اس وجہ سے پہلے نبی کی طرف یا پہلے انبیاء کی طرف جو بعض جزئیات دی گئی تھیں یا تو اگر وہ فراموش کر دی گئی تھیں، محرف ہو گئی تھیں، ضائع ہو گئی تھیں تو اُنہی جیسے احکام نئے نبی کی وساطت سے دیدیئے گئے اور اگر زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے اُن میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی تو پھر اُن سے بہتر جزئیات اُس نبی کے زمانے کے تقاضوں کے مطابق دیدیئے گئے۔

عزیزانِ من! سورۃ بقرہ کی اہم آیت ہے جس کے غلط مفہوم نے، قرآن کی کونسی ایسی بات ہے جس کا ہمارے ہاں غلط مفہوم نہیں لیا گیا، ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ آیت میں پہلے اہل الکتاب کا ذکر ہے۔ کہتا ہے کہ **مَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ لَا الۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ** (2:105) یہ پسند ہی نہیں کرتے تھے کہ کوئی دوسرا رسول آ جائے

اور وہ دوسری کتاب ہمارے سامنے پیش کرے۔ یہ اُس کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ تو یہ جو اہلِ کتاب تھے اُن کا یہ اعتراض تھا کہ پھر ان احکام میں اختلاف کیوں ہے۔ کہا کہ اُس کی وجہ یہ تھی کہ **مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ** (2:106) پہلے نبیوں کی طرف جو احکام نازل کیے گئے تھے اُن میں سے کچھ وہ تھے جو لوگوں نے بھلا دیئے' فراموش کر دیئے' تلف ہو گئے' اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہے تو ہم یہ کرتے رہے ہیں کہ اگر تو اُن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی تو ہم اُنہی جیسے احکام نئے رسول کے دین میں دیدیتے تھے اور اگر زمانے کے تقاضوں سے بدلے ہوئے حالات کے تابع اور دینے کی ضرورت تھی تو **نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ** (2:106) اُن سے بہتر احکام ہم دیدیتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ جو نیا رسول آتا تھا۔ اُس کے احکام کی جزئیات میں ہوسکتا تھا کہ پہلے رسولوں کی کسی کتاب کے بعض احکام سے اختلاف بھی اُس میں ہو اور اُس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک شیطان کی تعریف

قبل اُس کے کہ میں بتاؤں کہ یہاں سے ہمارے ساتھ کیا قیامت گزری' میں ایک اور آیت اسی کے تسلسل میں پیش کر رہا ہوں۔ اس آیت کے متعلق بھی عجیب قصہ ہے اور کونسی آیت اس میں ایسی ہے جہاں یہ قصہ نہیں ہے۔ کہا کہ **وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِہٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰہُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ** (22:52) اے رسول! یہ ہوتا چلا آ رہا ہے کہ ہم نے جو اُس رسول کی طرف وحی بھیجی تو اُس رسول کے بعد شیاطین نے اُس کی وحی میں بہت کچھ ملا دیا۔ قرآن تو ہر اُس شخص کو' جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتے' شیطان کہہ کر پکارتا ہے۔ ان مذہبی پیشواؤں کے جو سرِ خیل ہوتے ہیں قرآن اُنہیں شیاطین کہتا ہے۔ اسی طرح سے سیاسی طور پر جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں وہ اُنہیں شیاطین کہتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ایک فرد بھی جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے' قرآن اُسے بھی شیطان کہتا ہے۔ مگر ہم تو اُس کو کہتے ہیں جو کوئی اور باہر سے ہوتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو تو کہتے ہی نہیں ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ وہ کہیں اور ہوتا ہے۔ نہ کہیں وہ ملا ہے' نہ کہیں آج تک دیکھا ہے۔ وہ ہم نے اس کام کے لیے مہرہ رکھا ہوا ہے کہ صاحب! میں نے یہ نہیں کیا بلکہ یہ شیطان نے کیا ہے اور وہ کہیں اور ہے۔ اور پھر ایک ہی شیطان سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اربوں انسان جو دنیا میں بستے ہیں ہر ایک کا غلط کام وہی کرتا ہے۔

ناسخ و منسوخ کی اصل حقیقت یعنی شیاطین کی کارگزاری

قرآن میں کہا یہ گیا ہے کہ ہوتا یہ رہا کہ ہم نے رسول کی طرف وحی بھیجی تو اُس کے چلے جانے کے بعد شیاطین اُس کی وحی کے اندر

ملاوٹ کر دیتے تھے۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ (22:52)۔ یہاں وہی لفظ ''منسوخ'' کا ہے۔ دوسرا نبی آتا تھا تو جو کچھ اُن شیاطین نے اُس میں آمیزش کر رکھی تھی' خدا اُسے منسوخ کر دیتا اور اصلی وحی کو اُس کی جگہ لے آتا تھا۔ یہ بات بڑی صاف ہے۔ وہ ہر ملاوٹ کو پاک اور صاف کرتا رہا۔ اور تقاضا بھی یہی ہے۔ وحی تو ایک طرف رہی آج بھی نئی حکومت سے تقاضا یہ ہو رہا ہے کہ بھئی! اور کچھ نہیں تو چیزوں میں جو یہ آمیزشیں ہو رہی ہیں' کم از کم انہی کو دور کر دو۔ یہ آمیزش بڑی بُری بلا ہوتی ہے۔ اسپرین کی ٹکیہ میں جب چونا ملتا ہے تو وہ درد ِسر تو جاتا نہیں ہے' اُس سے پیچش شروع ہو جاتے ہیں۔ تو کہا کہ یہ ہم کرتے رہے ہیں کہ جو کچھ شیاطین نے اُس کے اندر ملا دیا ہوتا تھا' اُسے ہم الگ کر دیتے تھے اور پھر وہی اور یجنل وحی دوسرے رسول کی وساطت سے دیدیتے تھے۔ اِس سے بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ یہ ناسخ و منسوخ کیا ہے۔ اور یہ بھی جو میں نے کہا تھا کہ اس کے غلط مفہوم میں اُنہوں نے کیا کیا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعلق خدا نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115) ہم نے اِس کتاب کے اندر الدین کو مکمل کر دیا ہے۔ نوعِ انسانی کو قیامت تک کے لیے جو کچھ ہم نے دینا تھا ہم نے اُس میں مکمل کر دیا لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ان میں تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح سے ہم نے انہیں دیا ہے کہ اِس میں تبدیلی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ اور اُس کے بعد کہا کہ ہم نے اِس کتاب کو نازل کیا ہے اور اب وَ نَحْنُ لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم اِس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے مکمل' غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ آپ سوچیے کہ اب اس کتاب سے اِدھر اُدھر ہٹنا کتنا مشکل ہے۔

خدا تعالیٰ کی بادشاہت کے اندر اپنے اقتدار کا سکہ رائج کرنے کی جسارت

اِنہوں نے سوچا کہ اب یہ دوسری بادشاہت خدا کے مقابلے میں کیسے قائم کی جائے؟ یہ مشکل کام تھا لیکن مشکل کام تو دیانتدار کے لیے ہوتا ہے۔ اس مملکتِ خداوندی کے اندر کیسے دوسری مملکت قائم کی جائے؟ کیا یہ کہ یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے الدین میں جو وحی بھیجی تھی وہ ساری کی ساری اس کتاب کے اندر نہیں۔ جبکہ خدا اس کتاب کو ''تمت'' (6:115) کہہ رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' اِس میں مکمل نہیں ہے۔ مثلہ معہ کا' یہ عقیدہ وضع کیا کہ اس قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ اور بھی ہے۔ اور وہ احادیث کے اندر ہے۔ اس جانے والی ہستی جس ﷺ نے یہ قرآن دیا تھا ان حضور ﷺ نے تو اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع کے اندر سوا لاکھ افرادِ امت کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ میں تمہارے اندر ایک چیز چھوڑ چلا ہوں' اُس کا اتباع کرتے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ کتاب اللہ ہے۔ تو یہ بات ہی ٹھیک ہے۔

بنی امیہ کے دور تک قرآنِ حکیم کے علاوہ کسی اور کتاب یا فقہ کا تصور نہ تھا

اُس کے بعد جو صدرِ اول کا دور ہے جسے آپ خلافتِ راشدہ (632-661 AD) کہتے ہیں تو وہاں بھی ایک یہی کتاب تھی اور کوئی دوسری کتاب وہاں بالکل نہیں تھی۔ دو سو اڑھائی سو سال تک یہی ایک کتاب تھی حتیٰ کہ یہ ہمارے ہاں تاریخ میں بنی امیہ کے دور (661-750 AD) کو تو بہت زیادہ مذموم سمجھا جاتا ہے' اُس دور میں بھی شریعت کی قرآن کے سوا کوئی اور کتاب ہی نہیں تھی' کوئی اور فقہ نہیں تھی' کوئی حدیث کی کتاب نہیں تھی۔ یہ جو قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ کہتے ہیں' وہ لفظ ان کے ہاں مثلہ معہ کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مثلہ معہ کہاں سے آئی؟

مثلہ معہ دو اڑھائی سو سال کے بعد وجود میں آئی لیکن کیسے؟

عزیزانِ من! دو اڑھائی سو سال بعد یہ ایران [1] سے اٹھے۔ میں اُن بزرگوں کی اہانت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بخارا [2] سے آئے' نیشاپور [3] سے آئے' سیستان [4] سے آئے۔ یہ آپ کے ہاں چھ [5] ہیں جنہوں نے احادیث کو جمع کیا ہے۔ اُن کی جمع کردہ کتب کو صحاحِ ستہ [6] کہتے ہیں۔ اور یہ جو چھ کے چھ تھے' یہ سارے ایران سے عرب والوں کو یہ بتانے کے لیے آئے تھے کہ تمہارے رسول ﷺ نے کیا کہا تھا۔ آپ سوچیے کہ جن کے اندر یہ رسول ﷺ رہے' ان کے اندر یہ مملکت مسلسل چلی آ رہی تھی۔ اُن سے آ کر یہ کہا کہ تمہیں کیا پتہ ہے' ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تمہارے رسول ﷺ نے کیا کہا۔ اُن میں سے ایک ایک نے یہ کچھ کیا۔ ہمارے ہاں پہلے جو سب سے بڑے ہیں' وہ امام بخاری رحمہ اللہ [7] ہیں۔ جن کی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہتے ہیں' وہ اُن کی بخاری شریف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے کچھ ورق مل گئے تھے؟ ایسا کچھ بالکل نہیں تھا بلکہ طریق یہ تھا کہ لوگوں سے پوچھا

---

1. اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔ 201 معہ فٹ نوٹ 1 اور 2۔
2. امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-260ھ)
3. امام مسلم بن حجاجؒ (204-261ھ)
4. امام ابوداؤدؒ (203-275ھ)
5. امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-260ھ)' امام مسلم بن حجاجؒ (204-261ھ)' امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ (209-273ھ)' امام ابوداؤدؒ (203-275ھ)' ابوعبداللہ ابن ماجہؒ (209-273ھ) اور امام عبدالرحمٰن نسائیؒ (وفات 303ھ)
6. صحیح بخاری' صحیح مسلم' جامع ترمذی' سنن ابوداؤد' سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی۔
7. امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-260ھ)

کہ تمہیں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث یاد ہے۔ جواب ملا کہ جی ہاں یاد ہے۔ کہا کہ تمہیں کیسے معلوم ہے۔ جواب دیا کہ میں نے فلاں سے سنا تھا۔ اب یہ دوسو سال کے بعد کی بات ہے۔ تو کہا کہ اُنہوں نے کہاں سے سنا تھا۔ جواب دیا کہ اُنہوں نے فلاں سے سنا تھا' اور فلاں سے سنا تھا۔ یہ کچھ کرتے کرتے رسول اللہ ﷺ کے صحابی رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئے۔ یعنی یہ سب کچھ باتوں ہی باتوں میں تھا۔ اس طرح اُنہوں نے اس قسم کی چھ لاکھ حدیثیں جمع کیں۔ یعنی خدا کی طرف سے قرآن کی مثل وحی' قرآن کے ساتھ رکھنے کے لیے اس طرح سے جمع ہوئی تھیں۔ یہ چھ لاکھ اُن کو ملیں [1] تو بخاری صاحب کہنے لگے کہ اُس میں سے میں نے خود ہی سوچا اور انتخاب کیا اور اُس میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار مسترد ہی کر دیں۔ یعنی آپ سوچیں کہ فرض کریں اگر یہ خدا کی طرف سے وحی آئی ہوئی ہے اور یہ اُسے مسترد کر رہے ہیں۔ تو باقی چھ سات ہزار ہیں۔ ایک ایک حدیث دو دو تین دفعہ بھی آئی ہے' اُن کو اگر گنا جائے تو یہ قریباً تین ہزار [2] بنتی ہیں۔ یہ بخاری [1] صاحب نے رکھیں۔ مسلم شریف [3] والے آئے تو اُنہوں نے بھی اسی طرح مرتب کیں۔ یہ چھ [4] حدیث کی کتابیں ہیں۔ ترمذی [5] والے آئے تو اُنہوں نے اسی طرح سے یہ مرتب کر کے آپ کو دی ہیں۔

ہر کسی کی فقہ کی عمارت کا دارو مدار انہی روایات کی بنیاد پر استوار ہے

یہ ہوا مثلہ معہ یعنی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل۔ تو یہ جتنی آپ فقہ کہتے ہیں تو وہ مختلف اماموں کی فقہ ہے۔ ہر ایک فقہ والے نے اپنی سند کسی نہ کسی روایت پہ ہی رکھی ہے۔ وہ اتنی مختلف روایتیں آپ کو مل جاتی ہیں کہ اتنی مختلف فقہیں اُن سے مرتب ہو جاتی ہیں۔ ایک مملکت کے اندر قانون کے ضابطے اس طرح مرتب ہو رہے ہیں۔ اب اگر اُن سے کہیں کہ صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ صاحب! یہ ہماری تو نہیں ہیں یہ تو رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں ہیں۔

قرآن حکیم کے برعکس ان روایات اور فقوں میں قدم قدم پر اختلاف ہے

قرآن نے یہ کہا تھا کہ قرآن میں تدبر کرو' تم اِس میں کوئی اختلافی بات نہیں پاؤ گے۔ اگر اِس میں کوئی اختلافی بات نظر آئے تو سمجھ لو کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ قرآن میں یہ چیز موجود ہے۔ یعنی قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے دعوے کے ثبوت میں ایک

---

1. امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-260ھ)
2. ان کی تعداد 2762 ہے۔
3. امام مسلم بن حجاجؒ (204-261ھ)
4. صحیح بخاری' صحیح مسلم' جامع ترمذی' سنن ابوداؤد' سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی۔
5. امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ (209-279ھ)۔

دلیل یہ بھی دی ہے کہ اِس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ اگر اختلافی بات ہو تو یہ منزل من اللہ ہو نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! حکومتوں میں ایک Court (عدالت) کے اندر اگر دو متضاد قسم کے Laws (خواتین) ملیں تو دہائی مچ جاتی ہے۔ اس کے باوجود فقہ کی کتابوں کے اندر یا جو احادیث تھیں' اُن میں اِس قسم کی روایات' اس قسم کے احکام آ گئے جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں' بالکل قرآن کی آیات کے خلاف جاتے ہیں۔ اگر وہ مثلہ معہ ہے تو وہ تو اِس کے ساتھ ملتا جلتا ہونا چاہیے تھا جبکہ وہ اس کے سراسر خلاف جاتے ہیں۔

اس متضاد کیفیت کا حل متعدد آیاتِ قرآن کی منسوخی کی شکل میں پیش کر دیا گیا

اِنہوں نے سوچا کہ اب کیا کریں؟ مشکل اور بڑھ گئی تو کہنے لگے کہ یہ کونسا مشکل کام ہے۔ کہا کہ قرآن کی بہت سی آیات منسوخ [1] ہیں۔ یہ آیت جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پڑھی ہے' اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ دیکھیں یہ قرآن میں لکھا ہے جبکہ قرآن کتبِ سابقہ کے متعلق یہ کہہ رہا ہے کہ اُن احکام کو جو اس طرح سے غیر خداوندی ہو گئے تھے' ہم نے منسوخ کیا۔ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے اندر چھ سو آیتیں منسوخ ہیں۔ آپ دیکھیں کہ مملکتوں کے اندر اس قسم کے قوانین نافذ کیے جاتے ہیں جو بعد میں اُن کو Abrogate (منسوخ) کرنا پڑتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اپنی کسی آیت کو منسوخ کرنے کا اعلان نہیں کیا

انسانوں کے بنائے ہوئے قانون ہوں تو حالات کی تبدیلی کے ساتھ دوسرا قانون اُس کی جگہ منسوخ کر کے لایا جاتا ہے لیکن یہ تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بھی کوئی دوسرا قانون لاتے ہیں تو پہلے قانون کو منسوخ کرتے ہیں اور اعلان کیا جاتا ہے کہ جو فلاں قانون ہے اُس کو منسوخ کیا جاتا ہے اور اُس کی جگہ یہ قانون دیا جاتا ہے۔ سارے قرآن میں آپ کو کہیں یہ کچھ نہیں ملے گا کہ خدا نے یہ کہا ہو کہ ہم نے یہ جو آیت دی ہے یہ آیت ہمارے فلاں حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ یہ قرآن میں کہیں نہیں ہے جبکہ یہ کہتے ہیں کہ ہو یا نہ ہو' ہم جو کہہ رہے ہیں یعنی ان کے کہنے سے ہی منسوخ ہو گئی۔ اور یہ کتنے ہی احکامات اِنہوں نے منسوخ کیے ہیں۔ ابتدا میں اِنہوں نے کہا کہ بہت زیادہ تفاوت سے بھی کام لیا جائے تو کوئی چھ سو کے قریب احکام کی آیات ہیں۔ اُن میں سے اِنہوں نے کہا کہ پانچ سو منسوخ ہیں۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ بھئی! کہیں خدا نے بھی کہا ہے کہ ہم نے اِس آیت کو منسوخ کر دیا ہے' جواب دیتے ہیں کہ قرآن نے تو نہیں کہا لیکن ہم جو

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 197 تا 218 معہ انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔ نیز قرآن کریم کے خلاف سازشوں کے لیے دیکھیے اسی کتاب کے ص ص۔ 221 تا 242 معہ انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

کہہ رہے ہیں کہ منسوخ ہیں۔ بہر حال بعد ازاں آگے آگے چلتے آئے اور وہ پانچ سو جو تھیں وہ کم ہوتی چلی گئیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے آخر پر 5 آیات کی منسوخی پر یہ بات مصلحتاً ختم کر دی

آپ دیکھیے کہ اس طرح سے یہ دین مرتب ہو رہا ہے' مملکت کا ضابطہ قوانین مرتب ہو رہا ہے۔ یہ خود ہی کم کرتے چلے آئے اور آخر میں آکر شاہ ولی اللہ ❶ مرحوم نے کہا تھا کہ پانچ آیتیں ایسی ہیں جو منسوخ ہیں۔ اُن کی فکر کے شارح مولانا عبید اللہ سندھی ❷ نے کہا کہ اُنہوں نے پانچ آیتیں بھی اس لیے کہہ دیں کہ اگر وہ کہتے کہ ناسخ و منسوخ نہیں ہے تو اِس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگتا تھا۔ اس دور کے متعلق مولانا سندھی ❷ نے یہ لکھا کہ بھئی! اِس قسم کا دور تھا کہ وہاں کفر کے فتوے پر پھانسی کی سزا تھی تو اُنہوں نے کچھ نرم نرم سی آیتیں ایسی رکھ لیں کہ جن پر اگر بعد میں کوئی غور کرے گا تو وہ بتا دے گا کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔ اُنہوں نے بہر حال ناسخ و منسوخ کا عقیدہ باقی رکھا تا کہ کفر کا فتویٰ نہ لگ جائے ورنہ یہ جو آیتیں اُنہوں نے کہی ہیں تو میں ثابت کرتا ہوں کہ یہ بھی منسوخ نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! یہ خدا کی کتاب کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ یہ ہیں وہ جو ناسخ و منسوخ تھے۔ یہ ناسخ و منسوخ یہاں تو وہ پانچ سو آیات تک ہی تھا اور وہ شاہ ولی اللہ ❶ (1114-1176 H) پانچ کہہ گئے۔ مولانا سندھی ❷ نے اُن پانچ کو بھی ثابت کر دیا تو آگے بات چلی کہ خدا کا کوئی حکم اس قرآن میں منسوخ نہیں ہے۔ تو اگلے آنے والے تھے یہ کیا کرتے؟ وہ جو ناسخ و منسوخ والی اتھارٹی تھی وہ تو ختم کر دی۔

قرآنِ حکیم سات زبانوں میں نازل ہوا: مودودیؒ کا فرمان

عزیزانِ من! دل کے کانوں سے سنیے کہ قرآن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے دور کے سب سے بڑے مفسر مولانا مودودی ❸ صاحب ہیں۔ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن درحقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا' یہی سات ❹ زبانوں میں خدا نے دیا تھا اور سات زبانوں میں رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا' یہ سات زبانوں میں پہلے دو خلیفہ کے زمانے میں ❺ بھی تھا۔ حضرت عثمان ﷺ نے اپنے دورِ خلافت (645-656 AD) میں اپنے ہی حکم سے اُن میں سے چھ کو تو منسوخ ❻ کر کے جلا دیا اور ایک باقی رکھا جو ہمارے

---

❶ قطب الدین احمد والد عبد الرحیم المعروف بہ شاہ ولی اللہ مرحوم (1114-1176ھ)

❷ علامہ عبید اللہ سندھی (1865-1935ء)

❸ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

❹ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 224 تا 242۔

❺ حضرت ابوبکر صدیقؓ (632-634 AD) اور حضرت عمر فاروقؓ (634-644/ 45 AD)

❻ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔ 215۔

پاس ہے۔ وہ زندہ موجود ہیں اور اُن کی تحریر موجود ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ آپ تو کہہ رہے تھے کہ ایک کی فقہ کسی دوسرے کی فقہ سے نہیں ملتی جبکہ یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے۔ مودودی صاحب ❶ نے کہا ہے کہ یہ تو حضرتِ عثمانؓ (573-656ء) نے ایک رکھ لیا۔ یہ اُن کی مرضی کے مطابق تھا کہ جو اُن کو پسند آیا' اُنہوں نے ایک رکھ لیا۔

قرآن نے (22:52) میں یہ کہا کہ جتنے رسول بھیجے اُن کے ساتھ یہی کچھ ہوا کہ اُن کے جانے کے بعد شیاطین نے اُن کی وحی میں کچھ ملا دیا تو ہم نے دوسرا رسول بھیج دیا۔ اُس نے آمیزش کو الگ کر دیا اور پھر خالص وحی اُن کے سامنے پیش کر دی۔ یہ ہے اِس آیت کا واضح مفہوم۔ لیکن وہ جو تفسیر ہے وہ کیا کہتی ہے؟ جب میں نے یہ کہا تھا کہ وہ ❷ چھ ایران سے آئے تھے تو میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف اُن کا ایرانی ہونا ناقابلِ اعتماد تھا بلکہ بات یہ تھی کہ دین عرب سے چلا' رسول اللہ ﷺ اسی قوم میں پیدا ہوئے۔ عرب کے اندر مسلمانوں کی اسلامی مملکت مسلسل چلی آ رہی تھی' سارا عرب مسلمانوں کا تھا۔ اِس پورے کے پورے عرب میں کوئی ایک بھی ایسا نہ اٹھا کہ اِس نے ان روایات یا احادیث کو جمع کیا ہو۔ یہاں تو کوئی بھی ایک ایسا نہ ہوا۔ یہ جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے تو یہ سارے ان کے ہاں باہر سے آئے۔ اور آپ حیران ہونگے کہ پہلی تفسیر جو آپ کے ہاں لکھی گئی' جسے امام طبری ❸ کی تفسیر کہتے ہیں' طبری نام نہیں ہے' وہ طبرستان کے رہنے والے کو طبری کہتے ہیں' وہ طبرستان سے آئے تھے۔ اُنہوں نے اِس آیت کی تفسیر میں کہا کہ رسول کے ساتھ ہوتا یہ تھا کہ رسول کی زندگی میں' رسول کی وحی میں' شیاطین کچھ ملا دیتے تھے۔ اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں قرآن کے ساتھ یہی ہوا۔

رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک منسوب کردہ واقعہ

ایک واقعہ اس کے ساتھ منسوب کیا۔ قریش آپ ﷺ کی بڑی مخالفت کرتے تھے اور حضور ﷺ اُن کی بت پرستی کی مخالفت کرتے' اُن کے بتوں کی مخالفت کرتے تھے۔ مخالفت بڑی شدت تک پہنچ گئی۔ اُنہوں نے تہیہ کر لیا کہ ہم یا تو اِس رسول کو یہاں سے نکال دیں گے یا اِس کو قتل کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے۔ یاد رہے میں یہ اُن کی روایت بیان کر رہا ہوں تو اُس میں آپ جو سورۃ تلاوت کر رہے تھے' اُس میں آپ ﷺ نے یہ کہا کہ یہ جو اِن کے ہاں کے بت تھے تو خدا نے ان کو بھی بڑا اکرم پیدا کیا ہے۔ یہ سارے خوش ہو گئے کہ لو بھئی! مفاہمت ہو گئی۔ بعد میں یہ سوال ہوا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ تو خدا نے یہ کہا کہ اے رسول ﷺ! تیری اس تلاوت میں یہ چیزیں شیطان نے ملا دی تھیں لیکن ہم انہیں منسوخ کرتے ہیں۔ نماز میں یہ سورۃ تلاوت ہو رہی تھی۔ خدا نے کہا کہ اے رسول! شیطان

---

❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979ء)

❷ امام بخاریؒ' امام مسلمؒ' امام ترمذیؒ' امام ابوداؤدؒ' امام ابن ماجہؒ اور امام عبدالرحمٰنؒ نسائی۔

❸ علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی 310ھ)

نے تمہاری زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے تھے (معاذ اللہ)۔

ہماری ہزار سالہ تاریخ اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے

عزیزانِ من! یہ چیز قریباً ہزار سال سے آپ کے ہاں چلی آ رہی ہے' صحیح مانی جا رہی ہے' پڑھائی جا رہی ہے۔ اِس کے پڑھنے والے' اس کی سندیں دینے والے آپ کے علما کہلاتے ہیں۔ جو کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا' خدا کا رسول ﷺ تو ایسا نہیں کرسکتا کہ شیطان اُس پہ غالب آ جائے اور اُس کی نماز میں یہ الفاظ ملا دے' تو اُسے کہا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے اور قابلِ دار ہے۔ عزیزانِ من! کیا کچھ کہا جائے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ آپ یہ معلوم کرنے کے لیے کمیشن بٹھاتے ہیں کہ ہم آج جو ذلیل وخوار ہیں تو کیوں ہیں۔ خدا کی کتاب کے ساتھ جو یہ کچھ کرتا ہے اُس کا خدا پہ ایمان نہیں ہے۔ میں کہونگا کہ اِس قسم کی چیزیں قابلِ برداشت نہیں ہیں۔ قومیں اسی طرح سے تباہ ہوئیں۔ خدا کی کتاب کے ساتھ اُنہوں نے اتنا کچھ کیا بھی نہیں ہوگا جتنا کچھ ہم نے اس کتاب کے ساتھ کیا ہے۔ میں تو دل پہ پتھر رکھ کر کبھی کبھی اِس قسم کی بات آپ سے کہتا ہوں' ورنہ تفسیر کی یہ ساری چیزیں اگر آپ کے سامنے لے آؤں تو آپ چیخ اٹھیں۔ معلوم نہیں کہ کس دل گردے کے ساتھ ہم نے یہ سب کچھ پڑھا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ کم ازکم اُس نے اس ناچیز کو اس قسم کے کھنڈرات سے نکال دیا۔

قرآنِ حکیم کے متعلق یہودیوں کے اعتراض پر نبی اکرم ﷺ کا ان کو جواب

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہودیوں سے کہا یہ جا رہا تھا کہ تم قرآن کے خلاف اِس طرح کے اعتراضات کرتے ہو کہ یہ بات ہمارے خلاف ہے' یہ بات ہمارے خلاف ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے موسیٰ ﷺ کی طرف جو کتاب نازل کی تھی' وہ ایسی ہی ہدایت دینے والی تھی جیسے قرآن ہدایت دینے والا ہے لیکن اُس میں تحریف ہو چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان یہودیوں سے کہا کہ وہ کتاب جو حضرتِ موسیٰ کو خدا نے دی تھی اگر تم وہ لے آؤ تو میں اُس کا بھی اتباع کروں گا۔ اس لیے کہ میں تم سے اپنی کتاب کا اتباع نہیں کررہا' میں تو خدا کی کتاب کا اتباع کرتا ہوں اور تم سے کراتا ہوں۔ اگر خدا کی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل کے اندر کہیں اور موجود ہے' اُسے لاؤ۔ میں نے تو خدا کی کتاب کا اتباع کرنا ہے تو میں اُس کا بھی اتباع کرلونگا۔ یہ کتنی بڑی کشادہ ظرفی ہے۔ یہ ہوتا ہے خدا کا رسول۔

نماز کے سلسلہ میں آج فرقوں کے اختلاف کی حالت

عزیزانِ من! یہ جتنے مختلف فرقے ہمارے ہاں ہیں' کتاب تو ایک طرف یہ نماز جس کو یہ کہتے ہیں کہ وہ دین کا پہلا رکن ہے' رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں نماز پڑھی اور ہزاروں لاکھوں کی موجودگی میں پڑھی۔ یہ کوئی ایسی نظری Academic چیز نہیں تھی کہ عقیدے کی بات تھی' کسی کی سمجھ میں آیا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ نماز محسوس حرکات کے ساتھ ہوتی ہے۔ حضور ﷺ لاکھوں کے سامنے تئیس برس تک یہ کچھ کرتے رہے۔ آج امت میں ایک متفق علیہ نماز موجود نہیں ہے اور ہر فرقہ اپنی اپنی نماز کے متعلق مدعی ہے کہ یہ رسول

اللہ ﷺ کی نماز ہے۔ اختلاف کی کیفیت یہ ہے۔ بنیادی طور پہ ہمارے ہاں شیعہ اور سُنّی الگ ہوئے۔ شیعہ حضرات کو الگ چھوڑ دیجیے' اُن کی نماز سُنّیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سُنّیوں کے ہاں آپ دیکھ لیجیے۔ اِن کی نماز تو ایک ہونی چاہیے۔ وہ بھی ایک نہیں ہے۔

اسی نماز کے سلسلہ میں چوہدری ظہور الٰہی کی کوٹھی پر علمائے کرام کا ایک عملی مظاہرہ

کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ اختلاف کہاں تک چلا گیا؟ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اور پھر دہرا دوں۔ پچھلے ❶ سال کا ذکر ہے جب ان کا سیاسی گٹھ جوڑ اتنا تھا کہ یہ سب متحد ہو گئے' تو چوہدری ظہور الٰہی ❷ صاحب نے افطار کی دعوت دی۔ مفتی محمود ❸ صاحب دیوبندیوں کے نمائندے تھے اور مولانا نورانی ❹ صاحب بریلیوں کے نمائندے تھے۔ روزہ افطار کیا۔ مفتی ❸ صاحب اپنے ٹولے کو لے کر اُسی لان کے اندر ایک طرف کھڑے ہو گئے' نورانی ❹ صاحب اُسی لان کے اندر اپنے ٹولے کو لے کر دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہ سنی حنفی ہیں اور ان کی نمازیں الگ الگ ہیں۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر اتحاد ہے اور کھانے کے لیے پھر اُسی میز کے اوپر اکٹھے ہو گئے۔ ایک جٹ نے کہا تھا کہ ''کھان پین نوں وکھو وکھ' تے لڑن بھڑن نوں نوں کٹھے۔ ایتھے سارے کھان پین نوں کٹھے' نماز وچوں وکھوں وکھ۔ ❺ یہ سُنّی حنفی ہیں۔

پاکستان میں امام کعبہ کی آمد پر لاکھوں نمازیوں کا اجتماع اور پھر داتا صاحب کے مزار پر حاضری

امام کعبہ یہاں پاکستان آ گئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اُنہوں نے نمازیں کرائی ہیں تو ایک ایک نماز کے اندر لاکھوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ ان دنوں میں داتا صاحب کا عرس ہو رہا تھا۔ وہ داتا صاحب شاہی مسجد سے قریب ہی تو ہیں۔ وہ جو امام تھے اُنہوں نے یہاں شاہی مسجد میں نماز پڑھائی۔ یہ امام' جو کعبے کے امام ہیں' اہلحدیث ہیں۔ یہ قبر' قبروں کے گنبد' اُن کے عرس' وہاں کی چادریں' وہاں کے غسل' تو بڑی بات ہے' اُن کے نزدیک پختہ قبر بنانا بھی خلافِ اسلام ہے' قبر کو چھ انچ یا شاید ایک فٹ سے زیادہ اونچا رکھنا خلافِ اسلام ہے' اُس پہ دیا جلانا خلافِ اسلام ہے تو کچھ لوگوں نے اِدھر ان کے پیچھے نماز پڑھی اور پھر داتا صاحب جا کر چادر چڑھانے لگے۔ اِنہوں نے یہ اچھا رکھا ہوا ہے کہ وہاں قیامت میں جا کر اگر پرسش ہوئی اور اُنہوں نے کہا کہ تم نے اہلحدیث کے پیچھے نماز پڑھ لی وہ تو شرک ہے' اصل اسلام تو وہاں داتا صاحب کے ہاں ہوتا ہے تو یہ کہیں گے کہ حضور ہم تو وہاں بھی جا کر چادر چڑھا آئے تھے۔ ''جیہڑا ٹکٹ قبول ہے او

---

❶ یعنی 1978ء میں۔

❷ چودھری ظہوری الٰہی مرحوم (1921-1981ء)

❸ مفتی محمودؒ (1919-1980)

❹ مولانا شاہ احمد نورانیؒ (1962-2003)

❺ کھانے پینے میں الگ تھلگ' جدا جدا مگر لڑنے بھڑنے میں متحد و یک جاں۔ یہاں کھانے پینے پہ سب متحد مگر ادائیگیٔ نماز میں سب الگ' جدا جدا۔

ساڈے کول موجود ہے' پنج ست ٹکٹ جیب اچ رکھ لیندے نیں''۔ ❶

مولانا نورانیؒ کا فتویٰ: امام کعبہ کے پیچھے نمازیں پڑھنے والوں کی ساری نمازیں باطل ہیں

امام کعبہ صاحب نے کراچی میں بھی نمازیں پڑھائی تھیں۔ نورانی صاحب نے یہ فتویٰ دیا کہ جن لوگوں نے جتنی نمازیں ان امام صاحب کے پیچھے پڑھی ہیں وہ ساری نمازیں باطل ہیں وہ اپنی نمازیں دوبارہ پڑھیں۔

نورانیؒ صاحب اور جنرل ضیا کی باہمی ملاقات میں سات زبانوں میں قرآن نازل ہونے کا ذکرِ خیر

نورانی صاحب نے ایک اور بھی بیان اپنے پرچہ ''اہلِ سنت'' میں لکھا۔ کہنے لگے کہ میں اور میرے ساتھ مولانا عبدالستار نیازی ❷ صاحب اور کچھ اور صاحب بھی تھے' ہم وفد کے طور پہ صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق ❸ صاحب کو ملنے گئے۔ اِنہوں نے یہ لکھا ہے کہ وہاں جاتے ہی اُنہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ تم نے جو حضرتِ عثمانؓ کے زمانے (645-656 AD) میں سات زبانوں میں قرآن کا کہا ہے وہ اصل میں جو مختلف قبیلوں کا لہجہ تھا اُس کا فرق تھا' اس لیے لہجوں کے فرق والے قرآن کو مٹایا تھا۔ وہ اس لیے تھا کہ عربوں سے باہر جائے گا تو پتہ نہیں اُن کے ری ایکشن (ردِّعمل) مختلف ہوں اس لیے ایک اسٹینڈرڈ لہجے والا جو قرآن تھا وہ اُنہوں نے رکھا تھا جبکہ مودودی صاحب ❹ کی یہ تحریر موجود ہے جس میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ قرآن سات زبانوں کے اندر نازل ہوا تھا۔ لہجہ نہیں تھا بلکہ سات زبانیں تھیں۔ اور لہجے کا اختلاف تو تحریر میں مٹایا ہی نہیں جاسکتا۔ لہجہ تو ایسی چیز ہے ہی نہیں کہ جو الگ لہجے کے قرآن ہوں۔ وہاں تو آج بھی یہ مصر وغیرہ والے ''ج'' کو ''گ'' ہی بولتے ہیں' وہ ''جیلانی'' کو ''گیلانی'' کہتے ہیں۔ تو یہ لہجے کا فرق جتنا بھی ہوتا ہے' اب تو یہاں تقسیم کے بعد ہم لوگ آپس میں مل گئے ورنہ کیفیت یہ تھی کہ ہم جو پنجابی بولنے والے تھے تو ایک فرقہ کوئی بول دیتا تھا تو ہم ضلع ہی نہیں بلکہ تحصیل تک بتا دیتے تھے کہ تم وہاں کے رہنے والے ہو۔ ''جس نے تنخواہ کہیا اے اسی فوری کہہ دتا کہ تُسی ہشیار پوری ہو''۔ ❺ یہ لہجے کا فرق تو ضرور ہے لیکن یہ ایک ہی طرح سے لکھا جائے گا۔ لہجے میں یہ فرق ہوتا ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ سوال ہی نہیں ہے کہ لہجے کا فرق آپ مٹا دیں۔ ایک شخص جب کسی چیز کو پڑھتا ہے یا بولتا ہے تو اُس کا جو Accent ہوتا ہے' اُسے لہجہ کہتے ہیں' یہ تحریر میں نہیں مٹایا جا سکتا۔

---

❶ جو ٹکٹ قابل قبول ہے وہ ہماری جیب میں موجود ہے۔ (یہ) پانچ سات ٹکٹ جیب میں موجود رکھتے ہیں۔

❷ مولانا عبدالستار نیازی (1915-2001)

❸ جنرل ضیاء الحق (1924-1988ء)

❹ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979ء)

❺ جس نے تنخواہ کہا ہم نے فوراً کہہ دیا کہ آپ ہوشیار پوری ہیں (یعنی ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں)

مولانا نورانی رحمہ اللہ کے نزدیک امام کعبہ کی اہمیت وتکریم

میں بات نورانی ❶ صاحب اور جنرل ضیاء ❷ صاحب کی ملاقات کی کر رہا تھا لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو اُس ملاقات میں جنرل صاحب ❷ نے اُن سے کہا کہ نورانی صاحب! ❶ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ بڑے وسیع القلب اور کشادہ ظرف واقع ہوئے ہیں کہ آپ ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ کہا کہ میں نے فوراً اُن سے کہا کہ صدرِ محترم! آپ نے کیا فرمادیا کہ ہر ایک کے پیچھے نماز پڑھ لیتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ تو یونہی ٹکے ٹکے کے جمعراتیے ہیں جو یہاں کے مولوی ہیں۔ یہ تو ایک طرف رہے' ہم تو کعبے میں جا کر بھی کعبے کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ اُن کی تحریر موجود ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی عملی زندگی کے برعکس علیحدہ علیحدہ طریقہ نماز کی ادائیگی

میں ایک بیّن مثال دے رہا ہوں کہ یہ نماز محسوسات کی چیز ہے جس طرح سے پڑھی جاتی ہے۔ جسے آپ سنتِ رسولؐ کا اتباع کہتے ہیں' اُس کی رو سے کچھ عقائد کا' نظریات کا' اختلاف ہی سہی مگر رسول ﷺ کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی عقیدے یا نظریئے میں بھی کوئی اختلاف رکھتے ہونگے۔ وہ تو ہمہ تن قرآن ہوتا تھا لیکن خیر' یہ کہہ دیا جائے کہ کسی کی بات سمجھ میں نہیں آئی ہوگی لیکن لاکھوں نے اس طرح سے نماز پڑھتے ہوئے حضور ﷺ کو دیکھا جبکہ ہمارے ہاں ہر فرقے کی نماز الگ ہے اور ہر فرقہ اپنی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز قرار دے رہا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کیسے اس فرق کو مٹا دیں گے؟ کس طرح سے یہ شرک مٹ سکتا ہے؟ خدا ایک ہے' رسول ﷺ ایک ہے' اُس کا ضابطہء قانون ایک ہے' ایک مملکت ہے' ایک اتھارٹی ہے' ایک ملت ہے۔ یہ ہے اسلام' یہ ہے نظامِ اسلامی' یہ ہے نظامِ خداوندی۔ آپ کہتے ہیں تو یہ ہے نظامِ مصطفیٰ ﷺ۔ جس نظام کے اندر نماز تک اکٹھی نہیں پڑھی جا سکتی اُسے آپ مصطفیٰ ﷺ کی طرف تو منسوب نہیں کر سکتے۔

میں اس درس میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ رسول ﷺ نے تو یہ بات کہہ دی کہ اگر تم واقعی وہ کتاب' جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور وہ اپنی اصلی شکل کے اندر موجود ہے' وہ لے آؤ تو میں اُس کا اتباع کرونگا۔

فرقوں کی موجودگی میں ایک ضابطہ قوانین کا نفاذ ناممکن اور سعی لاحاصل ہے

یہاں اُمت کے اندر آپ کے ہاں اتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر ایک اپنی اس چیز کو ایک اتھارٹی کی طرف منسوب کر رہا ہے جبکہ

---

❶ مولانا شاہ احمد نورانیؒ

❷ جنرل ضیاءالحق (1924-1988ء)

سب کے طریقے مختلف ہیں۔ کیا ایک اتھارٹی ایسی ہوسکتی ہے جو مختلف طریقے سکھائے؟ اور پھر بتاؤ تو سہی کہ ان فرقوں کی رو سے ایک ضابطہء قوانین آپ کیسے مرتب کرلیں گے؟ سوال ہی نہیں ہے۔ نماز پہ زور دیا گیا ہے۔ بڑی بابرکت بات ہے' بڑی اہم بات ہے لیکن اُس پہ ہر ایک نے اپنی اپنی نمازیں پڑھی ہیں۔ اگر کہیں یہ شکل پیدا ہوا اور اسلامی مملکت میں تو یہ ہونی چاہیے کیونکہ یہ بنیادی چیز ہے کہ کم از کم ابتدا تو اس سے کیجیے کہ نماز تو ایک طرح سے پڑھنی شروع کردیجیے لیکن نہیں کرتے۔ اِس چیز کو پہلے ہی قانون کے دائرے سے باہر رکھ لیا گیا ہے کہ اطاعت میں قانون دخل نہیں دے گا' مسالک میں دخل نہیں دے گا' مشارب میں دخل نہیں دے گا' شخصی قوانین میں دخل نہیں دے گا۔ ایک مملکت ہوگی' ایک اُس کی رعایا ہوگی' دعویٰ ایک نظام کا ہوگا اور یہ سب کچھ الگ الگ ہونگے۔ اور رسول ﷺ کہتا ہے کہ یہ قرآن تو ایک طرف رہا اگر تم کسی پہلے نبی کی بھی ایسی کتاب لے آؤ جو خالصتاً خدا کی کتاب ہو تو میں تو اُس کا بھی اتباع کرونگا کہ اُس میں اختلاف نہیں ہوگا۔ اُن کو یہ آفر دی۔ کہا کہ تم اختلاف والی بات کہتے ہو۔ اختلاف تو اس لیے کہتے ہو کہ تمہارے پاس کتاب اصلی شکل میں نہیں ہے۔ میری آفر تو یہ ہے کہ وہ کتاب اگر اصلی شکل میں ہے تو وہ لے آؤ' میں اُس کا اتباع شروع کردونگا کہ وہ اور قرآن ایک ہی ہوگا کیونکہ یہ ایک خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔ اس کی اتھارٹی' اس کا مآخذ' سرچشمہ' اس کا منبع ایک ہے اس لیے میں تو اُس کا بھی اتباع شروع کردونگا۔

فرقوں میں اپنی اپنی خواہشات کا اتباع ہوتا ہے' حدود اللہ کا نہیں

قرآن کہتا ہے کہ فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یَتَّبِعُوۡنَ اَهۡوَآءَ هُمۡ (28:50) اگر تمہاری اس آفر کو بھی یہ Accept (قبول) نہیں کرتے تو پھر سمجھ لو کہ یہ حق اور صداقت کا اتباع نہیں بلکہ یہ اپنی اپنی خواہشات کا اتباع کیے جارہے ہیں اور ہر شخص اُس کا نام اسلام رکھ رہا ہے۔ عزیزانِ من! اس آیت کی بات ابھی آدھی ہے۔ اھوآء ھم کی تشریح اگلے ٹکڑے میں آتی ہے اور وہ بڑی اہم چیز ہے لیکن یہاں تو یہ دیکھ لیا کہ جو انہوں نے کہا کہ اگر اس کے باوجود یہ اختلافات برقرار رکھتے ہیں تو سمجھ لو کہ خدا کی کتاب کا اتباع نہیں ہورہا بلکہ اپنی اپنی خواہشات کا اتباع ہورہا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القصص کی آیت 49 تک ہم آ گئے۔ 50ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

آٹھواں باب: سورۃ القصص (آیت 50: زندگی اور جبلی تقاضے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یَتَّبِعُوۡنَ اَہۡوَآءَہُمۡ ؕ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ بِغَیۡرِ ہُدًی مِّنَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۰﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1979ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 50 سے ہو رہا ہے: (28:50)۔

روزِ اوّل سے آخر تک دین کے اصولوں میں کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی فرق

سابقہ آیت میں بالخصوص یہودی مخاطب تھے اور وہی اس دین کی سب سے زیادہ مخالفت کیا کرتے تھے۔ اُن سے کہا یہ گیا تھا کہ تم جو اِس کی بار بار مخالفت کرتے ہو اور یہ کہتے ہو کہ اِس میں اختلاف ہے۔ تمہارے نبی کی طرف جو کتاب نازل کی گئی تھی اگر وہ تمہارے ہاں Original (اصلی)' غیر محرف اور اپنی اصل شکل میں ہے تو تم اُسے لاؤ اور تم دیکھو کہ اُس میں اور اس میں دین کے اصولوں کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوگا اور میں اس کا اتباع کرنے لگ جاؤں گا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ کتابِ موسیٰ بھی خدا کی طرف سے صحیح راہ نمائی دینے والی تھی تو قرآن کہتا ہے کہ وَ لَقَدۡ وَصَّلۡنَا لَہُمُ الۡقَوۡلَ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ (28:51)۔ دین کے اصولوں کی تو کیفیت یہ ہے کہ وہ مسلسل کڑیاں ہیں جو شروع سے آخر تک چلی آ رہی ہیں' اُن میں ایک ربط ہے' ایک کے ساتھ دوسری کڑی ملتی ہوئی چلی آ رہی ہے' اُس میں کوئی اختلافی چیز نہیں ہے۔ تمہارے اعتراضات کی بنیاد وہ کتاب ہے جو تمہارے پاس ہے لیکن وہ کتاب وہ نہیں ہے جو تمہارے رسول کو دی گئی تھی۔ اور تم خود اِس کے معترف ہو کہ اُس میں آمیزش بھی ہوئی ہے' تحریف بھی ہوئی ہے' تبدیلی بھی ہوئی ہے' کچھ حصہ گم بھی ہو چکا ہوا ہے۔ اور اُس کے بعد یہ قرآن ہے' اِس کو تم On Merit (استحقاقاً) لو۔ قرآن کو دیکھو اور بتاؤ کہ اِس پر تمہیں کیا اعتراض ہے۔ یہ اعتراض کہ یہ رسول بنی اسماعیل کی شاخ میں کیوں آ گیا' بنی اسرائیل کی شاخ میں کیوں نہیں رہا؟ تو یہ تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

نوعِ انسانی کے نزدیک انسانی جذبات کا اتباع اور اس کی حدود کے تعین کا مسئلہ

اب اُس کے بعد میں آج کی آیت کی طرف آتا ہوں۔ اس آیت میں یوں تو دو الفاظ آئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ چند ایسے اہم مسائل کو حل کر رہے ہیں جن کے حل میں انسانیت کی تاریخ میں بڑے بڑے دانشور اور اہلِ مذاہب بھی سرگرداں چلے آ رہے ہیں۔ آیت یہ ہے کہ ان سے کہو کہ اس کے باوجود جو ہم نے ان سے کہا ہے کہ یا اپنی اور یجنل اصلی کتاب لاؤ اور دیکھو تو سہی کہ اُس میں اور دین کی اساس کے متعلق جو اصول قرآن میں ہیں، تو کیا اُن دونوں میں کوئی فرق ہے۔ وہ کتاب لاؤ اور یا اس قرآن کو آن میرٹ دیکھو اور جو اس میں دیا گیا ہے اُس پہ کوئی اعتراض کرو۔ فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکَ (28:50) اگر اس کے باوجود تمہاری اس دعوت پر یہ لبیک نہیں کہتے، Response نہیں کرتے تو فَاعۡلَمۡ (28:50) پھر یہ سمجھ رکھو کہ یہ علم و دانش اور عقل و بصیرت کی بنیادوں پہ ایسا نہیں کرتے اَنَّمَا یَتَّبِعُوۡنَ اَھۡوَآءَ ھُمۡ (28:50) یہ محض اپنے جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ اس میں Reason (استدلال) نہیں ہے، اس میں دلیل نہیں ہے، اس میں علم نہیں ہے، بصیرت نہیں ہے، عقل نہیں ہے، شعور نہیں ہے بلکہ صرف جذبات ہیں اور جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ اب یہ ہے وہ مسئلہ: جذبات کا اتباع۔ تو اتنے سے تو یہ نظر آیا کہ جذبات کا اتباع ایسی چیز ہے جس کی قرآن بڑی مخالفت کرتا ہے، اُن کے خلاف بہت بڑا اعتراض کرتا ہے۔ یہ ہے پہلا مسئلہ جو سقراط Socrates کے زمانے (C449-399 BC) سے لے کے اس وقت تک ہے۔ یہ علمائے اخلاقیات (Ethics) کا جو فلسفہ ہے اُس میں یہ مشکل ترین مسئلہ گنا جاتا ہے کہ جذبات وہ چیز ہیں جن کے اوپر انسان کے عمل کا انحصار ہے۔ جب تک ایک جذبہ آپ کے ہاں پیدا نہ ہو تو آپ کسی کام کے لیے تیار ہی نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کے اندر کسی کام کے لیے جذبہ بیدار نہیں ہوتا تو پھر تو پتھر اور انسان میں فرق ہی نہیں ہے۔ اور اگر جذبات کے اتباع کی اتنی مخالفت کی گئی ہے تو پھر یہ انسان تو انسان نہیں رہتا بلکہ پتھر کے بت بن جاتا ہے۔ تو یہ کیا چیز ہے؟ ایک طرف یہ جذبات ہیں۔ اور یہاں آیت کا آدھا حصہ میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے کہ یہ محض اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں۔ اور دیگر مقامات میں قرآنِ کریم نے اھـــــوآء کہا ہے۔ یہ ھوٰی کی جمع ہے۔ اس کا عام ترجمہ ہمارے ہاں بھی جذبات کیا جاتا ہے، خواہشات کیا جاتا ہے۔

سیکولر نظام کا بنیادی فلسفہ

دنیائے انسانیت میں دو Extremes (انتہا) آئے: افراط اور تفریط۔ افراط کی طرف آئے تو آج کا ہمارا سیکولر نظام ہے، ساری یورپ کی تہذیب ہے۔ ان کا تمام فلسفہ اس بنیاد پہ ہے کہ انسان بھی حیوان ہی کی ایک شکل ہے، زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے، اسی جسم کی زندگی ہے، یہی Physical Life (طبعی زندگی) ہے۔ بس صرف Physical Life (طبعی زندگی) کے مقاصد حاصل کیجیے، اس زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحالیوں میں، عیش پرستیوں میں، آپ بسر کیجیے۔ موت آئی اور اُس کے ساتھ یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ زندگی کیا ہے؟

زندگی کچھ عناصر میں ظہورِ ترتیب ہے' کچھ Elements (عناصر) تھے وہ کسی طرح سے یوں اکٹھے ہوئے ہیں' اُن میں ربط پیدا ہوا ہے اور Life (زندگی) آ گئی۔ موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا۔ یہ جو مربوط اجزا ہیں' یہ پھر Disintigrate (منتشر) ہو جائیں گے اور انسان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو جب زندگی یہی طبعی زندگی ہے تو پھر تو کسی قسم کی حدود و قیود کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر جو جذبات بھی آپ کے اندر پیدا ہوں ان کا اتباع کیے چلے جایئے' ان کے مطابق زندگی بسر کیے چلے جایئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یونان کے فلاسفر میں سے ہی یہ جو اپیقورس (Epicurus: 341-270 BC) تھے یہ اُن کا تصور تھا کہ زندگی یہی طبعی زندگی ہے' جسے ❶ Epicueanism (اپیقوریت) کہا جاتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ ''بابر بہ عیش کوش عالم دوبارہ نیست''۔

انسانی فکر کا ایک دوسرا پہلو یعنی جذبات کی مکمل نفی جو تصوف کی دنیا کا ماحصل ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ فلسفے کی دنیا میں بھی یہ مشکل ترین مسئلہ تھا۔ اس کے حل کے لیے دوسرے فلسفی Extreme (انتہا) پہ چلے گئے۔ یہ وہ ہے جسے آج کی اصطلاح میں تصوف کہتے ہیں۔ یہ بھی نئی بات نہیں ہے۔ یونان ہی کے علما کا ایک گروہ تھا جنہیں اشراقین کہا جاتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جتنی تباہیاں دنیا میں آ رہی ہیں وہ ساری جذبات کے ٹکراؤ سے آ رہی ہیں۔ جب انسان اپنے جذبات کے تابع کوئی کام کرتا ہے' زندگی بسر کرتا ہے تو تباہیاں آتی ہیں۔ اس لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ جذبات کو ختم کر دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اسے نفس کشی کہا جاتا ہے۔ وہاں سے وہ بات چلی۔ یہ دونوں تحریکیں' نظام اور فلسفۂ زندگی' یہ دونوں' اُس دور سے متوازی چلی ہوئی ہیں۔ ان کی شکلیں بدلتی رہیں' ان کے نام بدلتے رہے لیکن یہ دونوں برابر چلی آ رہی ہیں۔

سیکولرازم کا نتیجہ پوری دنیا کی تباہی

اب وہ جو اپیقوریت (Epicueanism) ہے کہ جذبات کے تابع ہی زندگی بسر کی جائے تو اُس کا جو نتیجہ ہے وہ پہلی تاریخ میں

---

❶ ایک ایسا طرزِ زندگی جو لذت کوشی سے عبارت ہو۔ اس اپیقوریت (Epicueanism) کا بانی اپیقورس (Epicurus: C.341-270 BC) نامی ایک فلسفی تھا۔ اس نے اپنے فلسفیانہ مباحث کا آغاز ایتھنز میں قائم کردہ ایک اپیقوری سوسائٹی سے کیا جس کا قیام 306 ق م کے دوران عمل میں آیا۔ اس کے اجلاس اپیقرس کے باغات (Gardens of Epicurus) میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اس سوسائٹی سے وابستہ فلسفیوں کو تاریخ میں باغ و بہار (Philosophers of the garden) یا ''چہ غم فلاسفہ'' (Epicueanism) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ انہیں یہ اس لیے کہا گیا کہ یہ زندگی کے دکھ و آرام کی مطلق کوئی پرواہ نہ کیا کرتے۔ اپیقوری فکر جن دو اہم مکاتب فکر سے ماخوذ ہے ان میں سے ایک سیرینی لذتیت کا مکتب فکر ہے تو دوسرا مکتب فکر دیمقراطیس کا نفسیاتی۔ مابعد الطبیعاتی اندازِ نظر ہے۔ اپیقورس نے سیرینی لذت پرستوں سے یہ نظریہ مستعار لیا کہ لذت (Pleasure) ہی ''کامل خیر'' ہے (ماخوذ از قاضی قیصر الاسلام (2002)۔ تاریخ فلسفہ مغرب حصہ اول۔ لاہور: نیشنل فاؤنڈیشن' ص 82)۔

تو چھوڑ دیجئے' آج کے یورپ' امریکہ بلکہ ساری دنیا میں یہی صورت ہے۔ وہ ہے جسے سیکولرازم کہتے ہیں۔ وہ یہ چیز ہوتی ہے۔ اور جو اس کی وجہ سے تباہیاں لاحق ہو رہی ہیں' وہ پہلے تو افراد میں ہی ہوتی تھیں' اب بھی افراد میں بھی ہوتی ہیں اور پھر جب یہ اقوام میں شروع ہوئی ہیں تو اس نظریئے کے تابع ساری دنیا آج جہنم بن رہی ہے۔ اس کے برعکس وہ دوسرا نظریہ لیجیے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے تو آدھی دنیا اُس سے مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ بدھ مت میں آ کر یہ بات انتہا تک پہنچی تھی۔ جینیوں کے ہاں بھی یہ چیزیں انتہا تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ہندوؤں کے ویدانت میں بھی یہ چیز تھی۔ عیسائیوں کے جو Saints تھے اُن میں بھی یہ چیز تھی۔ یہودیوں کے ہیکل میں بھی یہ ہے۔ اور آپ کے ہاں تو تصوف' موجود ہی ہے۔ آپ کی ساری شاعری' آپ کا سارا تصوف' لٹھ لے کر جذبات کے پیچھے پھر رہے ہیں۔ وہ ہر چیز کا ترک کرتے ہیں۔ انتہائی چیز ترکِ آرزو ہے۔ کسی زمانے میں تو ہم بھی اسی کے پرچارک تھے۔ جب قرآن سامنے آیا تو ایک ہی چیز تھی جو میں نے اِن کی خدمت میں عرض کی کہ آپ جو ترکِ آرزو مقصدِ حیات بتا رہے ہیں تو کیا یہ بھی آپ کی آرزو نہیں ہے؟ یہ بھی تو آپ کی ایک خواہش ہے کہ آرزو کو ترک کرنا چاہیے' نفس کشی کرنا چاہیے:

وہ کہہ رہے تھے، نہ دیکھے کوئی ادا میری

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

تو ترکِ آرزو بھی اک آرزو ہے کہ مجھے اُسے ترک کر دینا چاہیے۔ یہ ہم آج کے دور میں آ گئے۔

نوعِ انسانی چودہ سو سال سے اسی مرضِ کہن کی شکار چلی آ رہی ہے

عزیزانِ من! یہ مقامات ہیں جہاں نظر آتا ہے بلکہ علی وجہ البصیرت ثابت ہوتا ہے کہ قرآن واقعی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ چودہ سو سال پیشتر کی آپ تاریخ دیکھیے تو یہی دونوں متوازی نظریات چلے آ رہے تھے اور اب تک چلے آ رہے ہیں۔ درمیان میں ایک اسٹیج آتی ہے جہاں انسانی فکر نہیں بلکہ وحی کی رو سے ایک چیز آتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آج کے دور میں اب جو سائیکولوجی ہے' اُس نے یہ معلوم کرنے کی کچھ کوشش شروع کی ہے کہ یہ جذبات ہوتے کیا ہیں' ان کا فنکشن (فعل) کیا ہے' ان کا فریضہ کیا ہے' ان کا مقام کیا ہے؟ ابھی اس کی ذرا ذرا سی ابتدا ہوئی ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ کیا چیز میرے سامنے آ گئی۔

قرآن حکیم کے نزدیک نفسیاتی طور پر انسانی جذبات کا مقام اور معاشرتی جرائم کا حل

میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہونگے کہ یہ بڑے ہی گہرے فکر کی چیز ہے اور بڑی توجہ سے بات سمجھنے کی ہے۔ یہ بڑی اہم چیزیں ہیں' علمی دنیا کی چیزیں ہیں جو قرآن کی رو سے آپ کے سامنے آئیں گی۔ یہ بہت عظیم مسئلہ ہے کہ جذبات کا مقام کیا ہے' یہ

ہوتے کیا ہیں؟ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور اہم سوال منسلک ہے کہ جرائم کسے کہتے ہیں' وہ کیوں وجود میں آتے ہیں' آدمی ارتکابِ جرم کیوں کرتا ہے' جرائم کو روکنے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ سوال کتنی اہمیت اختیار کر گیا ہوا ہے۔ ساری دنیا کے اندر جرائم اتنے عام ہو رہے ہیں کہ اُس سے پہلے انسانیت کی تاریخ میں جرائم نے اتنی عالمگیر حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ یہ ہمارے ہاں کے جو آئی جی صاحب [1] ہیں اُنہوں نے اگلے دن ٹی وی پر یہ بتایا تھا کہ امریکہ وغیرہ جنہیں تم مہذب ترین ملک کہہ رہے ہو' وہاں ہر تیسرے منٹ کے بعد قتل ہوتا ہے اور ساتویں منٹ کے بعد اغوا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے یہ سب کچھ گنایا تھا۔ جتنے مہذب ترین ممالک ہیں اُن میں جرائم کی کیفیت یہ ہے۔ اور وہ تنگ آ گئے ہیں کہ اِس کا کوئی حل نہیں مل رہا۔ یہ مسئلہ بھی اسی کا ہے کہ جرائم ہوتے کیوں ہیں' اس کا ارتکاب کیوں ہوتا ہے اور وہ کیا چیز ہے جس سے جرائم رک سکتے ہیں؟ آپ نے غور کیا کہ کتنا اہم مسئلہ ہے! قرآن کے صرف دو الفاظ ہیں جو اسے حل کر کے رکھ دیتے ہیں' عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔

فکرِ قرآنی کی روشنی میں انسانی ہیت کا تجزیہ

آج تحقیق یہ ہو رہی ہے کہ جذبات کیا ہوتے ہیں؟ قرآن نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ انسان کی جو موجودہ ہئیت ہے' یہ یوں ہے کہ زندگی پیچھے سے مختلف منازل طے کرتی ہوئی تدریجاً ارتقائی طور پہ' By Evolution پیکرِ انسانیت میں پہنچی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ انسان جس شکل میں ہے' اس میں 9/10 حصہ تو حیوان کا ہی ہوتا ہے۔ یہ .The animal in man (انسان میں حیوان) ہے۔ اور کوئی 1/10 حصہ وہ ہے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ وہ 1/10 ہو یا 9/10 ہو' یہ ماپنے کی چیز نہیں ہے۔ تو وہ کیا چیز ہے؟ وہ چیز ہے جسے انسانی ذات' Human Personality' نفس' خودی کہا جاتا ہے' جو انسانی جسم کا حصہ نہیں ہوتا۔ انسانی جسم طبعی قوانین کی رو سے اس شکل میں آیا ہے۔ اس کی Physical Demands (جسمانی تقاضے) ہیں' اس کے فزیکل تقاضے ہیں' فزیکل قوانین ہیں جن کے تابع یہ رہتا ہے۔ طبعی طور پہ اگر غلط چیز کھا لیجیے تو بیماری ہوتی ہے' طبعی طور پر اُس کا علاج ہوتا ہے۔ وہ جسم کا ہی علاج ہوتا ہے' یہ جسم کی ہی بیماریاں ہوتی ہیں۔ اور وہ جو ایک حصہ کہا جا رہا ہے آج اُس کا اعتراف ہو رہا ہے کہ انسان کے اندر ایک چیز ایسی بھی ہے جو نہ طبعی جسم کی پیداوار ہے' نہ طبعی قوانین کے تابع ہے۔ لہٰذا حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز وہ ایک چیز ہے' جسے 1/10 کہتے ہیں۔ اور اگر میں اس موضوع پہ آ جاؤں گا کہ انسانی ذات کیا ہے اور اِس کی اہمیت کیا ہے' تو برگسان (1859-1941) جو اس معاملے میں یورپ کے مفکرین میں بڑی بلند حیثیت رکھتا ہے' نے کہا تھا کہ جسے تم 1/10 کہتے ہو وہی تو Master of the House (اس سارے گھر کا مالک)

---

[1] حاجی حبیب الرحمٰن مرحوم

ہے۔ بہرحال اسے چھوڑ دیجیے۔ انسان کے اندر اتنا حصہ حیوان کا ہے۔ حیوان کی زندگی طبعی جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ حیوان ہی کی زندگی نہیں بلکہ آج اِس کی تحقیق ہوئی ہے کہ زندگی جہاں بھی ہے اُس کے کچھ اپنے Inner (اندرونی) تقاضے ہیں۔ اُن میں دو تقاضے بدیہی طور پر' بنیادی طور پہ' ابھی گنائے گئے ہیں۔ تیسرا ابھی شامل کرتے ہیں لیکن بنیادی دو ہی ہیں۔

انسانی جسم کو متحرک رکھنے والی شے کی خصوصیات

عزیزانِ من! ان میں ایک تقاضا Preservation of self (تحفظ خویش) ہے۔ زندگی تحفظِ خویش چاہتی ہے' اپنا تحفظ چاہتی ہے۔ زندگی جس شکل میں بھی ہے خواہ ایک چیونٹی کی شکل میں زندگی ہے' تو اُس کے سامنے بھی آپ تنکا کھڑا کیجیے تو آپ دیکھیے کہ وہ کس طرح اُس سے جنگ لڑتی ہے' اُس کے مقابلے میں لڑائی لڑتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو Preserve (حفاظت میں) کرنا چاہتی ہے۔ میں نے چیونٹی تو اس لیے کہا کہ اِس کو ہم آپ دیکھ سکتے ہیں' ورنہ ان سائنسدانوں سے پوچھیے وہ کہتے ہیں کہ یہ جو Cells (خلیے) ہوتے ہیں' ابتدائی جرثومے ہوتے ہیں' جو مائیکروسکوپ (خوردبین) کے بغیر نظر تک نہیں آتے' ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب یہ اُنہیں ٹیسٹ کرنے کے لیے کوئی ذرا سی زہریلی چیز اُس میں پھینکتے ہیں تو وہ کس طرح سے اُس سے بھاگتے ہیں' اُس سے لڑتے ہیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو Preserve (محفوظ) کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں Life (زندگی) ہوتی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ Life (زندگی) اپنے آپ کو Preserve (محفوظ) کرنا چاہتی ہے۔ حیوانات کے درجے تک تو بدیہی طور پہ نظر آجاتا ہے۔ وہی حصہ انسان کے اندر ہے اور اُس کا بھی تقاضا یہ ہے۔ پہلا تقاضا تو یہ Preservation of Self ہے' تحفظِ خویش ہے۔ اور اس کا دوسرا تقاضا Self Reproduction ہے' افزائشِ نسل ہے' اپنے جیسا پیدا کرتے جانا ہے۔ زندگی کا تسلسل اسی طرح سے قائم ہے۔ یہ دوسرا تقاضا ہے جسے عام طور پہ پھر Sex (جنسیات) کہا جاتا ہے۔ وہ جو Preservation of Self (تحفظ خویش) ہے' اُس میں یہ سائیکولوجسٹ کہتے ہیں کہ Self Aggression (تغلب خویش) بھی ایک چیز ہے یعنی دوسرے پر غالب آنے کا ایک جذبہ ہے۔ وہ اصل میں Preservation of Self (تحفظ خویش) کی ہی ایک شکل ہے کہ جب ویسے Preservation (حفاظت) نہ ہو تو پھر دوسرے کے اوپر تغلب حاصل کیا جائے۔ حیوانات کی زندگی میں آپ کو نمایاں طور پہ یہ چیز نظر آئے گی۔

تغلب کے جذبے کے علاوہ حیوانات میں افزائشِ نسل کے جذبے کی نوعیت

حیوانات کسی شکل میں بھی ہوں' وہ تحفظِ خویش کے لیے اپنی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور اُس میں تغلبِ خویش بھی ہوتا ہے۔ اور افزائشِ نسل کے لیے تو وہاں فطرت نے خود انتظام کر رکھا ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں Mating Season (جفتی رُت) ہوتے ہیں۔

اس لیے ان کے ہاں بقائے نسل کا سلسلہ چلا آتا ہے' اسے Self Reproduction (تولید خویش) کہتے ہیں۔ یہی چیزیں انسان کے اندر ہیں۔ فرق کیا ہے؟ اور یہ ہے نمایاں فرق جہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ حیوانات کی صورت میں Nature نے' فطرت نے' خدا نے' اُن کے اوپر خود کنٹرول رکھا ہوا ہے' جنہیں Safety Valves (حفاظتی والو) کہا جاتا ہے۔ دھات کے اوپر ایک Valve (والو) ہے کہ وہ یونہی نکلنے نہ پائے۔ ایک خاص درجے کے اوپر آ کر وہ Valve (والو) ذرا سا تھرکتا ہے تو اُس میں سے زائد جو چیز ہوتی ہے وہ نکلتی ہے۔ اسے Safety Valve (حفاظتی والو) کہتے ہیں۔ حیوانات کی شکل میں Safety Valve (حفاظتی والو) یا کنٹرول کہہ لیجیے' وہ فطرت نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ شیر اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ فطرت نے اُسے کہا ہے کہ تُو گوشت پر زندہ رہ سکتا ہے۔ سارے جنگل میں وہ پھرتا ہے' بھوکا مر رہا ہوتا ہے۔ ہر قسم کی سبزی' ترکاری' پھل' انگور لٹک رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اُن کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا؟ وہ اُن کی طرف کیوں نہیں دیکھتا۔ کیونکہ فطرت نے کہا ہے کہ یہ تجھ پہ حرام ہیں اور گوشت تمہارے لیے حلال ہے۔ وہ حرام کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا' حلال کی تلاش میں رہتا ہے اور اگر نہیں ملتا تو بھوکا مر جاتا ہے۔ ملتا ہے تو وہ جتنا بھوک کا تقاضا ہوتا ہے اتنا گوشت تو وہ کھا لیتا ہے اور باقی کے متعلق سوچتا ہی نہیں ہے کہ کون لے گیا۔ شیر کو تو ہم نے کم دیکھا ہے لیکن بیل تو دیکھے ہونگے۔ وہ جب تک بھوکا ہوتا ہے' کسی کو چارے کے پاس نہیں آنے دیتا اور جب اُس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہیں چپکے سے بیٹھ جاتا ہے' آنکھیں بند ہوتی ہیں اور بڑے مزے سے جگالی کرتا ہے۔ اُسے پرواہ ہی نہیں ہے کہ باقی چارہ کون لے گیا۔ وہ فطرت کے کنٹرول میں ہے۔ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد خود ہی ایک کنٹرول اُس کے اوپر عائد ہو جاتا ہے۔

سب سے بڑا شدید طاقتور جوجذبہ ہے' وہ جنس کا ہے۔ Nature (فطرت) نے ان کے اوپر کتنا بڑا کنٹرول رکھا ہے؟ سارا سال گائیوں کے گلے میں بیل پھرتا ہے' جنسی قوت بھی موجود ہوتی ہے لیکن نہ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے' نہ وہ ادھر دیکھ سکتی ہیں۔ وہ دونوں غَضِّ [1] بصر سے کام لیتے ہیں۔ جو قرآن نے کہا تھا کہ اپنی نگاہیں جھکی ہوئی رکھا کرو۔ جب افزائشِ نسل کا تقاضا ہوتا ہے' جسے آپ Mating Season (جُفتی رُت) کہتے ہیں تو بیل پاگل ہو جاتے ہیں۔ گائیوں کی بھی یہی قوت ہوتی ہے۔ اور جب اختلاط کے

---

[1] اس کا مادہ (Root) غ ض ض ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ مادہ اَبْصَارٌ کے لیے (24:30) میں آیا ہے جہاں اس کے معنی نگاہوں کو نیچا رکھنے' یا آنکھ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے روکنے کے ہیں جن کا دیکھنا اس کے لیے جائز نہیں (تاج العروس اور محیط المحیط) اور صَوْتٌ کے لیے (31:19) میں۔ یعنی آواز کا پست رکھنا۔ دونوں میں سرکشی اور بے باکی کے مقابلہ میں شرافت کے جھکاؤ کا پہلو ہے۔ جھکانا' کم کرنا' سمیٹ کر رکھنا' بے باک نہ ہونے دینا' آنکھوں کو بھی اور آواز کو بھی۔ یہ ہوگا قرآنی معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کا انداز۔ نہ چلنے پھرنے میں ان کی نگاہیں بیباک اور آوارہ ہوں گی' نہ بات چیت کرنے میں ان کی آواز اعتدال سے اونچی ہوگی (حوالہ پرویزؒ (1961)۔ لغات القرآن جلد سوم۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام' ص۔ 1232)۔

بعد یہ افزائش نسل کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے تو پھر وہی بیل ہے اور وہی گائیں ہیں اور وہ غضِ بصر ہے' پھر وہ ان کے اوپر حرام ہیں۔

انسان کی فضیلت اختیار وارادہ کی نعمت کی ہی رہینِ منت ہے

یہ تقاضے انسان کے اندر بھی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں فطرت نے خود اِس کے اوپر کنٹرول نہیں رکھا۔ وہ کنٹرول رکھ لیتی تو یہ مجبور ہو جاتا اور انسان کا انسان ہونے کے تو معنی یہ ہیں کہ اس پہ جبر نہیں ہے۔ اسے آزاد پیدا کیا گیا ہے' صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہاں یہ چیز مجبوراً حیوانات کے اوپر فطرت کر رہی ہے' وہ صاحبِ اختیار نہیں ہیں۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ شیر جو اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے' اُس کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے کہ جو چیز اُس پر حرام قرار دیدی گئی ہے' وہ اُس کی طرف دیکھ بھی سکے۔ یہ سب مجبور ہیں لیکن انسان کا تو اتنا سا بچہ بھی صاحبِ اختیار ہوتا ہے۔ شیر تو اُدھر منہ نہیں مارتا لیکن اس بچے کو دیکھیے۔ مرچ ہے تو اُس میں ہاتھ مار رہا ہے' آگ کی طرف بھی ہاتھ ڈال رہا ہے' پانی میں ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ اماں کو عجیب مصیبت ہوئی ہوتی ہے جب بچہ گھٹنوں چلنے لگتا ہے۔ اس کا اختیار کیا کرتا ہے؟ اس کے لیے مصیبت' گھر والوں کے لیے مصیبت۔ تو اب سوال تو اس میں ایک ہی تھا کہ یا تو اس کے اختیار وارادے چھین لیے جائیں۔ تو کیا پھر یہ انسان انسان رہتا؟ یاد رکھیے کہ انسان کی کسی آزادی کے اوپر اگر باہر سے جبر کیا جاتا ہے تو وہ صفِ انسانیت سے گر جاتا ہے؟ میں نے لفظ باہر سے یعنی Super Imposed کہا ہے۔ وہ تو پھر حیوان ہو گیا۔ حیوان پہ یہ Conditions (شرائط) دراصل Super Imposed (باہر سے عائد) ہوتی ہیں۔ انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ کیا گیا ہے۔ تو ایک اصول یہ یاد رکھیے جو قرآن نے کہا ہے کہ اگر اِس کے اوپر کوئی چیز Super Imposed (باہر سے عائد) کر کے' جبر کر کے کی جائے تو یہ انسانیت کے درجے پہ نہیں رہتا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ مصیبت یہ ہے کہ ایک شیر کو اتنی سی قوت دی گئی ہے کہ اپنے سے جو کمزور تر حیوان ہے اُس کو چیر پھاڑ کھائے۔ وہ چھلانگیں لگا کر دوڑتا بھی ہے لیکن اُس کی رفتار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پرندے اڑتے ہیں' ان کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ اُن کی قوتوں کی' صلاحیتوں کی' حد ہے۔ اُن کے یہ جو اندر سے خواہشات یا جذبات پیدا ہوتے ہیں ان پر ہم نے دیکھا کہ کنٹرول ہے۔ آپ سوچیے کہ انسان جیسا جانور ہے کہ اس کی ان قوتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی مثال لیجیے۔ درخت کے اوپر پھل لگا ہو یا درخت کے اوپر پتے ہوں' بکری نیچے بھوکی کھڑی ہے۔ وہاں تک پہنچ نہیں سکتی' تڑپ کے مر جائے گی' بھوک سے بلک کے مر جائے گی کیونکہ وہ اُس کی استطاعت سے آگے ہے۔ اور انسان کا بچہ یہ کرتا ہے کہ وہ لٹھ لے کر آسمان میں اڑنے والی پتنگ کو پکڑ لیتا ہے۔ اس نے اتنا سا وہ "ڈانگا"[1] لیا اور درخت کے آخر تک بھی جو لگا ہوا پھل ہے اُس کو یوں مارا اور پھل نیچے آ گیا۔

---

[1] لمبا ڈنڈا

حیوان کے بالمقابل انسانی اختیار وارادے کے کرشمے

عزیزانِ من! کوئی جانور بھی ''ڈانگا'' ❶ نہیں بنا سکتا۔ ''اونوں ڈانگا دے وی دیوؤ تے اونوں ڈانگا مارنا نہیں اوندا ہیگا''۔ ❷ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ حیوان تو ویسا ہی ہے اور ''ڈانگے اونوں دتے ہون ایہڈے ایہڈے کہ پئی ایتھوں اٹھے تے مریخ تے چلا جائے''۔ ❸ درندگی جتنی بھی دی گئی ہو لیکن شیر درندگی میں صرف یہ کرے گا کہ کوئی بکری قابو میں آ گئی' کوئی ہرن قابو میں آ جائے گا یا کبھی کوئی چلتا پھرتا انسان ہی قابو آ جائے' تو وہ تو یہیں تک ہے لیکن یہ انسان ایک بم ہیروشیما ❹ پہ گرا کر اس پوری بستی کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ اتنا بڑا درندہ ہے۔ اور ہیروشیما تو پرانی داستان ہو گئی۔ اب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک ایٹم بم سے یہ کرۂ ارض اڑا سکتا ہے۔ اس کی قوتوں کی لا انتہائیت کی یہ کیفیت ہے اور حیوانیت اِس کے اندر اس درجے کی ہے کہ کسی کا کنٹرول نہیں ہے۔ **قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا** (2:30) اور **وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ** (2:27) وہ جو فرشتوں نے تمثیلی انداز میں کہا تھا کہ یا اللہ! تُو کیا کر رہا ہے کہ اتنی حسین کائنات میں اِسے بھیج رہا ہے' جو اس قسم کا درندہ ہے' فساد انگیز ہے' اس کی قوتیں لاانتہا ہیں ''اینے اینے لمبے ٹانگھے دے کے'' ❺ تو تیری اس بستی کا کیا ہو جائے گا؟ اُس نے کہا کہ **اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** (2:30) اِسے تم نہیں سمجھ سکتے' ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں ذرا رک جاؤ۔ آپ نے غور فرمایا۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں

اِنہیں جن کو آپ تصوف والے کہتے ہیں' ان بیچاروں کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ یہ دیکھتے تھے کہ جذبات کی جو اِس طرح سے بپا کیاں ہیں' جن سے یہ کچھ کرتے ہیں تو ان کو کسی طرح سے فنا کرو۔ یہ کسی طرح سے فنا نہیں کر سکتے۔

انسانی جذبات کی Satisfaction (تسکین) کا طریق ان کے دبا دینے میں مضمر نہیں

آج کی سائیکولوجی سے پوچھیے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ان جذبات کو نکلنے کا صحیح چینل (راستہ) نہ دیا جائے تو اُس کے بعد یہ پھر

---

❶ لمبا ڈنڈا

❷ اسے لمبے لمبے ڈنڈے دے بھی دو تو بھی اسے وہ مارنے نہیں آتے۔

❸ اسے اتنے اتنے لانبے ڈنڈے دیئے ہوں کہ وہ یہاں سے اُٹھے اور مریخ پہ پہنچ جائے۔

❹ ہونشو (Honshu) کے ساحل پہ واقع جنوبی جاپان کا ایک شہر جسے اگست 1945 کی 6 تاریخ کو ایٹم بم سے قریباً تباہ کر دیا گیا۔ ایسا ہدف بننے والا یہ دنیا کا پہلا شہر تھا۔ تعمیر نو کے بعد یہ صنعتی مرکز کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا ہے جہاں ٹکسٹائلز' ربڑ کا سامان اور مشینری بنتی ہے۔

❺ اتنے لانبے ڈنڈے دے کر بھیجا ہے۔

Un Natural (غیر فطری) طریقوں سے اپنی Satisfaction (تسکین) کرتے ہیں۔ اُسے Perversion (بدنہادی) کہتے ہیں۔ اور وہ بیسیوں قسم کی نفسیاتی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔ یہ جنہیں آپ نفس کشی والے کہتے ہیں کہ جذبات کو اس طرح سے صحیح فطرت کے طریقے سے Satisfy نہ کرنے والے اور اپنے آپ کو فریب دے لینے والے کہ ہم نفس کشی کر رہے ہیں' یہ بیسیوں قسم کے نفسیاتی امراض کے مریض ہوتے ہیں۔ اور یہ ناممکنات میں سے ہے کہ جذبات کو فنا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی چیزیں جو لوگوں کی نگاہوں میں مذموم ہوں تو چلیے اُن جذبات کو تو روک بھی لیا۔ جذبات تو ہر قسم کے ہیں۔ بھوک بھی ایک جذبہ ہے' پیاس بھی ایک جذبہ ہے اور ان کو یہ نہیں روک سکتا۔ یہ رک ہی نہیں سکتے۔ بڑا خوبصورت شعر ہے لیکن فارسی کا ہے۔

پری رو تابِ مستوری ندارند

حسن پردوں میں نہیں رہ سکتا۔

چوں در بندی زروزن سر برآرند

''دروازہ بند کرکے تے روشندان وچوں جھاہ کرن لگ پیندے [1] نیں''، لیکن اس دور میں تو ہمارے نوجوانوں کو بڑی موج ہے۔ ''اے روشنداناں والی گل ہی کوئی نہیں ہیگی''۔ [2]

زمانہ آیا بے حیابی کا' عام دیدارِ یار ہوگا

قدرت نے کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی' خدا شر کا خالق ہی نہیں

عزیزانِ من! اسے Perversion (بدنہادی) کہتے ہیں۔ جذبات مارے نہیں جاسکتے' فنا نہیں کیے جاسکتے۔ اور اگر یہ ایسی ہی چیز تھے تو اِن سے پوچھیے کہ ان کو فنا کر لینا ہی مقصدِ حیات تھا تو اللہ کے اوپر کتنا بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ اُس نے ایسی چیز پیدا کر دی جس کا تباہ اور فنا کرنا ہی مقصدِ حیات ٹھہرا (معاذ اللہ)۔ می نہ سزد خدائے را۔ خدا شر کا خالق نہیں ہے۔ اُس نے جو کہا ہے کہ تم کس چیز سے بچنے کی آرزو کرو؟ کس چیز سے پناہ مانگو؟ وہ ہے مِنۡ شَـرِّ مَا خَلَقَ [3] (113:2)۔ اُس نے جو پیدا کیا ہے اُس کا طریقِ استعمال اُسے خیر یا

---

[1] دروازہ بند کرتے ہیں تو روشندان سے جھانکنے لگتے ہیں۔

[2] یہ روشندانوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔

[3] اُس (خدا) نے کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے' اُسے اُس کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے تو وہ خیر ہی ہے لیکن اگر اس کا استعمال غلط طریق سے کیا جائے تو اس سے شر (Evil) پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس طرح کے شر سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے یعنی اس احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہ کائناتی قوتوں کا استعمال غلط (وحی کے خلاف) طریق سے نہ ہونے پائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1498)۔

شر بنتا ہے۔تلوار تو اپنی ذات میں نہ شر ہوتی ہے، نہ خیر ہوتی ہے۔مظلوم کے سینے میں گھونپ دیجیے تو شر ہوگئی، ظالم کے بازو کو روک دیجیے تو خیر ہوگئی۔وہ شر کا خالق نہیں ہے وہ تو خیر ہی خیر ہے۔اُس نے کہا ہے کہ جو کچھ پیدا کیا ہے اُس کا استعمال خیر یا شر ہوتا ہے۔اور اُس نے انسان کے اندر جذبات کو جو باقی رکھا ہے تو اگر جذبات اتنے ہی شر ہیں کہ ان کا فنا کر دینا ہی مقصدِ حیات ہے، بلکہ ان کے نزدیک تو دین کا مقصد ہے، تو جذبات کے خالق کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ یہ نہ فنا کیے جا سکتے ہیں اور نہ فنا کرنا مقصودِ خداوندی ہے۔انہیں رہنا ہے۔یہ Life (زندگی) کے تقاضے ہیں۔جذبات تو مردے میں فنا ہوتے ہیں، جب Life (زندگی) نہیں ہوتی۔

انسان کے حیوانی جذبات کو بے لگام چھوڑ دینے کا نتیجہ جرم کی شکل اختیار کرتا ہے

یہیں سے بات آ گئی کہ جرائم کیا ہوتے ہیں؟ اتنی طاقتیں ہوں اور کوئی کنٹرول نہ ہو! میں ابھی یہ بتا دوں کہ ان ماہرین نفسیات نے Animal (حیوان) کے لیے Instinct (جبلت) کا لفظ وضع کیا ہے۔وہ صحیح ہے لیکن انسان میں اُس کے لیے Emotion کا لفظ ہے جسے جذبات کہتے ہیں۔اصل میں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ Instinct (جبلت) ہی ہے، جسے Animal Instinct (حیوانی جبلت) کہتے ہیں۔ The Animal in man (انسان میں حیوان) ہے تو اُس کے جو تقاضے ہیں یہ وہی ہیں جن کو Instinct (جبلت) کہا جاتا ہے۔جرائم یہ ہوتے ہیں کہ یہی جو تقاضے ہیں، ان تقاضوں کو بے مہابہ پورا کرنا۔بے مہابہ کے معنی ''بغیر کسی حدود و قیود'' کے ہیں۔قیود اور حدود تو اس کے اوپر Nature (فطرت) نے عائد نہیں کیں۔سوسائٹی صرف قانون بناتی ہے اور وہ قانون کیا ہیں؟ وہ اِس کا اعلان کرتی ہے کہ یہ حد ہم نے باندھ دی ہے کہ اِس کے اندر اندر رہنے سے تو یہ حلال ہے اور باہر جاؤ گے تو جرم ہے۔وہ جو حد باندھی ہوئی ہوتی ہے، وہ کوئی دیوار تو کھڑی کی نہیں ہوتی۔اور ایسا بھی ممکن نہیں ہے کہ تمام حدود کے اوپر، ہر قدم کے اوپر، سپاہی کھڑے کیے ہوئے ہوں۔یہ ناممکن ہے۔محض حد کا اعلان کرنے سے، یہ جو اتنا بڑا حیوان ہے، جس کی Instincts (جبلتیں) اتنی بڑی ہیں، جس کی ''ٹانگیں'' اتنی لمبی لمبی ہیں، کیا آپ ان کو اس اعلان سے روک سکیں گے؟ میرے ایک دوست نے ایک بڑی عمدہ بات کی تھی۔ہم جب شروع میں یہاں آئے تو یہ سنا کہ صاحب! رشوت عام ہوگئی ہے۔ایک افسر کے متعلق میرے اس دوست نے کہا کہ وہ بڑا دیانتدار ہے، وہ رشوت وغیرہ نہیں لیتا۔پھر کہا کہ ''اُس کے گردے کمزور ہیں یعنی کمزور واقع ہوا ہے تو حد کا تو وہ لحاظ رکھے گا۔اور جس کی یہ صورت نہیں ہے تو اُس کے لیے وہ حد شے کیا ہے۔'' آپ نے دیکھا کہ جرائم کیا چیز ہوتے ہیں۔یہ قانون کی پابندی ہے ہی شریفوں کے لیے۔

کافر ناتوانی شد
ناچار مسلماں شد

یہ ہم لوگ جو قانون کی پابندی کر رہے ہوتے ہیں تو یہ "ناچار مسلماں شو" والی بات ہوتی ہے۔ اور اُس کا تو ثبوت ہے کہ اندر سے ہمارا جی چاہ رہا ہوتا ہے کہ اتنی دولت مل جاتی ہے تو اچھا ہے۔ اب ملنے کی جو صورت ہے تو وہ لینے کی ہمت نہیں ہوتی ورنہ کیفیت یہ ہے کہ اُدھر قانون بن رہا ہوتا ہے اور اِدھر سے قانون کی Aversion (روگردانی) کے لیے ذہن میں شکلیں آ رہی ہوتی ہیں کہ اِس میں نکلنے کی راہیں کونسی ہیں۔

حیوان قانون کے تصور سے آگاہ ہی نہیں ہوتا

قانون کا اعلان حیوان تو نہیں کر سکتا۔ حیوان پہ بھی جس وقت، جس حد پر کنٹرول نہیں ہوتا، تو اُس کو کسی قانون سے روک کر دکھایئے مثلاً کہیے کسی بیل سے کہ اِس کھیت سے نہیں کھانا کیونکہ یہ تمہارے مالک کا نہیں، دوسرے کا ہے۔ وہ بیل بھوکا ہو تو پھر دیکھیے کہ اُس کو روکنے سے کیا تماشہ ہوتا ہے۔ وہ اِدھر سے روکتے ہیں تو وہ اُدھر سے جاتا ہے، اُدھر سے روکتے ہیں تو وہ یوں جاتا ہے۔ وہ رک ہی نہیں سکتا۔ وہ تو آپ کے لٹھ سے نہیں رکتا تو قانون سے وہ کیسے رکے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ Follow (سمجھتے) کرتے جا رہے ہیں۔ کڑی سے کڑی ملتی جا رہی ہے کیونکہ بڑی اہم چیز آ رہی ہے اس لیے میں نے گزارش کیا ہے کہ اِس کو Follow (سمجھتے) کرتے جایئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ فلسفے کے ساتھ جرائم کی شکل کیسے مل رہی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ پھر کیا کیا جائے؟ جذبات (Animal Instincts) تو ختم ہو ہی نہیں سکتے جب تک Life (زندگی) موجود ہے۔ فطرت کی طرف سے کنٹرول ہے ہی نہیں۔ کنٹرول ہوتا تو یہ انسان ہی نہ ہوتا۔ یہ جو جذبات ہیں، میں نے کہا ہے کہ اِس کے ترجمہ کے لیے Instincts (جبلتیں) کا لفظ ہی رکھیے۔ اِس کو ہمارے ہاں جبلت کہتے ہیں۔ جذبات، خواہشات، آرزوؤں وغیرہ کے معنی کچھ پامال ہو گئے ہوئے ہیں۔ انسان کے اندر یہ جو زندگی کے حیوانی تقاضے ہیں اِن کو کچھ کہہ لیجیے۔ ان کا پورا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے اوپر فطرت کا کنٹرول ہے نہیں۔ اب اس مسئلے کے حل کا کیا طریق ہے؟ کیا یہ جذبات فنا کر دیئے جانے چاہئیں؟ کیا دین اس بارے میں یہ کہتا ہے؟ یہ بڑے اہم سوالات ہیں۔

قرآن حکیم انسان کی بے مہابہ زندگی کو کنٹرول کرنے کا طریق عطا کرتا ہے

یہ ہے وہ مقام جہاں اُس نے کہا کہ **فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ** (28:50) اگر اس کے باوجود وہ اِس بات پہ نہیں آتے کہ اِس انداز کی زندگی بسر کرنی چاہیئے، تو سمجھ لو کہ یہ بات وہ محض اپنے حیوانی جذبات یا Instincts (جبلتوں) کے تابع کہہ رہے ہیں۔ اُس میں بے مہابہ زندگی بسر کرنے کی بڑی گنجائش اور اجازت ہوتی ہے۔ اب قرآن کا اگلا لفظ آ گیا: **و من اضل** (28:50) اُس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے۔ حیوانات تو راہ گم کردہ ہوتے ہی نہیں ہیں تو یہ کون ہیں؟ دوسری طرف میں نے یہ کہا ہے کہ یہ جو

کہہ رہے ہیں کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے تو یہ بھی راہ گم کردہ ہیں: مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ (28:50) اُس سے زیادہ غلط راستے پر چلنے والا کون ہے جو اپنے ان جذبات یا Instincts اور عربی زبان میں ھوٰہ کا لفظ ہے' کا اتباع کرتا ہے۔ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (28:50) خدا کی دی ہوئی راہنمائی کو چھوڑ کر' اُس کے بغیر' جو ان جذبات کا اتباع کرتا ہے تو وہ ہے جو راہ گم کردہ ہو گیا۔

حدود اللہ کے بغیر عقل و فکر کی چابکدستی کی لامحدودیت

عزیزانِ من! یہ ہے دین: اتباعِ اھوآء بالحق' بالھدیٰ. اب سوال یہ ہے کہ یہ ھدًی من اللہ کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ یہ جتنی حد بندیاں ہیں یہ انسانوں کی بنائی ہوئی ہونگی۔ انسان کو زیادہ سے زیادہ یہ عقل و فکر دی ہوئی ہے۔ خود عقل کی یہ کیفیت ہے کہ اگر اُس کو حدودِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو یہ جتنے بڑے بڑے جرائم ہوتے ہیں' وہ تو سارے عقل کے زور کے اوپر ہوتے ہیں۔ یہ ہے ہی Battle of wits (ذہنوں کی جنگ)۔ یہ جس طرح سے وہ جس کے گردے کمزور ہوتے ہیں تو وہ کوئی جرم نہیں کر سکتا' بدھونے کیا جرم کرنا ہے۔ اگر کرتا بھی ہے تو وہیں پکڑا جاتا ہے۔ جرائم پیشہ ہونے کے لیے بہت بڑے دماغ کی ضرورت ہے۔ اور جتنا زیادہ دماغ ہوتا ہے اتنے ہی بڑے قسم کے وہ جرائم کرتا ہے۔ پھر قومیں اجتماعی طور پر اپنی عقل سے کام لے کر دوسری قوموں کے مقابلے میں جا کر اُن کو پسپا کرتی ہیں۔ یہ تو Battle of wits (ذہنوں کی جنگ) ہوتا ہے۔ اگر یہ بات تنہا عقل پہ چھوڑ دی جائے کہ وہ اِس کے لیے کوئی تجویز کرے تو ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ عقل کا تو کام یہ ہے کہ اندر سے جو حیوانی جذبہ بھی اُٹھے' وہ اُس جذبے کی تسکین کے لیے وسائل مہیا کردے۔ یہ جو اُس نے ''اینوں ڈانگ دے دتی ہیگی''[1] تو یہ عقل ہے۔ آج بھی وہ جو جیب کاٹنے کے' چوری کرنے کے' اسمگل کرنے کے' دھوکا دینے کے' فریب کاری کے' ہزار طریقے سجھاتی ہے تو یہ سارا عقل کا کام ہوتا ہے۔ اسے عقلِ بے باک کہتے ہیں۔

یہ ہے عقلِ بے باک کہ جس کو قندیلِ آسمانی کی احتیاج ہر آن محسوس ہوگی

اس لیے یہ کہا ہے کہ یہ عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اِس قسم کی راہنمائی (حدود) متعین کردے۔ یہ تو ھدًی من اللہ ہے۔ یہاں آ کر ایک اِس قسم کے نظام کی ضرورت پڑی جو عقلِ انسانی کا تخلیق کردہ نہ ہو بلکہ جس فطرت نے حیوانات کے اوپر کنٹرول رکھا تھا اُسی خالقِ فطرت کی طرف سے اِس قسم کی چیز انسانوں کو ملے۔ وہ کنٹرول والی بات حیوانوں کی اپنی وضع کردہ نہیں ہوتی' وہ بھی تو وحیِ خداوندی ہوتی ہے' قرآن نے تو اُسے کہا ہی وحی ہے۔ اب جو اتباعِ اھــــوآء ہے' وہ دو قسم کا ہو گیا۔ ایک وہ جس میں کسی حدود اور قیود کا

---

[1] اسے لٹھ دے دی ہے۔

خیال ہی نہ رکھا جائے۔ دوسرا اھو آء کا' جذبات کا' Instincts کا' وہ اتباع جو حدودِ خداوندی کے تابع رہ کر کیا جائے۔

لفظ ھوٰہ کا قرآنی مفہوم

اب آیئے لفظ ھوٰہ کی طرف۔ عربی زبان کی بھی کیا بات ہے! ھوٰہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''ہر وہ شے جو پستی کی طرف لے جانی والی ہو''۔ اب آپ اس چیز پر غور کیجیے۔ اس کی جمع اھـــــو آء ہے۔ یعنی ہر وہ شے جو کسی کو پستی کی طرف لے جائے۔ قرآن انسان کو حیوانات سے بلندی کی طرف لایا ہے۔ اور اگر یہ انسان حیوانی جذبات کے تابع بلا حدود زندگی بسر کرنے لگ جائے تو اپنے مقامِ انسانیت سے گر کر نیچے آ جائے۔ اسے عربوں نے ھـــوٰہ کہا ہے۔ اس قوم کی بھی کیا بات ہے! آپ غور کیجیے کہ یہ حیوانات' چرند پرند' وہ سارے' اپنی Life (زندگی) کی' خواہشات کو یا اپنی Life (زندگی) کے تقاضوں کو' پورا کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ قرآن نے ان تقاضوں کو پورا کرنا جرم قرار دیا ہے یا معیوب قرار دیا ہے۔ حیوانات جس طرح سے اپنے تقاضے پورے کر رہے ہیں اُن کے متعلق کہا ہے کہ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ** (24:41) اُن کا ان تقاضوں کو پورا کرنا اُن کی صلوٰۃ ہے' اُن کی تسبیح ہے۔ کیا بات ہے! اور اگر انسان حیوانات کی طرح ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ اھوٰء ہے۔ یعنی یہ پستیوں کی طرف گر جاتا ہے۔

لفظ تسبیح کا قرآنی مفہوم

وہ حیوانات کی صلوٰۃ اور تسبیح کیوں ہے؟ اُس صلوٰۃ اور تسبیح کے متعلق یہ نہیں ہے کہ اُن کو کوئی کریڈٹ ملے گا۔ وہ اس لیے ہے کہ وہ جو فطرت یا خدا کی طرف سے جو حدود مقرر ہوئی تھیں تو وہ اُن حدود کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اِس لیے وہ اُن کی صلوٰۃ بھی ہے اور تسبیح بھی ہے۔ یعنی یہ قابلِ تحسین چیز ہے لیکن انسان کی صورت یہ ہے کہ اگر یہ حیوانات کی طرح اپنے ان Instincts یا جذبات کی تسکین کرتا ہے تو اِسے اس کی اھــو آء کہا گیا ہے۔ دیکھیے کہ کیا کیا باتیں قرآن کہتا ہے۔ سورۃ التین ہے۔ اگر ابتدائی الفاظ لاؤں گا تو بات آگے چلی جائے گی۔ کہا ہے کہ **وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ٥ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ٥ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ** (95:1-3)۔ ہمارے ہاں آپ ترجمے میں دیکھیے گا کہ ''قسم ہے انجیر کی' قسم ہے زیتون کی''۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے اسے یوں کہیں گے کہ ''دیکھو میں سچ کہناں مینوں زیتون دی سونہہ' مینوں انجیر دی سونہہ''۔ ❶

---

❶ دیکھو! میں سچ کہتا ہوں مجھے زیتون کی قسم' مجھے انجیر کی قسم۔

انسان کے لیے احسن تقویم کے مدارج کو برقرار رکھنے کا طریق

میں نے کہا ہے کہ اگر یہاں آ جاؤں گا تو بات دوسری طرف نکل جائے گی اور جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ کہا ہے کہ **لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ** (95:4) یہ جو ہم نے حیوانات سے اوپر لا کر اس کو انسانی پیکر دیا ہے تو یہ اس کی حسین ترین تقویم تھی، یہ حسین ترین امتزاج میں تھا۔ **ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ** (95:5)۔ اُس کے بعد کیفیت یہ ہوگئی یعنی وہی ھوٰہ والی بات ہوگئی، تو جب یہ اُن تقاضوں کو حیوانات کی طرح پورا کرتا ہے تو **اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ** (95:5) پست ترین درجے کے اوپر چلا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ **اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (95:6) وہ بچتے ہیں، وہ مقامِ انسانیت کے اوپر رہتے ہیں جو خدا کی طرف سے ہدایت یا جو حدود مقرر کی ہوئی ہیں اُن کی صداقت کا یقین رکھتے ہیں اور اُن کے مطابق اِن جذبات کی تسکین کرتے ہیں۔ **فَلَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ** (95:6) اِس زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک اجر ہے جو غیر منقطع ہے، ابد در کنار ہے، لامتناہی ہے کیونکہ زندگی تو آگے بھی چلی جاتی ہے۔

یہاں بتا دیا کہ یہ انسان جو موجودہ ہیئت کے اندر ہے، یہ کوئی قابلِ نفرت چیز نہیں ہے۔ اس کے اندر جو حیوانی جذبات ہیں، جو Instintcs (جبلتیں) ہیں جو زندگی کے تقاضے اِس کے اندر ہیں، یہ کوئی بُری بات نہیں ہے اور نہ اُن کا پورا کرنا بُری بات ہے لیکن شرط یہی ہے کہ اگر یہ ھدًی من اللہ کے تابع اُن کو پورا کرتا ہے تو اس کا مقام احسن تقویم کی مناسبت سے ہے۔ اگر اُس کو چھوڑتا ہے تو اھوآء کی طرح ہے، پستیوں کی طرف ہے، اسفل سٰفلین ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ کہا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ** (7:179) ایسے لوگ انسان نہیں حیوانات ہوتے ہیں۔ **بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ** (7:179) بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ حیوان تو حرام کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ایک اور مقام پہ اِس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہا ہے۔ اور یہ تو ہماری داستان ہے۔ کہ اے رسول! **وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ الَّذِیۡۤ اٰتَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا** (7:175) انہیں اُس شخص کی داستان سناؤ کہ ہم نے اُسے اِس قسم کی ہدایت دی، اِس قسم کی حدود دیں، اِس قسم کے قوانین دیئے۔ **فَانۡسَلَخَ مِنۡہَا** (7:175) وہ یوں اُس میں سے نکل گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور بیچ میں سے نکل جاتا ہے۔ اُس کا ذرا سا نشان بھی اُس کے اوپر باقی نہیں رہتا۔ ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔ وہ اُن کو یوں چھوڑ گیا کہ جیسے سانپ کینچلی میں سے نکل جاتا ہے۔ نتیجہ اُس کا کیا ہوا؟ یہ کہ **فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ** (7:175) جو اُس کے جذبات اور خواہشات تھیں، وہ اُن کے پیچھے لگ گیا۔ **فَکَانَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ** (7:175) پھر وہ راستہ بھولا اور تباہ ہوا۔ ہم نے اُس کو اپنے قوانین دیئے تھے۔ **وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِہَا** (7:176) ہم تو چاہتے تھے کہ وہ اِن قوانین کے اتباع سے بلندیوں اور رفعتوں کی طرف چلا

جائے۔ وَ لٰـکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ (7:176) لیکن وہ کم بخت اوپر سے گر کر زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک گیا' چمٹ گیا۔ یہ کیسے ہوا؟ یوں ہوا کہ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ (7:176) وہ ان جذبات کے ہی پیچھے لگ گیا اور پستیوں میں گر گیا۔ اس لیے فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ یَتَفَكَّرُوۡنَ (7:176) انہیں یہ کہانی سناؤ' شاید یہ غور کریں کہ یہ تو ہماری اپنی داستان ہے۔

معراجِ انسانیت تک پہنچنے والی اقدار کو وضع کرنا انسانی عقل سے ماوراہے

عزیزانِ من! نظریہ آیا کہ یہ جو قوانین ہیں' یہ جو حدود ہیں' یہ عقلِ انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ انسان کی عقل یہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ ایک فرد ہی نہیں بلکہ سارے پارلیمنٹ کے فرد ہی کیوں نہ اکٹھے ہو جائیں۔ عقل کی رو سے جرائم کے بند کرنے کی تدابیر سوچنے کے لیے ساری دنیا کے مفکر اکٹھے ہوئے ہیں لیکن کچھ نہیں بن سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو حدود آپ کہہ رہے ہیں' یہ جو ھدًی من اللہ ہے' یہ بھی تو بہر حال کچھ قوانین ہی ہیں' کچھ حدود ہی ہیں۔ ان سے یہ کیسے ہو جائے گا؟ تو پہلی شرط یہ ہے کہ ان الذین اٰمنوا قوانین ہم نے دیدیئے۔ یہ ان کے اوپر غور وفکر کرے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کوئی قوم جو یہ سوچے کہ کیا ہم نے اسی قسم کی زندگی بسر کرنی ہے یعنی تباہیوں کی زندگی' بربادیوں کی زندگی' مسلسل جہنم کی زندگی' یا اِس میں سے نکلنا ہے؟ تو پہلی شرط یہ ہے کہ سوچیں کہ ہم نے اس میں سے نکلنا ہے۔

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

پھر اگلی بات یہ ہے کہ وہ جو ہم نے ہدایات دی ہیں' Directives دیئے ہیں' حدود تجویز کی ہیں' انہیں غور وفکر' علم وبصیرت کی رو سے دیکھے اور پرکھے۔ اگر وہ یہ سمجھے کہ ہاں یہ ایسی ہیں جن سے اس مسئلے کا حل ہوتا ہے تو ان کی صداقت کے اوپر یقینِ کامل رکھیں۔ یہ پہلی شرط ہے۔ یہ Impose (خارج سے عائد کردہ) کی ہوئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح پیاسے کو پانی کا تقاضا اندر سے ابھرتا ہے' اسی طرح وہ ان کی صداقت کے اوپر خود یقین پیدا کرلیں۔ اور بطیبِ خاطر اپنے اختیار کو اس جبر کے تابع لے آئیں کہ ہاں ہم تیار ہیں۔ اِسے ایمان کہتے ہیں۔ یہ جو گروپ ہوگا' یہ وہ ہوگا جو ھدًی من اللہ کے ساتھ اتباعِ اھوآء کرے گا۔ کہا کہ چھوٹے سے پیمانے کے اوپر ہی کسی ایک گروپ کو اِس کے لیے تیار کرلو۔ جب اُس کے ہاں کے یہ سارے مسائل جس کے حل کرنے میں عقلِ انسانی یا اقوامِ عالم یوں ناکام رہے ہیں' اُن کے اندر وہ دیکھیں گے کہ یہ حل ہو رہے ہیں تو باقی خود اِس کی طرف چلے آئیں گے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ یہ چیز اگر ہے تو اِس سے یہ ایک امت' ایک گروپ وجود میں آئے گا۔ ایک گروہ! پھر سن لیجیے کہ بطیبِ خاطر وہ اِن کی صداقت کے اوپر ایمان لائیں گے۔ وہ بطیبِ خاطر اپنے آپ کو ان کے تابع رکھنے کا فیصلہ کریں گے۔

ایمان کی پختہ شعوری کے بغیر عمل صالح کا تصور ممکن ہی نہیں

یہ جبر نہیں ہوا۔ جبر سے تو اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ جو چیز ہے کہ ایمان ایمان ایمان' یہ قرآن کہے چلا جا رہا ہے۔ یہ عملِ صالح تو بعد میں آتا ہے۔ یہ ایمان کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ ایمان یہ ہے کہ اِن حدود' ان راہنمائیوں کو بطیبِ خاطر قبول کرے اور ان کو اختیار کرے۔ اور اِس طرح سے کرے کہ جب ان کے مطابق تمہاری کسی بات کا فیصلہ کیا جائے تو پھر اتنا ہی نہیں کہ وہ **وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** (4:65) اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے بلکہ **ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ** (4:65) اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف کوئی کدورت نہ پیدا ہو۔ یہ ہے وہ ایمان کا طریقہ۔ ان حدود کے مطابق جب وہاں فیصلہ ہو تو پھر دل میں بھی اُس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ ہے وہ ھدًی من اللہ. پھر سورۃ القصص ہے کہ **وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ** (28:50) اتباعِ اھوآء کرنا یعنی ہدایاتِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگ جانا' یہ حیوانی زندگی کی پست ترین سطح ہو گئی۔ پست ترین اس لیے کہ حیوان تو اُس کنٹرول کے تابع کرتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم نے اُس کو صلوٰۃ و تسبیح کہا ہے۔ جب انسان نے یہ اتباعِ اھوآء کر لیا تو وہ حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر آ گیا۔

زندگی کا حسین ترین ہو جانا چہ معنی؟

جب جذبات کو ہدایاتِ خداوندی کے تابع کیا تو پھر یہ نہیں ہے کہ وہ نفس کشی ہے' جذبات کشی ہے' ترکِ دنیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً** (2:201) تمہاری اِس دنیا کی زندگی بھی حسین ترین ہو جائے گی۔ قرآن نے یہ حسین کا لفظ بڑا ہی عجیب استعمال کیا ہے۔ وہ تو اچھے اور نیک اعمال کو بھی حُسنِ عمل کہتا ہے۔ زندگی کی خوشگواریوں کو بھی حسنات کہتا ہے۔ اور اس میں بھی بہت گہرائی کی چیز ہے جو اُس نے یہ کہا ہے۔ میں نے آپ کو کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ حُسن صحیح Proportion (تناسب) کو کہتے ہیں' صحیح توازن کو حُسن کہتے ہیں۔ غالباً یہ قول برنارڈ شاہ کا ہے کہ قلوپطرہ[1] جس کو دنیا کی حسین ترین کہا جاتا ہے' جس کے حسن نے قوموں اور بادشاہوں کو لڑا دیا تھا' اُس کے بارے میں اُس نے یہ کہا تھا کہ "قلوپطرہ کی ناک ذرا سی چپٹی ہوتی تو تاریخ کا رُخ کچھ اور ہوتا"۔ آنکھ کی جو سیاہی ہے' اُس کا سفیدی کے ساتھ ایک Proportion (تناسب) ہے۔ اگر وہ بال برابر بھی ذرا اِدھر ہو جائے تو آپ دیکھیے کہ بھینگا پن ہو جاتا ہے۔ کہا کہ **اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً** (2:20) اُس کی دنیا حسین ہو جائے گی۔ **وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (2:201) اگلی زندگی تو خود ہی حسین ہو جائے گی۔ اُس کے بعد یہ جتنے دنیاوی سامان ہیں' جن کے سہاروں پر زندگی زندہ رہتی ہے' آگے بڑھتی ہے'

---

[1] قلوپطرہ (Cleopatra vii: 69-30 BC)۔ ملکہ مصر (51-48bc, 47-30 bc) رہی۔

نشو ونما پاتی ہے' وہ سارے تقاضے جو حیوانات اپنے ہاں پورے کرتے ہیں' وہ سارے کے سارے اس کے لیے حلال وطیب ہو جاتے ہیں۔ مقصد بلندیوں اور رفعتوں کی طرف جانا ہوتا ہے۔ مقصود تو وہ ہوتا ہے لیکن یہ جو سہارے ہیں جن سے اِس دنیا کے اندر زندگی قائم ہوتی ہے' وہ بھی نہایت خوشگواری سے' حسین ترین انداز سے' اُس کو میسر آتے ہیں۔ حیوانی Instincts (جبلتوں) یا اھو آء کی تسکین نہایت حسین طریقے سے ہوتی ہے بشرطیکہ اِن کو بطیبِ خاطر' دل کی رضامندی' کے ساتھ ہدایاتِ خداوندی کے تابع رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو زندگی کے یہ تقاضے بھی دیئے۔ زندگی کے یہ تقاضے حرام نہیں ہیں۔ ان کی تسکین کے لیے جو سامان خدا نے پیدا کیا ہے' وہ شر نہیں ہے' وہ حرام نہیں ہے' شرط یہ ہے کہ ان کی تسکین ہدایاتِ خداوندی کے تابع ہو۔ وہ بھی ضروری چیز ہے۔

انسان کے لیے اس کرہ ارض کی زندگی جہانِ فردا کی پہلی کڑی ہے

اِس کرہ ارض کے اوپر یہ جو اگلی زندگی کا ارتقا ہے' اس کے لیے انسان کا یہ پیکر اُس ارتقائی زندگی کی پہلی کڑی ہے۔ وہ جو Physical Evolution (طبعی ارتقا) آ رہا تھا' وہ یہ ہے کہ اُس میں شاید یہ آخری کڑی ہو۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد اس میں کچھ اور بھی ہو جائے۔ بہرحال ابھی تو اُس کی یہ آخری کڑی ہے لیکن اس کے بعد جو زندگی کا Evolution (ارتقا) چلتا ہے تو وہ اس کی ذات کا Evolution (ارتقا) ہے۔ اُس کے لیے تو ابھی اِس کی ابتدا ہے۔ اس ابتدا میں یہ جتنی مادی زندگی اور طبعی زندگی ہے اور اِس کی یہ جتنی آسائشیں اور ضروریات ہیں' وہ اس کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ وہ کہنے والا[1] کیا کہہ گیا ہے۔

تو ہُما کا ہے شکاری' ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

(بالِ جبریل)

لیکن اِسی کا نہ ہو کر رہ جا۔

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو

تُو تو سدرہ کے شجرِ طیبؒ کی ایک شاخ ہے تُو باغ کا خس وخاشاک کیوں بن کر رہ جاتا ہے۔

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

منکرِ اُو اگر شوی، منکرِ خویشتن کم مشو ❶

اے بدقسمت! تُو اگر خدا کا منکر ہو گیا ہے تو بھی اپنی ذات کا منکر نہ ہو، اُس سے انکار نہ کر لیکن اسے یاد رکھ کہ یہ جو جہانِ مرغ و ماہی ہے، یہ نفرت کے قابل نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ مقصد یہ ہو کہ تو ہُما کا شکاری ہے۔ اس لیے زندگی کا بلند تریں نصب العین سامنے رکھ۔ ابھی تیری ابتدا ہے۔ یہ اس ابتدا کی پہلی کڑی ہے۔

نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

خدا تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق انسان کی موجودہ زندگی قابلِ نفرت شے نہیں

پھر وہی بات ہے کہ وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ❷ (28:50)۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ آگے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ❸ (28:50)۔ ان کو قوم ظالمین کہا ہے۔ یہ جو اھوآء یعنی Instincts ہیں ان کو قابلِ نفرت سمجھنا بھی ظلم ہے اور انہی کو بغیر حدود و قیود مقصودِ حیات سمجھ لینا بھی ظلم ہے۔ عدل ان کے بین بین ہے کہ انہیں خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کیا جائے۔ عزیزانِ من! یوں جرائم بند ہو سکتے ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ حدودِ خداوندی ہیں۔ عربی زبان کی رو سے حدود کے معنی Boundary Lines ہیں، Limitations ہیں۔ ان Limitations (حدود) کے اندر رہتے ہوئے، جنہیں انسان بطیبِ خاطر اپنے اوپر خود Impose کرتا ہے، جذبات کو پورا کیا جائے۔ لا اکراہ فی الدین (2:256) کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ زبردستی ٹھونسا نہیں جاتا۔ اگر کسی کے اوپر زبردستی ٹھونسا جائے تو وہ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ سب سے بڑا مسئلہ جرائم کے ختم کرنے کا ہے۔ اُس کی ابتدا کے لیے حقیقت یہ ہے کہ میرے جسم کے ہی تقاضے نہیں ہیں بلکہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، اُس کی نشوونما بھی میری زندگی کا تقاضا ہے۔

---

❶ حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کے منکر سے کہیں زیادہ کافر وہ ہے جو اپنی خودی (ذات) کا منکر ہے۔ دین کی ساری عمارت انسانی ذات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ جو شخص محض جسمانی زندگی (Physical life) ہی کو منتہی سمجھتا ہے، اس کا خدا پر ایمان لانا بے معنی ہے۔ خدا، وحی، رسالت، آخرت پر ایمان کی ضرورت ہی اس لیے پڑتی ہے کہ انسان اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ زندگی اسی جسم کی زندگی نہیں جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور مقصدِ زندگی اس کی نشوونما ہے۔

❷ جو شخص خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتا ہے، اُس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 896)۔

❸ اس قسم کے لوگ، جذبات اور ہدایت خداوندی کو اپنے اپنے مقام پہ نہیں رکھتے۔ ہدایت خداوندی سے بے اعتنائی برت کر جذبات کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کیسے مل سکتی ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 896)۔

جسمِ انسانی میں اسیر ''مرغِ جاں'' کی قدر و قیمت اور ذاتِ انسانی کے لیے حیاتِ جاوید کو اپنانے کا طریق

انسانی ذات اور جسم کی نشوونما اس طرح سے ہوتی ہے کہ یہ جو زندگی کے تقاضے ہیں' ان کی تسکین اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے' کی جائے۔ اِس طرح جسم اور ذات دونوں کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اگر اِن حدود و قیود کو چھوڑ دیا جائے اور زندگی کے تقاضوں کی بلا حدود تسکین کی جائے تو انسان کی زندگی حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ حیوانات تو پھر بھی مقرر کردہ حدود کے تابع رہتے ہیں لیکن اس انسان کی زندگی اُن سے بھی بدترین ہو جاتی ہے۔ یہ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ (95:5) کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور اگر زندگی کے ان تقاضوں کو ہی قابلِ نفرت سمجھا جائے تو مومن رہنا تو ایک طرف رہا' وہ تو زندہ انسان بھی نہیں رہتا' وہ مردہ ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من! جرائم اُس صورت میں ختم ہو سکتے ہیں جب ابتدا ہی سے آپ بچوں کی تعلیم اس طرح کریں کہ اُنہیں اس کا یقین ہو جائے کہ زندگی محض Physical Life (طبعی زندگی) نہیں ہے' حیوانی سطح کی زندگی نہیں ہے بلکہ اِس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو ان سے بلند تر ہے۔ اُس کی Development (نشوونما) زندگی کا مقصد ہے۔ اُس ''چیز'' کی نشوونما نہ تو Life (زندگی) کے طبعی تقاضوں کو چھوڑ کر ہو سکتی ہے اور نہ اُنہیں بلا حدود و قیود پورا کرنے سے ہو سکتی ہے اُن تقاضوں کو حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے پورا کرنے سے یہ دونوں مقاصد پورے ہو جاتے ہیں۔ ابتدا سے اُن بچوں کی تعلیم اس طرح سے کی جائے کہ اُن کی اپنی ذات کی نشوونما' ان کی زندگی کا اسی طرح سے تقاضا بن جائے جیسے زندگی کو محفوظ رکھنا اُن کی زندگی کا تقاضا ہوتا ہے۔ اِس طرح اُن کی تربیت کی جائے کہ ایک گروپ پیدا کیا جائے' ایک جماعت پیدا کی جائے' ایک قوم پیدا کی جائے۔ جب یہ گروپ' یہ جماعت' یہ قوم ہوگی اور اِن کا یہ ایمان ہوگا تو پھر اُن کے اوپر نہ پہرے بٹھانے کی ضرورت ہوگی' نہ اُن کو کسی قید و بند میں رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ تو اپنے اندرونی تقاضوں سے ان قوانین کا احترام کریں گے اور ان کی پابندی کریں گے۔

عزیزانِ من! ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جو پروگرام ہے وہ یہی تھا کہ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ (62:2) جو قوانینِ خداوندی ان کو دیئے جاتے تھے وہ اُنہوں نے بھی سمجھے ہوتے تھے اور وہ دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتے تھے۔ تو یہ ہیں وہ حدود و قیود جو مقرر کی گئی ہیں۔ کیا یہ کہہ دیا کہ تم میں سے جو ان حدود کی پابندی نہیں کریں گے اُن کو پھانسی چڑھا دیا جائے گا؟ نہیں بالکل نہیں بلکہ یہ کہا کہ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (62:2) پھر وہ رسول ان قوانین کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا فریضہ یہ بتایا گیا تھا' جس نے سب سے پہلے یہ طریق سکھایا کہ جرائم کیسے ختم ہوتے ہیں اور زندگی کی بلند منزلیں کیسے طے ہوتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی 13 سالہ مکی زندگی کی مصروفیات کا ماحصل

عزیزانِ من! قرآن بتاتا ہے کہ **وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ** (62:2) رسول اللہ ﷺ نے صرف قانون ہی کی تعلیم نہیں دی بلکہ **وَالْحِكْمَةَ** (62:2) وہ جو اس کا The why of it تھا کہ کیوں ایسا کیا گیا ہے' اس کا کیا نتیجہ نکلے گا' وہ بھی رسول کی زندگی ہے' وہ بھی انہوں نے بتایا۔ اور اگر یہ تاریخ میں صحیح ہے کہ وہ جو تیرہ سالہ آپ ﷺ کی مکے کی زندگی تھی' تو وہ یہی تعلیم تھی' دراصل وہ تعلیم کا دور تھا۔ یہ جماعت تیار ہوئی تھی' اور بطیبِ خاطر تیار ہوئی تھی۔ کوئی اکراہ نہیں تھا' کوئی جبر نہیں تھا اور اس طرح سے **وَیُزَكِّیْهِمْ** (62:2) وہ جو انسان کی ذات ہے' وہ تعلیم اُس کی نشوونما کا ذریعہ بنی تھی۔ اس طرح سے یہ جماعت تیار ہوئی تھی۔ پھر اُس کے بعد یوں کہیے کہ مدنی زندگی شروع ہوئی تھی تو وہاں جا کر ایک مملکت بنی تھی۔ وہاں جا کر یہ جو قوانین تھے پھر نافذ ہوئے تھے۔ تو نفوذ کے بعد جن کی زندگی کا تقاضا ان کا احترام ہو جائے تو اُن کے اوپر نہ ڈنڈے کی ضرورت تھی' نہ کسی پولیس کی ضرورت تھی۔

زاویہ نگاہ بدل جانے کے نتائج

حضرت ابوبکر صدیقؓ (573-634ء) کے زمانے (632-634ء) میں حضرت عمرؓ (581-44/45ء) کو اُنہوں نے مدینے کا مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ سال بھر کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ بابا! اس شعبے کو ختم کرو کیونکہ سال بھر میں میرے سامنے کوئی فوجداری مقدمہ ہی نہیں آیا۔ وہ آتا کیسے؟ یہ تو وہ تھے جنہوں نے بطیبِ خاطر اپنے اوپر ان حدود کو خود وارد کیا ہوا تھا۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کے چار الفاظ نے کتنے کتنے بڑے مسائل حل کر دیئے ہیں۔ یہ جو اتباعِ اھوآء بغیر حدودِ **من اللہ** ہے' اس سے ساری تباہیاں اور بربادیاں ہوتی ہیں۔

انسانی جذبات کو تباہ کیا ہی نہیں جا سکتا

اھوآء کے مار دینے اور ختم کر دینے کا یہ جو تصور چلا آ رہا تھا' اُس کو قرآنِ کریم نے باطل قرار دیا۔ یہ غلط ہے' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم یہ کر لو اور پھر زندہ بھی رہ سکو۔ اِس کو ختم کیا اور پھر فلسفے اور اخلاقیات کی دنیا میں یوں آئے کہ یہ شر (Evil) نہیں ہے۔ حیوانات کی مثال دے کر بتا دیا کہ وہاں ہم نے خود کنٹرول رکھا ہوا ہے۔ اُس کنٹرول کے تابع وہ زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ اُن کی صلوٰۃ و تسبیح ہے۔ او صلوٰۃ کو نمازیں اور تسبیح کو یہ کچھ کہنے والو! سنو وہ کیا کہتا ہے؟ ان حدود اللہ سے کنٹرول کے تابع انسانی جذبات یا زندگی کے ان تقاضوں کو پورا کرنا' **صلوۃ و تسبیح** ہے اور تمہارے لیے یہ حدود ہم وحی کے ذریعے سے دیں گے۔ ہم از خود کنٹرول نہیں عائد کر رہے کیونکہ یہ تمہاری انسانیت کے شرف کے خلاف ہے۔ یہ خدا کی طرف سے شرفِ انسانیت کا احترام ہے کہ اُس نے انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا۔ یہ خدا کی حدود کو اپنے

اوپر بطیبِ خاطر عائد کرتا ہے۔ اِس کو جبر نہیں کہتے۔ یہ جبر نہیں ہوتا کہ آپ صبح کو اٹھ کر تین میل تک سیر کے لیے جاتے ہیں۔ یہ جبر نہیں ہے۔ جبر یہ ہے کہ تھانے والا کہتا ہے کہ روز صبح آ کر یہاں حاضری لگواؤ' خواہ وہ دس قدم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جبر ہے۔ قرآن نے یہ چیز حل کر کے رکھ دی کہ اپنے اوپر یہ حدود خود عائد کرو۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں' مکمل ہیں' محفوظ ہیں۔

نظامِ مصطفیٰ کی اصطلاح کے بجائے نظامِ خداوندی یا حکومت الٰہیہ کے الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے

عزیزانِ من! جسے آپ اگر آج نظامِ مصطفیٰ ﷺ کہنا چاہتے ہیں تو وہ یہ ہے۔ میں اس اصطلاح کے متعلق بھی واضح کر دوں کہ اگر نظام دین کے مرادف یہ لفظ لیا گیا ہے تو وہ دین کسی نبی کا نہیں ہوتا بلکہ خدا نے ہمیشہ دین اللہ کہا ہے۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول اُس دین کو دوسروں کی طرف پہنچاتا ہے اور اُس دین کو اپنے ماحول کے تقاضوں کے مطابق قائم کرتا ہے' متشکل کرتا ہے۔ لہٰذا اگر اِسے دین کہنا ہے تو پھر صرف نظامِ خداوندی کہا جائے گا' دین اللہ کہا جائے گا لیکن اگر دین کے معنی خدا کی مقرر کردہ حدود کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنا ہے تو اِسے اسلامی نظام کہہ لیجیے۔ اس کو سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے متشکل فرمایا تھا۔ ان معنی میں آپ اِس کو نظامِ مصطفیٰ ﷺ کہہ سکتے ہو لیکن نظامِ خداوندی ہی کہنا چاہیے تاکہ کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہ ہو۔ بہر حال یہ ہے وہ نظامِ خداوندی' نظامِ اسلامی' نظامِ مصطفیٰ ﷺ جس میں قوم کی تعلیم اور تربیت اس طرح سے کی جائے کہ یہ جو خدا کی حدود مقرر کی ہوئی ہیں' ان حدود کے تابع رہنا' ان کی زندگی کا اندرونی تقاضا ہو جائے۔ یہ تعلیم و تربیت کی رو سے ہوگا۔ پھر اس معاشرے کا نام' اس نظام کا نام ''نظامِ خداوندی' اسلامی نظام' یا نظامِ مصطفیٰ ﷺ'' قرار پائے گا۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو یہ جو چیزیں ہیں یہ اوپر سے Super Impose (خارج سے عائد) نہ تو رسول اللہ ﷺ نے کی تھیں' نہ خدا کا یہ منشا تھا اور نہ ہی ان کے وہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اندر کا تقاضا ہے۔

عزیزانِ من! آیت تو ہم نے ایک ہی لی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنی اہم تھی کہ شاید اس سے بھی زیادہ درسوں کی ضرورت پڑتی لیکن میرا خیال ہے کہ آپ احباب نے اس توجہ سے اس کو سنا ہے کہ یہ چیزیں آپ کے ذہن کے اندر صاف ہو گئی ہونگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی صاف ہو گئی ہونگی کہ یہ اخلاق جو جذباتِ انسانی کا مسئلہ تھا' اس میں اُن جذبات کا مقام کیا ہے' اُن کی تسکین کیسے کرنی چاہیے' اور اُس کے بعد یہ بھی جو آپ کے ہاں دنیا میں جرائم کا مسئلہ عام ہو گیا' تو وہ جرائم کیسے ختم ہو سکتے ہیں؟ قرآن نے یہ مسائل چار لفظوں میں حل کر دیا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀❀............❀❀............❀❀

نواں باب :سورۃ القصص (آیات 51 تا 56)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥١﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ
يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿٥٣﴾ أُولَٰئِكَ
يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٥٤﴾ وَإِذَا
سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي
الْجَاهِلِينَ ﴿٥٥﴾ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1979ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 51 سے ہو رہا ہے:((28:51۔

وحی کی طرف سے عطا کردہ اصولِ حیات' ازل سے ابد تک ایک ہی رہے ہیں

سابقہ درس میں یہ نکتہ سامنے آیا تھا کہ جہاں تک دین کے اصولوں کا تعلق ہے وہ شروع سے آخر تک ایک ہی رہے ہیں' ایک ہی چلے آ رہے تھے۔ یہ اصول غیر متبدل ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کو جس جس انداز سے مختلف انبیائے کرامؑ نے اپنے اپنے زمانے میں Implement (نافذ) کیا' ان پر عملدر آمد کیا' ان کے مطابق معاشرے میں ایک نظام متشکل کیا' وہ اُن حالات کے مطابق تھا اور دوسرے نبی کے زمانے میں آ کر اُن میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں لیکن اصول کے اعتبار سے دین شروع سے آخر تک ایک ہی چلا آ رہا تھا۔ اسی کے متعلق پیشِ نظر آیت میں جہاں سے درس کا آغاز ہوتا ہے' کہا گیا کہ **وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ** ((28:51۔ یہ ان کی پہلی کتابیں جو تورات یا انجیل تھیں ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ محرف کتابیں تھیں' اُن میں تحریف کی گئی تھی' کئی حصے فراموش ہو چکے تھے۔ بایں ہمہ اُن میں کہیں کہیں ایسی چمکدار چیزیں موجود ہیں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں بھی اُن میں یہ چیزیں موجود ہونگی' جن سے نظر آتا ہے کہ واقعی یہ جو حصے ہیں' یہ خدا کی طرف سے منزل من اللہ ہی ہو سکتے ہیں' یہ کسی انسان کی فکر نہیں

کی فکر نہیں ہوسکتی۔ یعنی اُن میں بھی وہ ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے ہیں جو صداقت پر مبنی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ اہلِ کتاب بھی جو اِن چیزوں کو مانتے ہیں، وہ بھی اگر ضد پہ نہیں آ جائیں گے، تعصب نہیں ہوگا، فرقہ بندی نہیں ہوگی، گروہ سازی نہیں ہوگی، اور ذرا نظر کی کشادہ سے اس چیز پہ غور کریں گے تو اُنہیں نظر آ جائے گا کہ اصول کے اعتبار سے یہ وہی دین ہے جو اس سے پیشتر ان کے انبیائے کرام کو دیا جاتا رہا۔ اس لیے کہا کہ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِہٖ ہُمۡ بِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ (28:52) وہ اگر اس نقطہءِ نگاہ سے اس قرآن کا مطالعہ کریں گے اس پر غور وفکر کریں گے تو وہ یقیناً اس حقیقت کو تسلیم کر لیں گے کہ اس کتاب کا سرچشمہ بھی وہی ہے جو اُن کے ہاں کے انبیائے کرام کی طرف جو اصلی کتابیں نازل ہوئیں تھی، اُن کا سرچشمہ تھا۔ یعنی علمِ خداوندی، خدا کی طرف سے وحی، تو یہ تسلیم کر لیں گے بشرطیکہ وہ خالی الذہن ہو کر اس قرآن پہ غور وفکر کریں۔ پھر اُن کی کیفیت یہ ہوگی کہ وَ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖۤ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلِہٖ مُسۡلِمِیۡنَ (28:53) وہ کہہ دیں گے کہ ہم تو پہلے ہی اس قسم کی صداقتوں کے متعلق دل میں یہ سوچے ہوئے تھے کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔ ہم تو ان صداقتوں کے سامنے پہلے ہی سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ اب بات ہمارے سامنے آ گئی ہے کہ ان کتابوں کے اندر جو کچھ ایسا ہے جو قابلِ تسلیم نہیں تھا تو وہ خدا کی طرف سے نہیں تھا بلکہ وہ انسانوں کی آمیزش تھی، تحریف تھی جو اُس میں کی گئی تھی۔ اور اب یہ کتاب واقعی ان آمیزشوں کو الگ کر کے اُن سے منزہ اور مبرا حقیقی شکل میں دین کی صورت لیے ہوئے ہمارے سامنے آ گیا ہے اور وہ اُس کے اوپر ایمان لائیں گے۔

اہلِ مذاہب میں سے ایمان لانے والوں کو دہرا اجر دیا جائے گا

آگے ایک چیز ہے جو بڑی اہم ہے۔ کہا کہ اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا (28:54)۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ ایمان تو اِس قرآن پہ وہ بھی لائے جو اس سے پیشتر کسی کتاب کے ماننے والے نہیں تھے۔ یوں کہہ لیجیے کہ جو اہلِ کتاب نہیں تھے، کسی مذہب سے متعلق نہیں تھے۔ آج کی اصطلاح میں کہہ لیجیے کہ جو سیکولرزم (Secularism) کے قائل تھے لیکن یہ وہ لوگ تھے جو اس سے پہلے کسی نہ کسی مذہب سے متعلق تھے، یہ اس پہ ایمان لائے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کو دہرا اجر ملے گا اور آگے ہے کہ بِمَا صَبَرُوۡا (28:54) اس بنا پر کہ انہوں نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ان کے معاملے میں کونسی ایسی مشکل آ پڑی جو انہیں صبر اور استقامت کا ثبوت دینا پڑا۔ انہوں نے مخالفتوں کو بڑی پامردگی سے برداشت کیا، ان تلاطم انگیز موجوں کا مقابلہ کیا۔ اس بنا پہ انہیں ان کے ایمان لانے کا دہرا اجر دیا جائے گا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے۔ کوئی شخص جو پہلے سے کسی مذہب سے متعلق نہیں ہے اُس سے آپ گفتگو کیجیے تو وہ اُس بات کو آن میرٹ لے گا۔ دلیل سے، برہان سے، Reason سے، Rationally اُس کو Explain

کیجیے اور اگر وہ پہلے سے ذہنی طور پر کسی مذہب سے متعلق نہ ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ چیز جو پیش کی جا رہی ہے اگر وہ عقل و فکر‘ دلیل و برہان کے معیار پہ پوری اترتی ہے تو وہ نہایت آسانی سے اُسے قبول کر لے گا اور یہ بھی کہ اُسے اِس قبول کرنے کے لیے کسی قسم کی مصیبتیں مشقتیں نہیں اٹھانا پڑیں گی۔

مذہب کی تبدیلی کے باعث پیش آنے والی اذیت ناکیاں

جو شخص کسی مذہب سے متعلق ہے اُس مذہب کو چھوڑ کر اگر وہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے‘ تو اُس نے اُسی معاشرے میں رہنا ہے‘ وہی اُس کی سوسائٹی ہے‘ وہی لوگ ہیں جن کے اندر اُس نے زندگی بسر کی اور اُس کے بعد بھی زندگی بسر کرنا ہے۔ آپ سوچیے کہ اُن کی طرف سے اِس کی کس قدر شدید مخالفت ہوگی۔ یہ تو ایک پورے کا پورا مذہب بدل لینا ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ اگر یہاں کوئی شخص کسی ایسی مسجد میں نماز پڑھتا ہے جہاں ہاتھ اوپر باندھے جاتے ہیں اور اُس کے بعد کسی وقت کوئی دیکھتا ہے کہ اُس نے ہاتھ نیچے باندھ لیے ہیں تو پھر پوچھیے نہیں کہ اُس کی وہاں کیا درگت بنتی ہے‘ اُس کے ساتھ ہوتا کیا کچھ ہے۔ معاشرہ وہی ہے جس کے اندر اُس نے رہنا ہے‘ اُس کے روابط ہیں‘ تعلقات ہیں‘ رشتہ داریاں بھی ہیں اور اگر وہ ذرا سی بھی عقیدے یا مسلک کی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور پھر یہ تو پورے کا پورا مذہب بدلنا ہے‘ اُسی مذہب میں رہتے ہوئے جن کے اندر پہلے اُس نے زندگی بسر کی ہوئی ہے‘ مسلمان رہتے ہوئے ہی اگر وہ اُن لوگوں کے عقیدے اور مسلک سے ذرا سا بھی اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرتا ہے تو اُس کے بعد آپ سوچیے کہ اُس کا حشر کیا ہوتا ہے یہ دور تو پھر ایسا ہے کہ اس دور کے اندر کچھ زیادہ وسعتیں ہیں۔ لوگوں کو قانون کے بھی کچھ تحفظات حاصل ہوتے ہیں‘ جس کی وجہ سے اُس کے ساتھ کچھ شدت کے ساتھ ردِعمل نہیں ہوتا لیکن جس زمانے میں یہ چیز بھی نہ ہو اور وہاں اگر کوئی شخص اپنا پورے کا پورا سابقہ مذہب چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لیتا ہے تو سوچیے کہ اُس کو کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔

قتلِ مرتد کے فتویٰ کی پیدا کردہ مشکلات

یہاں اب ہمارے ہاں بھی جیسے یہ ایک ایک مسلمہ چلا آ رہا ہے یا ہمارے ہاں کے اہلِ مذہب مسلمان بھی جو کہتے ہیں کہ مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے یعنی اگر کوئی مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے تو اِن کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ واجب القتل ہے‘ اُسے قتل کر دینا چاہیے۔ اب اِس کے بعد کوئی کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ اِس مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے خواہ اُس کا دل اِس کے اوپر نہ ہی ٹکتا ہو۔ یہ جو چیز ہے کہ اگرچہ کوئی اہلِ مذہب کسی دوسری جگہ صداقت کو دیکھتا بھی ہے تو وہ ہمت نہیں کر سکتا کہ اُسے قبول کرے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ اِس کے بعد میرا حشر کیا ہوگا۔ لہٰذا کوئی شخص جو پہلے سے کسی خاص گروہ کے ساتھ متمسک ہے‘ اہلِ مذاہب میں سے ہے‘

کوئی خاص مذہب رکھتا ہے' عقیدہ رکھتا ہے' مسلک رکھتا ہے' اگر وہ اُسے چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک یا عقیدہ اختیار کرتا ہے تو اُسے بڑی بڑی سخت مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اگر وہ پامردی سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے تو اب آپ یہاں قرآن کا اندازہ لگائیے کہ اُسے اِس کا دہرا اجر ملتا ہے۔ صداقت کا قبول کر لینا ہی باعثِ اجر ہے اور پھر اِس قبول کرنے کے بعد اس کے عواقب اور نتائج کو پامردی' ہمت' استقامت اور استقلال سے برداشت کرنا' یہ ایک دوسری چیز ہے جس کے لیے اُسے واقعی اجر ملنا چاہیے۔ تو اُسے دہرا اجر ملتا ہے۔

عزیزانِ من! ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا تو ایک طرف رہا' ہمارے ہاں کے مذہب اسلام کے اندر' اسلام تو اب مذہب بن چکا ہوا ہے' دین تو نہیں رہا' جنہیں مسلمہ عقائد کہا جاتا ہے' جنہیں جمہور کا مذہب کہا جاتا ہے' آج کل کی اصطلاح میں جس کو سوادِ اعظم بھی کہتے ہیں' تو اگر کوئی ان سے ذرا سا اختلاف کر کے کوئی اور عقیدہ' کوئی اور نظریہ' کوئی اور مسلک قبول کر لیتا ہے تو پھر پوچھیے نہیں کہ اُس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ آج اِس دور کی یہ کیفیت ہے۔ اور ابھی اُس نے مذہب نہیں چھوڑا بلکہ اُن کے عقیدے سے اُس نے اختلاف کیا ہے تو اُسے معاشرے میں نکو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ شخص Wet paint (چکنا گھڑا) بن جاتا ہے' کوئی اُس کا نام سننا گوارہ نہیں کرتا۔ اس کے لیے واقعی بڑی ہمت کی ضرورت ہے کہ آدمی اس طرح صداقت قبول کرے اور پھر اُس کے اوپر جم کر کھڑا ہو۔ اب اس سے آپ دیکھیے کہ قرآن کتنی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔

اہلِ قریش کے لیے ایمان لانا کوئی اتنا مشکل نہ تھا

وہ جو قریش تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا' اُنہیں اس قسم کی کوئی مشکل نہیں پڑی کیونکہ وہ اہلِ مذہب نہیں تھے' وہ کسی خاص گروہ سے متعلق ہی نہیں تھے۔ اُنہوں نے اگر مخالفت کی تھی تو وہ سیاسی مخالفت تھی' وہ مذہب کی بنا پہ نہیں تھی۔

مذہب سے دین کی طرف رجوع کرنا ایک کٹھن منزل ہے

مذہب کی بنا پہ مخالفت تو اہلِ مذاہب یہودی یا نصاریٰ وغیرہ کی طرف سے ہوئی تھی بالخصوص یہودیوں نے تو ان میں سے اگر کوئی اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسری طرف آئے تو وہ جو پہلا گروہ جس کے اندر اُس نے زندگی بسر کی تھی' اُس کی طرف سے اِس کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ یہ وجہ ہے جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ وہ لوگ جو کسی بھی مذہب کے پیرا ہوں' وہ دین کی طرف بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ اُن کے دل میں یہ عقیدہ جاگزیں ہوتا ہے کہ جس عقیدے اور مسلک کے اوپر ہم ہیں یہی حق کا مسلک ہے اور اُس کے سوا باقی تمام مسالک جتنے بھی ہیں وہ باطل ہیں خواہ وہ عقائد کے ہوں خواہ وہ مسلک کے ہوں۔ اور دوسری چیز ایک اور بھی ہے کہ وہ ایک ایسی برادری کے اندر جُڑے ہوئے ہوتے ہیں جو اِسے برداشت ہی نہیں کرتی کہ وہ شخص اُن عقائد سے جو اُن کے ہاں مسلمہ چلے آ رہے ہیں کوئی بھی تبدیلی

اختیار کرے۔ وہ اِسے برداشت نہیں کر سکتے اور اِس کی بڑی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو اہلِ مذاہب ہیں' میں اہلِ کتاب کی جگہ آج اہلِ مذاہب کہونگا' یہ دین کی طرف بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ایک تو انفرادی طور پہ وہ پہلے سے اُس کے اوپر مطمئن ہوتے ہیں کہ جو کچھ اُن کے پاس ہوتا ہے وہ صحیح ہے: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ❶ (30:32)۔ ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا تو بڑی چیز ہے چہ جائیکہ آپ کے ہاں جو مختلف فرقے ہیں ان میں سے ایک فرقے کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف جانے والے کے متعلق پوچھیے۔ پھر نہ پوچھیے کہ اُس کے ساتھ کیا حشر ہوتا ہے۔ اُس فرقے کے اندر رہتے ہوئے ذرا سا اُن مسلمہ عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن نے شرط عائد کی ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256) حق اور صداقت پہ آنے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ جو کچھ غلط اور باطل ہے اُس سے کفر اختیار کرے۔ یہ دو Stages (مراحل) ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے اُس سے انکار کرے کہ یہ غلط ہے' یہ باطل ہے۔ اُس کے انکار کرنے سے اِس کی سلیٹ (لوح) صاف ہو جائے گی اور دوسری یہ ہے کہ قلب ونگاہ پاکیزہ ہو۔

قرآنِ حکیم کی ایک آیت کا غلط مفہوم

قرآن کے متعلق یہ جو ہے کہ جو مطہرین (56:79) ہیں وہی اِس سے تمسک کر سکتے ہیں۔ عام طور پہ تو اِس کے معنی یہ لیے گئے کہ وہ جو غسل کر کے' وضو کر کے' پاک صاف کپڑوں کے ساتھ' قرآن کو پڑھے تو وہ حاصل کر سکتا ہے۔ اصل میں وہ یہ چیز ہے کہ قلب و دماغ کو' پہلے خیالات سے' بالکل مبرا اور پاکیزہ کرنا ہوگا۔

زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے کی خاطر انسان کو کئی ایک کٹھن منازل سے گزرنا ہوگا

آپ کو ان پہلے سے آنے والے خیالات کو الگ کرنا پڑے گا۔ یہ دو چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کعبے کے دروازے کے اندر قدم اُس وقت رکھا تھا جب اُس کے اندر کے بت باہر نکال دیئے تھے کیونکہ دو چیزیں تو بیک وقت اُس کے اندر جا نہیں سکتی تھیں۔ بُت اور خدائے واحد بیک وقت ایک جگہ نہیں جا سکتے۔ آپ کو پہلے وہ غلط چیز جس کو آپ نے علی وجہ البصیرت غلط سمجھ لیا ہے' اُس سے' جرأت سے انکار کرنا پڑے گا' اُس کو چھوڑنا پڑے گا۔ بڑے سخت Consequences (نتائج) بھی برداشت کرنے پڑیں گے' بڑے سخت نتائج اور عواقب برداشت کرنے پڑیں گے' لیکن اگر آپ اُس کے متعلق Convince (قلب ونگاہ سے مانتے)

---

❶ ہر فرقہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

ہیں' آپ کو قلب و دماغ کی رو سے اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ سچائی یہی ہے' تو سوچ لیجیے گا کہ اُسے اختیار کرنے سے آپ کو کتنی مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اگر آپ اِس کے لیے تیار ہیں تو پھر اس کے اندر داخل ہونے کا وہ Process (عمل) ہے جو قرآن نے کہا ہے:

یہ شہادت گہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مسلمان ہونے کے لیے پہلے ہر غیر قرآنی تصور' نظریئے' مسلک' خیال' ہر چیز' سے کفر برتنا پڑے گا' انکار کرنا پڑے گا' اُس کو چھوڑنا پڑے گا' تو پھر آپ اِدھر آئیں گے اس لیے کہ

یہ شہادت گہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے

یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس کا دہرا اجر ملے گا۔ یہ قریش کے اسلام لانے کے اوپر نہیں کہا کہ اُن کو دہرا اجر ملے گا بلکہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (28:52) یہ جو اہلِ مذاہب ہیں' یہ اگر اِس طرف آئیں گے' اس پر ایمان لائیں گے تو انہیں دہرا اجر ملے گا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو قرآن ہے۔ اس نے بتا دیا کہ اِن کو دہرا اجر کیوں ملے گا کیونکہ بِمَا صَبَرُوْا (28:54) یہ مستقل مزاج رہیں گے۔ ذہن میں نہیں آتا کہ اِن کو کیا مصیبت پڑ جائے گی' کیوں اِن کے خلاف مخالفتیں اتنی شدت اختیار کر لیں گی کہ اِن کو مستقل مزاج رہنا پڑے گا۔ یہ اہلِ مذاہب کے متعلق کہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جو قرآن بیان کر گیا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے آج بھی اگر کوئی شخص اُس کو علیٰ وجہ البصیرت اور قرآن کی سند اور دلیل کے مطابق سمجھتا ہے کہ غلط ہے اور جو کچھ قرآنِ عظیم (دین) کہتا ہے اُس کی صداقت پہ اُس کا دل ٹک گیا ہے' اُسے یقین ہو گیا ہے' اطمینان ہو گیا ہے تو اُسے یہ سوچ لینا چاہیے کہ اُسے چھوڑ کر قرآن کی طرف آنے کے بعد دنیا بھر کی مخالفت مول لینی ہو گی۔ یہ ہے بِمَا صَبَرُوْا۔ اسے اگر جھیل گیا تو قرآن کے الفاظ میں یا اللہ تعالیٰ کی اِس ضمانت کے اعتبار سے' اُسے دہرا اجر ملے گا۔

سخت ترین مخالفت کے باوجود بلند اقدار کی پاسداری کا تصور

تو اب بِمَا صَبَرُوْا کے بعد آپ سوچیے کہ اُس کے اندر پھر کیا کیفیت ہونی چاہیے' اِن مخالفتوں کا مقابلہ کیسے کرنا ہو گا؟ اب اُدھر سے نکل آئے ہیں تو وہ تو اِس کی مخالفت میں اور اسے واپس لانے میں ہر حربہ استعمال کریں گے۔ وہ کفر پہ ہیں' باطل پہ ہیں۔ اس نے صداقت کو اختیار کیا ہے یہ تو مخالفت میں اب ہر حربہ استعمال نہیں کر سکتا۔ اس کے اندر پہلی تبدیلی یہی آنی ہے کہ اِس نے مخالفت میں بھی حق کو نہیں چھوڑنا۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا (5:8) کوئی قوم کتنی ہی تمہاری دشمن کیوں نہ ہو اگر اُس کا بھی معاملہ آن پڑے تو عدل کو ہاتھ سے نہ چھوڑو' اُس کے ساتھ بھی عدل کرو۔ قرآن دشمن کے ساتھ عدل کرنا سکھاتا ہے۔ یہ اُن

جیسے حربے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تو پھر یہ کیا کریں گے؟

تخریبی سوچ کا مقابلہ تعمیری عمل سے

قرآن کریم نے کہا کہ وَ يَدْرَءُ وْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (28:54) وہ جتنی چیزیں برائیوں کی کریں گے وہ ان کا مقابلہ حسنات سے کرے گا۔ اپنی بلندیٔ کردار سے اُس کا مقابلہ کرے گا۔ وہ تخریبی کارروائیاں کریں گے یہ اُتنی ہی تعمیری کارروائیاں کرے گا۔ سیئۃ کا جواب سیئۃ سے نہیں دے گا۔ یہ تو جب باطل میں تھا' یہ تو اُس زمانے کی باتیں ہیں۔ اِس نے تو وہ راستہ' وہ گاؤں جو اُس کی منزل تھی' اُس کو اُس نے ترک کر دیا ہے تو یہ کیسے وہی راستہ اختیار کرے گا۔ وہ راستہ ساتھ ہی اُسی وقت اِس کو چھوڑنا پڑے گا۔ راستہ تو Means (ذرائع) ہوتے ہیں۔

غلط راستے پر چلنے والا کبھی صحیح راستے پر نہیں پہنچ سکتا

اِن کے ہاں تو یہ ہے کہ .Means are justified by the end achieved یعنی طریقے کوئی بھی اختیار کر وا گر اُن سے کامیابی ہوتی ہے تو وہ سب طریقے جائز قرار پا جاتے ہیں۔ جس طریقے سے کامیابی ہوتی ہے وہ جائز ہے۔ یہ کفر کا' باطل کا' دورِ حاضر کی سیاست کا مسلک ہے کہ کوئی طریقہ اختیار کر و اگر اُس سے کامیابی ہوتی ہے تو وہ سب طریقے جائز ہیں جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل اور راستے میں فرق نہیں ہو سکتا۔ غلط راستہ صحیح منزل پہ پہنچا ہی نہیں سکتا۔ غلط Means (ذرائع) کا End (ماحصل) بھی غلط ہوگا۔ قرآن نے یہ بڑی عظیم چیز کہی ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ وہ اِن کی سیئۃ کا مقابلہ حسنات کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پہ ہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) اگر سیات (ناہمواریوں) کو دور کرنا چاہتے ہو تو ہمواریاں پیدا کرو۔ اگر تم نے اور بھی ناہمواراں پیدا کر دیں تو پھر ناہمواریاں کیسے دور ہونگی۔ اِن کو حسنات سے دور کرو۔

قرآنی سیاست کا ایک سنہری اصول: تنگ نظری کی بجائے فراخ دلی کا عمل

عزیزانِ من! یہ ہے جسے آپ اسلامی سیاست کہہ سکتے ہیں کہ سیئات کو حسنات سے دور کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (28:54) اور پھر جو کچھ اُنہیں ملتا ہے اُسے نوعِ انسانی کی نشوونما' منفعت' مفاد کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ اِن میں تنگ نظری نہیں ہوتی۔ اِن لوگوں کے ہاں ظرف میں کشادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اُس گروہ کو چھوڑ کر الگ ہوئے ہیں جو ہر قسم کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن نے یہ بیان کیا کہ بِمَا صَبَرُوْا (28:54) یہ بما صبروا کی تفسیر بیان ہو رہی ہے کہ کیا بات تھی جس کے لیے اِن کو اتنی ہمت اور صبر سے' استقامت اور استقلال سے' کھڑا ہونا پڑا تھا۔ یہ وہ چیز تھی کہ مخالفتیں ہو

رہی ہیں لیکن پتھر کا جواب پتھر سے نہیں دیا جا رہا' گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا جا رہا۔ بلکہ سیّئات کا جواب حسنات سے دے رہا ہے۔ اِس میں تنگ نظری بھی نہیں ہے کہ اگر تم اُن کی پہلے کچھ مدد کرتے تھے تو اب تم اپنا ہاتھ روک لو۔ وہاں تو یہ ہے کہ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (28:55) مخالفین کے ہاں جتنی باتیں ہونگی وہ لغویات کی ہونگی۔ وہ ان سے اعراض برتے گا۔

لفظ لغو کا قرآنی مفہوم

لغو کے معنی ہمارے ہاں تو کچھ ایسے ہی ہے کہ جیسے کچھ لغوسی بات کہہ دینا ہے۔ عرب اُن باتوں کو بھی جو بے معنی ہوں' جو بے مقصد ہوں' لغو کہتے تھے۔ ''چڑیوں کا یا پرندوں کا اس طرح چیں چیں کرنا یعنی آواز ہو لیکن اُس کے معنی آپ کے ذہن میں کچھ نہ آئیں'' تو وہ بھی عربوں کے ہاں لغو ہوتا تھا۔ یہ عجیب قوم تھی۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ انہوں نے یہ معنی کہاں سے لیے اور اس لفظ کا مادہ کیا ہوا؟ جب باتیں کرنے میں رال ٹپکتی ہے تو آپ نے دیکھا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوتا ہے' اُس کی باتیں کیسی ہوتی ہیں۔ یہ بچوں کے رال ٹپکتی ہے۔ اِس لفظ کی بنیاد عربوں کے ہاں یہ تھی کہ اِس قسم کی باتیں کرنے والا کہ باتیں کرے اور منہ سے رال ٹپک رہی ہو۔ یہ لغو بڑا جامع لفظ ہے یعنی بے معنی' بے مقصد باتیں' ایسی چیزیں جس میں Reason نہ ہو' دلیل نہ ہو۔ کہا کہ جب اُدھر سے اِس قسم کی چیزیں آئیں گی تو اِس کے پاس ان لغویات کا یا ان باتوں کا کیا جواب ہوگا کہ جو سننے کے لیے ہی تیار نہیں ہے۔ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (28:55) وہ یہ کرے گا کہ اُس سے اعراض برتے گا۔

قانونِ مکافاتِ عمل خود نتیجہ مرتب کر دے گا

دوسری جگہ ہے کہ جب وہ اِس کے پاس سے گزرتے ہیں تو وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (25:72)۔ اگر راستے میں کہیں کوڑا کرکٹ آ جاتا ہے تو وہ اُس کے پاس سے ناک کو بند کر کے شریفانہ گزر جاتا ہے۔ کوڑے کرکٹ کی گاڑی کے ساتھ الجھتے نہیں ہیں۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (25:72) اگر اُنہیں اتفاق سے لغو کے پاس سے گزرنا پڑے تو وہ شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ اُس سے الجھتے اور جھگڑتے نہیں ہیں۔ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (28:55) اُن سے کہتے ہیں کہ بابا! جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اُس کے نتائج تمہیں بھگتنے پڑیں گے۔ اور جو کچھ میں کر رہا ہوں اِس کے نتائج مجھے بھگتنے پڑیں گے۔ تو تم خوامخواہ مجھ سے کیوں اُلجھتے ہو۔ میں جو کر رہا ہوں اُس کے نتائج مجھے بھگتنے پڑیں گے' وہ تمہیں نہیں بھگتنے پڑیں گے۔ ''تُسی ایویں چاچے لگدے او وچ خوامخواہ''؟ [1] یہ بڑی اہم بات ہے کہ جس کام کا نتیجہ مجھے ہی بھگتنا پڑے گا وہ تمہیں نہیں بھگتنا پڑے گا تو تم

---

[1] کیا تم خواہ مخواہ بیچ میں چچا لگتے ہو (جو الجھ رہے ہو)؟

خوامخواہ اُس میں اتنے Interested کیوں ہو اور میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ یہ تو جب ہو کہ اگر کروں میں اور بھرنا تمہیں ہو تو پھر تو تم آ کر کہو کہ بابا! کیوں ہمیں مصیبت میں ڈال رہے ہو' تمہاری وجہ سے ہم پہ تباہی آئے گی۔ یہ بات تو ہے ہی نہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل تو یہ ہے کہ جس طرح سے جو کچھ تم کرتے ہو' میں اِس لیے دخل نہیں دے رہا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ اُس کا نتیجہ تمہیں خود بھگتنا پڑے گا' مجھے نہیں بھگتنا پڑے گا۔ اسی طرح سے جو کچھ میں کر رہا ہوں تو اِس کے نتائج مجھے بھگتنے پڑیں گے' وہ تمہیں نہیں بھگتنے پڑیں گے۔ جب تمہیں اُس کے نتائج ہی نہیں بھگتنے پڑیں گے تو تم کیوں اس معاملے میں Interfere (مداخلت) کرتے ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو معاشرے کے باہمی راستے ہیں قرآن اُن میں کس کس قسم کی تعلیم دیئے جا رہا ہے۔ یعنی جو لغو والے ہوں' Reason کو سننے کے لیے تیار نہ ہوں تو اُن سے کیا اُلجھنا۔ سیئات کا مقابلہ سیئات سے کرنا دین نہیں سکھاتا۔ اصل چیز یہ ہے کہ اگر لغو چیزیں ہو رہی ہیں تو اُن سے اعراض برتو۔ اُن سے کہو کہ جب میرے اعمال سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو تم کیوں اِس میں Interfere (مداخلت) کرتے ہو۔ یہ میرا معاملہ ہے یہ میرے ساتھ رہنے دو۔ میں تمہارا معاملہ تمہارے ساتھ رہنے دیتا ہوں۔

باہمی تعلقات منقطع کرنے کے باوجود دلی طور پر ہمدردی کی کوشش

اِس قطع تعلق کے باوجود میری آرزو اور خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ **سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ** (28:55) تم تباہی سے بچ جاؤ۔ اپنے متعلق میں تم سے کچھ نہیں چاہتا کہ تم میرے لیے کچھ کرو بلکہ تمہارے متعلق یہ ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ تم جس راستے پہ چل رہے ہو' یہ تمہیں صحیح منزل پہ نہیں پہنچا سکے گا' یہ غلط راستہ ہے۔ تباہیاں اور بربادیاں آئیں گی' نقصان اٹھاؤ گے۔ میں اِس کے باوجود کہ تم میرے ساتھ یہ کچھ کر رہے ہو' تمہاری سلامتی کے لیے کوشش کرونگا۔ **لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ** (28:55) اس لیے میں تمہارے ساتھ نہیں جھگڑنا چاہتا' نہیں الجھنا چاہتا' نہیں روابط رکھنا چاہتا' تمہارے معاملات میں Interfere (مداخلت) نہیں کرنا چاہتا کہ تم جاہلوں کے زمرے میں ہو۔

اب ہمارے ہاں عام طور پہ جاہل' بے علم کو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں کئی ایک مقام پہ یہ بات آئی ہے۔ جاہلین کا لفظ آیا ہے اور اُن کے متعلق ہمیں تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اُن سے اعراض برتو۔ دوسری جگہ بھی مومنین کا شعار بتایا گیا ہے کہ **وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا** (63:25)۔ عام طور پہ اِس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جب جاہل اُن سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام۔ ''اک ست سلام ہوندا اے یعنی او بابا! میری جان چھڈ''۔ [1] جاہل کے معنی یہ نہیں ہیں جو عام طور پہ لیے جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ جاہلین سے متعلق کہا گیا ہے کہ **خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ** (7:199)۔ اس آیت

---

[1] ایک بیزاری کا ''سلام'' ہوتا ہے کہ بابا! مجھے بخش دو' میری جان چھوڑ دو۔

میں پہلی بات تو بڑی تشریح طلب ہے میں اُس کو چھوڑتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔

لفظ متقی کے غلط استعمال کی وضاحت

حضور ﷺ سے یہ فرمایا گیا کہ یہ تعلیم دیتے رہو۔ **وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ** (7:199) اور جاہلین سے اعراض برتو۔ اب یہاں سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی پہلی سی سورۃ، سورۃ بقرۃ میں ہے کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2) ہمارے ہاں تو ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جو پہلے ہی متقی ہیں، اُن کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔ متقی تو ہدایت یافتگاں میں سے بھی پہلے درجے پہ ہوتا ہے۔ متقی مومن کا بھی اگلا درجہ ہوتا ہے۔ اگر یہ قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے تو یہ جو باقی گنہگار رہیں، جو متقی نہیں ہیں، اُن کے لیے تو یہ ہے نہیں۔ اور جو پہلے ہی متقی ہیں تو اُن کو اِس ہدایت کی کیا ضرورت ہے لیکن یہ پھر بھی کہے چلے جائیں گے۔ وہ اِس لیے کہ متقی کا لفظ ہمارے ہاں یوں عام ہوا۔ ''اصل اچ قرآن دے معنی جیہڑے پنجابی اچ کر لیے تے اوتھے بیڑہ غرق ہو یا اے''۔ [1] پنجابی سے مراد صرف پنجابی زبان ہی نہیں بلکہ خواہ وہ اُردو ہو، خواہ وہ انگلش ہو، یہ جو ہمارے ہاں مروج معنی ہم لے لیتے ہیں تو ہم قرآن کی تعلیم سے دور چلے جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! معنی، قرآن سے لینے چاہئیں۔ یہ بات اکثر دفعہ آ چکی ہے اور آتی بھی جائے گی جوں جوں اور چیزیں آئیں گی۔ تقوٰی کے معنی حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے سمجھائے تھے۔ اُنؓ سے پوچھا گیا تھا کہ متقی کون ہوتا ہے۔ آپؓ نے کہا تھا کہ کبھی تم اُس پگڈنڈی سے گزرے ہو جہاں اِدھر اُدھر خاردار جھاڑیاں ہوں، کانٹے والی جھاڑیاں ہوں۔ کہا کہ ہاں گزرے ہیں۔ عربوں کو تو آپ نے دیکھا ہے کہ اُن کے تو لباس وہ جھلے والی چیز ہوتی ہے، اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے۔ کہنےؓ لگے کہ وہ کیسے گزرتے ہو۔ کہا کہ اِدھر سے سمٹتے ہوئے، اُدھر سے سمٹتے ہوئے گزرتے ہیں تاکہ کسی کانٹے میں الجھ نہ جائیں۔ تو آپؓ نے کہا کہ بس اِسی کو تقوٰی کہتے ہیں۔ تو متقی وہ ہوتا ہے جو راستے کی خاردار جھاڑیوں سے بچ کر چلنا چاہے، اُن سے الجھنا نہ چاہے۔ یہ صحیح راستے پہ اُنہیں پہنچائے گا جو پہلے اِس کے لیے کوشش یہ کریں کہ میں راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ گزر جاؤں۔ میرا دامن خاردار جھاڑیوں میں نہ اُلجھے۔ جو صحیح راستے کی سلامتی چاہتا ہے اُس کو یہ صحیح راہنمائی دیتا ہے۔ جو خودکشی کرنے کے لیے جاتا ہے اُس کے لیے یہ کہنا کہ یہاں چھلانگ نہ لگانا، یہاں پانی ڈوبو ہے تو وہ کہے گا کہ تیری مت ماری گئی ہے، میں تو آیا ہی ڈوبنے کے لیے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب وہ واپس آ جائے تو اُس سے پوچھے کہ تم تو ڈوبنے گئے تھے پھر واپس کیوں آ گئے۔ کہنے لگا کہ یار میں نے دیکھا تو پانی بہت ٹھنڈا تھا۔

---

[1] اصل میں قرآنِ کریم کے جو معنی پنجابی میں کر لیے تو وہاں بیڑا غرق ہوا۔

لفظ ہدایت کے سلسلہ میں تین لوازمات کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ بتانا بڑی سیدھی سی بات ہے کہ یہ راستہ ماڈل ٹاؤن کی طرف جائے گا اور یہ راستہ فلاں طرف جائے گا۔ ہدایت صحیح راستے میں تمیز کرنے کو کہتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ ہے۔ اور جو ماڈل ٹاؤن جانا ہی نہیں چاہتا تو اُس کو یہ چیز کیا فائدہ دے گی کہ یہ راستہ ماڈل ٹاؤن کو جاتا ہے یا نہیں جاتا۔ پہلی چیز یہ ہے کہ وہ جو کسی صحیح منزل کے اوپر پہنچنے کا ارادہ کرتا ہے' وہ پتہ لیتا ہے کہ اِس کی طرف جانے والا راستہ کونسا ہے۔ اس کا یہ علم ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پھر وہ اُس راستے پہ چلنا چاہے تو تب جا کر منزل پہ پہنچے گا۔ تو یہ تین چیزیں ہو گئیں: منزل کا تعین کہ فلاں جگہ جانا ہے' اُس منزل تک پہنچانے والا صحیح راستہ' اور پھر اُس راستے کے اوپر چلنا۔ اگر وہ چلتا نہیں ہے تو پہلی دو چیزیں بھی فائدہ نہیں دیں گی۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تعینِ منزل یعنی ایمان ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ یہ جو صحیح راستہ ہے یہ ہدایت ہے۔ اور اگلی چیز جو اُس پہ چلنا ہے یہ ہیں اعمالِ صالحہ۔ یہ تین اکٹھے ہونگے تب جا کر وہ صحیح منزل پہ پہنچے گا۔ تو یہ جسے قرآن کی ہدایت کہا جاتا ہے' یہ اُس کے لیے ہے جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر منزل تک پہنچنے کی آرزو رکھتا ہے۔ یہ تھا هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2:2)۔ یہ دو لفظوں میں تھا۔ اور یہیں جاہلین کے متعلق ہے۔ جہلا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ تمہیں سات سلام ہے'' جاؤ میرا کھیڑا چھڈ و'' [1] میں تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ تو کیا پھر آپ عالموں کا یہ گروہ لیں گے بقول ان کے قرآن هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2:2) کہتا ہے؟ وہ تو پہلے ہی علم رکھتے ہیں ان کے لیے ہدایت کیوں؟

تصریفِ آیات کی روشنی میں جاہلیت کے دو گوشوں کی وضاحت

عزیزانِ من! اس کے لیے دو چیزیں یاد رکھیے۔ ہمارے ہاں بلکہ تاریخ میں بھی ایک تو زمانہ اسلام کا ہے جب قرآن نازل ہوا' حضور ﷺ نے اِس کا نظام نافذ فرمایا۔ اِس سے قبل کا جو زمانہ ہے خود عربوں کے ہاں اُسے زمانہء جاہلیت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے نہیں کہ وہ بے علم لوگ تھے یا اَن پڑھ تھے یا Illiterate تھے بلکہ اُس دور کے عربوں کی کچھ خاص خصوصیات تھیں اور وہ بڑی خرابیوں اور برائیوں کی خصوصیات تھیں' یعنی ضد تھی' عصبیت تھی' انتقام کا جذبہ تھا' حسب و نسب کے اوپر غلط مفاخرت تھی' باہمی دشمنیاں سینکڑوں برس تک چلی جاتی تھیں۔ یہ ساری اُن کی خصوصیات جو اُس دور کی تھیں اُنہیں لفظِ جاہلیت سے تعبیر کیا۔ اور اُس کے مقابلے میں اسلام تھا۔ اسلام میں یہ خصوصیات اُن کی خصوصیات کی بالکل ضد (Diameti cally opposite) تھیں۔ تو ایک چیز یہ ہے کہ جہاں قرآن میں جاہلین آتا ہے تو اُس کے معنی اُن خصوصیات کے حامل ہیں جو اسلام سے پہلے کے اُن عربوں کے اندر تھیں۔ اور جب اس کے عام

---

[1] جاؤ' میرا پلہ چھوڑو' میرا پیچھا چھوڑو۔

معنی لیے جاتے ہیں۔ تو وہ یہ ہیں کہ عربی زبان میں بھی اور قرآن نے بھی ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ جو شخص کسی معاملے کو Seriously (سنجیدگی سے) نہ لے بلکہ یونہی ہنسی مذاق ہی سمجھے تو عرب اُسے جاہل کہتے تھے۔ قرآن میں سورۃ بقرۃ میں حضرت موسیٰ کے متعلق اس کا استعمال ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ گائے ذبح کر دو۔ وہ تو اِس چیز کا بڑا ٹیسٹ تھا۔ جیسے اگر کوئی ہندو آ کر کہتا ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو پہلا ٹیسٹ اُس کا یہ ہوتا ہے کہ گائے کا گوشت کھا کر بتاؤ۔ تو وہ بنی اسرائیل گائے کی پرستش کرتے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اُن کے دل سے بچھڑے کی یہ محبت نکل گئی ہے یا نہیں' اُن کا یہ ٹیسٹ تھا اور اُن سے کہا گیا کہ یہ گائے ذبح کرو۔ **قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا** (2:67) اُنہوں نے اُن سے کہا کہ تم اس معاملے میں Serious (سنجیدہ) ہو یا ہم سے مذاق کر رہے ہو۔ یہ ھزوًا ہے یعنی استہزا ہے کہ کسی سے مذاق کرنا' Serious (سنجیدہ) نہ ہونا۔ **قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** (2:67) تم میرے متعلق یہ کیا کہتے ہو کہ خدانکردہ میں Serious (سنجیدہ) نہیں ہوں۔ خدا نہ کرے کہ میں کہیں ایسا ہو جاؤں کہ دین کے معاملوں میں تم سے مذاق کروں۔ جاہلین کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ تو آپ نے دیکھا کہ قرآن کیسے اپنے معنی خود واضح کرتا ہے۔ اِسے تصریفِ آیات کہتے ہیں۔

انسان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ زندگی کی اہمیت کے پیش نظر اس کے معاملہ میں سنجیدہ ہو

عزیزانِ من! لوگ زندگی جیسے اہم معاملے میں Serious (سنجیدہ) نہ ہوں تو وہ جاہلین ہیں۔ کہا ہے کہ جو اِن معاملات کو Seriously (سنجیدگی سے) لیتا ہی نہیں ہے' اُن سے ٹکر مار کر سر پھڑوانے کا فائدہ کیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ کیا وہ زندگی کے مسائل کے متعلق' اپنے متعلق' اپنے Future (مستقبل' آخرت) کے متعلق Serious (سنجیدہ) ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ یہاں علم اور جہالت کی بات تو بعد میں آتی ہے۔ یہاں بات ہی یہ ہے کہ کیا تم اپنے اور اپنے مستقبل کے متعلق Serious (سنجیدہ) ہو یا اِس کو یونہی Lightly (غیر سنجیدگی سے) لیتے ہو۔ تو کہا کہ جو لوگ اِس کے متعلق Serious (سنجیدہ) نہ ہوں اُن سے سر مارنے سے فائدہ نہیں ہے۔ پہلے ایسی کوشش کرو کہ وہ اس کے متعلق Serious (سنجیدہ) ہو جائیں۔ یہاں ایک اہم اور نازک مقام آ گے آ رہا ہے۔ پہلے منزل کا تعین کیا' پھر صحیح راستہ بتایا۔ یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے لیکن تیسری چیز کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ وہ کیا ہے؟

راستہ بتایا تو جا سکتا ہے' اس پر چلایا نہیں جا سکتا

اب اگلی بات یہ ہے کہ یہ جو شخص کھڑا ہے اِسے اُس راستے کے اوپر چلانا ہے۔ اِسے چلا تو کوئی نہیں سکتا۔ گھوڑے کو آپ دریا تک تو

لے جاسکتے ہیں لیکن وہاں لے جا کر اُسے آپ پانی نہیں پلا سکتے [1] جو جی میں آئے کر لیجیے' اُسے پانی تو خود پینا ہوتا ہے۔ اُس کی پیاس کا تقاضا ہے تو وہ پانی پیے گا۔ آپ اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ کو ندی معلوم ہو اور اُس کو آپ ندی تک لے جائیں۔ یہاں تک تو آپ کر سکتے ہیں لیکن اُسے پانی نہیں پلا سکتے۔ آپ منزل کا تعین کر سکتے ہیں' صحیح راستہ بتا سکتے ہیں لیکن کسی کو اُس راستے کے اوپر آپ چلا نہیں سکتے' آپ اور میں تو ایک طرف رہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ مقام بڑا اہم بھی ہے اور بڑا نازک بھی ہے۔ اِسے غور سے بھی سمجھیے گا اور اپنے جذبات پہ بھی قابو رکھ کر اِسے سمجھئے گا۔ نبی اکرم ﷺ کو وحی منزل من اللہ ملی۔ نبی اکرم ﷺ کا فریضہ یہ بتایا گیا کہ **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ** (5:67) جو کچھ تمہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ راستہ صحیح ہے اور یہ راستہ غلط ہے تو اِس بات کو عام کرو۔ لوگوں کو بتاؤ کہ کونسا راستہ صحیح منزلِ انسانیت کی طرف جاتا ہے۔ بلغ۔ یعنی اس بات کو پہنچاؤ۔ اگلی بات اِن کو اُس راستے کے اوپر چلانے کی ہے تو کہا کہ **لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ** (2:272) ان کو راستے کے اوپر چلانا تیرے ذمے ہی نہیں ہے۔ میں اگلی بات عرض کرونگا جو قرآن نے بتایا ہے کہ پھر اُس راستے کے اوپر چلتا کون ہے۔ اُسے اُس راستے کے اوپر کوئی چلا نہیں سکتا۔ اُسے بتا تو سکتے ہو کہ صحیح راستہ کونسا ہے' تم چلا نہیں سکتے۔ یہ جو ہے کہ **لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ** (2:256) دین میں اکراہ نہیں ہے تو وہ یہ منزل ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ دوسرے کو اُس کا علم دینا ہے' جس چیز سے وہ واقف نہیں ہے اُس کی واقفیت کرانی ہے کہ یہ ہے وہ گاؤں جہاں تم نے جانا ہے' یہ ہے وہ راستہ جس کے اوپر چل کر تم وہاں پہنچ سکتے ہو۔ یہ اُس کو علم دینا ہے۔ یہ **یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ** (3:164) تمہارا فریضہ ہے لیکن **لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ** (2:272) اس راستے پر چلا دینا تیری ذمہ داری نہیں ہے۔ عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ کی بھی ذمہ داری یہ ہے۔ تو یہ جن کو ہم خدائی فوجدار بنائے پھرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے ہم اِن کو راستے کے اوپر چلا کے رہیں گے یا للعجب!!۔

آگہی کی تڑپ ہی انسان کو صحیح راستے کی طرف آمادہ کرتی ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ بڑے غور سے سننے کی چیز ہے' یہ بڑا اہم مقام ہے۔ خدا اپنے رسولؐ سے کہہ رہا ہے کہ تم اِن کو صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ یہ تمہارا فریضہ ہی نہیں ہے جبکہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا فریضہ یہ بھی ہے' اِن کو راستے کے اوپر ہم چلائیں گے۔ تو یوں جو اُس کو مار کر چلاؤ گے تو کتنی دیر تک اُس کے ساتھ مارتے مارتے آخر تک چلتے جاؤ گے۔ جہاں تم نے چھوڑا اور ادھر ہوئے تو وہ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ''فیر اونے دھیان ماریا کہ کوئی نہیں اے تے اومڑ کے گھر آ گیا''۔ [2] عزیزانِ من!

---

[1] You can lead the horse to water but you cannot make it drink.

[2] پھر اس نے دھیان کیا کہ کوئی بھی نہیں ہے تو واپس گھر چلا گیا۔

اگر اُس گھوڑے کو پانی پلانا ہے تو اُس کے اندر پیاس پیدا کرو تو پھر تو وہ رسا تڑا کر بھی وہاں چلا جائے گا۔ پھر جسے تم صحیح راستے پہ چلنا اور صحیح کام کرنا کہتے ہو وہ تو:

بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

تو وہ سُولی پہ چڑھ کے حق بات کہے گا۔ تم اُس کے اندر پیاس پیدا کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے تو خدا تو رسولؐ سے کہہ رہا ہے کہ تُو بھی اِن کو صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتا۔ بات ساری یہ ہے کہ اُس کے اندر پیاس پیدا کرو۔ دین کی پیاس اندر ہوتی ہے تو پھر تو آدمی دوڑتا ہے' بھاگتا ہے' تلاش کرتا ہے کہ کہاں سے یہ بات ملے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے: ''بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت''۔ یہ جو ہم اِن کے تذکرے پڑھتے ہیں کہ کس طرح سے اُنہوں نے یہ کچھ کیا تو وہ اندر کی پیاس کی تڑپ تھی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہاں یہی نکتہ Neglect (فراموش) کیا جاتا ہے۔

قومی معاشرے کی حالت قوم کی نفسیاتی تبدیلی کی ہی رہین منت ہوتی ہے

وہ جو خدا نے کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** (13:11) تم تو ایک طرف رہے خدا بھی یہ نہیں کرتا کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر کے حالات میں تبدیلی پیدا نہ کرلے' اُس کے باہر کے حالات میں تبدیلی کر دے۔ خدا بھی یہ نہیں کرتا۔ خدا نے لفظ اِنَّ کے ساتھ کہا ہے جس کے معنی عربی زبان میں Surely (یقیناً) کے ہیں یعنی یہ ایک حقیقت ہے' یقینی بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جب تک یہ تبدیلی پیدا نہ کرو تو خدا بھی نہیں بدلتا۔ یہ کہتے ہیں کہ تو نہیں بدل سکتا نہ بدل' ہم بدل کے بتائیں گے۔ یہ خدا کو چیلنج دے رہے ہیں۔ اندرونی تبدیلی کے بغیر باہر کے خارجی ماحول میں تبدیلیاں لانا' یہ ہے وہ چیز جو کہی گئی ہے۔ رسول ﷺ سے کہا گیا ہے کہ یہ تیرا فریضہ ہی نہیں ہے۔

صحیح راستے کو اپنانے کے سلسلہ میں طبعی یا معاشرتی تعلقات کی کیفیت

اب یہ رہا کہ ٹھیک ہے فریضہ نہیں ہے لیکن میں اگر اپنی آرزو' اپنی خواہش' اپنی مرضی' اپنی پسند' سے کچھ کرنا چاہوں تو ممانعت تو نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ ممانعت نہیں ہے!! اب اپنی خواہش سے یہ کس کے لیے چاہے گا۔ تو جتنا آپ کے کوئی قریب ہوگا' عزیز ہوگا' جس سے آپ محبت کریں گے تو اُس کے متعلق سب سے پہلے خیال آئے گا کہ یہ کہیں تباہ نہ ہو جائیں۔ اُس کو بچانے کی فکر آپ سب سے پہلے کریں گے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ پھر سن لو **اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ** (28:56) تُو کسی کے ساتھ کتنی محبت کیوں نہ کرے' کسی کو کتنا ہی عزیز کیوں نہ جانے' اگر وہ چلنا نہیں چاہتا تو تم اُسے بھی نہیں چلا سکتے۔ یہ عام لوگوں کی نہیں بلکہ

رسول اللہ کی بات ہو رہی ہے کہ جسے تو بہت محبوب اور عزیز رکھتا ہے، تو اُسے بھی صحیح راستے کے اوپر زبردستی نہیں چلا سکتا۔ نظر آیا کہ یہ جو انسان اور انسان کے طبعی تعلقات ہیں یہ بھی اس معاملے کے اندر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ باپ اور بیٹے سے عزیز تر تعلق کیسا ہو سکتا ہے!! حضرتِ نوح علیہ السلام بیٹے کو صحیح راستے پر نہ چلا سکے۔ آوازیں دیتے رہے لیکن اُس نے کہا کہ جاؤ جاؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام باپ کو صحیح راستے پہ نہ چلا سکے۔ حضرتِ لوطؑ بیوی کو نہ Convert (بدل) کر سکے۔ ان سے زیادہ محبوب رشتے اور کیا ہوتے ہیں۔

صحیح راستے کی طرف آمادگی کے بارے میں محبت جیسا قیمتی اور مضبوط رشتہ بھی کارگر نہیں ہوتا

اَحۡبَبۡتَ (28:56) قرآن نے کہا ہے یعنی محبت کا تعلق۔ جس سے محبت ہوتی ہے اُس کے لیے تو انسان پوچھو نہیں کہ کہاں تک کوشش کرتا ہے، اُس کے متعلق کہاں تک آرزو رکھتا ہے کہ کسی طرح سے یہ ہو جائے۔ رسول جیسی شخصیت سے کہا کہ تم بھی یہ نہیں کر سکتے۔ یہ جو اِس میں نازک معاملہ میں نے کہا تھا، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ جس سے محبت رکھتا ہے اُسے بھی نہیں Convert (تبدیل) کر سکتا۔ گویا انسان میں یہ محبت کی چیزیں صرف طبعی ہیں، جسمانی ہیں۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ Blood Relation (خون کا رشتہ) ہے، Physical Relationship (جسمانی رشتہ) ہے۔ دین کا تعلق تو قلبی رشتے سے ہوتا ہے۔ یہ Physical Relationship (جسمانی رشتہ) دین کے معاملے میں کوئی کام نہیں دے سکتا۔

انسانیت کی پوری زندگی میں نازک ترین مقام شخصیت پرستی کا مقام ہے

اب یہاں سے وہ نازک تر معاملہ آ گیا۔ قرآنِ کریم نے قدم قدم پہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ اطہر سے کہلوایا کہ **قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ** (18:110) یہ وحی کی بات تو چھوڑ دو، یہ تو الگ معاملہ ہے۔ یہ خدا کی ایک چیز ہے، مجھ پہ آتی ہے اور میں تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اُس کے بعد میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے۔ اسے بڑی توجہ سے سنیے۔ ساری تاریخِ انسانیت کے اندر جو نازک ترین مقام آتے ہیں وہ شخصیت پرستی کے آتے ہیں۔ جہاں شخصیت پرستی آتی ہے تو وہاں ضروری نہیں ہے کہ صداقت پرستی ساتھ رہے۔ اُس شخص کے ساتھ جو آپ کا تعلق ہے وہ بہت گہرا رہ جاتا ہے۔ جتنے یہ بڑے بڑے مذاہب آپ کے سامنے آتے ہیں اُن کے اندر جتنی گمراہیاں پیدا ہوئی ہوتی ہیں، وہ صرف شخصیت پرستی کی بنا پہ ہوتی ہیں۔ کسی ایک بڑے کو خواہ وہ اُن کا بانی مذہب تھا، کوئی بزرگ تھا یا کچھ بھی تھا، اُس کا تصور ذہن میں ایسا رکھا کہ بس اُس کا ہر قول سند ہے، صداقت ہے، اُس کی ہر حرکت شرفِ انسانیت کی مظہر ہے۔ آپ نے اُسے کسی معیار پہ نہیں پرکھا، کسی کسوٹی کے اوپر نہیں جانچا۔ محض اُس کے نام یہ کچھ کیا کہ اُنہوں نے یہ کیا تھا، اُنہوں نے یہ کہا تھا۔ ارے بھئی! جو کچھ کہا تھا تو آج اُس کے متعلق کسی کسوٹی پہ پرکھ کر دیکھو۔

عقلِ انسانی کا پیدا کردہ مذہب، مقامِ نبوت، مقامِ وحی اور صداقتِ محمدیؐ کا علیحدہ علیحدہ باہمی فرق

مذاہب کی پوری تاریخ یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی انسان کہیں ہوتا ہے جس کی طرف یہ چیز کہی جاتی ہے۔ قرآن نے آ کر کہا کہ انسان کی بات نہیں ہے بلکہ بات تو قانون اور اصول کی ہے کہ وہ کیا ہے جو کہا گیا ہے۔ یہ قانون دینے والا قانون دیتا ہے اور الگ ہو کر کہتا ہے کہ اَنَـا بَشَـرٌ مِّثۡلُکُمۡ (18:110) میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں۔ یہ میں نے دو تین درسوں میں واضح کیا تھا اور پھر بھی کرتا ہوں کیونکہ یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ وہ یہ پہنچانے والا اتنا ہی نہیں کہتا کہ میں صرف تمہارے جیسا انسان ہوں بلکہ وہ کہتا ہے کہ اٰمَـــنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ (2:285) میں پہلے تمہاری طرح اس پہ ایمان لاتا ہوں جو رب کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

عزیزانِ من! اندازہ لگایئے کہ وحی خداوندی یا قانون و اصول اور اُن میں سے انسان کو الگ کرنے کی اس سے زیادہ اور کیا اہم چیز ہوگی۔ خدا کا پیغام یہ کہہ کر دیتا ہے کہ یہ میرا نہیں بلکہ خدا کا پیغام ہے۔ اور اُس کے بعد کہتا ہے کہ یہ جو مجھ پہ نازل ہوا ہے میں اس پہ تمہاری طرح ایمان لاتا ہوں: اٰمَـنَ الـرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (2:285) جس طرح سے باقی مومن ایمان لاتے ہیں رسول بھی اُسی طرح سے ما انزل الله کے اوپر ایمان لاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں کیا ہیں؟ یہ اصول، قانون، آئین، وحی سے شخصیت کو الگ کرنے کی چیز ہے۔ عزیزانِ من! اس انداز سے الگ کی ہوئی چیز کی مثال مجھے عالمِ انسانیت میں کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہے ذاتِ رسالت مآب ﷺ۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) اگر اُس میں تھوڑی سی بھی فریب کاری ہوتی تو رسول اتنا ٹکڑا گم کر جاتے۔ کون پوچھنے والا تھا اور کون کہنے والا تھا کیونکہ کسی کو علم ہی نہیں تھا کہ یہ بھی کہا گیا ہے۔ صداقتِ محمدی ﷺ اس سے نظر آتی ہے کہ انہوں نے یہ کچھ کہیں اور کبھی نہیں کیا۔ کہتا ہے کہ یہ ہے وحی جو میں نے تمہیں دیدی۔ اور اِس کے بعد اَنَـا بَشَـرٌ مِّثۡلُکُمۡ (18:110;41:6) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ میں خود اِس کے اوپر ایمان لاتا ہوں جیسے تم ایمان لا رہے ہو۔

عزیزانِ من! یہ ہے قرآن، یہ ہے وحی، یہ ہے مقامِ محمدی ﷺ۔ یوں الگ کر کے کوئی بتائے۔ یہ تو اتنی سی بات میں نے کہی ہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ تم سارے بھی مل جاؤ تو اِس کی ایک سورۃ جیسی سورۃ نہیں بنا سکتے۔ یہ اِس قسم کا بے نظیر اور بے مثل کلام ہے۔ تو اگر وہ پورے قرآن کے متعلق یہ کہہ دیتے کہ یہ میری تخلیق ہے، میری فکر کا نتیجہ ہے، تو کون اِس کو چیلنج کر سکتا تھا، کون چیک کر سکتا تھا کیونکہ وحی کے متعلق تو کسی دوسرے کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ وحی ہو رہی ہے یا اِس شخص کی اپنی فکر کا نتیجہ ہے۔ سیرتِ محمدیہ ﷺ کی بلندی تو اِس سے نظر آتی ہے۔ یہ ہے صداقتِ محمدیہ ﷺ کہ اتنی عظیم النظیر کتاب کے متعلق کہ کوئی چیلنج نہیں کر سکتا کہ اس کا منبع کیا ہے۔ اُس کے متعلق بار بار کہنا کہ او بابا! میرا اِس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ میں تو پہنچاتا ہوں اور اُس کے بعد میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔

ایک زندۂ جاوید بے مثل کریڈٹ کی حامل شخصیت ﷺ

عزیزانِ من! یہ بڑا کیریکٹر ہے' بڑا کردار ہے۔ یہ تو ان مصنفین سے' شعراء سے' پوچھیے کہ جی' للچاتا ہے کہ فلاں کے ہاں کا کوئی نکتہ ہی اپنے ہاں لے آیا جائے۔ یہ جسے ''توارد'' کہتے ہیں یعنی چوری پکڑی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ''توارد'' ہوگیا۔ اتنی عظیم کتاب یہ تیئس سال کے عرصے کے اندر پیش ہوئی چلی جا رہی ہے۔ عرب کے اندر دھوم مچ گئی ہے کہ یہ بے نظیر کتاب ہے۔ اُس کے متعلق وہ شخص خود کوئی کریڈٹ نہیں لے رہا حالانکہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اگر یہ دعویٰ کرتے کہ یہ میری ہی کتاب ہے تو آپ ﷺ کو اتنا بڑا کریڈٹ مل جاتا۔ آپ ﷺ اتنے بڑے کریڈٹ کو نہیں لیتے۔ عزیزانِ من! یہ کتنا بڑا صداقت کا جذبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ او بابا! اِس میں میرا کچھ نہیں ہے۔ اَنَـا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110;41:6) میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ دوسری طرف وہ کہنے والا وہ خدا ہے کہ یہ ٹھیک ہے ہم جانتے ہیں کہ تیرے دل میں یہ ہے کہ فلاں فلاں جن کو میں بہت ہی اپنا عزیز رکھتا ہوں' بہت محبت ہے' اُن کو تو میں صحیح راستے پہ چلاؤں۔ قرآن کہتا ہے کہ تم بھی نہیں چلا سکتے۔ یہ محبت کی دنیا ہے' یہ جو دوسری دنیا ہے' اِس میں جو جی چاہے اِن کے ساتھ کرو' ان کی مدد کرو' روپے پیسے دو' جو کچھ کرو لیکن اِن کے اندر تم پیاس تو نہیں پیدا کر سکتے' کسی کے ساتھ تمہاری کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔ حضور ﷺ نے اپنی بشریت کو وحی سے الگ کیا۔ اور اُس کے بعد جو انسانوں کے ساتھ تعلقات ہیں وہ تعلقات صرف ایمان کے رکھے۔ دین کے اندر کسی Blood Relation (خون کے رشتے) کا دخل نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو تمہارا محبوب ترین بھی ہے تم اُس کو بھی ہدایت پہ نہیں لا سکتے۔ اِس سے زیادہ تعلق کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ سب سے گہرا تعلق جو تھا اُس میں خدا رسول سے کہہ رہا ہے کہ تم اس معاملے میں نہیں کر سکتے۔

بندۂ عشق شوی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

دین میں بھی ذرہ بھر شخصیت پرستی نہیں ہوتی

باپ کا یا بیٹے کا تو یہاں سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں خود اپنی زندگی میں حضور ﷺ نے شخصیت پرستی کو مٹایا۔ قرآن نے یہ بتایا کہ جو خدا کی طرف سے قانون' اصول دیا گیا ہے اُس میں شخصیت پرستی نہیں آتی۔ یعنی شخصیت پرستی نہیں ہوتی ورنہ یہ نظام تو بہرحال انسانوں کے ہاتھوں سے ہی قائم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں جو نظام قائم فرمایا تھا' اُس میں بھی یہ چیز اہم طور پر بتائی تھی کہ اِس میں شخصیت پرستی نہیں ہے۔ اس چیز کو ختم کیا۔ اور اُس کے بعد اِس قانون کے متعلق کہا کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) جو بات خدا نے کہنی تھی وہ مکمل ہوگئی' اِس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی' اِس میں حک و اضافہ نہیں

ہوسکتا، اِس کی حفاظت کا ذمہ ہم نے لے لیا ہے۔ تو جب قانون یا آئین سے شخصیت کو الگ کیا اور آئین و قانون کو مکمل اور محفوظ شکل میں دیدیا تو آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ شخصیت پرستی کا اِس میں واسطہ ہی نہیں تھا اس لیے کہدیا کہ اس کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ خاتم النبین ت کے زبر سے ہے یا ت کے زیر سے ہے۔ او بابا! اِس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نکتہ تو یہ ہے کہ جو کہنا تھا وہ مکمل طور پہ محفوظ طور پہ کہہ کے دیدیا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ کہدیا کہ شخصیت پرستی نہیں ہے تو حضورؐ کے جانے کے بعد اور شخصیتیں کیسے آئیں گی، جن کی پرستش کی جائے۔

ختمِ نبوت کے اعلان کے بعد کسی بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی

عزیزانِ من! ختمِ نبوت درحقیقت شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اب کوئی شخص دنیا میں آ کر یہ نہیں کہے گا کہ آؤ، تمہیں میں بتاؤں کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور تمہاری منزل کونسی ہے۔ کوئی شخص آ کر یہ نہیں کہے گا کیونکہ بتانے والے نے بتا دیا ہے، یہ مکمل اور غیر متبدل موجود ہے۔ تو جب یہ مکمل اور غیر متبدل موجود ہے تو وہ آ کر کیا کہے گا۔ قرآن نے درمیان میں سے شخصیت پرستی ختم کردی اور کتنے عظیم اعلان سے کی کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ [1] (3:144) تم کیا کہتے ہو؟ ٹھیک ہے کہ ذاتِ محمدی ﷺ کے ساتھ وحی کو پہنچانے کے حوالے سے اور سب سے پہلے نظام قائم کرنے کے حوالے سے تمہارا رابطہ ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت اسوہءحسنہ ہے لیکن یاد رکھو کہ شخصیت پرستی نہیں ہے۔ محمد ﷺ اور رسولوں جیسا ہی ایک رسول ہے، پیغامبر ہے۔ اس سے پیشتر بھی رسول آئے اور اپنا اپنا مشن ادا کر کے دنیا سے چلے گئے۔ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ (3:144) کل کو اگر یہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ کہو گے کہ دین کا معاملہ ختم ہوگیا؟ دین کا معاملہ تو اِس قرآن سے، خدا کے پیغام سے آگے رہنا ہے۔ اب شخصیتوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ شخصیت خدا کا پیغام دینے کے لیے آتی ہے نہ کہ اپنی پرستش کرانے کے لیے۔

مامور من اللہ کا عقیدہ خود ساختہ تصور ہے

یہ پیغام پہنچا کر چلا گیا، پیغام مکمل ہوگیا۔ اب اس کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ سوال ہی نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی مامور آپ بنالیں۔ یہ قرآن کی تعلیم تھی۔ قیامت تک کے لیے اب کسی اور آنے والے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اور پھر اس امت کا پوچھیے ہی نہیں کہ

---

[1] موت اور مقاتلہ کا ذکر آ گیا ہے تو، اس ضمن میں ایک اور اہم اصول کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تم اپنی زندگی اور قوت کا راز اپنے نظام کے استحکام میں سمجھو۔ اسے شخصیتوں کے ساتھ وابستہ مت کرو۔ چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف، اس باب میں تو محمدؐ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے، اسی طرح، بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 156)۔

اِنہوں نے اِس کے خلاف کیا کیا کچھ نہ کہا۔ قدم قدم پہ مامور من اللہ کا عقیدہ وضع کیا۔ یہ آنے والوں کے نام کچھ اور رکھ لیے کیونکہ ختمِ نبوت میں نبیین کا لفظ آیا ہے اس لیے نبی تو نہ کہا۔ باقی سارا کچھ جو نبی آ کر کرتا تھا وہ یہ کرتے ہیں۔ دین جس چیز کو مٹانے کے لیے آیا تھا وہ شخصیت پرستی تھی۔

مذہب کا حوالہ ایک شخصیت تک آ کر رک جاتا ہے جب کہ دین کی سند قرآن ہے

اُس کے بعد جب یہ دین مذہب میں بدلا ہے تو اب آپ کا سارا مذہب شخصیتوں کے اوپر آ کر رک جاتا ہے۔ آپ مذہب کے متعلق کوئی بات کیجیے تو اُس کا حوالہ کسی نہ کسی شخصیت پہ آ کر رک جاتا ہے' خدا تک کوئی بھی نہیں پہنچتا۔ خدا تک پہنچنا تو قرآن سے ہے۔ اب یہاں صورت حال یہ ہے فلاں امام کے پیچھے ہیں' فلاں فقہ والے کے پیچھے ہیں' فلاں محدث کے پیچھے چل رہے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ختم نبوت دین کی بنیاد ہے' یہ بڑا نازک اور اہم مسئلہ ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد خدا کا پیغام قرآن محفوظ ہے' جو غیر متبدل اور مکمل ہے۔ اشخاص کوئی بھی ہوں لیکن وہ قرآن کی تعلیم دینے والے ہوں' قرآن کو سند پیش کرنے والے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کسی معاملے کے متعلق خود نہیں جانتا تو پوچھنا یہ چاہیے کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اُسے بتانا یہ چاہیے کہ خدا کا یہ ارشاد ہے۔ یہی سنت نبوی ﷺ ہے' یہی حضور ﷺ بتاتے تھے۔ مگر اب یہ ہے کہ اگر کوئی قرآن کی بات کہو تو یہ کہتے ہیں کہ کیا اِس سے پہلے بھی کسی نے یہ کہا ہے؟ اِن کی کیفیت یہ ہے۔

آج کی حالت زار اور غلط تراجم کی کیفیت

اگر خالص قرآن کی بات کہیے تو اُس کے بعد پوچھتے ہیں کہ صاحب! اِس سے پہلے کسی امام نے' کسی محدث نے' کسی مفسر نے' یہ کہا ہے۔ یعنی کسی شخصیت کی بات کہو تو اُس سے تو وہ مطمئن ہوتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ آ گئے نیا قرآن بتانے والے۔ کہتے ہیں کہ پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے۔ یہ چیز ہے جو ذہنوں کے اندر ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا' آخری دین آیا تھا' مکمل دین آیا تھا۔ اب یہ نہ پوچھو کہ کسی انسان نے بھی یہ کہا تھا۔ پوچھو تو یہ پوچھو' سند مانگو تو یہ سند مانگو کہ قرآن نے اس بارے میں کیا کہا ہے۔ تو بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن نے جب حضور ﷺ سے یہ کہا ہے کہ تُو جس سے محبت کرتا ہے' جہاں تک راستے پہ چلانا کا تعلق ہے تو تُو بھی اُسے نہیں چلاسکتا۔ قرآن نے شخصیتیں درمیان سے نکال دیں کہ کوئی شخص یہ نہیں کرسکتا۔ اتباع اور اطاعت قانونِ خداوندی کی ہے۔ اُس کے اندر جذبہ پیاس کی طرح خود بیدار ہونا چاہیے۔ یہ تھا دین۔ یہاں زندہ شخصیتیں تو ایک طرف رہیں' مُردوں اور اُن کے پتھروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ یعنی شخصیت پرستی کی ایسی ایسی شکلیں ہیں۔ وہ سندیں ہیں' دلیل اُن کی ہے' اقوال اُن کے ہیں' تعظیم ان کی ہے' احترامات ان کے ہیں۔ وہ پیغام جو خدا کا رسول دینے آیا تھا وہ تو بیچ سے نکل گیا اور یہاں سے وہاں تک ہر چیز شخصیت پرستی کی ہے۔ باقی

مذاہب والے یہی کرتے تھے۔ ہم بھی اُسی مقام پہ ہیں۔

اب اگلی بات یہ ہے جو خدا نے فرمائی ہے کہ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (28:56) اے رسول! تیرا جی کتنا ہی چاہے تجھے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو، کتنا ہی تمہارے قریبی کیوں نہ ہو، تم اُسے راستے پہ نہیں چلا سکتے۔ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (28:56)۔ اس کا غلط ترجمہ ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ اے رسول! جس کو تُو بہت زیادہ دوست رکھتا ہے، محبت رکھتا ہے، تو اُسے بھی ہدایت نہیں دے سکتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ یعنی (معاذ اللہ) یوں ہے جیسے کوئی مقابلے کی بات ہو رہی تھی کہ تُو چاہتا ہے کہ اُس کو ہدایت دیدو لیکن جسے ہم چاہیں گے اُسے ہدایت ملے گی۔ جسے تُو چاہے گا، اُسے نہیں ملے گی۔ عزیزانِ من! یہ کتنی صاف سی بات تھی۔ لیکن ہزار برس سے یہی مانتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ جس تفسیر یا ترجمے میں دیکھیں گے یہ لکھا ہوگا کہ اے رسول! تو کسی کو کتنا ہی عزیز کیوں نہ رکھتا ہو لیکن اُسے ہدایت نہیں دے سکتا۔ جسے ہم چاہتے ہیں اُسے ہدایت ملتی ہے۔ عزیزانِ من! آپ سوچیں کہ اِس سے ذہن میں کیا تصور پیدا ہو رہا ہے کہ دو مقابل میں کھڑے ہیں۔ اگلی بات یہ کہ ہدایت اُسے ملتی ہے جسے ہم چاہتے ہیں۔ تو اِس سے انسان کی ساری ذمہ داری ختم ہوگئی۔ خدا کہہ رہا ہے کہ رسول بھی نہیں دے سکتا۔ اُدھر سے یہ کہہ رہا ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں اُسے ہدایت دیتے ہیں تو جو ہدایت پہ نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ صاحب! خدا چاہتا ہی نہیں ہے کہ میں ہدایت پہ جاؤں تو پھر اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ اُس کے بعد یہ ہے کہ اُس کو جہنم میں ڈال دو۔ تو کاہے کو ڈال دو؟ کون کہے کہ صاحب! آپ نے تو خود ہی کہا تھا کہ ہدایت تو اُسے ہی مل سکتی ہے جسے ہم چاہیں گے۔

قرآن حکیم کا فرمان

عزیزانِ من! کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کہا یہ ہے کہ ''اے رسول ﷺ! تُو جس کو بڑا عزیز رکھتا ہے، تُو چاہے کہ اُس کو راہِ راست کے اوپر چلا دے تو تُو بھی یہ نہیں کرسکتا۔ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (28:56) جو خود چلنا چاہتا ہے اُسے خدا چلاتا ہے۔ مَنْ یَّشَآءُ کے معنی یہ ہیں کہ ''جو خود چلنا چاہتا ہے''۔ جو چلنا چاہتا ہے تو وہ اِس راستے پہ چلتا ہے۔ جو چاہتا نہیں ہے تو اُس کو تُو بھی نہیں چلا سکتا۔ یہ ہے من یشآء۔

آگے بات یہ چلے گی کہ جو چاہتا ہے اُس کے لیے بتایا ہے کہ چاہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ دل میں ایک آرزو رکھتا ہے بلکہ اُس کے لیے ایک Process (عمل) ہے، ایک طریقہ ہے، وہ بتایا گیا ہے۔

عزیزانِ من! ہم آج سورۃ القصص کی آیت 56 تک پہنچ گئے ہیں، 57 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

دسواں باب: سورۃ القصص (آیات 56 (بارِ دگر) تا 61)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾ وَقَالُوا
إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ
كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ
مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ﴿٥٨﴾ وَمَا
كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي
الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ﴿٥٩﴾ وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا ۚ وَمَا عِندَ
اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٠﴾ أَفَمَن وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ كَمَن مَّتَّعْنَاهُ مَتَاعَ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٦١﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1979ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز یوں تو سورۃ القصص کی آیت 57 سے ہو رہا ہے لیکن جو 56 ویں آیت پچھلی دفعہ فروری 1979ء کی 2 تاریخ کو زیرِ درس تھی تو اُس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا اس لیے ہم اُسی سے شروع کرتے ہیں۔ ویسے بھی پچھلا فروری 1979ء کی 9 تاریخ کا درس خصوصی تھا اس لیے پندرہ دنوں میں تجدیدِ یادداشت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کو شخصیت پرستی کے بجائے اصول پرستی کا درس دیتا ہے

56 ویں آیت میں خصوصیت سے ایک اہم چیز سامنے لائی گئی تھی۔ قرآنِ کریم شخصیت پرستی کو ختم کرتا ہے۔ وہ اصول دیتا ہے' قوانین دیتا ہے' راہنمائی دیتا ہے' غیر متبدل اقدار دیتا ہے لیکن اشخاص کی پرستش کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن میں پرستش کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اطاعت کا سوال ہے' محکومیت کا سوال ہے اور وہ خدا کی اطاعت و محکومیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے متعلق کہ شخصیتوں میں جن

سے بلند و بالا کوئی شخصیت نہیں ہوسکتی' بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر قرآن نے کہا ہے۔ کہا کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (3:144) محمدؐ اُس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ خدا کا ایک رسول ہے' پیغامبر ہے' قاصد ہے۔ وہ اپنا پیغام پہنچانے کے بعد طبعی عمر پانے کے بعد اس دنیا سے چلا جائے گا جیسے اس سے پہلے رسول چلے گئے۔ تو کل کو اگر وہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ سمجھو گے کہ دین کا خاتمہ ہو گیا' وہ کسی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا' وہ نہیں رہا تو دین بھی ختم ہو گیا۔ کیا پھر تم اپنے پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟ گویا حضور ﷺ کے متعلق بھی یہ چیز کہہ دی چہ جائیکہ اُن کے بعد دین کو اشخاص کے متعلق سمجھ لیا جائے۔ اشخاص کا اُن کے کردار' اُن کی سیرت اور اُن کے اچھے کاموں کی وجہ سے احترام ہے۔ اور وہ ضروری ہے' وہ ہونا بھی چاہیے۔ احترام اور چیز ہوتی ہے لیکن کسی کو جزوِ ایمان بنا لینا اور چیز ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسی کے لیے قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پہ حضورؐ سے یہ کہا ہے کہ تمہارا کام لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دینا ہے۔ اُس راستے پر چلا دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے اور نہ ہی یہ کیا جا سکتا ہے۔ راستہ دکھایا تو جا سکتا ہے لیکن کسی کو زبردستی راستے پہ نہیں چلایا جا سکتا۔ اُس کے بعد یہ اُس کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ صحیح راستہ اختیار کرے یا غلط کرے۔ یا صحیح راستہ سمجھنے کے بعد اُس پہ چلنا ہی نہ چاہے اور کھڑا رہے یا گھر میں بیٹھا رہے۔ کہا کہ یہ تمہارا ذمہ نہیں ہے۔ اور اِسے اس حد تک اس 56 ویں آیت میں ایک لفظ کا اضافہ کر کے شخصیت پرستی کا بھی قلع قمع کیا ہے۔ کہا کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ (28:56) اے رسول! اور تو اور جنہیں تُو بہت محبوب رکھتا ہے' اُنہیں بھی تُو صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کے ساتھ تیری محبت کا تقاضا ہو گا لیکن اس کے باوجود صورت یہی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تیرے راستہ دکھانے کے بعد اُس کے اوپر چلیں اور تُو اُن کو چلا بھی دے۔ اب یہ جو مــن احبــبت کہا ہے کہ جن کو تُو بہت محبوب رکھتا ہے' اب یہ دیکھ لیا گیا کہ وہ اگر صحیح راستے کے اوپر خود نہیں چلتے ہیں تو اُنہیں غلط رو ہی کہا جائے گا۔ محض یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب تھے یعنی رشتہ داری کی بنا پر' دوستی کی بنا پر' وہاں کے تمدن کے اعتبار سے' یہ جو چیز ہے اِس کی رعایت نہیں ہے کہ اگر وہ صحیح راستے پہ نہ چلیں تو اُس کے باوجود اُن کے متعلق یہی سمجھا جائے کہ اُن کا راستہ جس پہ وہ چلے تھے وہ صحیح راستہ ہے۔ صحیح راستہ تو وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور اُسی راستے کی راہنمائی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔

شخصیت پرست قوموں کا مستقبل ہمیشہ زوال پذیر ہوتا ہے: کیوں؟

قرآن تو اُس خدا کی کتاب ہے جو علیم ہے' خبیر ہے' قیامت تک کے انسانوں کے حالات سے واقف ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ چیز تھی کہ اُمتیں کس طرح گمراہ ہوا کرتی ہیں۔ قرآن نے جہاں کہیں کوئی احکام واقدار دیئے ہیں تو اِس کو بھی سامنے رکھا ہے کہ جن خطرناک گھاٹیوں میں پہلی اقوام گھر جاتی تھیں انہیں اُن سے بھی متنبہ کر دیا گیا۔ پہلی اقوام شخصیت پرستی کے ہاتھوں تباہ ہوا کرتی

تھیں، یعنی دین اُن کے ہاتھوں سے اُس وقت چھوٹ جاتا تھا جب اشخاص پرستی آ جاتی تھی۔ دیکھا یہ جاتا تھا کہ فلاں شخص، فلاں بزرگ، فلاں ہستی جن کو ہم بہت مقدس سمجھتے ہیں وہ کس راستے پہ چلتے تھے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کہا کہ جب تمہارے ہاں ایک قوم تیار ہو جائے گی تو پھر ضروری نہیں ہے کہ وہ راستہ صحیح راستہ ہی ہو جو اُس شخص نے اختیار کیا ہے۔ وہ بھی جس راستے پہ چلا تھا اُسے بھی تم قرآنِ کریم روشنی میں پرکھ کر دیکھو۔ اگر وہ صحیح ہے تو پھر صحیح ہے، اگر وہ اِس کے مطابق نہیں ہے تو کہو کہ اُن کا راستہ صحیح نہیں ہے بلکہ راستہ وہ صحیح ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ پہلی اُمتیں اسی طرح تباہ ہوئیں۔ اُن سب کے ہاں شخصیت پرستی ہے۔

اُن کے ہاں تو مشکل یہ تھی کہ خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں اُن میں سے کسی کے پاس نہیں رہی تھیں لیکن ہمارے پاس تو خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے، غیر متبدل طریق سے موجود ہے۔ اب ہمارے لیے تو بڑا آسان ہے کہ ہم یہ دیکھ لیں کہ کوئی بات جو اسلاف میں سے کسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اُسے قرآن کی رو سے پرکھ کر دیکھ لیں۔ اگر وہ اِس کے مطابق ہے تو ہم کہیں گے کہ اُنہوں نے صحیح کہا تھا، اگر وہ اِس کے خلاف ہے تو محض اس لیے کہ اُس بزرگ ہستی کا احترام و تکریم ہمارے دلوں کے اندر ہے، ہم کہیں کہ صاحب! جس راستے پہ وہ چلتے تھے وہی راستہ صحیح تھا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ یہ چیز تھی جو قرآن نے واضح کی کہ رسول کی جو کوئی محبوب ترین ہستیاں بھی تھیں اُن کا بھی جو راستہ تمہارے سامنے آئے تو اُسے دیکھو کہ وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔

قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے باوجود آج ہمارے ہاں مذہب ہی رائج ہے، دین نہیں ہے

عزیزانِ من! جس بات سے قرآن نے متنبہ کیا تھا، جس سے وارننگ دی تھی، ہم بھی اُسی غلطی کے مرتکب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اِس وقت اسلام مذہب بن گیا ہے، قرآن کی رو سے دین ہوتا ہے۔ مذہب کے معنی ہی یہ ہیں کہ ''کسی کا راستہ''۔ تو مذہب اس کا نام اس لیے پڑا کہ ہم اشخاص کے راستوں کے اوپر چل رہے ہیں۔ قرآن میں تو مذہب کا لفظ ہی نہیں آیا۔ دین جو خدا نے دیا تھا وہ اسلام ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مذہب کے تو لفظی معنی ہی ''کسی کا راستہ'' ہیں یعنی جس راستے پہ کوئی چلے۔ یہ تو اشخاص کے راستے ہوتے ہیں۔ اب آج ہمارا پورا اسلام جسے ہم کہتے ہیں وہ مذہب ہے، اُسے مذہب کی حیثیت سے ہی متعارف کرایا جاتا ہے۔ اور پھر آگے جب ہم چلتے ہیں تو ہمارے ہاں فقہ آتی ہیں جن سے مختلف فرقے بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بات جو کہی گئی ہے ھو علیٰ مذہبِ ابی حنیفہ یا علیٰ مذہبِ شافعی وہ ابوحنیفہ یا شافعی کے مذہب پر ہے۔ مذہب کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُس راستے پہ چلا تھا جس راستے کے اوپر فلاں امام چلا تھا۔ یہی مذہب ہے جو ہمارے ہاں آج اسلام بن گیا ہے۔ اور اِسی چیز کے خلاف قرآن آیا تھا۔ یہ انسانوں کا نہیں بلکہ خدا کا دین ہے۔ دین کے متعلق تو اُس نے کہا ہے کہ اسے دین اللہ کہو۔ اِسے پیغمبر کا دین بھی نہیں کہا جا سکتا۔ دین خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے اور پیغمبر اُس

دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اور وہ خدا کی کتاب کے اندر منضبط اور محفوظ ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں تو آپ اب دیکھیں گے کہ کسی سے مذہب کے متعلق یا اسلام کے متعلق کچھ پوچھیے تو وہ جو کچھ کہے گا اُس کی نسبت یا سند کسی انسان کی طرف جا کر رک جائے گی۔ یعنی فلاں امام نے یہ کہا' فلاں مفسر کا یہ قول ہے' فلاں محدث کا یہ ارشاد ہے' فلاں بزرگ نے یہ فرمایا ہے۔ انہی تک بات ہوگی' یہاں قرآن کی بات نہیں آئے گی۔ کوئی بات جو اُنہوں نے کہا ہے اور وہ قرآن کے خلاف جاتی ہے اگر اُن سے اِس کے بارے میں کہا جائے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ صاحب! وہ ہم سے زیادہ قرآن سمجھتے تھے۔ یعنی اب قرآن ہمارے لیے بیکار ہو گیا کیونکہ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہم سے زیادہ اچھا جنہوں نے سمجھنا تھا' سمجھ لیا۔ اب جو کچھ وہ کہیں یا جو کچھ اُن کی طرف منسوب کیا جائے کہ یہ کچھ اُنہوں نے کہا تھا بس وہی چیز اب ہے اور اُسی کو دین مانیں گے' اُسی کو اسلام مانیں گے۔ قرآنی اسلام تو اِس کے خلاف صدائے احتجاج ہوتا ہے۔ اِسی لیے اُس نے اس آیت کے اندر رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہا ہے کہ اور تُو اور جنہیں تو محبوب رکھتا ہے یا تیرے عزیز ہیں' ضروری نہیں ہے کہ تُو اُنہیں بھی صحیح راستے پہ چلا دے۔ ہمارے سامنے تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ حضور ﷺ کے دو چچا ابو طالب اور ابولہب اسلام نہیں لائے تھے۔ تیسرے چچا جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے وہ آخر وقت میں بہت دیر کے بعد جا کر اسلام لائے تھے۔ وہ پوری مکے کی زندگی میں بھی اسلام نہیں لائے تھے۔ بہرحال ایسے تو عزیز ترین جو آپ کے رشتے دار تھے وہ بھی اسلام نہیں لائے تھے۔ حضورؐ کے تعلقات ان کے ساتھ عزیز داری کی حیثیت سے تھے۔

حقیقت سے ماوراء اور متضاد نظریات انسانی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں

اب ہمارے ہاں تو پھر جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دین نام ہی اشخاص پرستی کا ہو گیا ہے اور پھر وہ ایسا سلسلہ چلا' کہ اِس قسم کی روایات ہمارے ہاں آ گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ [1] کی محبت نہیں ہوگی اُس کے دل میں ایمان نہیں آ سکتا۔ تو گویا ایمان کسی ایک بزرگ کی محبت کے ساتھ مشروط ہو گیا۔ ایک فرقے نے یہ بات کہی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات پہلے آئی ہوگی جب ابھی عباسیوں کی حکومت نہیں تھی [2] اُس کے بعد عباسیوں کی حکومت آئی تو ایک حدیث یہ بھی ہے کہ آپؐ نے یہ فرمایا کہ جس شخص کے دل میں عباسؓ کی محبت نہیں ہوگی اُس میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا۔ اور جو یہ بنو فاطمہؓ اور بنو عباسؓ تھے یہ ایک دوسرے کے سخت دشمن چلے آ رہے تھے۔ تو اب مشکل پیدا ہو گئی کہ دو ایسی ہستیاں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور اُن کے متعلق یہ

---

[1] عباسیوں کی حکومت کا آغاز AD 750 میں ہوا اور AD 1258 تک رہا۔

[2] حضرت علیؓ بن ابو طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف پیدائش سال فیل 570ء کے 30 سال بعد 600ء وفات 40ھ (662-600ء)

دوحدیثیں آ گئیں، تو ایک دل کے اندران دونوں کی محبت جمع ہونی چاہیے۔ اور اُس کے بعد جب آ گے سلسلہ چلا تو پھر تو یہ مودۃ فی القربیٰ کے اعتبار سے جتنے بھی سید ہیں، جن کو آلِ رسول کہا جاتا ہے، اُن کی جو محبت ہے وہ جزوِ ایمان ہو گیا۔ جس نے محض اپنے نام کے ساتھ سید لکھ دیا ہے اُن پہ آپ درود وسلام بھیج رہے ہیں۔ آپ عدالت میں کسی کے خلاف فوجداری مقدمہ چوری کا یا بدمعاشی کا دائر کیے ہوئے ہیں اور وہ سید ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر آپ اُس کو ہزار گالیاں دیتے ہیں، جھوٹا ثابت کرتے ہیں۔ اتنے میں نماز کا وقت آ جاتا ہے تو اُس پہ آپ درود بھیجتے ہیں۔ یعنی اِس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اسلام نام ہی اشخاص کا رہ گیا ہے۔ کوئی کسی انتہائی حد تک چلا جاتا ہے، کوئی ذرا درمیان میں رہ گیا ہے لیکن بات تو یہی ہے۔ اسلام کے متعلق کوئی احکام پوچھیے تو وہ فقہ کے ہوتے ہیں۔ فقہا جو تھے وہ تو بہرحال اشخاص تھے۔ کسی کے متعلق کوئی عقیدہ رکھنا ہے تو اُس میں روایات وغیرہ آ جاتی ہیں۔ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ یہ دونوں روایتیں موجود ہیں۔ اور روایت کی پوچھیے تو وہ تو بات بہت آ گے جاتی ہے۔

مجھے کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں: پرویزؒ

اب تو آپ کو معلوم ہے کیونکہ آپ کم از کم بیس برس سے میرا درس سن رہے ہیں کہ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہوتی ہے۔ اللہ مجھے فرقہ بازی سے محفوظ رکھے۔ اس لیے نہ مجھے سنیوں سے کوئی تعلق ہے، نہ شیعوں سے کوئی واسطہ ہے لیکن قرآن کی آیت جب سامنے آ جاتی ہے تو اُس کی تشریح میں جو ہمارے ہاں کے بعض مروجہ خلافِ قرآن عقائد ہیں اُن کا ذکر نا گزیر ہو جاتا ہے۔

شیعہ حضرات کے ہاں ایک عقیدہ رجعت کا بھی ہے

شیعہ حضرات کے ہاں ایک عقیدہ اور بھی ہے۔ یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ابو طالب [1] حضور کے چچا تھے، یہ حضرت علیؓ کے والد تھے۔ وہ اسلام لائے بغیر فوت ہو گئے۔ یہ تاریخ میں ہے۔ اِن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ قیامت سے پہلے رسول اللہ ﷺ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ وغیرہ یہ حضرات دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ اسے رجعت کا عقیدہ کہتے ہیں۔ اس کا ماننا اُن کے ہاں ایمان میں داخل ہے۔ وہ دنیا میں دوبارہ آئیں گے اور ایک طرف تو وہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ [2] اور یزید [3] (ابوسفیان رضی اللہ عنہ تو

---

[1] ابو طالب کا انتقال 10 نبوی میں ہوا۔

[2] امیر معاویہؓ کا دورِ خلافت (661-680 AD)

[3] یزید بن امیر معاویہؓ کا دورِ خلافت (680-683 AD)

یزید کے دادا ہوئے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ) کو قتل کیا جائے گا اور دوسری اصل چیز' جس کے لیے یہ سب پیش ہوگا' یہ ہے کہ ابوطالب ایمان لائیں گے اور جب مسلمان ہو جائیں گے تو پھر قیامت آئے گی ۔ یعنی اب مشکل پڑ گئی تھی کہ حضرت علیؓ کے والد ابوطالب اسلام نہیں لائے اور دنیا سے اسی طرح کفر کی حالت میں انتقال کر گئے ۔ اب اس چیز کو برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد کفر کی حالت میں دنیا سے چلے جائیں ۔ اب وہ تو دنیا سے چلے گئے ۔ اب کیا کیا جائے ؟ تو اُن کے ہاں یہ عقیدہ رجعت ہے اور یہ مسلمہ ہے کہ قیامت سے پہلے یہ دنیا میں واپس آئیں گے اور وہ اُن کو قتل کریں گے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ایمان لائیں گے اور رسول اللہؐ کی بیعت کریں گے ۔ اور جب یہ مسلمان ہو جائیں گے تو پھر قیامت آئے گی ۔ اس لیے ان کا قیامت سے پہلے جو مسلمان ہونا ہے یہ بڑا ضروری ہو گیا ۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں عقائد اِس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں ۔ اِسے بھی اسلام کہا جاتا ہے ۔

ایمان کی شرطِ لازم

قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کہی تھی کہ اور تو اور جنہیں تو عزیز رکھتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی تیرے کہنے پر صحیح راستے کے اوپر چل جائیں ۔ اس میں تمہاری ذمہ داری نہیں ہے ۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ایمان یا اِس کے اوپر چلنا یہ انسان کے دل سے ابھرنے والی ایک خواہش کا نام ہوتا ہے ۔ یہ مجبوراً نہیں کرایا جا سکتا ۔ جبر کا ایمان' ایمان ہی نہیں کہلاتا : لَآ اِكْـرَاهَ فِـي الـدِّيْـنِ (2:256) ۔ دین میں جبر کا سوال ہی نہیں ہے ۔ جبر سے اگر آپ کسی کو چلانا چاہیں تو اُسے اُس راستے کے اوپر گھسیٹ کر تو لے جائیں گے لیکن جبر سے اُسے چلا نہیں سکیں گے ۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا' وہ مشہور ہے کہ گھوڑے کو آپ لگام سے پکڑ کر ندی تک تو لے جا سکتے ہیں' وہاں آپ اُسے جبراً پانی نہیں پلا سکتے ۔ وہ پانی اُسی صورت میں پیئے گا جب اُسے اندر پیاس کا تقاضا ہوگا ۔ ایمان کا تقاضا پیاس کا تقاضا ہوتا ہے' وہ اندر سے ابھرتا ہے ۔ اس لیے اِس میں تو جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہی بات ہے جو کہی ہے کہ تو راستہ دکھا سکتا ہے لیکن کسی کو اس راستے پہ چلا نہیں سکتا ۔

لفظ ''من یشآء'' کا قرآنی مفہوم اور ہمارے پیش کردہ تراجم

اب اگلی بات ہے جہاں سے ہم نے اِس کو پچھلے درس میں چھوڑا تھا ۔ یہاں قرآن نے کہا کہ اے رسول ! تُو بھی اگر چاہے تو تیرے جو عزیز ترین' محبوب تریں ہیں' اُن کو بھی تو راستے پہ نہیں چلا سکتا ۔ اور اگلا ٹکڑا ہے کہ وَ لٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (28:56) ۔ میں نے کہا تھا کہ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ تُو نہیں کر سکتا' ہم جسے چاہیں چلا سکتے ہیں ۔ میں نے کہا تھا کہ اگلی بات تو یہ ہوگئی کہ رسول سے کہا گیا کہ تُو جتنا جی چاہے زور لگا کر دیکھ لے لیکن تو نہیں چلا سکتا' جسے چاہیں گے ہم اُسے چلائیں گے ۔ اگر رسولؐ کسی کو زبردستی نہیں چلا

سکتا اور زبردستی کا ایمان نہیں ہوتا تو اگر اس پہ یہ کہا جائے کہ ہم جس کو چاہیں گے چلائیں گے تو پھر تو بات وہی زبردستی والی ہوگئی۔ جو چلنا نہیں چاہتا اُس کو رسول نے نہ چلایا تو خدا نے چلا دیا۔ زبردستی تو یہاں بھی ہوگئی۔ اور پھر ’’من یشآء‘‘ کا ترجمہ یہ کر دیا کہ جس کو ہم چاہیں گے اُس کو چلائیں گے۔ اِس طرح سے جس کو خدا راستے کے اوپر چلائے تو اُس کو کیا کریڈٹ جاتا ہے؟ اُس کے ایمان کے معنی کیا ہوئے کیونکہ اُس کو تو زبردستی خدا نے چلا دیا۔ اور جو صحیح راستے پہ نہ چلے اُن کے متعلق یہ کہا کہ خدا نے اِن کو چلانا چاہا ہی نہیں تھا' تو پھر اُن کا جرم کیا ہے؟ نہ چلنے والے کو کوئی ثواب اور نہ ہی نہ چلنے والے کو کوئی عذاب۔

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ اس طرح کیا چیز پیش کی جاتی ہے۔ جو بھی ترجمہ آپ اٹھا کر دیکھیے' اُس میں آپ کو یہی ملے گا کہ تُو نہیں چلا سکتا' ہم جسے چاہیں چلائیں گے۔ یہ چلنے والا تو بیچ میں ختم ہوگیا۔ رسول تو چلا نہیں سکتے' باقی رہ گیا خدا' تو خدا تو جسے چاہتا ہے اُسے چلاتا ہے اور کوئی دوسرا تو چلاتا ہی نہیں ہے۔ جس کو چاہا چلا دیا اور جس کو چلانا نہیں چاہا وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ عزیزانِ من! می نہ سزد خدائے را۔ خدا تو ایسی باتیں نہیں کہتا۔ میں نے جیسا پہلے عرض کیا تھا کہ محاورۂ عربی زبان کا ماہر اور عام بدو بھی جانتا ہے کہ ’’مَن یشآء‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ ’’جو چلنا چاہے' وہ چل سکتا ہے‘‘۔ اب بات صاف ہوگئی۔ رسول سے بھی یہ کہا کہ کسی کو صحیح راستے پہ چلانے کے لیے تیرا جی کتنا ہی کیوں نہ چاہے لیکن تُو بھی نہیں چلا سکتا۔ جو چلنا چاہے وہی چل سکتا ہے۔ جو چلنا نہ چاہے اُس کو تُو بھی نہیں چلا سکتا اور اُس کو ہم بھی نہیں چلائیں گے۔ بات کتنی صاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ** (28:56) ہم جانتے ہیں کہ کون کون اپنی مرضی سے اس راستے کے اوپر چلے گا۔ چلنا یا نہ چلنا انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے۔ دین اسلام نام ہی اس چیز کا ہے۔

انسانی اختیار و ارادہ کی اہمیت اور اس کی کیفیت

اب یہ بات رہی کہ کون چلتا ہے اور کون نہیں چلتا؟ کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! رسول اللہ ﷺ پر قرآن بھی اترا' حضورؐ نے قرآن کی تبویب بھی کی۔ شاید حضورؐ کے دل میں بھی یہ بات آتی ہو کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لے آتے۔ کہا کہ **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا** (10:99) اگر خدا کی مشیت یہ ہوتی کہ یہ لوگ اپنی مرضی سے کفر اور ایمان کا فیصلہ نہ کریں بلکہ ہم چلائیں تو ہمارے لیے کونسا مشکل تھا کہ ہم سارے انسانوں کو پیدا ہی ایسا کرتے کہ وہ اسلام ہی کے اوپر ہوتے۔ جیسا ہم نے باقی حیوانات کے متعلق یہ کچھ کیا کہ بکری کو پیدا ہی ایسا کیا کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت نہ کھا سکے' شیر کو پیدا ہی ایسا کیا کہ وہ گوشت کھائے اور گھاس نہ کھا سکے۔ تو اِسی طرح سے اگر ہم چاہتے یا انسان کو بھی اس طرح سے مجبور پیدا کرتے کہ وہ غلط راستہ اختیار کر ہی نہ سکتا لیکن پھر انسان تو حیوانات کی سطح کے اوپر ہوگا اور ہم تو اِسے اس سطح سے بلند رکھنا چاہتے ہیں۔ اِسے ہم نے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے اور دوسرے کسی حیوان کو یہ اختیار نہیں دیا۔ اِس کو صاحبِ اختیار بنایا ہے اور راستہ دکھا کر کہا ہے کہ تُو انسان ہے' تو حیوان نہیں ہے۔ تم اپنے

فیصلے سے جو راستہ چاہتے ہو وہ اختیار کرو۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے وہ صحیح راستہ اختیار کرے، جس کا جی چاہے وہ غلط راستہ اختیار کرے۔ ہم نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے، اب تمہاری مرضی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ راستہ اختیار کرے۔ اب یہ بات کہ سارے انسان مسلمان ہی کیوں نہیں ہو گئے اور ایماندار کیوں نہیں، دیانتدار کیوں نہیں ہیں، عدل کیوں نہیں ہوتا؟ کہنے لگے کہ اگر ہمیں یہ مقصود ہوتا کہ یہ اپنا اختیار و ارادہ نہ رکھیں بلکہ جس راستے پہ ہم اِن کو چلانے پہ بالجبر مجبور کریں، یہ چلیں تو ہم اِن کو پیدا ہی ایسا کرتے جیسا کہ حیوانات کو کر دیا ہے لیکن ہماری مشیّت یہ نہیں تھی۔ انسانوں کے متعلق ہماری مشیّت یہی تھی کہ یہ اپنے اختیار و ارادے سے چلے۔

مومن بنانے کے سلسلہ میں زبردستی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

عزیزانِ من! اگلا لفظ ہے کہ اے رسول! جب ہم نے انہیں صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے اور یہ اپنی مرضی سے چاہیں کہ کونسا راستہ یہ چاہتے ہیں۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10:99) تُو کیا تو زبردستی کرے گا کہ اِن کو ضرور مومن ہونا چاہیے۔ اگر زبردستی کرنا ہوتی تو ہمارے لیے کیا مشکل تھا کہ ہم ایسا ہی پیدا کرتے۔ ہم نے تو انہیں ایسا پیدا نہیں کیا کہ یہ اسلام کے اوپر زبردستی چلیں۔

ایمان لانے کا عمل اور رِجس کا مفہوم

قرآن کہتا ہے کہ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (10:100) ایمان تو خدا کے قانون کے مطابق لایا جاتا ہے۔ اور اُس کی پہلی شرط یہ ہے جس کے بغیر انسان ایمان نہیں لا سکتا۔ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (10:100) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اُن کا معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔ ایمان لانے کے لیے یہ شرطِ اول ہے کہ عقل و فکر سے کام لیا جائے تو پھر انسان صحیح فیصلہ کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر معاملہ Confuse (الجھا) سا رہ جاتا ہے، مشتبہ رہ جاتا ہے۔ یہ رجس بڑا عجیب لفظ ہے۔ میں کیا کروں کہ مجھے پھر اپنی مادری زبان کی طرف آنا پڑتا ہے۔ ''اک ہونداا ے کچولا مار دینا''۔ [1] مٹی اگر پانی کے نیچے تہ میں بیٹھی ہوئی ہو اور اوپر پانی ہو تو وہ پانی اور مٹی الگ ہوتا ہے۔ اُس کے اندر کوئی ایسی چیز پھیر دینا کہ وہ گڈمڈ ہو جائے تو اِسے ''کچولا مار دینا'' کہتے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہ لفظ ہے۔ کہا کہ جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا تو بات یہ ہے کہ ''اونوں کچولا وج جانداا ے''۔ [2]

---

[1] ایک ہوتا ہے ''کچولا مارنا''۔

[2] اسے کچولا لگ جاتا ہے۔

کیا الفاظ ہیں اور یہ کیا زبان ہے! وہ ایسی چیز ہوتی ہے جس میں پانی بھی ہوتا ہے اور مٹی بھی ہوتی ہے لیکن وہ اِس طرح سے ملی ہوتی ہے کہ نہ اُس میں سے پانی الگ ہوتا ہے نہ اُس میں سے مٹی الگ ہوتی ہے۔ اُس کی شکل ہی عجیب ہوتی ہے۔ کہا کہ حق اور باطل دونوں یہاں موجود ہوتے ہیں لیکن عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (10:100) جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے وہ آپس میں اِس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں جس طرح کسی نے ''کچولا مار یا ہویا ہووے''۔ عقل وفکر سے کام لینے والوں کے سامنے حق اور باطل کی جو تمیز نہیں ہوتی تو اُس کی یہ وجہ ہوتی ہے ورنہ اگر وہ اُس سے کام لے تو بات تو ہم نے بڑی صاف صاف کی ہوئی ہے۔

قرآنی ہدایت کے شفاف ہونے کے ثبوت میں کائنات کی مثال کافی ہے

بات دوسری طرف نکل جائے گی ورنہ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (10:101) اِن سے کہو کہ اپنی دنیا میں کیا دیکھتے ہو ذرا کائنات میں دیکھو کہ وہاں کس طرح ہمارا قانون کارفرما ہے۔ اس لیے کہ ''اوتھے کوئی کچولا نہیں ماردا''۔ [1] عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے تو واضح طور پہ یہ کہہ دیا ہے۔ وہی آیت جس کو میں بار بار پیش کیا کرتا ہوں اور وہ صد بار پیش کی جانی چاہیئے جس میں قرآن نے مومن کی Definition (تعریف) دی ہے: مومن وہ ہے ایمان وہ لاتا ہے: وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (25:73) اور تو اور اِن (مومنین) کے سامنے جب خدا کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ اُن کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کے نہیں جھکتے۔ یہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے۔ کسی چیز کو اندھے بہرے بن کے تسلیم کرنا ایمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے کہ وَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ [2] (28:56)

ضد کا عنصر اور مالی مفاد حق کو حق تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں

اب ہم اگلی آیت کی طرف چلتے ہیں۔ کہا کہ وَ قَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (28:57)۔ اب ایک اور اعتراض پڑا۔ ایمان تو یہ ہے کہ جس بات کو آپ حق سمجھتے ہیں وہ صداقت ہے پھر آپ اُس کو تسلیم کرلیں کہ یہ صداقت ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کی مفاد پرستیاں راستے میں حائل ہو جاتی ہیں اور وہ فیصلے اِس بات پہ کرتے ہیں کہ انہیں زیادہ فائدہ کدھر ہونے میں ہے۔ یعنی کفر اور ایمان کی بات نہیں ہے وہ دیکھتے یہ ہیں کہ انہیں فائدہ مسلمانوں کا ساتھ دینے میں ہے یا کفار کا ساتھ دینے میں ہے۔ کہا کہ یہی چیز اِن کے ہاں ہوگئی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے جو یہ مفاد پرستی کی پیش کی جا رہی ہے۔ اب مسلمانوں کی مکے کی

---

[1] وہاں کوئی کچولا نہیں مارتا۔

[2] خدا کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس طرح عقل وفکر سے کام لے کر صحیح راستہ کون لوگ اختیار کرتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 898)۔

زندگی ہے' یہ بہت مختصر سی جماعت ہے' نہ دولت' نہ قوت' نہ اقتدار' نہ کعبے کی تولیت' نہ اتنی بڑی سوداگری جیسی قریش کی تھی۔ کہا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی اس جماعت میں شامل ہو جائیں جو بڑی اقلیت کی جماعت بھی ہے اور غریبوں کی جماعت بھی ہے' ہمیں تو نظر آتا ہے کہ یہ باہر کے جو بڑے بڑے لوگ ہیں وہ ہمیں اچک کر لے جائیں گے' اس لیے ہم ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یعنی اب فیصلہ کرنے کا معیار ان کے ہاں یہ ہو گیا۔ کن لوگوں کے ساتھ رہنے میں ہمارا فائدہ ہے' حق اور صدق معیار نہ رہا۔ قرآن نے کہا کہ ذرا پہلے یہ تو سوچو کہ ہم تم سے کیا کہتے ہیں؟ یہ جو کعبہ ہے اُس کعبے کے مجاور ہونے کی حیثیت سے تم لوگوں کو تمام مفاد حاصل ہیں۔ قریش کے مفاد ہی کعبے کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ اُس زمانے میں بہت بڑا مندر تھا۔ یہ سارے اُس کے بہت بڑے بڑے مہان تھے' بہت بڑے مجاور تھے۔ ویسے یہاں مالی فائدہ بھی تھا اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم تھی' بہت عزت تھی۔ جیسے ہندو' گو کہ اب وہ ہمارے ہاں ہوتے نہیں' جس راستے پہ چلتے تھے وہ سڑک اُن کے لیے مخصوص تھی' دوسرے لوگ اُس راستے پہ نہیں چل سکتے تھے' جس قسم کا وہ چاول کھاتے تھے کوئی دوسرا وہ چاول نہیں کھا سکتا تھا۔ ان مندروں کے پنڈتوں کی تو پوچھو نہیں کہ کیا صورت ہے۔ قریش کی بھی یہ صورت تھی۔ کہا کہ اَوَ لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجۡبٰٓى اِلَيۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَ لٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (28:57) اب بھی ان سے جن کے ہاں اتنی قوت' دولت اور حشمت ہے پوچھو تو یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم ان کے ساتھ ہو گئے تو یہ سب کچھ چھن جائے گا۔ کہا کہ کعبے کے ساتھ تمہاری نسبت ہے' اُس بنا پہ تمہیں یہ سارے مفاد حاصل ہیں۔ جس جماعت کے ساتھ ملنے کے لیے تم سے کہا جاتا ہے اُن کے ہاتھوں سے کعبہ چھنتا نہیں ہے۔ اس لیے اگر آپ اُن کے ساتھ ہوتے ہیں تو کعبہ تو یہی رہے گا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ پھر اسلام میں اور ہمارے اِس کفر میں کیا فرق پیدا ہوا کیونکہ کعبہ تو یہی رہا۔ کہا کہ بس اُس میں اتنا سا فرق ہو گا۔

کعبے کے مجاور ہونے کی بنا پر عرب میں قریش کے وقار کی کیفیت

سورۃ قریش میں ہے کہ لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍ ۝ اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ (106:1-2)۔ قریش کو اِس عرب کے اندر یہ پوزیشن حاصل ہے کہ کسی کا کوئی قافلہ محفوظ نہیں رہتا تھا' اتنی لوٹ مار عام ہوتی تھی لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ کعبے کے ساتھ نسبت کی بنا پر تمہارے قافلے سردیوں گرمیوں میں سارے ملک میں رواں دواں چلتے رہتے ہیں۔ ایک نشان ہوتا ہے کہ یہ کعبے کے مجاوروں کا یا قریش کا قافلہ ہے۔ کوئی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ کہا کہ آج بھی اِس کعبے کی طرف نسبت کی وجہ سے تمہاری یہ کیفیت ہے لیکن تم نے اِس کعبے کو خود لوٹ کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اپنی من مانی کرتے ہو۔ مہنت ہونے کی حیثیت سے خود قانون بنا کر لوگوں کے اوپر نافذ کرتے ہو' اپنی حکومت قائم کیے ہوئے ہو۔ کہا کہ فرق صرف اتنا ہی ہے۔ کعبہ کعبہ ہی رہے گا۔ تم اگر اِس جماعت کے ساتھ مل جاؤ

گے ان کو تمکن حاصل ہوگا۔ کعبہ کی مرکزیت یہی رہے گی۔

عزیزانِ من! غور فرمایئے گا کہ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے۔ کہا ہے کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ o الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (106:3-4) وہ رب جس نے انہیں اب بھی اس کعبے کی نسبت کی بنا پر بھوک سے بھی اطمینان دلایا ہوا ہے اور اِن کو کسی کا خوف اور ڈر بھی نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (106:3) یہ جو گھر ہے جس کی نسبت سے تمہاری یہ کیفیت ہے تو اس گھر کا کوئی مالک بھی تو ہے۔

خادمین کعبہ کا فریضہ اور ان کی فضیلت

ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ جو اِس گھر کا مالک ہے اُس کے احکام کی اطاعت کرو اور پھر موج کرو۔ عزیزانِ من! کعبے کی جو تولیت ہے جسے آپ خادمِ حرمین کہتے ہیں' اُس کے لیے یہ شرط تھی کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (106:3) اس گھر کے مالک کے احکام کی اطاعت کرو۔ اگر کعبے کی تولیت کسی بھی دور میں کسی کے پاس بھی ہو' اگر وہ ربِ کعبہ کی اطاعت نہیں کرتے ہیں تو وہ وہی قریش ہیں' جو زمانہء جاہلیت کے اندر تھے۔ قرآن نے یہ فرق بتایا ہے کہ کعبہ کعبہ ہی رہے گا۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن دو لفظوں میں کیا بات کہہ جاتا ہے کہ کعبہ بھی وہی ہے' کعبہ کے خادم بھی وہی ہیں' متولی بھی وہی ہیں۔ اُس کے ساتھ وابستہ ہونے کے ساتھ عزت وتکریم واحترام بھی وہی' مفادات بھی وہی لیکن فرق اتنا ہے کہ اِس گھر کے مالک کے احکام کی اطاعت کرو۔ ''کرایہ دار تے ایناں تے ضروری ہے' مالکِ مکان دی اینی نے رعایت رکھے''۔ [1] یہ میں نے ایسے ہی نہیں کہا۔ قریش میں سے ایک بڑا تھا' اُس نے ایک مشک شراب کے لیے کعبے کو کسی کے پاس رہن رکھ دیا تھا۔ عزیزانِ من! کسی کے کچھ ہاتھ آئے سہی تو وہ بیچ کے کھا جاتے ہیں۔ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ o الَّذِيْٓ (106:3)۔ ہم کہتے ہیں کہ اِسی گھر کے اندر رہو' خوش رہو' تم سے چھینتے نہیں ہیں بس اتنی سی بات ہے کہ محکومیت اُس کی اختیار کرو' پھر سب کچھ حاصل ہوگا۔ اب ان کی یہ بات کہ صاحب! اگر ہم نے اس کمزور سی' غریب سی جماعت کا ساتھ دیا' اِس کے ساتھ ہو گئے تو ہمیں بھی غریبی آ جائے گی۔

قوموں کی تباہی کا سبب صرف غربت ہی نہیں ہوتی

کہا کہ ایک بات اور بھی سن رکھو۔ قومیں غریبی کے ہاتھوں ہی تباہ نہیں ہوا کرتیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مفلسی اور غریبی بھی خدا کا غضب ہے لیکن قوموں کی تباہی کا یہی ایک سبب نہیں ہے۔ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ م بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58) تاریخ سے پوچھو کہ

---

[1] کرایہ دار کے لیے اتنا تو لازم ہے کہ وہ مالکِ مکان کی اتنی سی تو رعائت برقرار رکھے۔

کتنی ایسی قومیں تباہ ہوئیں جن میں رزق کی بڑی فروانیاں تھیں، بڑی دولت اُن کو حاصل تھی۔ وہی قومیں تباہ نہیں ہوئیں جو مفلس تھیں، جن کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ وہ بھی تباہ ہوئیں جن کے پاس رزق کی بڑی فراوانی تھی، بہت زیادہ معیشت کی فراوانیاں تھیں۔ ایسی قومیں بھی تباہ ہوئیں۔ کیا خوب قرآن کے کہنے کا انداز ہے! عرب کے اردگرد جو مضافات تھے اِس میں پہلے یہ سامی اقوام، عادؑ ثمود اور لوط تھیں۔ اُن کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات اِن کے راستوں میں پڑتے تھے۔ کہا کہ یہ کتنی ایسی قومیں تھیں جو اِس لیے بھی ہلاک ہوئیں کہ ان کے ہاں دولت اور رزق کی فراوانیاں تھیں۔

غربت کی نسبت دولت کا نشہ زیادہ تباہ کن ہوتا ہے

اصل یہ ہے کہ غریب اور مفلس تو پھر بھی کچھ وقت تک اپنے اوپر کچھ ضبط کر لیتا ہے کہ وہ اس قسم کی بدروی اختیار نہ کرے لیکن افراطِ دولت کا جونشہ ہے اُس میں تو انسان بیہوش ہوجاتا ہے، مدہوش ہوجاتا ہے، زیادہ تباہی اِس سے آتی ہے۔ **لَمۡ تُسۡكَنۡ مِّنۢ بَعۡدِهِمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا** (28:58) وہ اجڑے تو اُس کے بعد یہ ویران کی ویران رہ گئیں۔ اِس کے بعد ان میں کوئی نہیں بسا۔ الا قلیلًا. بس یونہی کوئی اکا دکا آیا اور بس گیا ورنہ یہ ویران کی ویران رہ گئیں۔

صرف شرفِ انسانیت کا چراغ ہی بستیوں کو روشن کرتا ہے

یہ جو ہمارے ہاں ایک مالیاتی ریونیو سسٹم ہے اُس میں ایک Term (اصطلاح) ہے۔ وہ یہ بتانے کے لیے بڑی Graphic ہے کہ اجڑے ہوئے گاؤں کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اُن کے ہاں اس خانے میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں گاؤں بے چراغ ہے یعنی وہ گاؤں جس میں دیا نہیں جلتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ویرانے کی بڑی عجیب Description (توضیح) ہے۔ کتنا ہی اجڑا ہوا کیوں نہ ہو بہر حال اُس میں اگر کوئی بستا ہے تو رات کو دیا تو جلتا ہے۔ اُن بستیوں کے متعلق کیا کہا جائے کہ جہاں نورانیت کی کرن بھی نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! یہ دیئے تیل کے قمقمے ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ تو شرفِ انسانیت کے سب سے اونچے دیئے ہوتے ہیں۔ جن بستیوں میں شرفِ انسانیت کا دیا نہیں جلتا، تو اُن سے زیادہ ویران اور کوئی بستی نہیں ہوتی۔ یہ ہیں اُن کی بستیوں کے کھنڈرات، کھنڈرات کی اینٹوں کے اوپر اُن کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ تم تو صبح شام اُن پر سے گزرتے ہو۔ اُن داستانوں کو جا کر پڑھو کہ جہاں رزق کے نہ ہونے نے، مفلسی نے، قوموں کو تباہ کیا، وہاں افراطِ رزق کی مدہوشی نے بھی انہیں کتنا تباہ کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ رزق کی جو فراوانی ہے اُس سے کیسے تباہی آتی ہے؟

قوموں کے زوال کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی ایک پیش کردہ مثال

دوسرے مقام پہ قرآن کریم نے کہا کہ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (16:112) مثال کے طور پر ان کو بات سمجھاؤ' مثال سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ جو نظریہ Academic (نظری سا) ہوتا ہے' وہ غیر محسوس شے ہوتا ہے' وہ لفظوں میں ہوتا ہے۔ مثال محسوس اور مرئی شے کی دی جاتی ہے' Concrete ہوتی ہے' اس لیے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قرآن اس لیے بات کو مثالوں سے سمجھاتا ہے۔ کہا کہ مثال کے طور پہ ایک بستی تھی' اُس کی کیفیت یہ تھی کہ اُس میں رزق کی بڑی فراوانیاں تھیں' چاروں طرف سے رزق کھنچا چلا آ رہا تھا۔ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (16:112)۔ اُن سے یہ کہا تھا کہ یہ سب کچھ جو آ رہا ہے یہ پوری نوعِ انسانی اور پورے معاشرے کی نشوونما و پرورش کے لیے ہے' ان کو کھلا رکھو۔ ہر ایک کو معلوم ہو کہ ہمارے ہاں کتنا ہے اور اُس کے مطابق اُس میں سے ہر ایک کا حصہ ہونا چاہیے۔ اتنا کچھ آتا تھا۔

عربی زبان میں كَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ کا مفہوم نعمتوں کو چھپا کے رکھ لینا ہے

اُن بستی والوں نے یہ کیا کہ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16:112)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے خدا کی ان نعمتوں سے کفر برتا۔ اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کفر اور ایمان تو ایسی چیزیں ہیں کہ جو ایمان نہ لائے تو وہ کافر ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں سے کفر برتا۔ عربی زبان میں ''کفر'' کے معنی ''چھپا کے رکھ دینا'' ہیں۔ اُنہوں نے یہ کیا کہ بجائے اِس کے کہ وہ نعمتیں عام کرتے بلکہ جس شخص کے ہاتھ لگی' اُس نے وہ نعمت چھپا کے رکھ لی۔ یہ ہے کہ دولت کی افراط سے تباہی کیوں آتی ہے۔ کہا کہ یوں سمجھاؤ۔ بڑی افراط سے دولت آ رہی تھی' بڑی افراط سے رزق اکٹھا کیا۔ اِنہوں نے یہ کیا کہ جس کے ہاتھ بھی لگ گیا اُس نے اُس کو چھپا کر رکھ لیا۔ کفر کے معنی ''چھپا لینا'' ہوتا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (16:112) بھوک کا اور خوف کا عذاب اُن کے اوپر آ گیا۔ وہ روٹی تک کے لیے دوسروں کے محتاج ہو گئے اور ہر وقت دل کو دھڑکا رہا کہ اب اُس نے مارا' اب اُس نے جھپٹا' اب وہ آیا۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کے دو ہی عذاب ہوتے ہیں۔ ایک بھوک کا عذاب اور دوسرا خوف کا عذاب۔ جو بستی انعاماتِ خداوندی کے ساتھ یہ کرتی ہے' جسے ہم کفرانِ نعمت کہتے ہیں' جو یہ کرتی ہے تو اُس بستی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بھوکی بھی مرتی ہے' روٹی تک کے لیے دوسروں کی محتاج ہوتی ہے اور ساری دنیا سے ڈرتی رہتی ہے۔

انسانی زندگی کے لیے بھوک اور خوف کا عذاب سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے

عزیزانِ من! بھوک اور اُس کے ساتھ خوف جیسا بڑا عذاب کوئی نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ

الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ ❶ (16:112)۔کہا کہ یہ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (16:112) اُنہوں نے بجائے اِس کے کہ اِس رزق کی تقسیم کا انتظام خداوندی طریق پر رکھتے' اُنہوں نے اپنا مصنوعی نظام بنایا اور اُس کی رو سے اِس کی تقسیم شروع کر دی: بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (16:112)۔صنعت کا لفظ یہیں سے ہے: مصنوعی نظام بنا دینا۔ جب بھی نظامِ خداوندی کی بجائے انسانوں کی صنعت کاریوں کا نظام قائم ہوگا تو یہ ہوگا کہ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (28:58) ان بستیوں میں پھر کوئی نہ بسا۔ اور آگے ہے وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (28:58) اُس کے بعد ان کا کوئی مالک نہ ہوا۔ ہم اُس کے مالک ہو گئے۔

اجڑی ہوئی بستیوں میں پھر کوئی شخص مالکانہ حقوق کا دعویٰ کرنے والا باقی نہیں رہتا

اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی ہر چیز کا مالک ہے' پھر یہاں جو کہا ہے کہ ہم اِس کے مالک ہو گئے تو اِس کے کیا معنی ہوئے؟ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے اور اس کی مثال ہمارے آج کے ہاں کے قانون سے دی ہے۔ یہ زمینیں' یہ چیزیں لوگوں کی ذاتی ملکیت میں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں قانون یہ ہے کہ اگر حکومت رفاعِ عامہ کے کسی مقصد کے لیے چاہے تو ان مالکوں کی زمین کو Acquire (نے) کر سکتی ہے' کچھ معاوضہ دے کر لے سکتی ہے۔ اب پہلا Step (قدم) تو یہ ہوتا ہے کہ حکومت خود اُن زمینوں کو Acquire (لے کر) کر کے اُس کی Possession (ملکیت) خود لے لیتی ہے' خود اُس کی وارث بن جاتی ہے۔ اور یہ کرنے کے بعد اُس زمین کا قبضہ اُن کی طرف منتقل کر دیتی ہے جن کے لیے یہ زمین Acquire کی جاتی ہے۔ تو عجیب چیز ہے کہ اُس قبضہ دینے کے اندر یہ دو شقیں رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اُس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ حکومت نے فلاں فلاں مالکانِ اراضی سے یہ زمین Acquire (لے کر) کر کے اپنے قبضے میں لی اور پھر اس کا قبضہ فلاں جماعت' فلاں کمیٹی' فلاں آرگنائزیشن' فلاں کارپوریشن کی طرف منتقل کیا۔ کچھ یوں نظر آتا ہے کہ یہ قانون تو یہاں سے لیا ہوگا۔ قرآن میں یہی لفظ کہا ہے کہ پھر ایسے ظالموں سے جو اس طرح سے کفرانِ نعمت کرتے ہیں ہم اُن کی مقبوضات کو چھین لیتے ہیں۔ اور پھر اس کو ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں جو اس قسم کے ظالم نہیں ہوتے۔

فرعون کی فرعونیت کا انجام قوموں کے لیے باعث عبرت ہے

اسی سورۃ القصص کے شروع میں بنی اسرائیل کی بات ہو رہی تھی کہ فرعون نے اِن کے اوپر اس قدر ظلم کر رکھا تھا' استبداد کر رکھا تھا' سب کچھ چھین رکھا تھا۔ کہا کہ پھر ہم نے چاہا کہ ان لوگوں کو' جنہیں اس طرح کچلا جاتا ہے' ان کے اوپر احسان کریں۔ نَجْعَلَهُمْ

---

❶ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 622)۔

اَئِمَّةً (28:5) ان کو اقتدار بھی دیں۔ وَ نَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِيۡنَ (28:5) اور پھر ان چیزوں کا قبضہ اپنے ہاتھ میں لے کر بنی اسرائیل کی طرف منتقل کر دیں۔ آپ دیکھیے کہ اس صورت میں مالک خدا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ یہ Land Acquision (قبضہ زمین) میں بھی یہ چیز ہے کہ گورنمنٹ اُن کو منتقل تو کر دیتی ہے لیکن Agreement (معاہدہ) میں شرط لکھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اگر تم نے اس Agreement (معاہدہ) کی شرط کے خلاف کیا تو اس کا قبضہ پھر واپس حکومت کی طرف لوٹ آئے گا۔ یہ جو ''ورثہ'' کا لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے کہ پھر اُس کے بعد ہم وارث ہوتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے ہاتھ میں اُس کو لے کر اپنے قانون کے مطابق پھر دوسرے کی طرف اِس کو منتقل کرتے ہیں۔ یہ کن لوگوں کی طرف منتقل کیا جاتا ہے؟ وَ لَقَدۡ كَتَبۡنَا فِى الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ (21:105)) آسمانی کتابوں میں یا زبور ایک خاص کتاب ہے یہ دونوں معنی ہو سکتے ہیں ہم نے ان میں واضح قوانین دینے کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ یاد رکھو! ہمارا اصول یہ ہے کہ اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ (21:105) یہ جو ارض ہے' یا مملکت بھی اس کے معنی ہوتے ہیں' ارض کے معنی اقتدار بھی ہوتا ہے' ارض کے معنی زمین بھی ہوتا ہے' یہ جو کچھ بھی آپ کہیں' مملکت اور اقتدار کے لیے زمین تو پہلی چیز ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام میں ملکتِ زمین کا یہی اصول ہے

ہمارا اصول یہ ہے جو ہم نے لکھ دیا تھا کہ جو لوگ اِس میں دھاندلی کریں گے اُن سے ہم چھین کر جب اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں تو وہ اس لیے کہ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ (21:105) ہم اُن لوگوں کو دیں جو عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ ہیں' جن کے اعمال صالحہ ہوں پھر ہم اُن کو دیتے ہیں۔ اس لیے ان سے چھینتے ہیں ورنہ ہم نے ان سے چھین کر کیا کرنا ہے۔ ویسے تو وہ زمین و آسمان کا مالک ہے۔ مستغنی اتنا ہے کہ اتنا بڑا مالک ہے کہ ''کتھے گھر ہی نہیں بنایا ہُن تیکر''۔ ❶ خدائی اُس کو چچتی ہے جو اتنا بڑا مالک ہو اور اپنے لیے مکان تک نہ بنائے۔ ملکیت کی تو کیفیت یہ ہے اور خود اپنی ذات کی کیفیت یہ ہے۔ وہ ان کے لیے یہ کرتا ہے۔

ذاتِ خداوندی انسانوں کو زمین استعمال کے لیے تو دیتی ہے' اس کے مالکانہ حقوق نہیں دیتی

ان سے چھینتا ہے اور پھر خود اپنے قانون کے مطابق جس کو دیکھتا ہے کہ ان کو یہ ملنی چاہیے اور یہ اس کو ٹھیک طریقے سے رکھیں گے' یہ کفران نہیں کریں گے' اس لیے ہم اُن لوگوں سے چھین کر اِس کی وراثت ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں جو واقعی اس کا صحیح استعمال کریں گے۔ کہا کہ یہ ہے ہمارا قانون اور ہمارا انتظام۔ اس لیے اس کے بعد کہا کہ وَ كُنَّا نَحۡنُ الۡوٰرِثِيۡنَ (28:58) اس کے مالک

---

❶ کہ اب تک اپنا گھر ہی کہیں نہیں بنایا۔

ہم ہی ہو گئے۔ تو اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا پہلے وارث نہیں تھا اور اُس کے بعد وارث ہو گیا۔ ہم اُن سے چھین لیتے ہیں تا کہ اس کی تقسیم صحیح عدل کے مطابق کریں، حقوق کے مطابق کریں۔ اور اگلی بات نے تو بات واضح کر دی۔ کہا کہ **وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى** (28:59) یہ جو ہم نے کہا ہے کہ دیکھو! کتنی بستیاں تھیں جن کو تباہ کر دیا گیا، جو تباہ ہو گئیں، ہم یہ دھاندلی سے نہیں کیا کرتے۔

خدا تعالیٰ کسی قوم کو بھی متنبہ کیے بغیر تباہ نہیں کرتا

اِس میں دو چیزیں بتائیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ **حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا** (28:59) پہلی چیز یہ ہے کہ وہاں ایک Warn (تنبیہ) کرنے والا بھیجا جاتا ہے۔ وہ اُن کو بتاتا ہے کہ اپنی اِس روش سے باز آ جاؤ، تمہاری یہ روش تمہیں تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ بڑا عجیب اصول ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ Ignorance of Law is no excuce کہ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ اِس طرح سے قانون کو نافذ کرے کہ ایک ایک شخص کو اُس کا علم ہو جائے۔ قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ ہم کسی بستی کو اُس وقت تک تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ پہلے اُن کو وارننگ نہیں دیتے کہ تمہاری یہ روش تمہیں تباہی کی طرف لیے جا رہی ہے۔

قوموں کے مرضِ کہن کا علاج مملکت کے سرکردہ اعلیٰ اور بااختیار لوگوں کی اصلاح میں ہے

کہا کہ **فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا** (28:59) یہ بھی بڑی چیز ہے، اور قرآن کا تو ایک ایک لفظ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ قومِ عاد کے متعلق تھا کہ حضرت ہودؑ ان کی طرف آئے تھے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ یا اللہ! تم نے مجھے بھیجا ہے کہ ذرا ان کی اصلاح کروں۔ میں کس کس کی اصلاح کروں، یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، یہاں تو خرابیاں عام ہو رہی ہیں، معاشرے کے تمام افراد جس جس کے اوپر نگاہ دوڑا کے دیکھیے، وہ تمام کے تمام ان برائیوں کے اندر ملوث ہیں۔ میں کس کس کا علاج کروں، کیسے یہ علاج کروں؟ کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ جتنے اس طرح سے پھر رہے ہیں یہ متعدی مرض ان کو آ کے چمٹ گیا ہے۔ جہاں سے مرض شروع ہوا ہے وہ ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو مملکت کا Capital (دارالخلافہ) ہوتا ہے اُس میں نو بدمعاش بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اُن کو ٹھیک کر لو گے تو سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ قومِ عاد سے کہا گیا اور یہ بات پانچ چھ ہزار سال پہلے کی کہی گئی ہے۔

ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ کتنی بنیادی چیز ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہاں جو **حَتّٰى يَبْعَثَ** (28:59) کہا تھا تو ساتھ یہی کیوں نہ کہہ دیا کہ تاوقتیکہ ہم اُن میں پہلے رسول نہیں بھیج دیتے بلکہ کہا کہ **فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا** (28:59) اُس کے کیپٹل سٹی میں پہلے ہم پیغامبر بھیجتے ہیں کہ ان

خرابیوں کا سارا سرچشمہ وہیں ہے۔

ختم نبوت کے بعد رسالت کا فریضہ پوری امت کی ذمہ داری ہے

اب یہ نہ کہیے کہ صاحب! اب نبوت تو حضور ﷺ پہ ختم ہوگئی اور اب رسول ہی نہیں آتے' اب تو وہ بھیجتا ہی نہیں تو پھر موج ہوگئی۔ یہاں (28:59) میں خدا نے رسول کہا ہے' نبی نہیں کہا۔ ختم نبوت ہوئی ہے۔ حضورؐ کی رسالت تو قرآن کے اندر موجود ہے۔ یہ جو پیغام پہنچانے والی بات ہے یا یہ جو پیغام ہیں تو یہ اب مقصد ہیں۔ اور اُن کے ذمے یہ پیغام پہنچانا ہوجاتا ہے جو اس پیغام کو سمجھیں۔ قرآن نے تو کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہم نے اِس اُمت کو اِس کتاب کا وارث بنادیا ہے' پیغام رسانی کا یا تبلیغ کا جو فریضہ حضور ﷺ کے اوپر تھا وہ اب اِس اُمت کے اوپر ہوگا۔ اس لیے یہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ بتائیں کہ خدا کا پیغام کیا ہے لیکن جب وہ پوری کی پوری امت ہی اس راستے پہ چل پڑے تو پھر کوئی کسے راہنما کرے۔ بہرحال قرآن نے کہا ہے کہ وہ جو اُس کا کیپٹل سٹی ہوتا ہے' اُس کے اندر سب سے پہلے اصلاح کی کوشش کرتے ہیں: **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا** (28:59) اور اگلی بات ہے کہ **وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ** (28:59) اور یہ سمجھ رکھو کہ ہم کسی قوم یا بستی یا مملکت کو ایسے ہی تباہ نہیں کردیتے۔ ہم اُنہیں تباہ کرتے ہیں جہاں ظلم کا دوردورہ ہو' جہاں دھاندلی ہو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان کے اندر یہ لفظ "ظـلـم" بڑا وسیع المعنی ہے۔ بنیادی طور پہ اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جہاں کسی چیز یا کسی شخص کو ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ ہو بلکہ جسے وہاں نہ ہونا چاہیے وہ وہاں ہو۔ اِسے ظلم کہتے ہیں اور یہ بڑی جامع چیز ہے۔ کہا کہ ہم کسی بستی کو اُس وقت تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ **اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ** (28:59) اگر اُس کے رہنے والے ظالم ہوتے ہیں تو پھر اُن کی تباہی آتی ہے۔ اب یہ رہا کہ دولت کی فراوانیوں کے باوجود تباہیاں آجاتی ہیں۔ کہا وہ دولت کی فراوانیاں بھی اگر ہوں تو دو قسم کے تصوراتِ حیات ہوتے ہیں۔

زندگی دو تصورات کو محیط کیے ہوئے ہے

ایک تصور یہ ہے: کیا کارہائے نمایاں کر گئے' بی اے کیا' نوکر ہوئے' پنشن ہوئی اور مر گئے۔ باقی رہا مرنے کے بعد کیا ہوگا تو ہر کوئی یہ سن کر کان کھڑے کرے گا کہ بتائیں تم کو کہ کیا ہوگا؟ احباب پلاؤ کھائیں گے اور فاتحہ ہوگا۔ ایک تو تصورِ حیات یہ ہے کہ کھاؤ پیؤ "بابر عیش کوش بہ عالم دوبارہ نیست"۔ یہ اُس بابر [1] کی طرف یونہی منسوب کردیا گیا ہے ورنہ اُس کو تو عیش کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا تھا

---

[1] بابر' حقیقی نام ظہیر الدین (1483-1530 AD)' باپ کی طرف سے منگول' ماں کی طرف سے چنگیز خان سے متعلق' ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی' پہلا شہنشاہ (1526-1530 AD) جس نے سلطان ابراہیم لودھی (1517-1526 AD) کو شکست دی۔

لیکن ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ اِسی دنیا کا مال متاع' دولت' قوت' حشمت' اقتدار' یہ سب یہیں کا ہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور دوسرا تصور یہ ہے کہ یہاں بھی رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201) یعنی حال بھی خوشگوار اور مستقبل بھی سرفرازیوں اور شادابیوں کا گہوارہ ہوگا۔ یہ دوسرا تصور ہے۔ کہا کہ یہ جو تصور ہے کہ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتُہَا (28:60)۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ اتنا جو کچھ ہے' یہ تو اِسی طبعی زندگی کے متعلق سامانِ رزق ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ تمہارے ہاں زینت بھی ہوتی ہے لیکن ضرورت کی اُس میں دو ہونگی اور ڈیکوریشن کی اُس میں بیس ہونگی۔ زینت بُری چیز نہیں ہے۔ زینت کو قرآن نے ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ چیزوں کو جو زینت کا موجب ہیں حرام قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات یاد رکھو کہ یہ صرف طبعی زندگی کی چیزیں ہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے اجرِ عظیم کے تصور کا ثبوت

کہا کہ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی (28:60) لیکن جو کچھ خدا کے قانون کے مطابق ملتا ہے وہ اِن سے بہتر بھی ہوتا ہے اور زیادہ پائیدار بھی ہوتا ہے۔ کہا کہ ثبوت اِس کا کیا ہے؟ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (28:60) عقل وفکر سے سوچ کر بات کرو تو بات خود ہی سمجھ میں آ جائے گی۔ قرآن اس کا ثبوت دھاندلی سے نہیں دیتا بلکہ کہتا ہے کہ تعصب کو ذرا الگ رکھ کے سوچ کر دیکھو کہ آیا بددیانتی سے یا سمگلنگ وغیرہ سے حاصل کی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ o الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ (104:6-7) وہ اِس قسم کے جہنم پیدا کرتی ہے کہ جس کی آگ دلوں کو لپیٹ لیتی ہے۔ اور انجامِ کار جو کچھ ہوتا ہے وہ فرضی نہیں ہوتا ہے بلکہ اُس کے بعد وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اور قوانینِ خداوندی کے بعد یہی دولت اور یہی حشمت اور یہی چیزیں ملتی ہیں تو وہ یہاں کی زندگی بھی خوشگوار ہوتی ہے۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

عزیزانِ من! قرآن میں یہاں اور وہاں کا سوال نہیں ہے۔ یہاں اور وہاں کی تفریق تو ٹائم کے لحاظ سے ہماری پیدا کی ہوئی ہے کہ آج یہ 16 تاریخ ہے اور کل 17 ہو جانی ہے پھر فروری کے بعد مارچ آ جانا ہے' یہ 79 کے بعد اسی 80 آنا ہے۔ یہ تو وقت کے گز کے اوپر ہم نے لکیریں لگا رکھی ہوئی ہیں' ورنہ زندگی تو جوئے رواں ہے یہاں سے آگے تک چلتی جاتی ہے۔ جسے موت کہتے ہیں' اُس وقت یہ ندی اُس باغ میں داخل ہو جاتی ہے جس کے کنارے کے اوپر کوئی باڑ کھڑی ہے۔ وہ اندر کا حصہ ہمیں نظر نہیں آتا ورنہ یہ ندی تو مستقل مسلسل چلتی جاتی ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ اگر ندی یہاں گدلی ہے' اُس کے اندر گدلا پانی ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ باڑ کے اندر جاتے ہوئے وہ صاف اور مصفا ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہاں صاف اور شفاف ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہاں جانے کے بعد وہ گدلی ہو جائے: وَ

مَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہی ہوتا ہے۔

فریبِ قلب سے ماورا زندگی ہی کامرانیوں کی زندگی ہے

زندگی کا یہ جو فردوس بدآماں منظر ہے وہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے گرد اس کی فراوانیاں' اقتدار اور قلب کا صحیح اطمینان ہوتا ہے۔ فریب قلب بالکل نہیں ہوتا کیونکہ اُس کا نام بھی ہم اطمینان رکھ لیتے ہیں' جبکہ وہ جھوٹا فریب ہوتا ہے۔ جس کو ہم صحیح Balanced Personality (متوازن شخصیت) کہتے ہیں' وہ اس معاشرہ میں ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:38) نہ ہی اُنہیں کوئی بیرونی خطرہ ہوگا اور نہ ہی کسی قسم کی دل گرفتگی ہوگی۔ یہ اِس دنیا کے اندر ہوگا۔ اور اُس نے کہا کہ جس کا آج یہ ہے تو اُس کا کل بھی یہی ہوگا۔ اس سے زیادہ خوشگوار ہوگا۔ جو صحیح معنی میں پودا لگتا ہے تو اُس کا کل آج کی نسبت زیادہ شاداب ہوتا ہے' وہ زیادہ پختگی کی طرف بڑھتا ہے۔

اگر زندگی کی خوشگوار و شاداب ندی ایک جگہ رک جائے تو پھر وہ جوہڑ بن جاتی ہے

وہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن کی زندگی کے لیے یاد رکھو کہ جس شخص کے دو دن یعنی کل (Yesterday) گزرا ہوا اور آج کا دن (Today) ایک جیسا گزر جائے تو وہ تباہ ہو گیا۔ آج کا جو دن (Today) ہے وہ کل (Yesterday) کے مقابلے میں ایک قدم آگے ہونا چاہیے۔ جس کے دو دن ایک جیسے ہوں یعنی اُس کا اگلا قدم کل (Yesterday) کے مقابلے میں ترقی کی طرف نہیں اٹھا ہے تو وہ بھی تباہ ہو گیا۔ اور جب کیفیت یہ ہو کہ ''اُس کے دل سے پوچھیے' اُس کے جگر سے پوچھیے' کہ آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو''۔ وہاں یہ کیفیت تھی کہ جس کا آج کا دن کل کے مقابلے میں ایک ہی جیسا ہو گیا تو وہ تباہ ہو گیا۔ ندی جب ساکن ہو جاتی ہے تو وہ جوہڑ ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ندی نہیں کہلاتی۔ اور اگر اسی طرح سے کچھ عرصہ کے لیے رہے تو اُس میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی تو نام ہی حرکت کا ہے۔ اگر یہ ندی متحرک رہتی ہے تو ندی رہتی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے دو دن بھی ایک جیسے ہو جائیں یعنی ندی کا پانی اگر کسی طرح وہیں کھڑا ہو گیا تو یاد رکھو' یہ ندی نہیں رہے گی بلکہ یہ جوہڑ بن جائے گی۔ اور اگر ندی پیچھے کیطرف بہنی شروع ہو جائے' یعنی جس کی منزلِ مقصود کل سے شروع ہو تو اُس قوم کے اوپر ہر نیا دن نئے ماتم کا اور نئے مرثیے کا متقاضی ہو جاتا ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّ اَبۡقٰى (28:60) جو متاعِ حیات' قوانین خداوندی کے اتباع سے ملتی ہے' وہ تمہارے موجودہ ساز و سامان کے مقابلے میں بہتر بھی ہے اور دیرپا بھی ہے اور نہایت پائیدار بھی۔ دیرپا اس لیے ہے کہ وہ دنیاوی زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ساتھ جاتی ہے۔ نظام خداوندی کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے' دنیاوی ساز و یراق بھی بہتر

سے بہتر ملتا ہے اور اس کے ساتھ ان کی ذات کی نشو ونما بھی ہوتی ہے۔ دنیاوی سامان طبعی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن انسانی ذات کی نشو ونما یافتہ صلاحیتیں مرنے کے بعد زندگی کو فردوس بداماں بنا دیتی ہیں۔ اس لیے کہا کہ **اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (28:60) پہلے عقل و فکر سے کام تو لو کہتا ہے کہ **اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰهُ وَعۡدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيۡهِ كَمَنۡ مَّتَّعۡنٰهُ مَتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ثُمَّ هُوَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ** (28:61) [1] ذرا سوچو اور عقل سے کام لو کہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ کیا ایسا شخص جس کے ساتھ ہم نے نہایت اچھے خوشگوار کچھ وعدے کیے تھے اور پھر وہ وعدہ ہی نہیں رہا بلکہ وہ اس طرح ہمیں یقین دلاتا ہے تسلی دیتا ہے کہ **فَهُوَ لَاقِيۡهِ** (28:61) ہم جو وعدہ کریں تو اُس کو پھر وہ مل جائے۔ کیا بات ہے قرآن کی' ورنہ جب یہ کہہ دیا جائے گا کہ خدا نے وعدہ کیا تو پکی بات ہے کہ وہ وعدہ تو پکا وعدہ ہی ہوگا کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ** (3:9) ہم تو وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ یہ ایسا نہیں ہے کہ

تیرے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جاناں

یہ ذرا سے' تھوڑے سے' لفظی فرق کے ساتھ ہمارے بھی وعدے ہیں کہ وعدہ کیا اور پورا نہ کیا۔ تو اگلے نے کہا کہ صاحب! تم نے تو وعدہ کیا تھا تو ہنس کے ٹال دیا۔ یہ قرآن کی بات ہنسنا نہیں ہے۔ **وَعَدۡنٰهُ وَعۡدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيۡهِ** (28:61) وہ خوشگوار وعدہ ہے اور وہ بھی ایسا جو واقعی اُس کو مل جائے۔ ''کیا سوہنٹرا رب ہیگا اے''۔ [2] کہتا ہے کہ کیا وہ شخص اُس جیسا ہو جائے گا جس کو ہم نے یہ سب کچھ دے تو دیا اور اُس نے یہاں تو بڑی عیش اڑائی لیکن جب محاسبے کا وقت آیا تو وہ **مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ** (28:61) مجرموں کے کٹہرے میں آ کے کھڑا ہو گیا۔ کہا کہ عقل و فکر سے کام لو' سوچو کہ ان دونوں میں سے کون اچھا ہے۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا ہے۔ سورۃ القصص کی آیت 61 تک ہم آ گئے' 62ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

---

[1] بات بڑی واضح ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس سے ہم نے وعدہ کیا ہے اور ہمارا یہ وعدہ حقیقت بن کر اس کے سامنے آنے والا ہے کہ اُسے اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں بھی حاصل ہوں گی (24:55) اور اس کے بعد اس دنیا کا ساز و سامان تو مل جائے گا لیکن آخرت کی زندگی میں' وہ (مجرموں کی حیثیت سے ہماری عدالت میں) حاضر کیا جائے گا (سوچو کہ ان دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ زیادہ خوش بخت ہے!)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 900)۔

[2] کتنا حسین' دل کش' دل موہ لینے والا خدا ہے!

گیارھواں باب: سورۃ القصص (آیات 62 تا 69)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ
الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ۚ أَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا
يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾ وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ
كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿٦٤﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ
يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿٦٦﴾ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى أَنْ يَكُونَ مِنَ
الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يُشْرِكُونَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1979ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 62 سے ہو رہا ہے:((28:62۔

دو مختلف نظریات رکھنے والوں کے لیے دو مختلف نتائج وعواقب

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ دو افراد یا دو گروہوں' دو قوموں' دو جماعتوں کا تقابل تھا۔ ان حقائق سے انکار کرنے والوں سے کہا گیا تھا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ ایک جماعت' ایک گروہ' ایک نظام' وہ ہے جس کا حال بھی خوشگواریوں کا محمل ہے اور مستقبل بھی سرفرازیوں کی خبر دے رہا ہے۔ اور دوسری جماعت' دوسری پارٹی' دوسرا گروہ' دوسرا نظام وہ ہے کہ اُس کے حال میں تو اُسے تمام مادی آسائشیں اور زیبائشیں کچھ وقت کے لیے حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اُس کے بعد کی جو زندگی ہے یعنی اُس کا جو مستقبل ہے وہ بڑی تباہیوں کا' ہولناکیوں کا' اذیتوں کا' کرب' کا ہوتا ہے۔ کہا کہ تم بتاؤ کہ اِن دونوں میں سے کونسا گروہ' کونسا نظام' بہتر سمجھتے ہو؟ وہ نظام جس کی نگاہ صرف حال پر ہوتی ہے اور مستقبل پر نظر نہیں ہوتی۔ آخری الفاظ یہ تھے کہ پھر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ حال میں تو وہ جس طرح سے لوٹ کھسوٹ کے جی

چاہے' یہ سب کچھ اکٹھا کر سکتے ہیں لیکن جب محاسبہ کا وقت آتا ہے تو اُن کے جتنے اعمال ہیں' اُن کا جو نظام ہے' اُس کے نتائج سامنے آنے کا وقت آتا ہے تو مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ (28:61) یوں سمجھیے کہ جیسے وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونگے اور اُن سے وہ ایک فقرہ پوچھا جائے گا کہ یہ سب کچھ کیسے اکٹھا کیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا؟ یہ 61ویں آیت کا آخری فقرہ تھا۔

اُس کے بعد قرآنِ کریم میں کوئی چار آیتوں میں کچھ یوں بتایا ہے جیسے کچھ ایک مکالمہ ہو رہا ہے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جنہیں لیڈر کہا جاتا ہے' مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ جو لوگوں کو اپنے پیچھے لگاتے ہیں یا لوگ اُن کے پیچھے لگتے ہیں اور وہ آگے ہوتے ہیں۔ غلط نظام کے عواقب میں یوں ہے جیسے یہ دونوں گروہ عدالت کے اندر موجود ہیں۔ میں یہ چار آیتیں تو آپ کے سامنے پیش کرونگا اور اُن کا مروجہ ترجمہ بھی ساتھ دونگا لیکن بعد میں قرآنِ کریم کی روشنی میں اِن کی تشریح کرونگا کیونکہ یہ بڑی اہم بات ہے۔

غلط نظام کو تشکیل دینے اور اسے اپنانے والوں کے باہمی مکالمے کا ایک محاکاتی انداز

معاف رکھیے' ویسے تو قرآن کی کونسی بات اہم نہیں ہے لیکن موضوعات کے اعتبار سے جو بعض مقامات' بعض آیات' بعض گوشے بعض نکات کبھی درس میں پیشِ نظر ہوتے ہیں تو وہ نسبتاً زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں یہ بات میں بے ساختہ کہہ دیا کرتا ہوں کہ بڑی اہم چیز ہے جو سامنے آ رہی ہے۔ وہ یوں ہے جیسے کہ یہ سب لوگ وہاں موجود ہیں۔ وہ بھی جو اِن کو پیچھے چلایا کرتے تھے اور وہ بھی جن کے پیچھے یہ چلا کرتے تھے۔ کہا کہ وَ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ فَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (28:62) ان سے پوچھا جائے گا کہ وہ جنہیں تم نے خدا کے ساتھ یا خدا کو چھوڑ کر خدا بنا رکھا تھا' ذرا آج ان کو آواز تو دو کہ وہ تمہیں تمہارے اِس نظام کے اذیت ناک' کرب انگیز' تباہ کن نتائج سے بچالیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن جب کوئی چیز سمجھاتا ہے تو اصل میں وہ اُس کے اصول اور قوانین ہیں جنہیں وہ سمجھاتا ہے لیکن یہ تمام چیزیں ہمیشہ محسوس اور مرئی شکل میں زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اسی لیے وہ ان چیزوں کو مثال کے ذریعے سمجھاتا ہے اور مثالیں وہ ہمیشہ مرئی یا Concrete (محسوس) شکل میں دیتا ہے۔ یہ مکافاتِ عمل ہے جو اُس نظام کے نتائج سامنے لاتا ہے۔ اُسے کچھ ایسی شکل میں پیش کرتا ہے جیسے ایک عدالت لگی ہوئی ہو' مجرم پیش ہوئے ہوں' اُن کے گواہ آ رہے ہوں' اُن کے ساتھی ہوں' اُن کے مخالف ہوں' جج بیٹھا ہوا ہو' دستاویزات پیش ہو رہی ہوں۔ اس انداز میں قرآن بات سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُن سے کہا جائے گا کہ بتاؤ وہ کہاں ہیں جنہیں تم نے تَزْعُمُوْنَ (28:62) بزعمِ خویش خدا بنا رکھا تھا؟ قَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا (28:63) ان کی طرف سے جواب ملنے کی بجائے وہ جو گروہ ہوگا جو یہ سمجھیں گے کہ آج تو پکڑے گئے' وہ کہیں گے کہ اصل یہ ہے کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا تھا' غلط راستے پہ ڈال دیا تھا۔ اَغْوَیْنٰهُمْ کَمَا غَوَیْنَا (28:63) اور اس میں کچھ ہمارا

بھی قصور تھا۔ ہم خود ہی غلط راستے پہ چل رہے تھے اس لیے ہمارے پیچھے چلنے والے تو اُسی راستے پہ چلیں گے۔ یعنی وہ بجائے اِس کے کہ جب اُن سے مجرمین کی حیثیت سے سوال کیا جائے تو یہ جواب دیں' یہ انداز ایسا ہے کہ جیسا وہ خود ہی وہاں اعترافِ جرم کرلیں گے۔ وہ آج کی اصطلاح میں جنہیں وعدہ معاف گواہ یا سلطانی گواہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہ دیکھ کر کہ اب کیا ہونے والا ہے' وہ خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کرلیں گے۔ یہ قرآن کا انداز ہے۔ وہ خود ہی پکار اٹھیں گے کہ اِن سے آپ کیا کہہ رہے ہیں اور اِنہیں کیا پوچھ رہے ہیں' یہ تو ہمارے پیچھے لگے اور گمراہ ہوئے اور ہم نے اِن کو اس لیے گمراہ کیا کہ ہم تو خود غلط راستے پہ چل رہے تھے۔

ہمارے پیچھے لگنے والوں کا تو اپنا مفاد وابستہ تھا: لیڈروں کا بیان

قرآن کہتا ہے کہ تَبَرَّاْنَآ اِلَیْکَ مَا کَانُوْٓا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ (28:63) ایک بات البتہ ایسی ہے جسے ہم پیشِ خدمت کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور جس سے ہماری بریت ہوسکتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ یہ درحقیقت ہماری محکومیت اختیار نہیں کرتے تھے' ہماری احتیاج نہیں کرتے تھے بلکہ اِس میں ان کا اپنا مفاد وابستہ تھا۔ یہ اس لیے ہمیں خدا بناتے تھے۔ ہم خدا نہیں بنتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ ہماری خدائی تسلیم کرلینے میں اِن کے اپنے مفاد وابستہ تھے۔ ہمیں تو جو جی میں آئے کہیے لیکن اِن کے متعلق جو ہم نے کہا ہے کہ واقعی ہمارے پیچھے لگے اور یہ بھی گمراہ ہوئے تو اُس میں ہم یہ عرض کردیں کہ ہم نے اِن کو کوئی زبردستی اپنے پیچھے نہیں لگایا' نہ ہی یہ نیک نیتی سے ہمیں واقعی خدا سمجھتے تھے بلکہ اِن کے مفاد وابستہ تھے۔ یہ اس لیے ہمارے پیچھے تھے۔ وَ قِیْلَ ادْعُوْا شُرَکَآءَ کُمْ فَدَعَوْھُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَھُمْ وَ رَاَوُا الْعَذَابَ لَوْ اَنَّھُمْ کَانُوْا یَھْتَدُوْنَ (28:64) اِن سے کہا جائے گا کہ بتاؤ بھئی! تمہارے اور کوئی ساتھی' کوئی مددگار ہیں تو اُنہیں ہی بلالو۔ وہ اُنہیں بلائیں گے تو وہ اُس وقت جواب ہی نہیں دیں گے' اُن کی بات ہی نہیں سنیں گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ دو آیتیں اور ختم کرلوں تو پھر میں بتاؤنگا کہ یہ بات کیا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ وہ جواب اس لیے نہیں دیں گے کہ اُس تباہی کو اپنے سامنے آنکھوں سے دیکھ رہے ہونگے۔ اس لیے وہ جواب تک نہیں دیں گے۔ درمیان میں قرآن کہتا ہے کہ اُس وقت یہ احساس ہوگا کہ اے کاش! ہم صحیح راستہ اختیار کرلیتے۔

قرآن حکیم کی طرف سے فردِ جرم کی تفصیل

قرآن نے کہا ہے کہ ہم ہمیشہ پہلے آگاہ کرنے والے بھیجتے تھے' اُن کو آگاہ کردیا جاتا تھا کہ جس روش پہ تم جارہے ہو' یہ آخرالامر تمہیں جہنم کی تباہیوں میں لے جائے گی۔ وہ اِس کو Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے تھے بلکہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور جب وہ عذاب آنکھوں کے سامنے دیکھتے تھے' موت نظر آجاتی تھی تو اُس وقت پکار اٹھتے کہ ہاں' واقعی ہم غلط راستے پہ چل رہے تھے۔ لَــوْ

اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ (28:64) اے کاش! یہ لوگ صحیح راستے پہ چلتے۔ وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (28:65) اُن سے یہ کہا جائے گا کہ تم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ناواقف تھے یا جانتے نہیں تھے کہ یہ راستہ غلط ہے۔ بتاؤ کہ جب تمہیں بتانے والوں نے بتایا تھا کہ یہ راستہ غلط ہے تو اُنہیں تم کیا جواب دیا کرتے تھے۔ تم کسی کو پکڑ کے پھانسی کے تختے پہ لٹکا دیا کرتے تھے کسی کی کھال کھینچ دیتے تھے کسی کا مذاق اڑا دیتے تھے ہر ایک کی تکذیب کرتے تھے۔ تمہارے پاس بتانے والے آتے تھے لیکن تم اُن کی بات سنتے ہی نہیں تھے۔ کہو بتاؤ اب جواب کیوں نہیں دیتے؟

اپنے سامنے نتائج کو دیکھ کر وہاں ایک بدحواسی کا عالم ہوگا

کہا کہ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (28:66) اُس وقت بدحواسی اور وحشت انگیز دہشت اس قدر ہوگی کہ اوسان بالکل خطا ہوئے ہونگے اُن کو کچھ سوجھے گا ہی نہیں۔ یہ لفظی ترجمہ ہے کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جائے گا۔ اور اُس کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے سے پوچھ ہی لیں کہ یار! تم بھی ساتھ ہوا کرتے تھے بتاؤ اب کیا جواب دیں۔ ایسی شکل بھی نہیں رہے گی۔ بدحواسی کا عالم ہوگا افراتفری کا عالم ہوگا نفسانفسی کا عالم ہوگا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا ہوگا۔ کسی ایک دوسرے سے پوچھ کر بھی جواب نہیں دے سکیں گے۔ یہ ہیں وہ آیات جن کے بارے میں میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ یہ بات اس سے پیشتر جستہ جستہ تو آچکی ہے۔ چونکہ یہاں یہ آیتیں درس کے تسلسل میں ہمارے سامنے آئی ہیں اس لیے میں پھر دہرادوں۔ قرآنِ کریم کے نہ سمجھنے کی اسلام سے ناواقف رہنے کی دین کی لم کو سامنے نہ آنے دینے کی اصل وجہ تو وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ ہم نے اسلام کو مذہب کی جگہ سمجھ لیا ہے۔ اور اُس میں جس وجہ سے ہم پر حقیقت عیاں نہ ہوئی ہم نے ان تمام معاملات کو مرنے کے بعد کی زندگی پر اٹھا رکھا۔

زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد کی زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے اور اُس کے بغیر تو کوئی شخص ایمان والا نہیں ہوسکتا مسلمان نہیں ہوسکتا لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ قرآنِ کریم نے مکافاتِ عمل غلط نظام کے نتائج غلط اعمال کے جو عواقب بتائے ہیں کیا یہ صرف مرنے کے بعد کی زندگی میں ہی سامنے آئیں گے؟ غلط نظام کے تباہ کن نتائج اسی دنیا میں سامنے آتے ہیں۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ دیکھو! فلاں قوم کا انجام کیا ہوا دیکھو! فلاں بستی کے کھنڈرات تمہیں کیا کہہ رہے ہیں۔ تو اِسی دنیا میں اُن کا انجام ہوگیا تھا۔ قرآن تاریخ کو بار بار سامنے لاتا ہے اُن قوموں کی نشاندہی کرتا ہے جن کا غلط نظام تھا۔ اِن کو بار بار بتایا گیا سمجھایا گیا لیکن یہ نہیں مانے۔ تو جاؤ! جا کے اُن کے کھنڈرات دیکھو اینٹوں اور پتھروں پہ لکھی ہوئی اُن کی داستانیں مرثیے اور آہ و فغاں کو پڑھو۔ اُن کا یہ انجام اِس دنیا میں ہوگیا۔ بعد کی

زندگی میں جو انجام یا عواقب ہوگا تو وہ وہاں کی بات ہے لیکن قرآن تو یہاں کے لیے بھی بتاتا ہے۔ اور یہاں اُن کے غلط نظام کا نتیجہ بتاتا ہے تو صحیح نظام کے نتائج کو بھی یہیں بتاتا ہے۔ پھر اُس کے بعد زندگی آگے چلتی ہے۔ جیسی یہاں ہوگی ویسی ہی وہاں ہوگی۔ جو قوم یہاں عذاب میں مبتلا ہے تو یہ نہیں ہوگا کہ آنکھیں بند کیں اور وہاں جنت میں پہنچ گئے۔ جو یہاں جہنم میں ہے وہ وہاں بھی جہنم میں ہی ہوگا۔ زندگی کی غلط روش، غلط نظام کے جو نتائج ہیں اُن کو قرآن اِس دنیا میں سامنے لاتا ہے۔ اب بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ جو محاکات کے انداز میں کہا کہ عدالت بنی ہوئی ہے، جج موجود ہے، گواہ موجود ہیں، یہ اِس زندگی کے اندر محاسبے ہو رہے ہیں۔ یہ یہیں کی بات ہو رہی ہے۔ جہنم پر اٹھا رکھنے کی بات نہیں ہے کہ قیامت پر ہی اٹھا دیا جائے اور یہ سمجھا ہی نہ جائے کہ یہاں وہ جہنم بھی ہے۔

لفظ جہنم کا مفہوم اور موجودہ زندگی کی کیفیت

غور کیجیے کہ قرآن کیا بتاتا ہے۔ کہا ہے کہ ان سے جہنم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ جہنم ہوگا۔ یہ لفظ ''جھـــنـم'' عبرانی زبان کا ہے۔ پہلے پرانے دور میں ایک وادی تھی، اُس کے اندر اُس زمانے کے مشرکین کا ایک بت تھا اور اُس بت کے حضور انسانوں کو جلایا جاتا تھا۔ انسانوں کو ذبح کر کے تو بتوں کے آستانوں کے اوپر چڑھاتے ہی ہیں لیکن وہاں خصوصیت یہ تھی کہ وہاں انسانوں کو جلایا جاتا تھا۔ تو یہ وادی جہنم ہے۔ اِس وادی کی رو سے عبرانی میں بھی یہ لفظ آیا اور پھر عربی زبان میں بھی لفظ آیا اور قرآن میں بھی یہ ہے۔ یعنی وہ نظام، وہ مقام جہاں شرفِ انسانیت کو جلا دیا جاتا ہے، اس کے لیے لفظ جحیم بھی آیا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ زندگی جوئے رواں ہے، یہ تو حرکت کا نام ہے، اِس کو چلتے رہنا چاہیے۔ جہاں کوئی شے آ کر رک جائے اُس کو جحیم کہتے ہیں۔ ندی رک جاتی ہے تو تالاب، جوہڑ، بن جاتی ہے اور اُس میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے، پھر اُس میں سے بیماریاں پھیلتی ہیں۔ کسی حرکت کا رک جانا جحیم کہلاتا ہے۔ کہا کہ یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ (29:54) یہ کہتے ہیں کہ تم جو کہہ رہے ہو کہ عذاب آئے گا، اِس غلط روش کا نتیجہ یہ ہوگا تو وہ عذاب کہاں ہے؟ وہ عذاب لاؤ۔

بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ ''یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں'' [1] ہے

عزیزانِ من! سنیے کہ کیا جواب مل رہا ہے۔ کہا کہ اِن آنکھوں کے اندھوں سے کہو کہ وَ اِنَّ جَھَنَّمَ لَمُحِیْطَۃٌ بِالْکٰفِرِیْنَ (29:54) کم بختو! جہنم تو تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ لاؤ! وہ جہنم کہاں ہے۔ وہ تو

---

[1] یہ گھڑی محشر کی ہے، تُو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے (اقبالؒ: بانگِ درا (زندگی))

لَمُحِيْطَةٌ (29:54) ہے' یہیں محیط ہے۔ جب اِن کو یہاں محیط ہے تو پھر ہو کیا رہا ہے۔ کہا کہ بات اور ہے۔ یہاں کہا کہ جہنم ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ فرق صرف یہ ہے کہ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (82:16) وہ تو انہیں اِس وقت بھی دیکھ رہی ہے لیکن اِن کی آنکھیں اندھی ہوئی ہیں' یہ اُسے نہیں دیکھ رہے۔ تو جسے عذاب کہا جاتا ہے' جہنم کا آ جانا کہا جاتا ہے اور جسے ہم نے اگلی زندگی پر اٹھا رکھا ہے' قرآن میں ہے کہ جسے تم لوگ قیامت کہتے ہو' سنو! وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) بس فرق اتنا ہے کہ جسے تم کہتے ہو کہ قیامت ہوتی ہے وہ پھر دیکھنے والوں کو نظر آ جائے گی' وہ تو اِس وقت بھی یہاں موجود ہے اور اِن کو گھیرے ہوئے ہے' وہ اِن کو دیکھ رہی ہے لیکن اِن کی آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی ہے' مدہوشی ہے' اس اقتدار کے نشہ قوت میں مست ہیں۔ ان کو اِس وقت نظر نہیں آ رہی۔ یعنی وہ موجود تو اِس وقت بھی ہے بس یہ ہوگا کہ جس وقت وہ شدت اختیار کر جائے گی یعنی پھل پک کر گرنے کا وقت آتا ہے تو اُس غلط روش کے نتائج محسوس طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ یرٰی کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کا نمودار ہو کر سامنے آ جانا۔ جہنم ابھر کر سامنے آ جائے گی لیکن پھر بھی وہ کس کے سامنے آئے گی؟ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) وہ دیکھنے والوں کو ہی نظر آئے گی۔

ہم نے اپنے ہر عمل کا نتیجہ قیامت تک اٹھا رکھا ہے

عزیزانِ من! یہ ذکر ہے غلط نظام یا غلط روشِ زندگی کے نتائج اور عواقب کا جو قرآن نے محاکات کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور ہم نے اُس سارے کے سارے عمل کے نتیجے کو قیامت پر اُٹھا کر رکھ دیا ہے۔ یہاں ہمارے پاس کوئی ٹیسٹ ہی نہ رہا' کوئی معیار ہی نہ رہا کہ پرکھ سکیں کہ ہم کس حالت میں ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ کو اطمینان دلا لیتا ہے اور مطمئن ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! اِس دنیا کے اندر ذلیل اور پست ہونا کوئی بات نہیں ہے' یہ دنیا اور اُس کی دولت تو آنی جانی چیز ہے' یہ تو کافروں کو بھی میسر ہو سکتی ہے۔ یہ مسکینی' درویشی' قحط یہ سب کچھ جو ہے یہ مومن کی نشانیاں ہیں' قیامت کے دن جنت انہی کے لیے ہوگی۔

قرآن حکیم کے مروجہ تراجم نے الفاظ و معانی میں بڑی دُوری پیدا کر دی ہے

عزیزانِ من! اب اِس کے لیے تو یہاں کوئی ٹیسٹ اور معیار تو ہے ہی نہیں۔ مذہب یہ کرتا ہے کہ وہ سامنے دیکھنے نہیں دیتا' وہ افیون پلا دیتا ہے کہ وہ اپنے ہی تصور کے اندر مگن بیٹھا ہوتا ہے۔ اُس کا پھر پوچھو ہی نہیں کہ وہ کس نشے میں ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب افیون بند ہوتی ہے تو وہ کیسے مرتے ہیں۔ روز خبریں آ رہی ہیں کہ موتیں ہو رہی ہیں لیکن اُس نشے والے افیونی سے پوچھے نہیں کہ ''او کس

جنت دے اندر ہلارے لے رہیا ہونداا ے“ ❶ اِس وقت کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ اُس وقت ہر چیز واضح ہو کر سامنے نظر آ جائے گی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دین تو یہ ہے کہ وہ یہاں نظام قائم کرتا ہے‘ اُس کے نتائج بتاتا ہے اور پھر اسی طرح سے زندگی کو آگے بھی لے جاتا ہے۔ مذہب یہ ہے کہ وہ یہاں غلط اطمینان وفریبِ نفس کے اندر مبتلا رکھتا ہے اور ہم خود ہی فیصلہ کر لیتے ہیں۔

خود پرستی ایک عجیب وغریب فریب ہے

سب سے بڑی چیز جس کو آپ خود پرستی کہتے ہیں‘ وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ وہ مست ہوتا ہے اور اُس بُت کو پوجتا ہے جو سامنے سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو بڑی عجیب قسم کی پرستش ہے کہ وہ آگے سے کچھ کہے ہی نہیں اور ہم اپنے دل میں ہی مطمئن ہو کر آ جائیں کہ آج دیوتا خوش ہو گئے۔ مذہب میں اسی قسم کی پرستش مسلمان بھی کرتے ہیں۔ وہ خدا تو اِن کو کچھ کہتا نہیں ہے یہ اپنے ذہن میں ہی خدا سے کچھ کہتے جاتے ہیں‘ کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر خوش ہو جاتے ہیں کہ مولا راضی ہو گیا۔ کبھی وہ راضی ہو گیا اور کبھی اُنہوں نے کہا کہ نہیں ہوا‘ اور کر لیجیے۔ وہ تو آگے سے کہتا نہیں ہے کہ میں راضی ہو گیا ہوں بلکہ یہ خود ہی اپنے اندر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ یہاں مذہب میں اُن نتائج کو سامنے نہیں آنے دیتے۔ قرآن کی یہ آیتیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اِن کے سامنے جب بھی یہ آیتیں پڑھو تو یہ اس کا Future Tense (زمانہ مستقبل) بتا دیتے ہیں کہ صاحب! یہ Present Tense (زمانہ حال) میں ہے ہی نہیں۔ ان کے ہاں یا ماضی ہوتا ہے یا مستقبل ہوتا ہے‘ حال تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ ”ایناں دا حال تے بے حال ہونداا ے“۔ ❷ وہ ❸ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآنی بصیرت اور کہنے کا انداز عطا کیا تھا وہ کیا باتیں کہہ جاتا ہے!

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت

واعظ منبر پہ کھڑا ہے ”کافراں دیاں گلاں ہو رہیاں نیں“۔ ❹ ساری دنیا کے عیب کاروں اور کافروں کو جہنم میں پھینکا ہوا ہے‘ عذاب کی تفصیلیں ہو رہی ہیں: بچھو ہیں‘ سانپ ہیں‘ گرزوں والے ہیں‘ مار مار کر کچومر نکال رہے ہیں‘ دہائی ہے۔

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت

---

❶ وہ کس جنت کے مزے لے رہا ہوتا ہے!

❷ ان کا زمانہ حال تو بدحال ہوتا ہے۔

❸ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

❹ کافروں کی باتیں ہو رہی ہیں۔

واعظ ہو اور کافر کے متعلق دوزخ کی وہ باتیں کر رہا ہو‘ کہا کہ پوچھو تو سہی کہ وہ وہاں کیا کچھ نہیں کہہ رہا ہو گا!

حدیثِ خوشتر از وے‘ کافرے گفت

ایک کافر نے اُس کے جواب میں ایک بات کہی جو اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت بات تھی۔ اُس نے کہا:

نداند آں غلام احوالِ خود را

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے ”گفت“

وہ غلام اپنے متعلق کیا جانے جو دوزخ کو کسی اور کا مقام بتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان [1] کو عجیب نوازا تھا۔ یہاں ایک لفظ غلام کہہ کر یہ ساری بات کہہ گیا۔ وہ غلامی ہے جس کا نام جہنم ہے۔ اِسے غلام کہہ کر کتنی بڑی بات کہہ گیا!

غلامی ہر قسم کی محرومیوں کو جنم دیتی ہے

اسلام نے غلامی کو دنیا سے ختم کر دیا اور وہ آیا ہی اسی لیے تھا۔ اِنہوں نے پھر غلاموں کو‘ جسے ہم Slavery (غلامی) کہتے ہیں‘ جس میں وہ Actual Slaves (حقیقی غلام) ہوتے تھے‘ پہلے تو وہاں تک ہی محدود رکھا۔ اب وہاں تک محدود رکھا تو پھر سوچا کہ اب کیا کریں اور جنسی خواہشات کا کیا ہو؟ میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں‘ میں ابھی جو کہنے لگا ہوں کہ یہ لونڈیوں کو لے آئے۔

قومی اسمبلی میں چار چار بیویوں کی ممانعت پر کم از کم ایک لونڈی کی تمنا کا اظہار

یہ آپ کے ہاں کے جو بڑے بڑے بظاہر متقی اور پرہیزگار شہنشاہ اور سلاطین ہوتے ہیں اُن کے محلوں میں بھی دو دو تین ہزار لونڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ ان کے ہاں غلامی نہیں ہے۔ آج بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ میدانِ جنگ میں جو دشمنوں کی عورتیں گرفتار ہوں تو کم از کم اُن کو تو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے دعوے ملاحظہ فرمائیے۔ غلامی کو قرآن نے دنیا سے مٹا دیا تھا لیکن پھر بھی اُنہیں بنایا جا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں آپ کے ہاں جب اسمبلی میں عائلی قوانین کے سلسلے میں بحث ہو رہی تھی کہ یہ جو چار چار بیویاں کرتے چلے جاتے ہیں‘ ان پہ کچھ پابندیاں عائد کی جائیں۔ تو وہاں ایک مولوی صاحب [1] بھی ممبر ہو کر آ گئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ تم نے اگر زبردستی یہ قانون پاس کر ہی دینا ہے تو کم از کم ایک ایک لونڈی رکھنے کی اجازت تو دے دی جائے۔ یہاں آپ کے ہاں کی اسمبلی کے اندر یہ چیز اُنہوں نے پیش کی تھی۔ اور پھر بھی مولوی صاحب دنیا کے سامنے دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو مٹا دیا تھا۔ میں تو بات کچھ اور کہہ رہا ہوں۔ یہ جو محسوس شکل کی غلامی ہے اس کا تو سوال ہی نہیں ہے کہ اسلام اِسے رہنے دیتا۔

---

[1] جمعیت العلماء کے رکن مولوی نعمت اللہ نے ۱۹۷۳ء کے فروری کے سنٹرل پارلیمنٹ اسمبلی کے سیشن میں کہا تھا۔

نوعِ انسانی کے لیے بدترین غلامی کی شکل قلب ونظر کی ناپختگی ہوتی ہے

عزیزانِ من! غلامی اتنی ہی تو نہیں ہے جو انسان کو پکڑ کر غلام بنالیا جاتا تھا۔ وہ انسان جو بظاہر کسی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں نہیں ہوتے' اِن کی غلامی بدترین ہوتی ہے۔ وہ قلب ونظر کی غلامی ہوتی ہے' وہ ذہنیت کی غلامی ہوتی ہے جو یہ زنجیریں نظر ہی نہیں آتیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وَ يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ (7:157)۔ اب یہاں ایک بات آجاتی ہے کہ یضع عنھم یعنی یہ پوری انسانیت کے متعلق کہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ یہ جو واقعی Slaves (غلام) ہیں' ان کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے آیا ہے بلکہ نوعِ انسانی کے متعلق کہا کہ یہ نوعِ انسانی جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے' یہ رسول ﷺ اُنہیں توڑنے کے لیے آیا ہے۔ جن سِلوں کے نیچے انسانیت دبی ہوئی ہے' یہ اُن سِلوں کو اُن کے سروں سے اٹھانے کے لیے آیا ہے۔ یہ تو وہ غلامی تھی اور ہے جس میں انسانیت جکڑے ہوئے رہتی ہے۔

دینِ خداوندی پہاڑ کی ایک ایسی چوٹی ہے جس میں انسان کا ہر قدم بلندی کی طرف اٹھتا ہے

قرآن نے دین یا دین کے قائم کرنے والی جماعت کی جو خصوصیات بتائی ہیں' بلکہ دین کے متعلق یہ کہا کہ یہ دین کے متعلق پوچھتے ہیں' ان سے کہیے کہ دین تو پہاڑ کی گھاٹی یا چوٹی پہ چڑھنے والی بات ہے۔ قدم قدم چڑھا جائے گا' سانس پھولے گی' تھکان بھی ہوگی لیکن ہر قدم پہلے قدم سے اونچا بھی ہوگا اور آگے بھی ہوگا۔ قرآن کی کیا مثالیں ہیں! وہ بتدریج بلندیوں کی طرف جائے گا' بھاگ کر نہیں جایا جاسکتا۔ کہا کہ یہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے کہ پہلی بات بتائیں کہ وہ کیا ہے؟ فک رَقَبَةٍ عجیب لفظ ہے۔ ❶ اس کے معنی ''گردن'' ہیں۔ کہا کہ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ عالمگیر نظام ہے' دنیا میں انسانیت کا نظام ہے۔ یہ نظام وہ ہے جس میں کسی انسان کی گردن کسی انسان کے سامنے نہیں جھکے گی: فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13)۔ یہ گردنوں کو اُبھار دے گا' یہ گردنوں کو آزاد کردے گا۔

اقبال رحمہ اللہ کے ہاں غلامی کی تعریف

یہ وہ غلامی تھی جس سے چھڑانے کے لیے دین آیا تھا۔ مجھ سے نہیں بلکہ اِسی ❷ سے پوچھیے جس نے یہ کہا ہے کہ

ندانند آں غلام احوالِ خود را
کہ دوزخ را مقامِ دیگرے ''گفت''

---

❶ رق ب اس کا مادہ (Root) ہے۔ الرَّقَبَةُ گردن کو کہتے ہیں۔ تاج العروس میں لکھا ہے کہ رَقَبَہٗ کے معنی ہیں ''اس کی گردن میں رسی ڈالی''۔

❷ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1827) کی طرف ہے۔

خود غلام ہے اور دوزخ کے متعلق کہتا ہے کہ یہ اُن کے لیے ہے۔ ''زبورِ عجم'' کے آخر میں ''بندگی نامہ'' ہے۔ بندگی کے معنی ہی ''غلامی'' ہیں۔ یہ بڑی جامع نظم ہے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں تا کہ معلوم ہو کہ یہ جو کہہ رہا ہے کہ غلام اپنے احوال کو نہیں جانتا اور دوسروں کو کہتا ہے کہ وہ جہنم میں ہیں' وہ اپنے متعلق نہیں دیکھ رہا۔

در غلامی تن ز جاں گردد تہی

جسم اور پیکر' یہ Physical Life' یہ تو قربانی کے بکرے کی طرح بڑی تنومند ہوتی ہے لیکن اندر جان نہیں رہتی۔

از تنِ بے جاں چہ اُمید بہی

کہو کہ کوئی تن' کوئی جسم جس میں جان نہ ہو' اُس سے کوئی امید وابستہ کی جاسکتی ہے۔ کیا ہوتا ہے غلام اور کیا ہوتی ہے غلامی؟

کیشِ او تقلید و کارش آزری ست

اس کا مسلک' اس کا مذہب تقلید ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ قلد اِسے کہتے ہیں جو مویشیوں کے گلے میں وہ رسا ڈال دیا جاتا ہے اور اُس کو پکڑ کر اتنا سا بچہ اتنے بڑے ہاتھی کو لیے جاتا ہے۔ وہ جو رسی گلے میں پڑی ہوئی ہوتی ہے جس سے کھینچ کر وہ جدھر جی چاہے لیے جاتا ہے اُسے قلد کہتے ہیں۔ وہاں سے تقلید ہے۔ اس کا مذہب' اس کا مسلک' تقلید ہوتا ہے' اِس نے کسی کے پیچھے چلنا ہوتا ہے۔ اس کا مسلک یہ ہوتا ہے اور کام بت تراشی ہوتا ہے۔ خود بھی کسی نہ کسی بت کے سامنے جھکا ہوا ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی بت تراشتا رہتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ غلام کیا کرتا ہے؟

ندرت اندر مذہبِ او کافری ست

کوئی جو نئی بات ہے وہ اُس کے نزدیک کفر ہے۔ ایک ہزار برس سے آپ کے ہاں ہر فرقے کے اندر یہ چیز داخل ہے اور ہر خطبے میں آپ یہ سنیں گے کہ **کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار**: یعنی ہر چیز جو نئی ہے وہ گمراہی ہے' ہر گمراہی جہنم میں لے جائے گی۔

ندرت اندر مذہبِ او کافری ست

تازگیہا وہم و شک افزایدش

کوئی نئی بات جو کہیں ندرت کی کہہ دی جائے تو اُس کے متعلق شک وشبہات پیدا کر دینے شروع کر دیئے جائیں' شروع سے ہی جھگڑا شروع کر دیا جائے گا۔

کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

جو تمام چیزیں پرانی ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے' اُنہوں نے یہ فرمایا' اُنہوں نے وہ فرمایا۔ اور پھر بڑے خوش

ہوتے ہیں، جھوم جھوم کے، گا گا کے پیش کرتے ہیں:

چشمِ او بر رفتہ از آئندہ کور

قرآنِ حکیم نے انسان کی اس زندگی کی تباہی و بربادی کو جہنم سے تعبیر کیا ہے

قرآنِ کریم میں جہنم والوں کے متعلق کہا ہے کہ اُن کی آنکھیں گدی میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ قرآن کیا خوب بات کہہ گیا ہے! آنکھیں تو آنے والے راستے کو دیکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ یہاں سے ہٹا لیتے ہیں اور پیچھے رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آئندہ آنے والا راستہ، مستقبل سارا تاریک ہوتا ہے۔ اِن کے ہاں کا ماضی روشن ہوتا ہے۔ جب کسی سے پوچھو تو کہیں گے کہ صاحب! ہمارے ہاں بڑے بڑے سائنٹسٹ گزرے، بڑے بڑے فلاسفر گزرے، ہمارا وہ دور بہترین گزرا تھا، ہمارا وہ زمانہ اچھا تھا۔ ہمیشہ ماضی کے قصے بیان کرتے ہیں۔

چشمِ او بر رفتہ از آئندہ کور

چوں مجاور رزقِ او از خاکِ گور

مجاور یہ کرتا ہے کہ اگر سچ مچ بھی کسی کی لاش ہے یا اُس کے اوپر یونہی ایک مقبرہ بنایا اور اُس کے اوپر گنبد بنایا۔ پھر مشہور کیا کہ یہ سلطان محمود غوری کے زمانے میں حضرت صاحب تشریف لائے تھے اور بڑے لوگوں کو انہوں نے مسلمان کیا۔ دریائے راوی کے اوپر سے یونہی اِدھر سے اُدھر چلے جایا کرتے تھے اور اُن کا جو لنگر تھا تو اُس میں سو اونٹوں کے اوپر لدا ہوا نمک آتا تھا اور روز خرچ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ پانچ سو سال پہلے کے حضرت صاحب کی بات ہے۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ''اللہ واسطے اک پیسہ تے دے جا''۔ [1] ارے! اگر ان حضرت صاحب سے نسبت کرتے ہو جن کی کرامات اتنی کچھ بیان کرتے ہیں تو پھر یہ حالت کیوں؟ موجودہ حضرت صاحب جتنے بھی ہیں اِن کی حالت یہ ہے کہ دوسرے کماتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں۔ یہی حضرت صاحب جب بوہڑ کے نیچے چلے جائیں گے اور اوپر جو جھنڈی والا ہوگا تو وہ کہے گا کہ صاحب! یہ دس ہزار کو کھلانے کے بعد پھر بھی خود نہیں کھایا کرتے تھے۔ ''آپ او لکڑی دی روٹی نوں چک مار لیندے ہوندے سن''۔ [2]

دین و دانش را غلام ارزاں دہد

وہ دین کو بھی بیچتا ہے، عقل و فکر کو بھی بیچتا ہے۔

---

[1] اللہ کے نام پہ ایک پیسہ دے جا۔

[2] آپ خود وہ لکڑی کی بنی ہوئی چپاتی کو منہ مار لیتے تھے۔

تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

جسم کو زندہ رکھنے کے لیے جان بیچ دیتا ہے۔ یہ شخص ❶ بھی کیا خوب بات کر جاتا ہے۔ غور سے سنیے کہ یہ غلامی کیا ہے؟

گرچہ بر لب ہائے او نامِ خدا ست

ہر وقت دین اور مذہب اور خدا اور رسول یہ سارا کچھ کرتا رہتا ہے۔

گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست

قبلۂ او طاقتِ فرماں روا است

کہتا ہے کہ جس بُت کو یہ اپنا خدا بناتے ہیں اُن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست

ان خداؤں کے اندر Physically (طبعی طور پر) اپنی کوئی قوت نہیں ہوتی بلکہ اِن کی قوت کا راز تمہارے سجدوں میں ہے۔ تم سجدہ کیے چلے جاؤ تو یہ خدا بنے ہوئے ہیں۔

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

تُو کھڑا ہو جائے تو یہ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے اقبالؒ (1877-1938) کا مقام۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ الفاظ اور تلمیحات نماز کی لا رہا ہے۔

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

یہ تو برف کے بنائے ہوئے دیوتا ہوتے ہیں۔ ذرا سورج کو ابھرنے دیجیے تو ایک ایک کرن اِن کو فنا کر کے رکھ دے گی۔

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

تیرے کھڑے ہونے کی دیر ہے یہ ختم ہو جائیں گے۔ تُو اِن کے سامنے سجدہ کر رہا ہے جو تیرے کھڑے ہونے سے ختم ہو جائیں۔ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں دو خداؤں میں فرق بتائیں:

آں خدا دہد جانے دہد

---

❶ یعنی علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)۔

وہ خدا روٹی بھی دیتا ہے اور جان بھی دیتا ہے۔

ایں خدا جانے 'برد' نانے دہد

یہ خدا روٹی تو دیتا ہے لیکن جان لے جاتا ہے۔

عزیزانِ من! بہت کچھ کہنے کے لیے ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس نے کہا یہ تھا کہ

نداند آں غلام احوالِ خود را

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے ''گفت''

وہ غلام اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا جو دوزخ کے متعلق کہتا ہے کہ وہ دوسروں کا مقام ہے۔ یہ تو کمبخت خود سر سے پاؤں تک دوزخ میں ہوتا ہے، جہنم کے اندر ہوتا ہے لیکن جہنم کو نہیں دیکھ رہا ہوتا۔

عالم گیر انسانیت کا عالم گیر سطح پر ربوبیت عالمینی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا نام یومِ قیامت بھی ہے

کہا کہ جسے تم مکافاتِ عمل کا دن کہتے ہو، جسے قیامت کہتے ہو، تو قیامت تو ہے ہی قیام سے، اُس نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ جسے تم قیامت کہتے ہو اُس میں کیا ہوگا؟ **يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6) جس دن عالمگیر انسانیت انسانوں کے ہاتھوں روٹی لینے کے بجائے ربوبیتِ عالمینی کے لیے کھڑی ہوگی تو وہ قیامت ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نہایت محاکاتی انداز میں بات کہتا ہے۔ وہ ان Leaders (لیڈروں) اور اِن کے جو Followers (متبعین) یا Masses (عوام الناس) ہیں، ان کے متعلق بات کرتا ہے۔ ان لفظوں پہ تو ہم کبھی غور ہی نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں عوام کے لیے عام لفظ Masses ہی ہے۔ اور Mass کے معنی کوئی انسان کی شکل وصورت نہیں ہے۔ انگریزی جاننے والے جانتے ہیں کہ اِس کے کیا معنی ہیں۔ وہ انہیں انسان سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ **وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ** (34:31) ذرا چشمِ تصور میں اس منظر کو لائیے کہ یہ بڑے بڑے جو خدا بنے بیٹھے ہیں، یہ صف بستہ قیدیوں کی طرح، مجرموں کی طرح، خدا کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونگے اور **يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ۣ الْقَوْلَ** (34:31) ان کا آپس میں مکالمہ ہو رہا ہوگا، باتیں ہو رہی ہونگی۔ یہاں ان بڑے بڑے لیڈروں نے اپنے Followers (پیروکاروں) کے دل میں جو اپنا ہول بٹھایا ہوا ہوتا ہے، یہ وہاں نہیں رہے گا۔ پھر عدالت میں کھل کے بات ہو جاتی ہے۔

قرآنی لفظ استکبار اور استضعفوا کا مفہوم

کہا کہ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِیْنَ (34:31)۔ یہاں قرآن نے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک استکبار ہے اس کے معنی ہیں کہ خوامخواہ ہی بڑا بن بیٹھنا۔ دوسرا لفظ استضعفوا ہے اس کے معنی ہیں کہ جو فی الحقیقت کمزور نہیں ہوتے اُن کو کمزور کر دیا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کے تو ایک ایک لفظ پہ غور کرنا چاہیے۔ یہ زبان بڑی عجیب Scientific (سائنسی) زبان ہے۔ تمام الفاظ کا مادہ (Root) تو ایک ہی ہوتا ہے اُس میں آگے مختلف باب ہوتے ہیں۔ اُس اعتبار سے اس کے معنوں کے اندر Shade (سائے کا سا) کا فرق آتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کبریائی یا سچ مچ کا جو بڑا ہونا ہے یہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلے میں حاصل نہیں ہوتا' یہ خود بن بیٹھتے ہیں۔ دوسرا انسان خود کمزور نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے ہر انسان یکساں ہوتا ہے۔ اُسے تو کمزور کر دیا جاتا ہے۔

مجرموں کے کٹہرے میں مجرموں کی باہمی تکرار کا منظر اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

یہ جو Followers (متبعین) ہیں' جنہیں کمزور کر دیا گیا تھا' یہ اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے اور ہمیں تباہ نہ کرتے تو آج ہماری یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔ تم نے ہمارے ساتھ یہ کچھ کیا' تم تو غلط راستے پہ چل ہی رہے تھے' تم ہمیں بھی ساتھ لے ڈوبے۔ اور آج ہم بھی تمہاری وجہ سے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بات ہے کہ جب بھی Followers (پیروکاروں) کو' Masses (جمہور) کو دھڑکا نہ رہے' خوف نہ رہے' ڈر نہ رہے' یعنی دونوں کٹہرے میں کھڑے ہوں تو آپ سوچیے کہ وہ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کیا کچھ وہاں کہتے ہیں۔ اُس کی ہر چیز جو پہلے دبائی ہوئی ہوتی ہے پھر وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ (79:36) پھر وہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کہا کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم کبھی اس کٹہرے کے اندر مجرموں کی صف میں نہ کھڑے ہوئے ہوتے۔ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ (34:32) وہ کہیں گے کہ کوئی کسی کو غلط راستے کے اوپر نہیں لگا سکتا بلکہ یہ تمہاری اپنی مفاد پرستیاں تھیں جن کی وجہ سے تم ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ تم تو خود مجرم تھے اور الزام ہمیں دیتے ہو۔ ہم نے کیا کر دیا تھا جو تمہیں زبردستی اپنے پیچھے لگا رہے تھے' تم تو خود پیچھے لگے ہوئے تھے' تم خود مجرم تھے۔

عزیزانِ من! قرآن یہ بڑی اہم باتیں کہہ رہا ہے۔ یہاں کے جتنے غلط نظام ہیں' یہ اُن کے سارے پردے کھول رہا ہے۔ کہا کہ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗٓ

اَنۡدَادًا (34:33) یہ ٹھیک ہے کہ تم زبردستی تو ہمارے سر کے اوپر تلوار لیے ہوئے نہیں کھڑے تھے لیکن تمہاری جو سیاسی سازشیں تھیں، وہ تو ہماری عقل و فکر میں بھی باتیں نہیں آتی تھیں جو تم تدبریں سازشیں کیا کرتے تھے۔ وہ چیزیں تھیں جو ہمیں اس طرح سے تمہارے پیچھے چلا دیتی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے جو تم آج کہتے ہو کہ تم ہمیں مار مار کر تو مجبور نہیں کر دیتے تھے کہ پیچھے چلو لیکن وہ جو تمہارے Plans (سازشیں) تھے، وہ تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم چلے تو تھے۔ یہ نہیں تھا کہ تم جو آج کہہ رہے ہو کہ ہماری مفاد پرستیاں ہی تھیں بلکہ تمہارے وہ جو Plans (سازشیں) ہوتے تھے وہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتے تھے۔ ہم اس لیے تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے۔ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ (34:33) جب یہ نتائج سامنے آتے ہیں تو ہر ایک کوشش کرتا ہے کہ کچھ نہ کچھ اپنی Justification (وجہ جواز) پیش کرے کہ میں اصل میں مجرم نہیں تھا بلکہ یہ تھا۔ لیکن جَعَلۡنَا الۡاَغۡلٰلَ فِیۡۤ اَعۡنَاقِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (34:33) وہ بیڑیاں اور ہتھکڑیاں جو ہیں وہ تو ان سب نے پہنی ہوئی ہوتی تھیں، یہ سارے ہی تباہیوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور هَلۡ يُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (34:33) اُس کے بعد عدالت کی طرف سے یہ بات آئے گی کہ یہ سمجھ لو کہ تمہارے خلاف دھاندلی سے کچھ نہیں کیا جا رہا بلکہ یہ تمہارے اپنے ہی غلط اعمال تھے جن کے نتائج میں تم اس طرح جہنم میں جکڑے ہوئے ہو۔ ایک اور مقام پہ یہ بات ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات جب سامنے آئی ہے تو قرآن کے دو چار متعلقہ مقامات ان کی تائید میں آجائیں تو اچھا ہے۔ وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَ لُوۡنَ [1] (37:27) وہاں ایک دوسرے کے ساتھ سوال جواب کا موقعہ دیا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ جو کچھ تمہیں ایک دوسرے سے پوچھنا ہے وہ آزادی سے پوچھو۔ کہیں تمہارے دل میں یہ بات نہ رہ جائے کہ ہم یہ بات کہہ نہیں سکے تھے اس لیے ہمیں سزا مل گئی ہے۔

وہاں ہر کوئی ایک دوسرے پر الزام عائد کرے گا

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ قَالُوۡۤا اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَاۡتُوۡنَنَا عَنِ الۡيَمِيۡنِ (37:28) یہ Followers (پیروکار) کہیں گے کہ تم ہمارے دائیں بائیں سے آ کے ہمیں گھیر لیا کرتے تھے۔ عزیزانِ من! میں یہ کہتا جا رہا ہوں کہ آپ انفرادی طور پہ اپنے ذہن میں مثالیں خود لاتے چلے جائیے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ او کم بختو! تم کہتے ہو کہ ہم صاحبِ اختیار تھے، ہم نے خود فیصلے کیے جبکہ تم دائیں بائیں سے ہم پہ یورشیں کر کے گھیر لیا کرتے تھے۔ قَالُوۡا بَلۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ o وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ بَلۡ

---

[1] وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر، آپس میں سوال جواب کریں گے۔

كُنتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ❶ (37:29-30) وہ کہیں گے کہ بھائی صاحب! جو جی میں آئے کہیئے تمہارے من کے اندر اگر بات ہوتی کہ ہم نے سچائی پہ ہی رہنا ہے تو نہ ہماری پلاننگ کچھ کر سکتی تھی' نہ دائیں بائیں کی یورش کچھ کر سکتی تھی۔ یہ تمہارے اندر کا چور تھا جس کو ہم Exploit (سلب و نہب سے نمایاں) کیا کرتے تھے۔

عزیزانِ من! سوچیے کہ یہ کہاں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک اور مقام ہے جہاں کہا ہے کہ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِى النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ (40:47) Followers (متبعین) اُن سے کہیں گے کہ یہ تباہی و بربادی آئی ہے اور تم تو اتنے وعدے کیا کرتے تھے کہ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا' کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھ نہیں سکے گا۔ اب دیکھو تو سہی کہ ہم کس تباہی کے اندر ہیں' اپنے ان وعدوں کو پورا کرو' ہمیں بچاؤ۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ (40:48) وہ کہیں گے کہ تمہیں کیا بتائیں کہ تم سے پہلے تو ہم خود اِس عذاب میں مبتلا ہیں۔

عزیزانِ من! آخری فیصلے کی جو بات ہے وہ دوسرے مقام پہ آئے گی۔ یہ جو Justificatory Reasons (وجہ جواز کے دلائل و براہین) ہیں یعنی اپنے آپ کی معذرت' تو پیش کی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ لیڈر کہتے ہیں کہ ہم ان کی اس غلط روش کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ یہ خود ذمہ دار ہیں۔ Followers (متبعین) کہتے ہیں کہ کیا ہم صاحبِ اختیار تھے بلکہ تم ہمارے ساتھ جو کچھ کیا کرتے تھے تو ہم تو یہ مجبور ہو کر کیا کرتے تھے۔ یعنی دونوں اپنے آپ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ہم ذمہ دار نہیں تھے بلکہ دوسروں نے یہ کچھ کرایا۔

قرآنِ حکیم کی بصیرت افروز تعلیم

قرآنِ کریم یہ فیصلہ کہہ رہا ہے۔ وہاں پہلے تو ایسا تھا کہ جیسے کوئی ایک ایک مجرم کھڑا ہوا اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہا ہو۔ اب یہ Parties (پارٹیاں) سامنے آتی ہیں۔ کہا کہ جہنم کے اندر کیفیت یہ ہوگی کہ افراد نہیں بلکہ Parties (پارٹیاں) آئیں گی۔ انفرادی طور پہ تو ہو سکتا ہے کہ اُن میں کچھ لوگ اچھے بھی ہوں اور کچھ بُرے ہوں لیکن وہ جس نظام' مسلک' منشور کا ساتھ دینے والے تھے' جب اُس کا نتیجہ' اُس کا انجام تباہی' سامنے آئے گا تو اُس کے اندر

اچھے اور برے سب ہوں گے

ذاتی طور پر تو یہ بیچارے جو دیانتدار ہوتے ہیں وہ بھی پھر اُس میں ساتھ ہوتے ہیں کیونکہ یہ اُس نظام کے ساتھ جکڑنے والی بات

---

❶ وہ ان سے کہیں گے کہ یہ بالکل غلط ہے تم خود سچی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہمارا تم پر کیا غلبہ واقتدار تھا جو ہم تمہیں مجبور کر کے' راہ راست سے باز رکھتے۔ حق وصداقت سے سرکشی تم خود اختیار کرنا چاہتے تھے' اور اب الزام ہمارے سر دھر رہے ہو؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1036)۔

ہے۔ یہ اصل راز ہے۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ وَ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (9:119) ہمیشہ اُس کا ساتھ دو جو سچائی کے اوپر ہے ورنہ تمہاری انفرادی صداقت پرستی تمہیں اُس عذاب سے نہیں بچا سکے گی۔ غلط نظام سے جو عذاب آتا ہے' اُس کے اندر اِس قسم کے لوگ جو انفرادی طور پہ اچھے ہوتے ہیں' وہ بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ اُن کا جرم یہ ہے کہ تُم نے اِس کا ساتھ کیوں دیا۔ یہ جن کو آج تم کہتے ہو کہ یہ بڑے بڑے تھے جنہوں نے یہ کچھ کہا تو بتاؤ کہ اِن کی بڑائی کس کے سجدے میں تھی۔

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست

سچ تو یہ ہے کہ

تمہیں تو تم کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا
جناب ہم نے بنایا حضور ہم نے کیا

قرآنِ حکیم کی نظر میں فلسفہ اجتماعیت کی اہمیت

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا فلسفہ بیان کر رہا ہے؟۔ اِسے فلسفہ اجتماعیت کہتے ہیں۔ اب Parties (پارٹیاں) آتی ہیں۔ کہا کہ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (7:38) ایک پارٹی جہنم میں آئے گی تو اُس کی ہم آہنگ' ہم رنگ جو مقابلے کی دوسری پارٹی ہوگی وہ اُس پہ لعنت بھیجے گی۔ شروع مفاد پرستی کے زمانے میں جو ایک دوسرے کے ساتھ بڑے رفیقِ کار بنے ہوئے ہوتے ہیں' بڑی دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہوتے ہیں' وہ جب ذرا الگ ہوتے ہیں تو پھر دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے؟ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (7:38) آپس میں پارٹیاں ایک دوسرے پہ لعنتیں بھیجتی ہیں۔ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا (7:38) تا آنکہ جب اُس غلط نظام کے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہ سارے کے سارے جہنم میں ہوتے ہیں۔ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (7:38) یہ جو پہلے اُس غلط راستے کی طرف چلنے والے تھے تو بعد والے اُن کے متعلق کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! یہ تھے جنہوں نے ہمیں ڈبو دیا۔ یہ اِس روش پہ چلے آ رہے تھے تو ہم نے بھی اِسی روش پہ چلنا شروع کر دیا' تو انہیں دوگنا عذاب دو۔ ایک تو اِس لیے کہ یہ خود غلط روش پہ چلے ہوئے تھے اور اِس لیے کہ پھر اِن کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی غلط روش کے اوپر چلنا شروع ہو گئے۔ ان کو دوہرا عذاب دیجیے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر دو فریقین کے لیے کیا جانے والا فیصلہ

خدا کی طرف سے' عدالت کی طرف سے' فیصلہ ہوتا ہے: قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ (7:38) کہا کہ ان

دونوں کو دوگنا عذاب ہے۔ اس لیے کہ تم اصل بات سمجھتے نہیں ہو۔ جنہوں نے اِس غلط نظام اور روش کی ابتدا کی ہے تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ انہوں نے غلط نظام اختیار کیا اور پھر وہ جو پیچھے آنے والے تھے اُن کی پیروی کے لیے تقلید کا نمونہ بن گئے۔ اس لیے دہرا جرم ہے۔ یہ جو پیچھے آنے والے تھے اِنہوں نے کچھ عقل وفہم سے کام نہیں لیا، علم وبصیرت سے کام نہیں لیا بلکہ وہ جو پہلی پارٹی چلی جا رہی تھی تو یہ بھی اُس کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ پہلی چیز تو یہ کہ اِنہوں نے خود عقل وفکر سے کام نہیں لیا اور اُن کے پیچھے چلے۔ دوسری چیز یہ کہ جس طرح سے وہ جو پہلے تھے اِن کے لیے تقلید کا نمونہ بنے تو یہ اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے تقلید کا نمونہ بن جائیں گے۔ اِس طرح سے ان کے لیے بھی دہرا عذاب ہوگیا: **لِكُلٍّ ضِعۡفٌ** (7:38) دونوں کو دوگنا عذاب ہوگا۔

معاشرتی طور پر تباہی سے بچنے کے لیے پہلے ہی انتظام کرنا ہوگا

عزیزانِ من! آخری چیز ہے جو سب کچھ کہنے کے بعد قرآن نے Warn (وارن) کیا ہے۔ کہا کہ **وَ اتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً** (8:35) یاد رکھو کہ پہلے سے حفظِ ماتقدم کے طور پر ایسا انتظام کرلو کہ وہ تباہی نہ آنے پائے جو آیا کرتی ہے تو پھر اُنہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتی جو ظالم اُس کے ذمہ دار تھے بلکہ سارے معاشرے کو لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ عزیزانِ من! جب دریا کا بند ٹوٹتا ہے تو وہ پانی پھر مسجد اور مندر میں تمیز نہیں کیا کرتا۔ وہ پانی جب گاؤں کی طرف رخ کرتا ہے تو وہاں یہ نہیں دیکھتا کہ یہ بہت شریف آدمی تھا اس کا گھر چھوڑ دیجیے اور یہ بدمعاش تھا اِس کا گھر ڈھا دیجیے:

سیلاب نہ پرسد کہ درِ خانہ کجاست

پانی کا سیلاب آتا ہے تو وہ یہ بھی آکر نہیں پوچھتا کہ دروازہ کدھر سے ہے تاکہ میں اندر آؤں۔ قرآن کا انداز بہت خوب ہے۔ یعنی انداز یہ ہے کہ پہلے سے پیش بندی کرو کہ اِس قسم کی تباہی معاشرے پہ نہ آنے پائے کہ جو پھر اُنہی تک محدود نہیں رہا کرتی جو ظالم اُس کے ذمہ دار ہوتے ہیں بلکہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ وقت نہیں ہے ورنہ آج کی سوشیالوجی (سماجیات) میں جسے فلسفہ اجتماع کہتے ہیں، آپ کو بتاتا کہ اس کے اندر بڑی چیزیں ہیں جو قرآن اس طرح سے کہہ گیا ہے۔ ہمیں بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ جنہوں نے بڑی دیانتداری سے، شرافت سے، امن پسندی سے، زندگی گزاری تھی وہ بھی اس لپیٹ میں کیوں آگئے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آج بھی اس کا اعتراف ہو رہا ہے کہ جب تک معاشرہ دانستہ یا نادانستہ اُس کے اندر شریک نہیں ہوتا، اِس قسم کی تباہیاں نہیں آیا کرتیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا تھا کہ عقل وبصیرت سے کام لو۔ غلط معاشرہ پہلے دن ہی مرتب نہیں ہو جایا کرتا بلکہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچا کرتا ہے۔ اس دوران میں جو عقل وفکر سے کام لینے والے تھے وہ دیکھتے کہ یہ معاشرہ کس طرف لیے جا رہا ہے۔ اُن کے اوپر یہ **تَعَاوَنُوۡا**

عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى (5:2) فریضہ عائد ہوجاتا ہے کہ بر و تقویٰ کے ساتھ تعاون کرو۔ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (5:2)۔ اور پھر بات اثم اور عدوان کی آ گئی اگر ادھر آ و نگا تو بات کہیں اور ہی نکل جائے گی۔ اُس نے کہا کہ غلط نظام اور غلط روش کے ساتھ تعاون مت کرو۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو بہت بڑی چیز ہے' یہ کبھی کسی دوسرے وقت میں عرض کرونگا جب میرا موضوع ہی یہ ہوگا۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں سوشیالوجی کو اپنانے کے اصول بڑی وضاحت سے دے رکھے ہیں

آج جس مقام کے او پر اتنی تگ و تاز کے بعد ہمارے ہاں کے سوشیالوجی کے فلاسفر پہنچے ہیں' قرآنِ کریم چار چار لفظوں کے اندر کس طرح پورا فلسفہء اجتماعیت بیان کر گیا ہوا ہے۔ قرآن انفرادی مذہب نہیں ہے کہ وہ ایک فرد کے متعلق کہتا ہے۔ فرد کے متعلق وہ اس لیے کہتا ہے کہ جب تک مشین کا ہر پرزہ صحیح نہ ہو' مشین چل ہی نہیں سکتی لیکن گھڑی کا ایک پرزہ کتنا ہی اعلیٰ درجے کا کیوں نہ ہو' اگر وہ میز کے او پر رکھا ہوا ہو اور سارے پرزے میز کے او پر رکھے ہوئے ہوں تو گھڑی بنتی یا چلتی ہی نہیں ہے۔ پرزوں کا صالح ہونا ضروری ہے۔ اور جب وہ صحیح نظام کے اندر Fit in ہوتے ہیں پھر گھڑی وقت بتاتی ہے۔ جو صحیح پرزہ اپنے آپ کو غلط مشین کے اندر Fit in ہونے دیتا ہے تو مشینری کے جامد یا غلط ہونے میں وہ بھی تو برابر کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ معاشرہ جسے آپ کہتے ہیں' وہ تو عشر سے ہے۔ ایک دو تین چار سے نو تک آپ دیکھیں گے تو ایک ہندسہ ہوتا ہے۔ جونہی ایک کے ساتھ دوسرا صفر ملتا ہے تو یہ عشر ہوتا ہے' جس کو دس کہتے ہیں۔ یہاں سے اُنہوں نے معاشرے کا لفظ بنایا ہے۔ اگر وہ صفر ایک سے الگ رہتا تو معاشرہ بنتا ہی نہیں۔ تمہارے اس کے ساتھ لگنے سے معاشرہ بنا ہے۔ تم کہو کہ جی' میں تو صفر تھا۔ تو اُس نے کہا کہ اُس کو تو تُو نے دس گنا بنا دیا۔ یہ قرآن کا فلسفہ ہے۔ وہ تو رسالت مآب ﷺ کے قائم کردہ نظام کے متعلق بھی یہ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ یعنی محمدؐ اللہ کا رسول ہے اور یہ جو اُس کے ساتھ لگے ہیں' تو انہوں نے صحیح نظام قائم کیا ہے۔

ہر انسان کا نفع و نقصان یا تباہی و بربادی پورے معاشرے کی بد نظمی کا نتیجہ ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ وجہ ہے کہ یہ جو یہ اعتراض کرنے والے ہیں کہ میں تو ذاتی طور پر بڑا امن پسند تھا اور میں تو بڑا دیانتدار تھا مجھ پہ یہ عذاب کیوں آ گیا؟ جب تباہی آتی ہے تو اُس کے لیے تو یہ کچھ کہا جاتا ہے۔ اچھے معاشرے کے اندر جب خوشگواریاں آتی ہیں تو اُس میں ہمارے جیسے بھی گنہگار رہوتے ہیں لیکن اُن خوشگواریوں سے ہم برابر متمتع ہوتے ہیں۔ اُن نعمتوں کے اندر ہم برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہم اُس وقت یہ نہیں کہتے کہ صاحب! ہم نے تو اِس کے اندر کچھ زیادہ حصہ نہیں لیا تھا اس لیے ہم اِس میں شریک نہیں ہونا چاہتے بلکہ

ہم تو وہاں برابر کے شریک ہوجاتے ہیں۔ وہاں یہ اعتراض نہیں کرتے کہ میں تو ان خوشگواریوں کا ذمہ دار نہیں تھا اس لیے میں اس میں کیوں کچھ لوں۔ لیکن جب تباہی آتی ہے تو اُس وقت یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ میں کیوں اس لپیٹ میں آ گیا۔ عزیزانِ من! یہ اجتماعیت ہے۔ انسانی زندگی تو تمدنی زندگی ہے' باہمی ربط وضبط کی زندگی ہے۔ اس لیے کہا کہ **وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ** (5:2) جہاں اثم و عدوان کی بات ہوتی ہے تو وہ نظام تمہارے تعاون سے پروان چڑھتا ہے۔ تم کیوں اُس میں تعاون کرتے ہو؟

سوال وجواب کا یہ تمثیلی انداز یہاں کی معاشرتی زندگی کے متعلق ہے

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کی یہ آیات ہمارے سامنے آئیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ Followers (پیروکار) یہ سوال کریں گے' لیڈر یہ جواب دیں گے' آپس میں مکالمہ ہوگا' پھر عدالت کی طرف سے ایک فیصلہ ہوگا۔ تو گویا یہ بات سمجھانے کے لیے ہے۔ یہ بات مرنے کے بعد کی اُس قیامت ہی کی نہیں ہے۔ وہاں کا مواخذہ' وہاں کے سوال وجواب کا' تو سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے تو میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ ہر فرد کا اعمال نامہ اُس کی گردن میں یہاں لٹکا ہوا ہوتا ہے' وہ اُس کو ساتھ لے کر جاتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ یہاں لپٹا ہوا ہوتا ہے اور وہاں کھول دیا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ دوسرا استغاثہ والا تمہارے خلاف کوئی فردِ جرم عائد کرے گا اور پڑھ کر سنائے گا بلکہ اُسے کہا جاتا ہے کہ **اِقْرَاْ كِتٰبَكَ** (17:14) خود اِس کو پڑھ اور بتا کہ تجھ پر کون کون سی دفعہ لگتی ہے۔ اور اُس کے بعد یہ ہے کہ پھر اس کے بعد فیصلہ دینے والا جج بھی کوئی اور نہیں ہوگا۔ کہا کہ **كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ** (17:14) تو پھر خود ہی اپنے متعلق فیصلہ کرلے۔ وہاں کا مواخذہ تو یہ ہے۔ تو یہ جو ہے کہ ایک عدالت ہے' اُس میں مجرم ہیں' مستغیث ہیں' مدعی ہیں' مدعا علیہ ہیں' گواہ ہیں' Followers (متبعین) ہیں' Leaders (لیڈران) ہیں' یہ تو اس دنیا کے متعلق ہمیں سمجھانے کے لیے گفتگو ہورہی ہے۔ ہماری ساری مشکل یہ ہے کہ دین کو اِس دنیا سے متعلق نہیں سمجھا گیا بلکہ اِسے مذہب بنادیا گیا۔

سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی

بڑی لمبی باتیں تم نے کیں کہ خدا کے ہاں کا وہ ترازو اتنا بڑا ہوگا اور قیامت والے دن تانبے کا ایک فرش ہوگا۔

ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود

لیکن اے کم بخت یہ جو موجود قیامت ہے اس کو تُو دیکھ۔

قرآن حکیم کی یہ ساری تعلیم ہماری اس زندگی کو سنوارنے کے لیے ہے

عزیزانِ من! دین کو سمجھنا ہو تو قرآن کو سمجھنا چاہیے۔ اور قرآن کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمہاری اس زندگی کے متعلق گفتگو کرتا

ہے' تمہاری اِس زندگی کو سنوارتا ہے۔ انفرادی طور پہ بھی سنوارتا ہے اور اجتماعی طور پہ بھی سنوارتا ہے۔ یہاں غلط نظام کے نتائج بتاتا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85)۔ اس زندگی کی رسوائیوں' ذلتوں' پستیوں کو وہ عذاب کہتا ہے جبکہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں کوئی جتنا ذلیل ہوتا ہے وہ خدا کے ہاں اتنا ہی مقرب ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس زندگی میں ذلتیں' پستیاں' رسوائیاں ہمارا عذاب ہے جبکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا مقرب ہے۔

عزیزانِ من! یہ ایک بات یاد رکھیے کہ قرآن اس دنیا کے متعلق بھی' آپ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق گفتگو کرتا ہے' یہیں نتائج بھی بتاتا ہے۔ یہاں سے پھر وہ آگے لے جاتا ہے۔ یہاں تک وہ لایا کہ یہ یہاں کٹہرے میں کھڑے ہوئے' یہ سب چیزیں سامنے آئیں گی۔ آدمی کانپ اٹھتا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (8:2; 22:3) قرآن اگر واقعی انسان کے سامنے آ جائے تو انسان کے اوپر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ رحیم بھی ہے۔

مہلت کا وقفہ خدا کی کرم نوازی ہے لیکن ایک قانون کے تحت

کہا کہ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ [1] (28:67) ڈرو نہیں' ابھی وقت ہے۔ یہ کچھ سننے کے بعد سمجھ لیا کہ یہ غلط نظام ہے' اس کو ختم کرنا ہے اور اِس کی جگہ دوسرا نظام لانا ہے۔ جس نے اس کے بعد اپنی روش بدل لی اور واقعی وہ کام کیے جو انسانوں کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے والے ہوں تو فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (28:67) اِس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی۔ اب جسے ہمارے کہتے ہیں کہ ذرا پچھیتی [2] ہو جائے گی تو ٹھیک ہے کہ وقت پہ نہیں بوئی تھی' وقت پہ پانی نہیں دیا تھا لیکن وہ بونے کا ایک پیریڈ ہوتا ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں اگر تم کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہو تو ہماری صورت یہ نہیں ہے کہ جو ایک قدم پیچھے رہ گئے ہیں' اُن کو اُسی وقت جہنم میں دھکیل دیا جائے بلکہ ہم مہلت دیتے ہیں' وقفہ دیتے ہیں۔ ہم انسانی کمزوریوں کو جانتے ہیں لیکن یہ اُس وقت ہوگا جو بوائی کا وقت ہے اُس کے اندر بوؤ گے۔ یہ ہے تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا (28:67)۔ جب بھی تم اپنا نظام بدل لو گے بشرطیکہ آخری تباہی نہ آ چکی ہوئی ہو' تم صحیح طور کے اوپر اچھا بیج لاؤ' زراعت کے

---

[1] (ان سے کہہ دو کہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو اس وقت تمہاری حالت یہ ہو جائے گی۔ لہٰذا تم اس موقعہ کو غنیمت سمجھو۔ ابھی وقت ہے کہ) تم میں سے جو شخص اپنی غلط روش کو چھوڑ کر' صحیح راستہ اختیار کر لے اور خدا کے تجویز کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہو جائے' تو اسے امید رکھنی چاہیے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہو جائے گا جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی اور ان کی زندگی کامیاب رہے گی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 901)۔

[2] موسم سے ذرا بعد کی۔

قوانین کا مطالعہ کرو۔ زمین کو دیکھو کہ کیسی ہے، وقت پہ پانی دو، اُس کی حفاظت کرو: مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (28:67)۔

ایک اچھے نظام کی مثال سرسبز و شاداب کھیتی کی مانند ہے

قرآن کے اندر عام طور پر اچھے نظام کی مثال کھیتی سے دی ہے یا درختوں سے دی ہے۔ یہ بڑی جامع مثال ہے۔ بیج پھل لانے تک کے زمانے میں بڑا وقت لیتا ہے۔ بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بظاہر بلا معاوضہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ گھر میں جو گیہوں رکھا تھا وہ کسان وہاں بو آتا ہے۔ چھ مہینے روز علی الصبح وہ اٹھتا ہے اور چلا جاتا ہے، سارا دن اُس پہ محنت کرتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ واپس آ جاتا ہے۔ ایک دو دن نہیں بلکہ مہینوں وہ ایسا کرتا ہے۔ عزیزانِ من! وہ اس لیے ایسا کرتا ہے کہ اُسے یہ یقین ہے کہ یہ جو میرا صحیح دانہ ڈالا ہوا ہے، جو میری محنت میں صحیح طریق پہ کر رہا ہوں تو ایک ایک دانے کے سات سات سو دانے مجھے ملیں گے۔ عملِ صالح کے لیے ایمان اس لیے ضروری ہے۔ اگر کسان کے دل سے یہ بات نکال دو کہ مجھے اِس کا بدلا یہ کچھ ملے گا تو پھر وہ دوسری صبح اٹھ کر کبھی بھی کھیت میں نہیں جائے گا۔ اُس نے چھ مہینے تک روز صبح اٹھ کر کھیت میں جانا ہے اور محنت کرنا ہے تو اُسے کونسی چیز لے جا سکتی ہے۔ یہ وہ Incentive (جذبہ محرکہ) ہے۔ اس ایمان کے ساتھ وہ جاتا ہے اور محنت کرتا ہے۔ قرآن ہمیشہ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (28:67) کہتا ہے۔ یہ ایمان ہونے کے مطابق صحیح نظام قائم کرتے ہیں تو ان کی کھیتی پھل لائے گی۔

آگے بات بڑی اہم ہے۔ کہا کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ بیج اچھا ہو، زمین اِس قسم کی ہو، پانی یوں دیا جائے تو پھر ہی پیداوار ہوگی۔ یہ کیوں نہیں ہے کہ جیسا یہ بیج ڈال آئے یعنی جَو کا بیج ڈال آئے اور گیہوں اُس میں سے پیدا ہو۔ عزیزانِ من! چار الفاظ ہیں۔ بات تو مکافاتِ عمل کی ہو رہی ہے۔ ایک Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) ہے۔ اس میں بنیاد Natural Selection (فطری انتخاب) ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تخلیق بڑی عام ہوتی ہے، بڑی بکثرت ہوتی ہے۔ یعنی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ یہ بوہڑ کا درخت ہے اور اِس میں ہزاروں یا لاکھوں کی تعداد میں گولے ہوتے ہیں اور ہر گولے میں لاکھوں ہزاروں دانے ہوتے ہیں۔ اُس ایک دانے سے اُسی قسم کا ایک درخت پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جو تخلیق کے Process (عمل) کی Continuity (تسلسل) ہے کہ بڑ پیدا ہونے چاہئیں۔ وہ اِس کے لیے اتنا کچھ بناتا ہے تاکہ ایک دانے سے یہ بوہڑ پیدا ہو جائے۔ کتنے ہی دانے ضائع کیوں نہ ہو جائیں لیکن Nature (فطرت) کا یہ Process (عمل) کبھی ناکام نہیں رہتا۔ وہ اتنی افراط میں، لاتعداد، اِس کو پھیلاتا چلا جاتا ہے کہ کوئی تو اِس کے اندر پیدا ہوگا۔ یہ پروسیس (عمل) ہے۔

قانون مشیّت کے مطابق نشو ونما کا ہونا

عزیزانِ من! ڈارون ❶ سے شروع ہو کر اب تک اتنی اتنی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اِس کو وہ Process of Natural Selection (فطری انتخاب کا عمل) کہتے ہیں۔ پھر اس کے لیے قوانین ہیں کہ ان میں سے کونسی چیز ہے جو قائم رہتی ہے یا آگے بڑھتی ہے تو اُس میں کیا کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔ یہ ایک پوری سائنس بن گئی ہوئی ہے کہ تخلیق تو بے شمار ہوتی ہے لیکن اُس تخلیق میں سے کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتی ہیں کہ وہ قائم رہیں' زندہ رہیں اور آگے بڑھیں۔ عزیزانِ من! سارا پروسیس ہی یہ ہے۔ قرآن نے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کہا تھا کہ اگر صلاحیت پیدا کر لو تو پھر کوئی بات نہیں ورنہ یہ سارے کا سارا معاشرہ تباہ ہونے والا ہے۔ سوال یہ تھا کہ انسانیت کے اندر سے کوئی گروہ کیسے بچ سکتا ہے؟

صرف نشو ونما یافتہ صلاحیت ہی طبعی قانونِ انتخاب کے تحت آگے بڑھتی ہے

قرآن کہتا ہے کہ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ وَ رَبُّکَ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخۡتَارُ (28:68)۔ ہمارے ہاں تخلیق تو بکثرت ہوتی ہے۔ اور پھر اُس میں سے خاص قانون کے تابع Selection (انتخاب) ہوتا ہے۔ یہ ہمارا قانون ہے کہ کون ایسے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے اہل ہیں' کون ایسے ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے' یہ ہمارا قانونِ اختیار ہے۔ مَا کَانَ لَهُمُ الۡخِیَرَةُ (28:68)۔ یہ قانون ان انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے کہ جسے یہ چاہیں باقی رہے تو وہ باقی رہے اور جسے یہ چاہیں تباہ ہو جائے تو وہ تباہ ہو جائے۔ یہ ہمارا قانونِ مشیت ہے کہ جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے وہ باقی رہے گا' جس میں آگے بڑھنے کے لیے استعداد

---

❶ Darwin, Charles Robert (1809-82). Darwin, a British naturalist who revolutionized biological theory by putting forward his theory of evolution based on natural selection. His views, formed after his comprehensive observations of fossils and the diverse plant and animal life during his voyage (1831-36) round South America and the Pacific as naturalist on H.M.S. Beagle, were published in "On the Origin of Speies." His conclusions conflicted with received Christian opinion on the creation of the world, and caused much controversy, especially where, as in his "The Descent of Man (1871)," evolutionary theories were applied to human origins. (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P. 397.)

ہے وہ آگے بڑھے گا۔ یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوگا۔ یہ تمہارے قانون کے مطابق نہیں ہو سکتا۔

انسانوں کی زندگی کی بات شروع ہوئی ہے۔ قرآن وہ اصول دے رہا ہے جس کے اوپر آپ کے ہاں کی Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) ہے۔ اس کی ساری عمارت دو الفاظ کے اوپر استوار ہوتی ہے۔ **رَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ** (28:68) ہم بے حساب پیدا کیے چلے جاتے ہیں لیکن اُس میں سے **وَ یَخْتَارُ** ہے یعنی زندہ کون رہتا ہے' آگے کون بڑھتا ہے؟ کہا کہ یہ ہمارے Law of Selection (قانونِ انتخاب) کے تابع ہوتا ہے۔ ڈارون [1] کی کتاب میں Variety of Species (انواع کا تنوع) دی ہوئی ہیں۔ یہ جو دس لاکھ سال پرانے' کروڑوں سال پرانے' ڈھانچے نکلتے ہیں' یہ اُس میں اور جو موجودہ شکل کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے' اس میں' دیکھتے ہیں کہ یہ اِس شکل کے اندر کیسے آئی۔ یا یہ فلاں چیز باقی کیوں نہ رہی؟ یہ کیسے مٹ گئی؟ اس کے متعلق پورا قانون ہے۔ **یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخْتَارُ ط مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ** [2] (28:68)۔ اور اِس بات کے اوپر آ کر بڑے سے بڑا سائنسدان بھی انگشت بدنداں ہوتا ہے کہ یہ قانون کوئی انسان نہیں بنا سکتا تھا کہ اِن میں سے زندہ رہنے کا قانون کونسا ہے اور مٹ جانے کا قانون کونسا ہے۔ کہا کہ **مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ** (28:68) یہ قانون خدا کا ہے اور وہ جو تمہیں یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے زندہ رہنا ہے اور آگے بڑھنا ہے تو ہمارا جو Selection (انتخاب) کا قانون ہے اُس کے مطابق تم زندہ رہو۔ اگر اُس قانون کے اوپر پورے نہیں اترو گے تو تمہیں چیلیں اور کرگس [3] کھا جائیں گے:

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

خدا تعالیٰ اپنے کسی قانون میں دوسرے کو شریک نہیں ہونے دیتا

عزیزانِ من! کمزور ہونا بہت بڑا جرم ہے۔ ہمارے قانونِ تخلیق کے مطابق تم پیدا تو ہو گئے تھے۔ اب زندہ وہی رہے گا جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے' آگے وہی بڑھے گا جو ہمارے قانونِ سلیکشن (انتخاب) کے اوپر پورا اترے گا۔ **مَا کَانَ لَهُمُ**

---

[1] ڈارون' چارلس رابرٹ (1882-1809)۔ اس کتاب کا نام ہے On the Origin of Species۔

[2] زندگی کی کامیابی اور ناکامی خدا کے اُس قانونِ مشیّت کے مطابق واقع ہوتی ہے جس کی رُو سے کائنات کی مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو چیزیں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہیں' انہیں (قانونِ انتخاب طبعی Law of Ntural Selection۔ کے مطابق' زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے) چن لیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب' خدا کے مقرر کردہ قانونِ ارتقا کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے نظریوں کے مطابق نہیں ہوتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص (902-901)۔

[3] گِدھ۔

الۡخِیَرَۃُ (28:68)۔ یہ انسانوں کے قانون کے مطابق نہیں ہوگا۔ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (28:68) یہ جو کہتے ہیں کہ ان کے قانون کے مطابق بھی یہ ہو جائے گا تو یہ شرک ہے۔ خدا ان سے بہت بلند ہے' ان سے بہت اونچا ہے کہ اپنے ان قوانین میں' ان انسانوں کو شریک کرے۔ یہ کرنا شروع کر دے تو یہ نظم و نسق ایک دن کے لیے نہیں چل سکتا۔ وہ چیز وحدتِ قانون ہے جس کی بنا کے اوپر اس کائنات کا سارا نظم و نسق چل رہا ہے۔ وَ رَبُّکَ یَعۡلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوۡرُہُمۡ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ (28:69) ہمارا قانونِ سلیکشن ❶ (انتخاب) ہے۔ بظاہر تم کہو گے کہ جی بڑا دیانتدار ہے' بڑا امانتدار ہے تو اِس میں تو یہ چیز ہونی چاہیے کہ زندہ اور باقی رہے۔ کہا کہ یہ چیزیں وہ جانتے ہیں جن کو اتنا ہی پتہ ہے کہ کیا کہتے ہو۔ ہمیں یہ پتہ ہے کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ ہمارا قانونِ سلیکشن (انتخاب) بہت بڑا ہے۔ عزیزانِ من! ہونا بھی چاہیے۔ اتنی بڑی کائنات کا نظام چلانے والا ہے۔ کہا کہ تم ہمارے قانونِ سلیکشن (انتخاب) کا کیا پوچھتے ہو۔ تم ہمیں فریب نہیں دے سکتے۔ دوسری جگہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ (35:8) یہ جو کچھ تم مصنوعی طور' پہ تصنع سے' بناتے ہو ہم جانتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں کیا چیز ہے۔ ہمارا قانونِ سلیکشن اس قدر دور رس واقع ہوا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القصص کی آیت 69 تک ہم آ گئے۔ 70 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀❀............❀❀............❀❀

---

❶ Law of Natural Selection (قانونِ انتخابِ طبعی)

بارھواں باب: سورۃ القصص (آیات 69 تا 77)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى
وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ
سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَمِنْ
رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَيَوْمَ
يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى
فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا
تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ
الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1979ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 69 سے ہو رہا ہے:((28:69۔ان ناسازگار حالات میں بھی آپ احباب کا درس کے لیے تشریف لے آنا قرآن سے وابستگی کی دلیل ہے۔میرے لیے بڑا خوش کن لمحہ ہے۔اللہ اِس میں اور برکت عطا فرمائے۔

سابقہ آیت درس کے آخری لمحات میں ہمارے سامنے آئی تھی لیکن وہ تو ایک بہت بڑے عظیم سائنٹفک مسئلے کی شہادت ہمارے سامنے پیش کرتی تھی۔ وہ بڑی عظیم چیز ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں قرآنِ کریم کے متعلق یہ ہے ہی نہیں ہ جو اقبالؒ ((1877-1938 نے کہا تھا کہ ''ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است''۔ واقعی یہ چیزے دیگر ہے' یہ قیامت تک محفوظ ہے۔ ذرا اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ اگر خدا کے متعلق کوئی تصور آپ کے ذہن میں ہے تو اُس سے بلند تصور تو ہو نہیں سکتا۔ خدا جیسا مصنف ہے' یہ اس

کی آخری کتاب ہے۔ اُس [1] نے کہا ہے کہ ''قرآں کشید ودست از قلم کشید خدا۔'' کہ تصویر کو کھینچا تو پھر اُس مصور نے قلم کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ اس کتاب کے بعد وہ خدائے عظیم وخبیر وعلیم قلم ہاتھ سے رکھ دے اور وہ کتاب اُس کے نزدیک اتنی محبوب اور قیمتی ہو کہ وہ کہے کہ ہم خود اِس کی حفاظت کریں گے۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔ اُس کے بعد کی صورت یہ ہوگی کہ جوں جوں علمِ انسانی بلند ہوتا چلا جائے گا' اُس کے حقائق زیادہ نمایاں طور پر بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ قرآن نہ تو کسی ایک دور میں سمجھے جانے کی بات ہے یعنی یہ کہنا کہ قرآن کسی ایک دور میں' کسی ایک فرد نے سب سمجھ لیا ہے' صحیح نہیں ہے۔ اِس کے جو حقائق ہیں وہ تو بلند فکر کے متقاضی ہیں:

عشقِ نَبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا [2]

نظریہ ارتقا کے بارے میں اہل یورپ کی تحقیقی کوشش اور نتائج

یہ جو ہمارے ہاں کی عام سطح ہے' قرآن اُس سے بہت بلند چیز ہے۔ کچھ امید کی کرن نظر آ رہی ہے کہ مغرب کے پہلے جو مفکرین تھے اور اب جو سائنسدان ہیں' اُن کی توجہ اس طرف منعطف ہو رہی ہے۔ اُن کی تحقیقات کے صدقے میں ہمیں بھی قرآن کی کوئی آیت سمجھ میں آ جاتی ہے۔

سابقہ درس کی پچھلی آیت میں یہ تھا کہ وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ (28:68)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ تخلیقِ کائنات کی تھیوری نظریہ کے اس ایک Issue (مسئلے) کے اوپر ڈارون (82-1809) سے بھی پہلے' اِس وقت تک لائبریری بھری ہوئی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ [3] (28:68)۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق پیدا کیے چلا جاتا ہے۔ پھر اُس میں سے اُس کے اِس قسم کے قوانین ہیں کہ جو Species جو نوع' جو فرد' جو قوم' زندہ رہنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے

---

[1] علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877)

[2] دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نَبرد تھا — عِشقِ نَبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا (غالب)

[3] زندگی کی کامیابی اور ناکامی خدا کے اُس قانون مشیت کے مطابق واقع ہوتی ہے جس کی رُو سے کائنات کی مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو چیزیں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہیں انہیں (قانونِ انتخاب طبعی Law of Natural Selection کے مطابق زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے) چن لیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب' خدا کے مقرر کردہ قانونِ ارتقا کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے نظریوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 902-901)۔

تو وہ زندہ رہتی ہے یعنی جو آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کر لیتی ہے وہ آگے بڑھتی ہے' وہ اگلی منزل میں آجاتی ہے۔ پھر اس منزل میں وہی چیز شروع ہو جاتی ہے یعنی یختار. The Law of Natural Selection (قانونِ انتخابِ طبعی) ان کے ہاں ایک چیز ہے۔ یختار کا ترجمہ ہی یہ Selection (انتخاب) ہے۔ یعنی تخلیق (Creation) اور اُس کے بعد یہ Selection (انتخاب)۔ یہ یورپ کے اندر بڑا اہم موضوع ہے کہ یہ محسوس اشیاء کس طرح سے موجودہ منزل میں یا موجودہ Stage (مرحلے) میں پہنچ گئیں کیونکہ جب وہ مختلف انواع کی یا مختلف Species کی ابتدائی کڑیاں دیکھتے ہیں' جن کے ڈھانچے برفوں کے نیچے سے' سمندروں کے نیچے سے نکل رہے ہیں تو وہ اُن ڈھانچوں سے اُن کی مسلسل کڑیاں ملاتے ہوئے وہاں تک پہنچتے ہیں جہاں تک وہ نسل موجودہ ہے اور اس کی تحقیق کرتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ جو پیدائش تھی اس میں سے درمیان میں یہ جو اتنا کچھ تھا' وہ تو معدوم ہو گیا لیکن اُس کی یہ جو شکل ہے' یہ کیسے آگے بڑھی۔ اور اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ Natural Selection (فطری انتخاب) کا ایک Law (قانون) ہے کہ Nature (فطرت) کے قوانین کے اوپر جو Species (انواع) پوری اتریں یا زندہ رہیں یا جنہوں نے آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لی' وہ اس شکل میں آ گئیں۔ یہاں پھر وہی پروسیس (عمل) شروع ہو گیا۔

ہمارے یہاں زندگی کے خاتمے کے لیے سورۃ یٰسین سنادی جاتی ہے

یہاں سے پہلے قرآن یہ بات کر رہا تھا کہ اقوام کس طرح زندہ رہتی ہیں' کس طرح آگے بڑھتی ہیں اور کس طرح ختم ہو جاتی ہیں۔ اُس کے آگے تخلیق اور ''یختار'' کی یہ آیت (28:68) آتی ہے۔ بھلا بتائیے تو سہی کہ ہم جو محض ثواب کی خاطر اس کی تلاوت کریں یا مردے کی موت واقع ہونے کے لیے سورۃ یٰسین سنائیں تو ہم اس چیز کو کیا سمجھیں گے کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ اُن سائنسدانوں سے پوچھیے کہ اس ایک آیت کو لے کر انہوں نے اس کے اوپر انکشافات کی عمارتیں کھڑی کر دی ہیں۔ یہ آیت ہے: **یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخْتَارُ** (28:68) جس دانے میں اُگنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ اُگتا ہے اور جو باقی ہیں وہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہماری جو تخلیق ہوتی ہے وہ ایسے ہی ہوتی ہے۔ پھر اُس میں صلاحیتوں کے مطابق برومندی ہوتی ہے۔ اب ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ گیہوں بو کے گیہوں ہی اگے گا۔ اُس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہم نے خود بند کر دی ہے کیونکہ ہم نے تحقیق ہی نہیں کی' ورنہ کیا عجب کہ ہم اس کے بعد تحقیق کرتے تو یختار کی جو منزل ہے' ہم اُس میں آتے۔ اس Selection (انتخاب) سے بابا آدم کے زمانے کا گیہوں' جس کی ایک صفت ہمیں پتہ ہے کہ وہ جنت سے نکلوا دیتی ہے' ''ہور سانوں پتہ ای نہیں اے کے کردی کی ہیگی اے''[1] وہ Nature (فطرت) کے قبضے میں تھا'

---

[1] مزید ہمیں معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ کیا کچھ کر دیتی ہے۔

اُس نے اُس میں کیا سے کیا بنا دیا ہے:

مغاں کہ دانہ انگور ناب می سازند

کہ یہ شراب خانے والے انگور کے دانے کو جو دراخ بناتے ہیں

ستارہ می سی کنند آفتاب می سازند

اس شخص [1] کی بھی کیا بات ہے! انگور کے دانے کو ستارہ کہنا اور شراب کے پیالے کو آفتاب کہنا اور Evolution (ارتقا) کا جو اتنا بڑا مسئلہ ہے وہ بیان کر جانا' یہ سب اسی کا کام ہے۔

قانون سلیکشن کے تحت تخلیقی عمل کی بنا پر آج کے انسان کی بھی ارتقائی منازل رواں دواں ہیں

یہ اس طرح سے انگور کو نچوڑ کے شراب بنا دیتے ہیں:

ستارہ می سی کنند آفتاب می سازند

قرآن کہتا ہے کہ **يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ** (28:68) تخلیق کرتا ہے اور پھر Selection (انتخاب) کی رو سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی یہ ساری چیزیں یہاں آتی ہیں۔ قوموں کی زندگی بھی غاروں میں رہنے والے انسانوں سے شروع ہو کر آج چاند اور مریخ تک پہنچنے والے انسانوں تک پہنچی ہے۔ اس میں **يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ** (28:68) کی تفسیر اور تفصیل نظر آئے گی۔ بار بار جو قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے اندر **الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ** (10:24) ہیں او بابا! یہ جو ہم کہہ رہے ہیں تو اِس کو غور و فکر کرنے والی قوم سمجھے گی کہ ہم نے کیا کہہ دیا ہے۔ جو قوم ناظرہ قرآن پڑھ کر ایک ایک حرف پہ دس دس نیکیوں کا عقیدہ رکھتی ہو' اُس کو کیا معلوم ہے کہ یہ کیا کہہ گیا ہے۔ یہ ہے قومٍ یتفکرون اور یہ ہے **مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ** (28:68) یعنی یہ جو قانون ہے کہ زندہ کون رہے گا اور آگے کون بڑھے گا تو یہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے کہ تم اپنے ذہن سے جو کچھ بنا لو۔ میں نے جو کہا ہے کہ قرآن پیچھے سے قوموں کی تباہی کی یا موت و حیات کی بات کر رہا تھا اور درمیان میں ایک فقرہ لے کر آ گیا ہے۔ اُس میں اُس نے اتنا عظیم اصول بتا دیا ہے۔ اُس نے کہا **مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ** (28:68) یہ ان کے اختیار کی بات نہیں ہے کہ اپنے لیے جو جی چاہے نظام بنائیں اور کہیں کہ ہم اِس کی رو سے زندہ رہیں گے' اِس کی رو سے آگے بڑھیں گے۔ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ جو ہمارا بنایا ہوا قانون ہے اُس کے مطابق قوم زندہ رہے گی' اُس کے مطابق تباہ ہوگی' اُسی کے مطابق آگے بڑھے گی اس لیے کہا کہ **سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا**

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

یُشۡرِکُوۡنَ (28:68) [1] یہ لوگ خدا کے شریک بناتے ہیں کہ وہ بھی اس طرح کا قانون اور نظام بناتا ہے اور ہم بھی بناتے ہیں۔ یہ شرک ہے۔ خدا نے جو کہا ہے وہ اِس سے بہت بلند ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔ [2]

کوئی انسان بھی قانون سازی اور اقتدار میں خدا تعالیٰ کی ہمسری نہیں کر سکتا

قانون سازی میں اُس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ یہی تو ایک چیز ہے جو اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے۔ اگر قانون سازی کا اختیار انسانوں کے ہاتھوں میں دیا ہوا ہوتا تو ساری دنیا جہنم بن گئی ہوتی۔ شرک کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ مٹی اور پتھر کے بت کے سامنے جھک جانا جہالت ہے' توہم پرستی ہے' عقل وفکر سے یہ چیز ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اقتدار اور قانون سازی سے انسان آگے بڑھتا ہے' اگر انسان اِس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے تو تباہیوں کے جہنم میں چلے جائیں گے۔ عزیزانِ من! یہ ہے سُبۡحٰنَ اللّٰہِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (28:68)۔

قوموں کی موت وحیات کا فیصلہ دلوں میں گزرنے والے خیالات کی بنا پر ہوتا ہے

اُس نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ جو محسوس چیزیں ہیں اُنہی کے مطابق قوموں کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہوتا ہے نہیں' بلکہ ان کا دارومدار دلوں میں گزرنے والے خیالات' ان کے ارادے' ان کی اسکیموں' ان کی سازشوں پر ہوتا ہے اسی لیے کہا کہ وَ رَبُّکَ یَعۡلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوۡرُہُمۡ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ (28:69) [3] یہ قانون وہ بنا سکتا ہے جو محسوس اعمال پہ ہی نگاہ نہ رکھے بلکہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی باخبر ہو کہ یہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ کہا کہ قوموں کو تم اپنی زبانی باتوں یا بیانات سے بے خبر رکھ سکتے ہو لیکن تم خدا کے قانون کو نہیں جھٹلا سکتے۔ محسوس دنیا کے اندر مثال کے طور پہ تو ٹھیک ہے کہ سنکھیا کسی نے چرایا' اگر کسی نے دیکھ لیا یا کسی طرح سے جرم کا ثبوت مل گیا تو اُس کی کوئی سزا مل گئی۔ اگر کوئی دیکھنے والا نہیں اور جرم کا ثبوت نہیں مل رہا تو اِس چوری کی سزا نہیں ملتی لیکن اگر وہ سنکھیا تنہائیوں میں کمروں میں' بیٹھا ہوا بھی کھالے تو اُس کے لیے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی عدالت میں اور نہ ہی

---

[1] خدا کا قانونِ حیات اس سے بہت بلند ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ نظریات بھی اس میں شریک ہو جائیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 902)

[2] قانونِ انتخابِ طبعی کا اطلاق: جس قسم کا قانون انتخابِ طبعی (Law of Natural Selection) خارجی کائنات میں کارفرما ہے' اسی قسم کا قانون' خود انسانوں پر بھی نافذ ہے۔ اس قانون کے مطابق' مفلحین - کامیاب وکامران - وہ ہوتے ہیں جن کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پا چکی ہیں۔ جن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی' وہ ناکام ونامراد رہتے ہیں۔

[3] یہ قانون ایسا باریک بین اور جزرس ہے کہ لوگ جو کچھ اپنے دل میں چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں' اس کے نزدیک سب برابر ہے۔ (خود طبعی دنیا میں بھی دیکھیے۔ سنکھیا بند کمرے کی تنہائی میں' چوری چوری کھایا جائے' یا کھلے بندوں' اس کا اثر ایک جیسا ہوگا)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 902)۔

پولیس میں جانے کی ضرورت ہے۔ وہ وہاں بھی اپنا نتیجہ پیدا کرے گا۔ خدا کا قانون تمہارے اِس قسم کے نظام کا محتاج نہیں ہے کہ سپاہی دیکھے تو پکڑے جاؤ' نہ دیکھے تو نہ پکڑے جاؤ۔ قوموں کی موت وحیات کے متعلق یہ بتایا اور کہا کہ **سُبۡحٰنَ اللّٰہِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ** [1] (28:68) اور اگلی آیت یہ ہے کہ **وَ ھُوَ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ** (28:70) اس کے سوا قانون کا اختیار کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے' اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

موسمِ خزاں اپنے اندر آنے والی بہار کی نوید لیے ہوئے ہوتا ہے

عزیزانِ من! پھر اس پروگرام کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ **لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاُوۡلٰی وَ الۡاٰخِرَۃِ** (28:70) پروگرام کی جو پہلی کڑی ہے وہ بھی باعثِ حمد وستائش ہے اور وہ پروگرام جتنی کڑیوں میں سے گزرتا ہے' ان میں کی ہر کڑی باعثِ حمد وتحسین ہے۔ اور جس انجام پہ وہ پہنچتا ہے وہ بھی اسی طرح سے سرخرو ہونی ہوتی ہے۔ الحمد ہی الحمد ہے۔ تمہاری نگاہیں بظاہر جسے تباہی دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ ہو گیا' وہ بھی اُس کے پروگرام اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ خزاں کے جس درخت پہ ایک پتہ نہیں ہوتا' وہ ایک آنے والی بہار کے لیے سروشِ مشیت ہوتی ہے' طائرِ پیش رفت ہوتی ہے۔ دیکھنے والی نگاہوں کو وہ خوشخبریاں دے رہی ہوتی ہے کہ اس ٹنڈ منڈ درخت کی طرف نہ جاؤ' اس کے اندر حیاتِ نو ابھرے گی بشرطیکہ اس کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔ **لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاُوۡلٰی وَ الۡاٰخِرَۃِ** (28:70) کیا بات ہے اس آیت کی بھی! پھولوں کے کھلنے کے وقت کی بات نہیں ہے کہ اُس کا پروگرام باعثِ حمد وستائش ہے بلکہ خزاں بھی اُس کے پرگرام کی ایک وجہ حمد وستائش ہے۔ اس لیے کہ اِس کے بعد اگر اُس قوم کے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے تو جس طرح سے خزاں کے لیے ابتدا باعثِ حمد وستائش تھی' یہ مرحلہ بھی باعثِ حمد وستائش ہے۔

لفظ ''حمد'' کا قرآنی مفہوم

قرآنِ کریم نے ایک مقام پر اسی ''حمد'' کو بیان کیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر حمد کے معنی ذہن میں نہ ہوں تو میری کتاب ''لغات القرآن'' میں دیکھیے۔ یہ بات نہیں ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ یہ تو اس طرح ہے جیسے بادشاہوں کے دربار میں قصیدہ خوانی ہوتی تھی کہ تم بڑے اور تمہارا باپ بڑا اور یہ سب کچھ ہے۔ یہ اس طرح سے نہیں ہے۔ قرآن کی ابتدا ہی الحمد للہ سے ہوتی ہے۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے والی بات نہیں ہے۔ یہ عربی زبان کا بڑا جامع لفظ ہے۔ ''کسی عظیم خالق کا شاہکار' جو محسوس شکل میں سامنے آ جائے اور نوعِ انسانی کے لیے اتنا حسین وجمیل اور مفید ہو' کہ اُس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان کے اوپر واہ واہ آ جائے' اسے حمد کہتے ہیں''۔

---

[1] خدا کا قانونِ حیات اس سے بہت بلند ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ نظریات بھی اس میں شریک ہو جائیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 902)۔

یہ لفظ محض تعریف کے لیے نہیں ہے۔ عربی زبان میں تعریف کے لیے تو لفظ ''مدح'' ہے۔ جس معنی میں ہم تعریف لیتے ہیں وہ اِس کو مدح کہتے تھے۔ قرآن میں خدا کے لیے ''مدح'' کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ قرآن میں ''حمد'' کا لفظ آیا ہے اور حمد یہ نہیں ہے کہ آپ یونہی کسی کی تعریف کریں بلکہ کسی کے شاہکار کو دیکھ کر بے ساختہ زبان کے اوپر جو تحسین اور واہ واہ آتی ہے تو اُسے حمد کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھنے والے کے لیے اس پروگرام کی ابتدا میں اور انتہا میں بے ساختہ زبان کے اوپر واہ واہ آتی ہے۔ اور جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ دیکھنے والا تو خزاں میں بھی آنے والی بہار کی غمازیاں محسوس کر لیتا ہے۔ اور جسے ہم بظاہر دیکھتے ہیں کہ تباہی آ رہی ہے اگر اُس قوم کے اندر زندہ رہنے کی یا آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے تو وہ زندہ بھی رہے گی اور آگے بھی بڑھے گی۔

ظالم کی موت اپنے ساتھ مظلوم کے لیے زندگی کا پیغام لیے ہوئے آتی ہے

قوموں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اُس قوم نے اس طرح سے اپنے اندر صلاحیت کھو دی تو اُس کا انجام کیا ہوا' وہ اس چیز کو ظلم اور فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اُس کے بعد یہ ذکر کر کے کہ دیکھو اُس قوم کے اوپر کس طرح سے تباہیاں آئیں' وہ کہتا ہے کہ **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا** (6:45) جس قوم نے اس طرح سے ظلم پہ کمر باندھ رکھی تھی' ہمارے اِس قانونِ مکافات کی رو سے اُس کی جڑ کٹ گئی۔ اور اُس کے بعد ہے کہ **وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45) یعنی بظاہر تو نظر آتا ہے کہ اتنی بڑی تباہی ہوئی ہے' اُس قوم کی جڑ کٹ رہی ہے۔ تو اُس تباہی کے بعد تو ہونا چاہیے تھا کہ صاحب! اِس کے اوپر بڑا افسوس ہے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ **الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45)۔ یہ الحمد کے ساتھ یہاں رب العٰلمین کیوں کہا ہے؟ کہا کہ اُس رب کے سامنے کسی ایک قوم کی زندگی یا موت نہیں ہوتی بلکہ وہ تو رب العالمین ہے' اُس کے سامنے عالمگیر انسانیت ہوتی ہے۔ ظالم کی موت مظلوم کی زندگی کا باعث بنتی ہے:

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است

ظلم پر مبنی نظام کا ختم ہونا انسانیت کی زندگی کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45)۔ ہمارے سامنے ربوبیتِ عالمینی ہے۔ کوئی ایک قوم ہی نہیں ہے کہ یہ ہمارے لیے اپنا ہے جیسے بنی اسرائیل نے کہہ دیا تھا کہ ہم تو خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔

خدا تعالیٰ کے ہاں قانون کی ایسی حکمرانی ہے جو ربوبیت عالمینی کی مظہر ہے

خدا نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں کوئی چہیتی اولاد نہیں ہے۔ ہمارے ہاں **يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ** (28:68) Natural Selection (انتخاب طبعی) کا قانون ہے کہ اُس کی رو سے یہ صورت ہوتی ہے۔ اور ظلم پر مبنی قوم میں تو زندہ رہنے کی اور آگے

بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اور اِس قوم کا جو انجام ہے وہ ہماری ربوبیتِ عالمینی کی شہادت ہے۔ جن اقوام کو انہوں نے اپنے استبداد کے پنجے میں جکڑ کے کچل کر رکھ دیا تھا' اُس قوم کو' اُس انسانیت کو' زندگی بخشنے کے لیے ارتقا کے منازل طے کرنے کے لیے' تباہ کرنا ضروری تھا۔ اس لیے ظالم کا سرکٹنا خدا کے قانون کی رو سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا مستحق ہے۔ یہ ہے جو کہا تھا کہ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ [1] (28:68) اور وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ لَهُ الْحُكْمُ [2] (28:70)۔ کتنے جلال سے بھری ہوئی یہ آیات چلی آرہی ہیں! یہاں حکم اور حکومت اُسی کی ہے۔ جو بھی اُس کے سوا اپنی حکومت کا مدعی ہے یا کسی اور کی حکومت کو تسلیم کر رہا ہے' وہ خدا اور قرآن کی رو سے مشرک ہے۔ یہاں لَهُ الْحُكْمُ (28:70) ہے' خدا کے سوا کسی اور کا حکم نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ کے قانون کی نظروں سے کوئی شخص بھی پوشیدہ نہیں

اگلی بات یہ رہی کہ ٹھیک ہے جی' حکم اور حکومت تو اُسی کی ہے اور یہ جو اُس کی خلاف ورزی کر کے' سرکشی کر کے' بغاوت کر کے' دوسرے راستوں کے اوپر چلے جاتے ہیں تو یہاں تو ٹھیک ہے کہ جرم کرنے کے بعد مجرم مفرور ہو جاتا ہے' پولیس اُس کے پیچھے ہوتی ہے' اُس کو اشتہاری مجرم قرار دیدیتے ہیں' وہ ملتا نہیں ہے' بھاگا چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! عجیب چیز ہے۔ کہا کہ اُس کی حکومت میں یہ کیفیت نہیں ہے کہ جرم کرنے کے بعد مفرور ہو جاؤ گے۔ وہاں تو وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ [3] (28:70) مجرم کا ہر قدم ''تھانے''[4] کی طرف اٹھتا ہے۔ یہ ہوئی نا حکومت۔ کس خوبصورت انداز میں یہ بات کہی ہے کہ اِن حکومتوں میں تو یہ کیفیت ہے کہ مجرم جرم کرنے کے بعد بھاگ جاتا ہے' مفرور ہو جاتا ہے' اشتہاری ہو جاتا ہے اور قرآن کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ بظاہر وہ سمجھ رہا ہے کہ میں دوسری طرف جا رہا ہوں لیکن اُسے معلوم نہیں کہ اُس کا ہر قدم ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔

---

[1] خدا کا قانونِ حیات اس سے بہت بلند ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ نظریات بھی اس میں شریک ہو جائیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔902)۔

[2] یہ سب کچھ خدا کے اقتدار و اختیار کے مطابق ہوتا ہے۔ کائنات میں اس کے علاوہ' اور کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اس کے قوانین کے مطابق عمل پیرا ہونے سے' طبعی زندگی کے قریبی مفاد بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور اخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔ یہ سرفرازیاں اور خوشگواریاں ایسے حسن کارانہ انداز سے ملتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر' ہر ایک کی زبان پر بے ساختہ زمزمۂ حمد و ستائش آ جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے کائنات کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں رکھی ہے' ہر معاملہ کا فیصلہ اس کے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 902)۔

[3] اور کوئی شے اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ ہر ایک کا قدم اُسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔902)۔

[4] اس سے مراد ''خدا کا قانونِ مکافات'' ہے۔

قرآنِ حکیم کے بات کرنے کا انداز دو طرح کا ہے

بات زندگی کی چلی آ رہی تھی کہ یہ کیسے قائم رہتی ہے اور کیسے آگے بڑھتی ہے۔ بات انسانوں تک پہنچ گئی تھی۔ انسان کی طبعی زندگی کے متعلق آیت پڑھتا ہوں تو پھر میں عرض کرونگا کہ یہ کس کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ پہلے تو میں نے عرض کیا ہے کہ پیچھے سے قوموں کا ذکر آ رہا تھا اور درمیان میں یہ قانونِ سلیکشن (Law of Natural Selection) آ گیا ہے' اُس کے بعد خدا کی حکومت ہے۔ عزیزانِ من! یہ کتاب واقعی اونچی علمی سطح کی متقاضی ہے۔ یعنی جہاں تک ہدایت و راہنمائی کا تعلق ہے' یہ بڑی آسان کتاب ہے۔ ہر چوراہے کے اوپر Bold Letters (جلی حروف) میں اس نے سائن پوسٹ (نشانِ راہ) لکھ کر لگا دیا ہے کہ یہ غلط راستہ ہے اور یہ صحیح راستہ ہے۔ اُس کے لیے کوئی لمبی چوڑی فکر کی ضرورت نہیں ہے' صرف آنکھوں کی ضرورت ہے' دیکھنے کی ضرورت ہے لیکن جہاں تک اِس کے حقائق کا تعلق ہے وہ حقائق بڑی بلند فکری' شعوری' علمی اور عقلی استعداد کے متقاضی ہیں۔ یہ بڑی بلند کتاب ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ کائنات کی ہر شے کی نقل و حرکت خدا کے قانون کے مطابق ہو رہی ہے' بالکل واضح ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ **قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِضِیَآءٍ ط اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ o قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ النَّھَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِلَیْلٍ تَسْکُنُوْنَ فِیْہِ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ** (28:71-72) بتاؤ اگر یہاں ایسا انتظام ہوتا کہ دن ہوتا تو قیامت تک دن ہی رہتا اور رات ہی نہ آتی' رات ہوتی تو قیامت تک رات ہی رہتی' دن ہی نہ آتا تو کیا خدا کے علاوہ کوئی قوت ایسی تھی جو تمہارے لیے دن کی روشنی مہیا کر دیتی؟ یا دن ہی رہتا تو تمہارے لیے رات لے آتی تاکہ تم اس میں آرام کر سکتے؟ کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم سن رہے ہو؟ کیا ذرا تم نے اِس پہ بھی غور کیا ہے؟

ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ قرآن حکیم میں باہمی ربط ہی نظر نہیں آتا

عزیزانِ من! میں عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں پکی روٹی کا مُلّا تو یہی سمجھے گا' آپ کے ہاں درس ہوتے ہیں تو اُن میں کہا جاتا ہے کہ قرآن میں ربط ہے ہی نہیں۔ آپ کے ہاں کے بڑے بڑے علما یہ کچھ درسوں میں کہتے ہیں کہ قرآن میں ربط ہی نہیں ہے۔ اور ٹھیک نظر آتا ہے کہ ابھی عاد و ثمود کا قصہ تھا اور اُس کے بعد **یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ** (28:68) آ گیا' اُس کے بعد **وَ لَہُ الْحُکْمُ وَ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ** (28:70) آ گیا' پھر اگلی آیت میں آ گیا کہ دیکھو تو سہی کہ اگر رات ہی رات رہتی اور دن نہ ہوتا تو کیا تھا؟ دن ہی دن رہتا اور رات نہ ہوتی تو پھر کیا ہوتا؟ یہ کہتے ہیں کہ اس میں کیا ربط ہے؟ اس کے اندر ان کو بے ربطگی نظر آتی ہے۔ ربط تو اربابِ فکر و نظر کو نظر

آ تا ہے۔ کہا ہے کہ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (28:72) کیا بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو؟ ہماری آ نکھیں تو دیکھ سکتی ہیں کہ اب دن ہو گیا' اب رات پڑ گئی۔ کیا بصیرت بھی ہے؟ قرآن بڑی گہری چیز کہہ گیا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن اس طرح سے سمجھ میں آ تا ہے۔ کہا کہ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (28:72) تم ان مثالوں پر' جو تمہارے سامنے لائی جا رہی ہیں غور و فکر سے اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ کائنات میں صرف ایک ہی ہستی کا قانون کارفرما ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔

قرآن کے حقائق تک پہنچنے کے لیے بصارت کی ضرورت ہے

بات یہ چلی آ رہی ہے کہ دن اور رات کا اختلاف ہے۔ ذہن میں نہیں آ تا کہ اس میں بصیرت کی کونسی ضرورت ہے' یہ تو سارا تعلق بصارت کا ہے: روشنی آ گئی یا اندھیرا ہو گیا۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ [1] (45:5) یہ جو اختلافِ لیل و نہار ہے' دن اور رات کی جو ایک گردش ہے' اِس کے اندر اربابِ فکر و نظر کے لیے حقائق تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ وہ ان چیزوں کے بارے میں اربابِ فکر و نظر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ کہا کہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جیسے وہ ہاتھوں والا تالا ہوتا ہے اگر ذرا سی چیز اُس میں پھنسا دی جائے' تو وہ جھٹ سے کھل جاتا ہے۔ اگلی آیت میں ہے کہ وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ لِتَسۡكُنُوۡا فِیۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ [2] (28:73)۔ یہاں پھر کھڑے ہو جانا پڑتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تو رحمت کا ترجمہ ہی رحمت ہو گیا۔ بارش کو بارانِ رحمت کہتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک دوست بتا رہے تھے کہ بارش ایسی بے وقت ہوئی ہے اور اتنی زیادہ ہوئی ہے کہ گیہوں کی تیار فصل پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ جو اختلافِ لیل و نہار ہے' وہ کہتا ہے کہ اِس کے اندر رحمت کی بات ہے۔ اور رحمت کے معنی اب تو آپ کو معلوم ہے کیونکہ آپ اتنے عرصے سے یہ درسِ قرآن سن رہے ہیں۔ رحمت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اِس طرح سے نشو و نما دینا کہ محسوس و معلوم بھی نہ ہو کہ نشو و نما ہو رہی ہے' جیسے رحمِ مادر میں جنین ہوتا ہے۔ رحم کے لفظ سے رحمت ہے۔ جس طرح جنین کی پرورش رحمِ مادر میں ہوتی ہے اُس قسم کی' اُس انداز کی' جو پرورش و نشو و نما ہے اُسے رحمت کہا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اور چیزوں کے علاوہ اُس نشو و نما میں وہ بچہ نہ کسی کا دستِ نگر ہوتا ہے' نہ محتاج ہوتا ہے' نہ ہی نشو و نما کرنے

---

[1] اور دن اور رات کی گردش میں...... خدا کے قوانین کی صداقت کی نشانیاں ہیں لیکن صرف انہی کے لیے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 66-1165)۔

[2] یہ صرف خدا کے نظامِ رحمت و ربوبیت کا تصدق ہے کہ اس نے دن اور رات کی گردشیں قائم کر رکھی ہیں تا کہ تم رات کے وقت آرام اور دن کے وقت کاروبار کر سکو۔ اور اس طرح محنت اور آرام' دونوں مل کر' تمہاری کوششوں کو بھرپور نتائج کا حامل بنا دیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 903)۔

والی ماں اُس سے شکریہ ہی مانگتی ہے' نہ اُس سے تمنا مانگتی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے اور یہ رحمت ہے کہ کسی کی احتیاج نہ ہو' نشو ونما دینے والا شکریئے تک کا متمنی نہیں ہوتا۔ بہرحال نشو ونما کی بات آ گئی۔ اختلافِ لیل ونہار میں یہ کہا ہے کہ تمہارے لیے اِس انداز کی نشو ونما ہے مگر تم غور نہیں کرتے' فکر نہیں کرتے۔

صدیوں سے ہماری سوچ اندھی تقلید کی اسیر ہونے کے باعث معدوم ہو چکی ہے

ہم نے کیا غور وفکر کرنا ہے کیونکہ ہماری غور وفکر پہ تو ہزار برس سے تالے پڑے ہوئے ہیں' سوئچ آف کر دیئے گئے ہیں۔ ہمیں تو بس اسلاف کے راستے پر اندھے کی طرح چلے جانا ہے۔ آپ اپنی ساری تاریخ میں دیکھیے' کسی نے بھی اگر ذرا غور وفکر سے کام لیا تو اِنہوں نے اس کی کھال کھنچوا دی۔ جس قوم پہ غور وفکر' صدیوں سے اس طرح بند کر دیا گیا ہو' وہ تو فطرت کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی نوع اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے تو کچھ عرصے کے بعد فطرت اُس کو معدوم ہی کر دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ اِس کے لیے بیکار ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مذہب پرست قوموں کی طرح ہماری بھی یہ صورت ہو گئی ہے کہ عقل وفکر کی جو صلاحیتیں تھیں وہ ہمارے ہاں شاید معدوم نہیں تو مفلوج تو ضرور ہو چکی ہیں۔ اور قرآن قدم قدم پر کہتا ہے کہ غور وفکر کرو۔ اس اختلافِ لیل ونہار کے بارے میں کہتا ہے کہ اِس کے اندر رحمت کا سامان ہے۔ وہ سامانِ نشو ونما جو غیر محسوس طور پہ ہوتا ہے' تم اِس کے اوپر غور کرو۔ میں پوری تفصیل میں تو نہیں جا سکتا' یہ بڑا اہم موضوع ہے۔

نیند کے اندر بھی سامانِ نشو ونما پوشیدہ ہے: موجودہ سائنسی تحقیق

یہ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں نیند ہے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ نیند میں کچھ سکون ہو جاتا ہے' بس اتنی سی چیز ہی ہم جانتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ اِس میں سامانِ رحمت ہے۔ اِس سلسلے میں یورپ کے محققین سے پوچھو تو وہ آپ کو سامانِ نشو ونما بتائیں گے کہ نیند کے اندر کیا ہوتا ہے۔ ایک کتاب میں نیند کے متعلق ضمناً بات ہو رہی ہے۔ [1] میں کوشش کرونگا کہ عام فہم الفاظ میں بات آ جائے

---

[1] جو قارئین اس موضوع پر مزید آ گاہی کے خواہاں ہیں وہ درج ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں:

1- Chrousos, G.P, et al. (eds.): Mechanisms of Physical and Emotional Stress. New York: Plenum Publishing Corp, 1988.

2- Kryger, M.H. et al.: Principles and Practice of Sleep Medicine. Philadalphia: W.B. Saunders Co., 1986.

کیونکہ یہ تو بڑی اونچی سائنس کی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جو Cells[1] (خلیات) ہیں جو مائیکروسکوپ (خوردبین) سے نظر آتے ہیں' ہم اُن کا ترجمہ ''جراثیم'' کرتے ہیں۔ اصل میں وہ Cells (خلیات) ہوتے ہیں۔ سارا جسم اُنہی Cells (خلیات) سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ایسی بات نہیں ہے کہ ایک دفعہ وہ Cells (خلیات) اندر بن گئے ہیں تو وہ بنے ہوئے رہتے ہیں بلکہ ہر سانس کے اندر ایک[2] Motabolism (تحول/عملِ استحالہ) ہوتا ہے کہ یہ جو Cells (خلیات) ہیں' جن میں انرجی ختم ہوجاتی ہے تو وہ Cells (خلیات) مرتے چلے جاتے ہیں اور وہ کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اور ہر سانس میں کروڑوں کی تعداد میں نئی توانائیوں والے Cells (خلیات) پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔ دیکھیے یہ ہے وہ رحمت کی بات جو قرآن کہہ رہا ہے۔ کیا ہمیں کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اندر یہ ہو رہا ہے؟ ساری زندگی کا دارومدار اس Motabolism (عملِ استحالہ) کے اوپر ہے۔ وہ Cells (خلیات) جو ناکارہ ہیں' اگر وہ ناکارہ' وہ مردہ' ہو کر نکل نہ جائیں تو آپ کے اندر اِس قسم کا سڑاند پیدا ہوجائے تو اُس سے زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ اور اگر اُن مرنے والے Cells (خلیات) کی جگہ نئے Cells پیدا نہ ہوں تو اُس کے بعد موت اِسی کا نام ہوتا ہے کہ جسم کے اندر نئے Cells (خلیات) پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ یہ جو Motabolism (عملِ استحالہ) ہے یہ انسانوں کے اندر یا یہ حیوانات کے اندر بھی ہوتی ہے۔ جہاں اس انداز کی لائف (زندگی) ہوتی ہے تو وہاں نیند ہوتی ہے۔ یہ جو Motabolism (عملِ استحالہ) ہے' یہ کیسے ہوتا ہے؟ فقرہ اُسی کتاب کا میں پڑھ کے سناؤں گا۔

Motabolism of heavy species is the circadian rhythm[3], the alternation

---

[1] Cell. Any of the protoplasmic masses making up organized tissue, consisting of a micleus surrounded by cytoplasm enclosed in a cell or plasma membrane. It is the fundamental, structural, and functiona. unit of living organism. (Dorland's Pocket Medical Dictionary (24th ed.): New Delhi: Oxford & IBH Publishing Co., Pvt., LTD, 1989, P.111)

[2] Metabolism: The sum of all the physical and chemical processes by which living organized substance is produced and maintained (anabolism), and also the transformation by which energy is made available for uses of the organism (catabolism). (P.358).

[3] Circadian rhythm. Circadian denotes a 24-hour period. Circadian rhiythm is the regular recurrence in cycles of apporximately 24 hours from one stated point to another. e.g. cirtain biological activities darkness or other conditions illumination. (Dorland`s Pocket Medical Dictionary (24th ed.) Dxford I B H publishing co, PVT, LTD, 1989, p.521)

of light and dark.

''یہ Matabolism (عملِ استحالہ) کا جو نظام جاری ہے' وہ یہ جو دن اور رات' روشنی اور تاریکی ہے' وہ ردھم کی طرح' تال کی طرح' یہ گردش آتی ہے۔ جس کی وجہ سے جسم کے اندر یہ Motabolism (عمل استحالہ) جاری ہے۔''

عزیزانِ من! ان سے پوچھو کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اے غور وفکر کرنے والو! تمہارے لیے اختلافِ لیل ونہار کے اندر رحمت کے سامان ہیں۔ کیا خوب بات کہہ گیا ہے کہ

The circadian rythem the alternation of light and dark.

آپ کو پتہ ہے کہ دل کی دھڑکن ردھم کہلاتی ہے' اُس کو تال کہتے ہیں۔ اسی سے نبض ردھم کہلاتی ہے۔ یہ جو نبض ہے اس سے بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایسے ہوتا ہے کہ اُس ردھم میں ذرا سا فرق آتا ہے تو جاننے والے اربابِ فکر ونظر کو بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ موسیقی کے شناسا جانتے ہیں کہ اِس سے کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر ایک سیکنڈ کے برابر بھی تال کا فرق ہو جائے تو سارے راگ کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

The circadian rhythm, the alternation of light and dark.

اِس دن اور رات' روشنی اور تاریکی سے جو Matabolism (عمل استحالہ) کا نظام ہے' وہ جاری رہتا ہے۔ یہاں پھر اُن کے ہاں دو Terms (اصطلاحات) آتی ہیں۔ یہ waves ❶ Alpha (الفا لہریں) اور Waves ❷ Delta (ڈلٹا لہریں) ہوتی ہیں۔ یہ وہی ہیں جن سے کچھ ضائع ہوتا ہے اور کچھ نیا بنتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

At the deep sleep the Alpha waves gradually, disappear has the rhythm slow down to the long quiet delta wave at one cycle every 2to 3 seconds.

---

❶ Alpha Waves are rhythmic waves occuring at a frequency of between 8 and 13 per second. During deep sleep the alpha waves disappear entirely.

❷ Delta waves include all the waves of the EEC (electroencephalogram) below 3.5 cycles per second and some times as low as 1 cycle every 2 to 3 seconds. These occur in very deep sleep (P 662) The Delta waves also occur in very deep "slow vave" sleep; an this suggests that the cortex then might be released from the activating influeneces of the lower conters of the Brain. (P. 663)

ایک سیکنڈ میں اس کی 8 سے 13 گردشیں پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک قسم کی جو Alpha Wave (الفالہر) ہے' یہ دوسری قسم کی Delta Wave (ڈلٹا لہر) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اِس طرح سے نیند کی حالت میں ردھم کے ساتھ گردش کے اندر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ہم یہ جتنے کام کاج کرتے ہیں' اُس میں ہماری ساری توانائی صرف ہوتی ہے۔ ورزش کے بعد یا بھاگنے دوڑنے کے بعد آدمی تھک سا جاتا ہے' اس کے اندر توانائی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جسے ہم پروٹین کہتے ہیں یعنی یہ گوشت Muscles وغیرہ' یہ سارے Cells (خلیات) ہی ہوتے ہیں۔ زیادہ بھاگ دوڑ کرنے میں' توانائی صرف کرنے' میں یہ زیادہ تعداد کے اندر جلدی سے ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ورزش کے بعد یا تھکنے کے بعد کہتے ہیں کہ بڑی پیاری نیند آتی ہے۔ وہ اُس کا نظام ہے کہ اُس کے بعد نیند آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ یہ ہوتا ہے:

> Regeneration and replacement depend on the simple rise of due protein and most of this feel to take place during sleep.

یہ جو اتنی توانائی صرف ہوتی ہے اور اُس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ گوشت بھی کم ہو جاتا ہے۔ توانائی اگر صرف ہوتی ہے تو Muscle کم ہوتے ہیں' پروٹین یعنی گوشت ختم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت اُس کے فوری بعد خود تھکے ہوئے کو نیند کی طرف لے آتی ہے۔ ''اوکڑی سوہنی ڈاہڈی ماں ہیگی اے'' ❶ کہ یہ جو پروٹین ضائع ہو گیا ہے' اُس کی Regeneration and Replacement (تخلیق وتجدید نو) نیند کی حالت میں اُسی ردھم کے طریقے کے اوپر ہوتی چلی جاتی ❷ اسی لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ (28:73) یہ صرف خدا کے نظامِ رحمت وربوبیّت کا تصدّق ہے کہ اُس نے یہ

---

❶ وہ کتنی پیاری من موہ لینے والی ماں ہوتی ہے۔

❷ اصل الفاظ یہ ہیں:

There is enhanced sympathetic activity during wakefulness and also enhanced number of impulses to the skeletal musculature to increase muscle tone. Conversely during sleeps, sympathetic activity decreases while parasympathetic activity increases. Therefore, arterial blood pressure falls, pulse rate decreases muscles fall into a mainly relaxed state, and the overall basal metabolic rate falls by 10 to 30 percent (guyton, Arthur C. (1991). Textbook of Medical Physiology (8th ed.). Philadelphia: W.B. Saunders Company, p.661)

رات اور دن کی گردشیں قائم کر رکھی ہیں۔ وہ آگے کہتا ہے کہ

Human growth hormones are manufactured during this time and the rate of cell division starts increasing rapidly.

جونہی نیند غالب ہوئی تو ہارمونز بننے شروع ہو گئے' سیلز (خلیات) کی Split (توڑ پھوڑ) کی جو Division (تقسیم) تھی اُس میں جلدی سے تیزی آ گئی اور وہ بننے شروع ہو گئے۔ پھر نیند کے بعد آدمی Fresh (تروتازہ) اٹھتا ہے۔ وہ کیسے ہوتا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو ضائع شدہ سیلز (خلیات) وغیرہ ہوتے ہیں' اُن کی Regeneration (تخلیقِ نو) اور Replacement (تبدیلیٔ نو) ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ نیند میں ہی ہوتی ہے۔ انسانی دماغ کے اندر جو Brain ہے' جسے ہم مغز کہتے ہیں' ''سانوں تے ایناں ای پتہ اے کہ اونوں بھُن کے کھا لینے آں' تے او بڑا مزیدار ہوندا اے۔''[1] یہ جو Brain (مغز) ہوتا ہے' یہ بچے کی پیدائش سے دو مہینے پہلے بننا شروع ہوتا ہے اور پیدائش کے بعد قریباً ایک مہینے تک بڑی سرعت سے اس کا بننا ضروری ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بچہ پیدائش کے بعد چوبیس گھنٹے میں سے بیس بائیں گھنٹے سوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نیند کی حالت میں بنتا ہے۔ اب آگے وہ کہتا ہے کہ

نیند کے عالم میں جسم کے باقی اعضا کام کرنا بند کر دیتے ہیں' جتنا خون ہوتا ہے' وہ Brain کی طرف جانا شروع ہو جاتا ہے اور وہاں یہ جتنے بھی Cells وغیرہ تھکے ماندے ہوتے ہیں' پھر وہاں ان کی Cure ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اِنہوں نے تجربے کیے کہ نیند میں یہ ہوتا ہے۔ ایک Sleeplessness ہوتی ہے۔ ''پنجابی اچ انیدرا کیندے نیں''۔[2] اردو کا لفظ بے خوابی وہ بات نہیں پیدا کرتا ''جیہڑی گل انیندرے اچ ہوندی اے''۔[3] اِنہوں نے تحقیق یہ کی ہے کہ جو Sleeplessness ہے' اُس کے اندر یہ Physical (جسمانی/طبعی) چیزیں کافی وقت تک ٹھیک رہتی ہیں۔

---

1. ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے کہ اسے (مغز کو) بھون کر کھا لیتے ہیں' وہ بڑا ہی لذیز ہوتا ہے۔

That while the body is in sleep, the paradoxicalfood it gets, Brain receives the tension easy alternate, it strengthes and the blood goes more and more to the head and becomes generative of the hormones.

2. پنجابی میں اسے ''انیندرا'' کہتے ہیں۔
3. جو بات ''انیندرے'' میں سما جاتی ہے۔

تصوف کی ان وادیوں کا مسافر ''پرویز''

یہ ہمارے ہاں کے تصوف میں، ہندوؤں کے یوگا میں، جگانے کی ایک مشق ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں کا یہ جو درویش ❶ ہے یہ تو اِن مرحلوں سے گزرا ہے اور پتہ نہیں کہ کیسے بچ گیا۔ یہ ریاضت میں، مراقبے میں، جگاتے ہیں۔ اور اِنہوں نے تحقیق کی ہے کہ اِس طرح سے مسلسل جاگنے کا جو عمل ہے، اُس سے Concentration (ارتکاز) نہیں رہتی اور پھر عجیب عجیب قسم کی عجائب اور طلسماتی چیزیں ذہن میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مجھے بھی پتہ ہے کہ پھر کیا کیا نظر آتا ہے کیونکہ پھر Concentration (ارتکاز) ہی ختم ہو گئی تھی۔ پھر جس طرح سے خواب میں ہوتا ہے تو اُس طرح سے جاگتے میں ہونے لگ جاتا ہے۔ ''بس اک منزل اگے رہ جاندی ہیگی اے، فیر او مینٹل ہسپتال پہنچ جاندا اے''۔ ❷ آپ کے ہاں اُسے مجذوب کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ لیل و نہار کی گردشِ دولابی کے اندر سوچنے والوں کے لیے حقیقت تک پہنچنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ کہا کہ وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَ النَّهَارَ (28:73) یہ تو تمہارا غیر محسوس طور پر ذریعہ نشوونما ہے جو دن اور رات کی اِس گردش اور اختلاف کے اندر موجود ہے۔ جو، یہ دن اور رات کا آنا ہے کہ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے تو دن کے اجالے میں تم آتے ہو کہ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (28:73) رات میں، یعنی نیند سے تمہارے اعضا Repair (مرمت) ہو چکے ہوتے ہیں، نئی توانائی آ جاتی ہے، نئے سیلز (خلیات) بن جاتے ہیں، اُس میں نئی توانائیاں آ جاتی ہیں تاکہ پھر تم تلاشِ معاش میں نکلو اور تمہاری نیند بھرپور نتائج پیدا کرے۔ یہ ہے وہ قصہ۔ کہا کہ دیکھا! ہمارا قانونِ مشیت تخلیق و یختار کیسے کام کرتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو Physical (طبعی) کائنات ہے، اُس کے اندر جو رات اور دن آتا ہے، تو اُس رات کے سکون میں یہ کچھ ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے لِتَسۡكُنُوۡا (28:73) کہا ہے تاکہ یہ جو حرکتیں یعنی Movements ہیں، یہ کچھ عرصے کے لیے ساکت ہو جائیں اور جیسا میں نے ابھی کہا ہے کہ خون اور انرجی زیادہ سے زیادہ دماغ کی طرف چلی جائے اور اعضا دماغ Repair (درست و مرمت) ہو جائیں۔ یہ ہے لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ (28:73) یعنی تم اس کے لیے رات کے وقت آرام کر سکو۔

غلط نظام میں جسمانی Cells کا بننا محال ہو جاتا ہے اور پھر اس میں رزق کی بہار نہیں آتی

جو نظام غلط ہو، باطل اور ظلم پر مبنی ہو تو وہ کہتا ہے کہ اُس میں جاگنے والوں کو بھی یہ سکون میسر نہیں آتا۔ اُن کے سیلز (خلیات) کی

---

❶ یہ اشارہ پرویزؒ: اپنی ہی طرف ہے۔

❷ بس پھر وہ دماغی امراض کے ہسپتال میں پہنچنے سے ایک ہی قدم پیچھے رہ جاتا ہے۔

Repair (مرمت) نہیں ہوتی، اُن کے نئے Cells (خلیے) نہیں بنتے۔ عزیزانِ من! اُنہیں تو رات کو بھی Sound Sleep (پُرسکون نیند) نہیں ملتی۔ ان کی اصطلاح میں اسے Paradoxical sleep [1] کہتے ہیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ وہی جو قوموں کی زندگی چلی آ رہی تھی اور درمیان میں یہ چیز لا کر پھر کیسے آگے پہنچایا کہ بابا! یہ جو ذہن کے اندر سکون ہے "اپنی سوہنی نیند آ جانی جیہڑی ہیگی اے" [2] اس میں رحمت کا راز ہے، ہماری نشوونما کا راز ہے۔ اِس میں کھوئی ہوئی توانیاں بحال ہوتی ہیں، اِس میں تلف شدہ Cells (خلیات) کی باز آفرینی ہوتی ہے، اِس میں Concentration (ارتکاز) کی قوتیں ایک پوائنٹ (نقطے) کے اوپر مرتکز ہوتی ہیں۔ اس سے ہی ارتقا کا سلسلہ آگے جاری رہتا ہے۔ کائنات کے اندر اگر یہ استطاعت نہیں رہتی تو وہ وہیں رک جاتی۔ اُس درخت پہ بہار نہیں آتی جس کو کوئی کیڑا کھا گیا ہو۔ عزیزانِ من! اُس قوم پہ رزق کی بہار نہیں آتی جس قوم میں ذہنی اور قلبی سکون ختم ہو گیا ہو۔ کہا کہ لتسکنوا۔ یہ چیز تو ہماری پیدا کردہ کائنات کی ہے کہ یہ ہم اس دن اور رات کی گردش کو لاتے ہیں، از خود لاتے ہیں۔ اگر یہ بات بھی تمہارے ہاتھ میں ہوتو تم ایسا بھی نہ ہونے دو، یہ تو ہم کرتے ہیں۔

ذہنی اور قلبی سکون کے لیے اسلامی مملکت کا فریضہ

اسے یاد رکھیے کہ یہ تو Physical Life (طبعی زندگی) کے متعلق ہے۔ تمہارے ہاں کی جو انسانی زندگی ہے، اُس میں تو یہ چیز تمہارے نظام کو کرنا چاہیے کہ کام کے لیے ایک وقت دے اور ساتھ ہی ذہنی و قلبی سکون کے لیے بھی وہ وقت دے تاکہ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (28:73) [3]۔ ہم تو اس کو ایسے ہی کہتے ہیں کہ جیسے یا اللہ تیرا شکر ہے، جبکہ "شکر" کے معنی یہ ہوتے ہیں "محنت کا بھرپور نتیجہ مرتب ہونا"۔ جس کو طبعی زندگی میں، رات کی نیند میں، سکون نہیں ملتا تو اُس کی محنت بھرپور نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ وہ محنت کر ہی نہیں سکتا۔ انسانی نظام کی زندگی میں بھی اگر کوئی محنت اور کام کرے تو وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (28:73) اس کے بعد بھی اگر قلبی اور ذہنی سکون میسر نہیں آتا تو پھر اس کی تلف شدہ توانائیوں کی باز آفرینی نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ یہ یوں قومیں مرتی تھیں۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن میں کتنا ربط ہے!

---

1. Paradoxical Sleep کا دوسرا نام REM Sleep یعنی Rapid Eye Movement Sleep یا Desynchronized Sleep بھی ہے۔
2. جو اتنی پیاری نیند کا آ جاتا ہے۔
3. تاکہ اس طرح محنت اور آرام، دونوں مل کر، تمہاری کوششوں کو بھرپور نتائج کا حامل بنا دیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 903)۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں ❶

کائنات کے متعلق سر جیمز جینس کی تحقیق، موجودہ سائنس کا کمال اور قرآنِ حکیم کا ربط

سر جیمز جینس اس دور کا علم الافلاک کا سب سے بڑا ماہر ❷ ہے۔ اُس کی کتاب کا نام The Mysterious Universe (پراسرار کائنات) ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ اِس کائنات میں کتنا ربط ہے! اُس میں لکھا ہے کہ میں یہاں کھڑا جو انگلی ہلا رہا ہوں تو اِس کی حرکت مریخ کے اوپر جا رہی ہے۔ عزیزِ من! آج تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ کتنا ربط ہے! مریخ پہ تو ابھی نہیں پہنچے تھے، چاند کے اوپر پہنچے ہوئے تھے۔ یہاں زمین کے اوپر بیٹھے ہوئے کے ساتھ ان کے ربط کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں وہ جو ایک شخص یعنی خلانورد جہاز میں تھا تو یہاں جو شخص زمین پہ تھا، وہ اس وقت ایک مشین کے اوپر تھا، اس نے اس سے کہا جو یہاں نہیں ہے خلا میں ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ تو فلاں وقت سو رہا تھا۔ اُس نے پوچھا کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہے۔ کہنے لگے کہ اُس کے دل کی جو حرکت ہے وہ Slow (سست) ہو گئی ہے اور یہ نیند (Sleep) میں ہوتی ہے، یہ جاگنے (Awakening) میں نہیں ہوتی۔ اُس کے دل کی حرکت کا حساب رکھا جا رہا ہے اور یہ ریکارڈ میں ہے کہ وہ اتنا وقت سویا ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ حرکت جو Slow ہوئی ہے تو یہ نیند میں ہوا کرتی ہے۔ وہ وہاں سے کہتا ہے اور یہ یہاں سے کہتا ہے کہ اس کو سو لینے دو، مجھے پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے۔ قرآن میں **الحمد** سے **والناس** تک یہ ربط ہے۔ باقی کائنات کی تسخیر تو نفسِ انسانی کے اوپر ہے۔ اسی لیے اُس نے کہا تھا کہ ہم جانتے ہیں کہ **وَ رَبُّکَ یَعۡلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوۡرُہُمۡ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ** (28:69) جو کچھ وہ اظہار کرتے ہیں، اُسے بھی ہم جانتے ہیں اور جو اِس کے اندر ہوتا ہے اُسے بھی ہم جانتے ہیں۔ تو ہم سے چھپ کر کہاں چلے جائیں گے، ہمارا قانون تو ان کو گھیرے ہوئے ہے۔

عزیزِ من! اُس کے بعد وہی موضوع ہے جو چلا آ رہا تھا۔ وہی ہے جسے ہم قیامت کا نقشہ کہتے ہیں! وہی عدالت کا کٹہرا، وہی اُس کے اندر مجرم۔ قرآن بتاتا ہے کہ **وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ** (28:74) اس تباہی کے وقت اِن سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ! وہ تمہارے بڑے بڑے عمائدین، بڑے بڑے مددگار، جن کو تم اپنے ذہن میں خدا بنائے بیٹھے تھے، وہ آج کہاں ہیں کہ تمہیں اِس سے آ کر بچا لیں؟ **وَ نَزَعۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا** (28:75) اُن میں سے، ہر قوم میں سے، جو ایک بڑا لیڈر ہے، جو وہ بطور گواہ کے یا نگران کے وہاں تھا تو اُس کو بلائیں گے کہ تم ذرا ادھر آؤ۔ عزیزِ من! یاد رہے کہ یہ عدالتِ خداوندی ہے، جس خدا کو مجرم کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی علم ہے، پھر بھی یہ گواہی کا عمل جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟

---

❶ حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں (اقبالؒ: بانگِ درا)

❷ یاد رہے کہ یہ بات مارچ 1979ء کی 2 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

مکافاتِ عمل اور عدالتِ خداوندی کا یہ نقشہ بات کو سمجھانے کے سلسلہ میں ہے

ایک بات سمجھ رکھیے کہ قرآنِ کریم نے یہ جو قیامت کے یا مکافاتِ عمل کے نقشے دیئے ہیں تو وہ دراصل آپ کے نظامِ عدل کو اس نقشے کے اوپر استوار کرنا چاہتا ہے کہ تمہارا نظام اس ٹائپ کا ہونا چاہیئے' تمہارا اندازِ عدل اس نقشے کا ہونا چاہیے جو ہم بتا رہے ہیں کہ قیامت میں ہم یہ کریں گے۔ سب کچھ علم ہے کہ مجرم کون ہے اور کون صحیح ہے۔ خدا نے فیصلہ دینا ہے۔ وہ ایسے ہی فیصلہ نہیں دے رہا بلکہ کہتا ہے کہ صفائی کا موقعہ دینا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ جن کو تم نے بلانا ہے اُن کو بلاؤ' جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ انہوں نے یہ کچھ کیا تھا اُن کو بھی بلالو۔ وہ سامنے آجائیں گے۔

عزیزانِ من! عدل کی بنیاد یہ ہے۔ **فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ** (28:75) عدالت میں کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اپنی ساری دلیل و برہان لاؤ۔ ہم ایسے ہی کسی کے خلاف فیصلہ نہیں دیدیتے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ وہ دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے لیکن ایک ہمارے ہاں وہ فقرہ مشہور ہے کہ یہی نہ ہو کہ Justice is done کہ عدل ہو رہا ہے بلکہ یہ بھی ہو کہ It seems to have been done یعنی ہر ایک کو معلوم ہو کہ عدل ہو رہا ہے' نظر آجائے کہ عدل ہو رہا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ قوم میں اُسی صورت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ جب قوم کو یقین ہو کہ عدل ہو رہا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ہم دل کے حالات سے بھی واقف ہیں اور اِس کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ عدالت بیٹھی ہے' کٹہرا بھی ہے' مجرم بھی ہے' گواہ بلائے جارہے ہیں۔ اُن کے ہاں گواہان کو بلایا جارہا ہے۔ اُن سے کہا جارہا ہے کہ تم اپنے ہاں کے برہان پیش کروا گر پیش کرنا چاہتے ہو تو۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا بھی نظامِ عدل اِس انداز کا ہونا چاہیے۔ کہا کہ **فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ** (28:75) اتنے مواقع بہم پہنچانے کے بعد اُنہوں نے پھر خود اقرار کر لیا کہ واقعی ہم غلط راستے پہ تھے۔ صحیح راستہ وہی تھا جو خدا نے مقرر کیا ہوا تھا۔ تو اِس طرح سے **ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ** (28:75) وہ چیزیں جو اُنہوں نے افتراء' کذب' جھوٹ سے مہیا کر رکھی تھیں' اُن کی وجہ سے یوں تباہی ہوئی۔

قرآن عدالت کا نقشہ دے رہا ہے کہ ایسی عدالت ہے جس میں مجرم سے کہا جائے کہ **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ** (28:75) یعنی اُس کا جو اپنا جاننا ہے وہ اُس کو بیچ میں Interfere (دخل انداز) نہیں ہونے دیتا کہ ہم جانتے ہیں۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ تم میں یہ کیا سوچے ہوئے ہو کہ وہاں قیامت میں یہ ہوگا اور یہ کریں گے۔ او بابا! صرف اتنا ہی ہوگا کہ تمہارا اعمال نامہ آج لپٹا ہوا ہے اور اُس دن کھول دیا جائے گا۔ اور پھر کہا جائے گا کہ **اِقْرَاْ كِتٰبَكَ** (17:14) اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ اور پھر آگے کہا جائے گا کہ آج تم اپنے متعلق آپ ہی فیصلہ بھی کر لو۔ تو یہ ہوئی عدل کی بات۔ آگے جو آیت آرہی ہے اُس کے متعلق پھر وہی ربط والی بات

آ جائے گی۔ کہا کہ اِنَّ قَارُوۡنَ کَانَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰی (28:76)۔ اس میں موسیٰ اور قارون کی بات آ گئی۔

قرآنِ حکیم کے ربط کے سلسلہ میں ریڈیو پر ایک علامہ صاحب کا خطاب

ریڈیو پاکستان پر قرآن پاک کا درس نشر ہو رہا تھا اور بہت بڑے علامہ صاحب درس دے رہے تھے۔ قرآن پہ بات آئی تو وہ کہنے لگے کہ قرآن تو بڑی مجمل کتاب ہے' مبہم کتاب ہے' بے ربط کتاب ہے۔'' کوئی ہے نہیں طمانچہ مارن والا۔ تے طمانچہ جدوں پیندا اے تے جباڑا نکال کے رکھ دیندا اے''۔ [1]

یہ بہت بڑے علامہ صاحب ریڈیو پاکستان پہ درس دے رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بڑے میاں دسترخوان پہ بیٹھے ہوئے ہیں' ساتھ بچہ بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کو وہ سمجھا رہے ہیں کہ بیٹا! یہ چیز اچھی ہے' یہ یوں کیا کرو' وہ یوں کیا کرو۔ اتنے میں بچے کے دسترخوان پہ لقمہ گر جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ بیٹا! طریقے سے کھاؤ' دیکھو! تم نے دسترخوان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اور بڑے میاں یہ کہنے کے بعد پھر کہتے ہیں کہ اچھا' میں کہہ رہا تھا کہ تم یوں کیا کرو۔ تو علامہ صاحب کہنے لگے کہ یہ بیچ میں جو قرآن میں ایسی باتیں آ جاتی ہیں تو وہ ایسے ہی ہیں جیسے وہ بچے کو بیچ میں دھمکا دیتا ہے۔ عزیزانِ من! ملاحظہ فرمائیے' یہ قرآن کا ربط بتا رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں قارون کا ذکر بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے

یہ جو پہلے تباہیوں کے دو اسباب بتائے تھے' یہ جو سلسلہ پیچھے سے چلا آ رہا تھا' اُس میں بات یوں تھی کہ ایک تو ملوکیت تھی یعنی اربابِ اقتدار اور دوسری مذہبی پیشوائیت تھی' فرعون کا قصہ تھا اور ہامان کا قصہ تھا کہ قوموں پہ تباہیاں ان کی وجہ سے آتی ہیں۔ انہی کے متعلق تھا کہ ذرا ان کو بلاؤ لیکن قوم کی تباہی کی ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے۔ وہ وجہ سرمایہ داری کا نظام ہوتا ہے۔ یہ اس تباہی کا جو تیسرا ستون ہے اُس کا نمائندہ قارون ہے۔ ان دو کا ذکر پہلے آیا تھا۔ اس لیے قارون کا ذکر نہایت ضروری تھا' اب اِس کا ذکر آ گیا۔ قارون کے متعلق خاص طور پہ یہ کہنا کہ وہ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰی (28:76) تھا' یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قومیں جو دوسری قوموں کے اوپر آ کر حکومت کرتی ہیں' جو اربابِ اقتدار ہوتے ہیں تو ان میں ایک قوم دوسری قوم کو آ کر دباتی ہے۔ اس میں جو اربابِ اقتدار بن جاتے ہیں' وہ ایک الگ گروہ ہو جاتا ہے۔ یہ مذہبی پیشوائیت بھی ایک الگ نمایاں گروہ کی شکل میں ہوتا ہے' جن کو ہم علمائے کرام کہتے ہیں یا احبار و رہبان کہتے ہیں۔ یہ جو مہاجن ہوتا ہے' جس کو سرمایہ دار کہتے ہیں تو وہ اُسی قوم کے اندر کا ایک فرد ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے عجیب بات کہی ہے کہ یہ اِن میں سے الگ نہیں ہوتا' یہ ان کے اندر ہی ہوتا ہے اور خون چوستا چلا جاتا ہے۔ یہ فرعون نہیں تھا جو دوسری قوم کا تھا۔ یہ ہامان نہیں تھا۔ یہ قارون قومِ

---

[1] کوئی طمانچہ رسید کرنے والا نہیں ہے۔ جب طمانچہ پڑتا ہے تو جبڑا نکال باہر کرتا ہے۔

موسیٰ کے اندر ہی کا تھا۔ اور قیامت یہ ہوئی کہ حضرتِ موسیٰ ہامان اور فرعون سے تو پیچھا چھڑا کر بنی اسرائیل کو یہاں لے آئے تو یہ قارون ساتھ ہی آ گیا۔ ''ایہہ پیچھا ہی نہیں چھڈ دا''۔ [1] یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ قارون ساتھ ہی آ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ فَبَغٰى عَلَيْهِمْ (28:76) یہ قوم کے اندر کا ایک فرد ہے اور کوشش یہ ہے کہ میں انہی کے اوپر چڑھ دوڑوں۔ انہی کا پیسہ ہے' انہی کی محنت ہے اور کہتا ہے کہ میں انہی کے اندر رہوں اور جذبہ یہ ہے کہ ان کے اوپر غالب آ جاؤں۔

مقروض کا دبنا حاکم کے ڈنڈے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! پیسے کی محتاجی سے یہ مقروض جس طرح سے دبتا ہے' اس طرح سے حاکم کا ڈنڈا بھی نہیں دبا سکتا۔ وہ تو پھر بھی انسان کی جو طبعی زندگی ہے اُسی کے اوپر تک ہوتا ہے لیکن یہ قرض کی ادائیگی کی بات تو سوہانِ روح ہوتی ہے' یہ تو ایک سیکنڈ کے لیے' ایک ثانیے کے لیے بھی انسان کو اطمینان ہی نہیں آنے دیتی۔ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ (28:76) اس کے پاس بڑی دولت جمع ہو گئی تھی' اس نے اتنے خزانے بھر لیے۔ اُس زمانے میں تو ابھی نوٹ نہیں چلے تھا کہ آج کی طرح اگر لاکھ روپیہ بھی ہو تو جیب میں آ جائے۔ اُس وقت تو دھات کے روپے ہوتے تھے تو اُس نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ بڑے بڑے پہلوان ہی اُس کو اٹھا سکتے تھے۔ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (28:76) وہ اس کی قوم اُس سے کہتی تھی کہ اِس روپے کی بنا پر یہ اوچھا پن اچھا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ خراب ہوتا ہے' تم ہمارے میں سے ہی ہو۔ یاد رکھو! یہ روش قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔ آگے ایک چیز ہے' وہ اُس دَور کی ہے لیکن ہر دَور کے سرمایہ دار کے اوپر اِس کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ وَ ابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (28:77) قوم اُس سے کہہ رہی ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ مال و دولت' یہ محنت کرنا یا کمانا' کوئی بُری چیز ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ تم فقیری دھار لو' سنیاس دھار لو' ننگ دھڑنگ ہو جاؤ' جنگلوں میں نکل جاؤ' درویشی دھار لو۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ اس میں سے اپنا حصہ لو' تم بھی اس سے فائدہ اُٹھاؤ لیکن سارے کا سارا ہی سمیٹ کر نہ بیٹھ جاؤ' اسے نہ بھولو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس۔ زندگی اس کے بعد بھی ہے۔ کہا کہ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ (28:77) بھی ہے۔ مستقبل کے اوپر بھی نگاہ رکھو۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس کا طریقہ کیا ہے؟

---

[1] یہ تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔

معاشرے کا حسن ہی انسانی زندگی کے حسن کا مظہر ہے

عزیزانِ من! مستقبل کے اوپر نگاہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ **وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ** (28:77) جس طرح سے تمہاری ہر کمی پوری ہوئی ہے' اسی طرح سے جو لوگ تمہارے اردگرد ہیں' اُن کی اُس کمی کو پورا کرو تا کہ معاشرے کا حسن قائم رہے' اُسی میں تمہارا حسن قائم رہے گا۔ کیا بات ہے قرآن کی کہ یہ تیرے Interest (مفاد) میں ہے۔ اب ان بیچاروں کو احسن کے معنی کیا معلوم کہ قوموں کے اندر Balance (توازن) کیا ہوتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یاد رکھ! اگر معاشرے کے اندر یہ Balance (توازن) قائم نہ رہا ''تے جیویں منجی نوں بے کار سمجھ کے تھلے لاسٹاں گے' ایدھر دا پاوا نیچے لا یئے تے اودھر دا پاوا اٹھ جاندا ہیگا اے۔ تے جے دووں پاسے زور پایئے تے اوہدیاں بانہیاں ٹوٹ جاندیاں ہیگیاں''۔ [1] عزیزانِ من! آپ کو اُسی چارپائی پہ نیند آتی ہے جس کا بیلنس (توازن) ہو۔ اگر وہ ذرا سی ایک طرف سے اونچی ہو تو ساری رات کروٹیں بدلتے رہتے ہو۔ اس Balance (توازن) کو احسن کہتے ہیں۔ اس لیے کہا ہے کہ **وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ** [2] (28:77)۔

طبقاتی تقسیم معاشرتی حسن میں بگاڑ پیدا کرتی ہے اور اسے فساد کہتے ہیں

اس کے مقابل میں کہا ہے کہ **وَ لَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ** (28:77) طبقات پیدا نہ کرو' ناہمواریاں پیدا نہ کرو کہ تم امیر سے امیر بنتے جاؤ اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ یہ چیز خدا کے قانون میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اسے فساد کہتے ہیں۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ ''فساد'' سرمایہ داری کے لیے آ رہا ہے اور صحیح نظام کے لیے لفظ ''حُسن'' آیا ہے۔ تو آپ نے سمجھ لیا کہ اعمالِ حسنہ کیا ہوتے ہیں۔ حسنات اس کی جمع ہے۔ عزیزانِ من! بات بڑی اہم ہے۔ یہ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد کے اوپر ہے۔ آج کے دور میں تو یہ بڑے بڑے کارخانہ دار' بڑے بڑے تجارت والے یہی لوگ ہیں جن کے پاس یہ سارا کچھ ہوتا ہے۔ اُن سے جا کر یہ کہیے کہ یہ سب کچھ تم اپنے ہی لیے لے کر بیٹھ گئے ہو' تم اس میں اور لوگوں کا حصہ نہیں بتاتے' تم اس سارے کے سارے کے مالک نہیں ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس کا جواب اُن کی طرف سے کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ یہ دولت میرے ہنر کی پیدا کردہ ہے۔

---

[1] جیسے چارپائی کو بیکار سمجھ کر باہر پھینک دیتے ہیں کہ اگر ادھر کا پایا نیچے کریں تو اُدھر کا اوپر اٹھ جاتا (اُدھر کا نیچے کریں تو اِدھر کا اٹھ جاتا) اگر دونوں ہی طرف کے پایوں پر زور لگا کر ہموار و برابر کریں تو اس کے دونوں ہی بازو ٹوٹ جاتے ہیں۔

[2] جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے' اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 904)۔

نظامِ سرمایہ داری کی پیش کردہ دلیل یہ ہے کہ یہ دولت میرے ہنر کی پیدا کردہ ہے

عزیزانِ من! قرآن قارون کی زبان سے بات کہلا رہا ہے۔ یہ آج بھی صحیح ہے اور قیامت تک صحیح رہے گی۔ آج سرمایہ دار جو اتنی دولت سمیٹ کر بیٹھتا ہے' آپ کسی سے جا کر پوچھیے کہ جو زائد ہے' یہ دوسروں کو دو تا کہ اُن کی ضرورتیں پوری ہوں' تم کس حیثیت سے اِس کے مالک بن بیٹھے ہو' تمہارے پاس کیا جواز ہے' تمہارے پاس اس کی کیا Justification (وجہ تسمیہ) ہے تو اُس کی طرف سے یہ جواب ملے گا کہ **قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ** (28:78) یہ میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہوا ہے۔ کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اِس میں دخل دے۔ یہی جواب اُس کی طرف سے ہوتا ہے۔ Personal Property (ذاتی جائداد) نظامِ سرمایہ داری کے حق میں یہی دلیل ہوتی ہے۔ بڑے بڑے جو اکنامسٹ ہیں وہ بنیاد ہی یہ رکھتے ہیں کہ ایک شخص جو اپنی محنت سے کچھ کماتا ہے تو اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اُس کی ملکیت میں ہو۔ وہ اُس کا مالک ہوتا ہے' تم اُس سے چھین نہیں سکتے۔ یہ ہے سرمایہ داری کی بنیاد۔ یہی کہ **اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ** (28:78)۔ وہ کہتا ہے کہ یہ میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔ کسی اور کا اِس میں کیا حق ہے' میں اِس کا واحد مالک ہوں۔ عزیزانِ من! جی تو چاہتا ہے کہ

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے ❶

قرآن ہو' آپ احباب ہوں اور وقت ہو تو باتیں ہوتی رہیں۔ دوسری جگہ ایک اور آیت میں قارون کی زبان سے الفاظ کہلوائے گئے ہیں۔ کہا کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب یہ کسی مصیبت میں پھنستا ہے تو دہائی دینے لگ جاتا ہے' دوسروں کو مدد کے لیے بلاتا ہے' خدا سے بھی دہائی دیتا ہے۔ اور **اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا** (39:49) جب ہم اُسے کسی نعمت سے نوازتے ہیں' جب خوشحالیاں آتی ہیں' فراخیاں آتی ہیں' وہ دولت سمیٹتا ہے تو ایک شخص جو اُسی کی طرح کا مصیبت میں گرفتار ہے' جیسے پہلے وہ خود تھا' وہ اُس سے کہتا ہے کہ یہ جو اتنا تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے' تم اِس کے مالک بن بیٹھے ہو تو اس میں سے میری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مجھے دے دو۔ اس پر **قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ** (39:49) اُس کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ میں اِس کا واحد مالک ہوں' میں نے اِسے اپنی ہنر مندی سے کمایا ہے کہاں کا خدا اور کونسا اس کا قانون؟ یہ وہی قارون کے الفاظ ہیں۔

قارون کی یہ داستان' داستانِ پارینہ نہیں بلکہ ہر دور کی کہانی ہے

عزیزانِ من! یہاں آگے بات اور ہے۔ وہاں قارون کی بات ہوتی تو ہم کہہ دیتے کہ یہ داستانِ پارینہ ہے یعنی فرعون کے زمانے

---

❶ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت' کہ رات دن بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے (غالب)

میں ایک قارون ہوتا تھا اُس سے اُس کی قوم نے کہا اور اُس نے یہ جواب دیا تھا لیکن یہ قرآن ہے۔ وہی الفاظ نقل کرنے کے بعد کہ ہر دور کا سرمایہ دار یہی جواب دے گا' کہا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (39:49) اصلی فتنے کی جڑ یہ ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (39:49) حقیقت یہ ہے کہ یہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ یہ قارون کی بات نہ سمجھو کہ ایک پرانی کہانی دہرائی جا رہی ہے بلکہ ہر سرمایہ داری اپنی وجہ جواز ہی یہ پیش کرتی ہے۔ ہر سرمایہ دار کا یہی جواب ہوتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت کی بنیاد ہی اُس پہ اُٹھتی ہے کہ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (28:78) میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے' تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟

قرآنِ حکیم کا جواب نظام سرمایہ داری کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم اس کا جواب دیتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (39:49) یہ فساد کی جڑ ہے۔ اور قرآن اِس فساد کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ یہ جو جناب نے اپنی ہنرمندی بتائی ہے' یہ اپنی صلاحیتیں' اور کاریگری کا کہا' یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن یاد رکھو کہ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ [1] (16:71) کمانے کی صلاحیتوں میں تمہیں فرق نظر آئے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) یہ جو اُس کارخانے کے اندر مالک بنا بیٹھا ہے اور اتنا کچھ لے جاتا ہے' اس کے بالمقابل یہ جو دوسرے ہیں' اِن کو پیٹ بھر کر بھی نہیں ملتا' بلکہ ان کے بچے بھوکے مرتے ہیں۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ کمانے کی استطاعت یا استعداد ایک دوسرے سے الگ تھی۔ وہ اس لیے تھی کہ گھڑی کے یا مشین کے اندر مختلف پرزے ہوتے ہیں' اُس کے اندر ایک پیچ بھی ہوتا ہے' Funnel بھی اُس کے اندر ہوتا ہے اور اُس کے اندر پاور والی چیز بھی ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں الگ الگ استطاعت اور استعداد رکھتی ہیں تاکہ پوری مشینری کام کر سکے۔ اس میں یہ چیز ہے کہ اگر ایک پیچ بھی اپنے مقام کے اوپر فٹ نہ بیٹھے تو ساری مشین کھڑ کھڑانے لگ جاتی ہے۔ ہر پرزے کی اپنی اپنی قیمت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ جو معاشرے کے اندر انسانوں کی الگ الگ صلاحیتیں ہیں' اپنا اپنا مقام رکھتی ہیں اور ضروری بھی ہیں تو وہ اس لیے ہیں کہ اِن کے باہمی تعاون سے معاشرے کی مشینری چلتی رہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس میں زیادہ صلاحیت ہے وہ یہ کہے کہ اِس میں میرا تو 90% حصہ ہوگا اور باقی جتنے مزدور کام کر رہے ہیں اُن کا 10% حصہ ہوگا۔ کہنے لگے کہ یہ ذہنیت غلط ہے۔ یہ کیوں ایسا نہیں کرتے کہ جو زیادہ سے زیادہ آیا ہے وہ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) اُس کی تقسیم برابر برابر کریں' ہر ایک کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یہ ایسا کیوں نہیں

---

[1] یہ حقیقت ہے کہ مختلف افراد میں' اکتسابِ رزق (کمانے کی) صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کو ایک قسم کی صلاحیت زیادہ حاصل ہوتی ہے' دوسرے کو دوسری قسم کی صلاحیت۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 610)۔

کرتے؟ کہا کہ اس لیے نہیں کرتے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری کاریگری کی وجہ سے ہمیں زیادہ ملا ہے' ہماری صلاحیت زیادہ تھی اس لیے ہم نے اِس میں سے زیادہ لیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ انسان نے یہ صلاحیتیں کہاں سے حاصل کیں

اب سوال یہ ہے کہ انسان نے یہ استعداد اور صلاحیتیں کہاں سے حاصل کی ہیں؟ عزیزانِ من! قرآن ایک لفظ میں بات کہہ گیا ہے اور دوسری جگہ تفسیر کردی کہ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (16:71) اس کی یہ کاریگری' صلاحیتیں' استعداد' اس سارے کے بارے میں' یہ کہتا ہے کہ یہ اس کی اپنی چیزیں تھیں۔ کہا کہ یہ بھول گیا کہ اِس میں اِس کا اپنا کتنا حصہ تھا؟ اس سے پوچھو کہ کہاں سے خریدا تھا؟ یہ پیدائش کے اعتبار سے بچوں میں جو صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے تو اِس نے یہ کہاں سے لیا تھا؟ پھر اُس کے بعد یہ جس معاشرے کے اندر پیدا ہوا تو یہ بھول گیا کہ بڑی استعداد کا بچہ بھی اگر کسی ایسے گاؤں میں پیدا ہو جائے جہاں مدرسہ ہی نہیں ہے' تو اُس کی وہ استعداد اور صلاحیت کس کام کی رہے گی؟ وہ تو کچھ فتنہ ہی برپا کرے گا۔ اس کا خود اپنا innate (زورِ دُروں) کیا ہے؟ یہ چیز کہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں تعلیم گاہیں ہیں' تربیتیں گاہیں ہیں' کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے یہ کچھ تنہا پیدا کرلیا تھا؟ یہ سارا معاشرہ مل کر تمہارے لیے یہ کر رہا ہے۔ خدا کی پہلی نعمت فطری صلاحیت ہے جس میں تمہاری کوئی کاریگری نہیں ہے' تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ کہ پورے کا پورا معاشرہ جس نے اتنا کچھ اپنی محنتوں سے کما کر' یہ سامان تمہارے لیے پیدا کیا' جس میں تمہاری تعلیم ہوئی' تربیت ہوئی' جس میں تمہاری صلاحیتیں برومند ہوئیں' کیا یہ سب کچھ تمہارا تنہا پیدا کردہ ہے؟ اُس کے بعد Opportunities یا مواقع جو تمہیں میسر آئے' وہ بھی معاشرے کے پیدا کردہ ہیں۔ تمہارے اپنے نہیں ہیں۔ پھر یہ جو تمام افراد کارخانے میں کام کرنے والے ہیں' ان کے بغیر تم اکیلے کام ہی نہیں کر سکتے اور اُس کے بعد پھر یہ Consumers یا صارفین ہیں' وہ اگر لینا بند کر دیں تو تمہیں نانی یاد آجائے گی۔ اب بتاؤ کہ ان تمام میں تمہارا اپنا کمایا ہوا (Earned) کیا ہے؟ کہا کہ اس سے پوچھتے جاؤ کہ اِس کا کتنا حصہ ہے؟

آنکھ نرگس کی' دہن غنچے کا' حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھے کوئی' ان کا کیا ہے

دراصل انسانی صلاحیتوں اور معاشرے کے تعاون کو اپنا ذاتی سمجھ لینا فریبِ نفس ہے

یہاں یہ الفاظ آئے ہیں: اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (16:71) وہ نعمتیں' وہ صلاحیتیں جو اِس کی اپنی زرخرید نہیں ہیں' اُس کے باوجود ہمیں کھاتا ہوا پھرتا ہے اور اس بات سے انکار کرتا ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہیں یا معاشرے کی عطا کردہ ہیں بلکہ کہتا ہے کہ یہ

چیز میری اپنی ہے۔ اسی سورۃ النحل میں کہا ہے کہ یاد رکھو! اصل نظام یہ ہے کہ **وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** [1] (16:53) یہ ایمان رکھو کہ فرد کے اندر جتنی زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں، وہ خدا کی عطا کردہ ہوتی ہیں، یہ اِس کی زر خرید نہیں ہوتیں۔ اس لیے جو تمہیں زیادہ ملتا ہے تو وہ تمہارا نہیں ہے وہ خدا کا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ وہ بھوکوں کو دیدو۔ خدا کہتا ہے کہ وہ میرا حصہ ہے۔ ''میرا حصہ میںنوں دے''۔ [2] کہا کہ جی! آپ تو سامنے ہیں نہیں تو میں آپ کو کیسے دے سکتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میرا حصہ بھوکے کو دیدو، مجھے پہنچ جائے گا۔ اس سے نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔ عزیزانِ من! صرف اتنے ٹکڑے میں کہ **وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53) یہ جو زیادہ صلاحیتیں، یہ کاریگریاں، یہ معاشرے کا تعاون، یہ سارا کچھ جتنا بھی ہے، یہ تمہارا نہیں ہے۔ جسے وہ **فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53) کہتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ یہ جو دوسرے انسان ہیں، وہ مل کر یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہم نے مل کر کیا تھا اس لیے یاد رکھو! اس سے تم اس فریبِ نفس میں نہ آجاؤ کہ یہ ساری کاریگری میری ہے، جس کی وجہ سے میں یہ کرتا ہوں اور انہیں کیا حق حاصل ہے کہ میں انہیں دوں۔ اس آیت میں اس Logic (منطق) کا ٹکڑا یہ ہے کہ تم خود ایمانداری سے Analysis (تجزیہ) کر کے دیکھ لو کہ تمہارا کتنا حصہ ہے، کہ تمہاری ذاتی کاریگری کتنی ہے اور خدا کی عطا کردہ، معاشرے کی عطا کردہ، حالات کی عطا کردہ، ان تعاون کرنے والے مزدوروں کی عطا کردہ اس کے اندر کتنی ہے۔ اچھا بزنس مین بن، دیانتدار کاروباری بن۔ اپنا حصہ آپ لے اور ان کا جو حصہ ہے وہ خدا کا حصہ ہے۔ خدا کا حصہ خدا کو دے یعنی اُس کے بھوکے بندوں کو دے دو۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام، قرآنِ حکیم کی تین آیات میں بیان کر دیا گیا ہے

عزیزانِ من! کیا عرض کروں! بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے، مشکلات کا حل کیسے ہوگا؟ میں عرض کر رہا ہوں کہ قرآن سے پوچھو تو وہ تمہارا معاشی نظام بتائے گا۔ یہ تین ہی آیات بنیاد ہیں: ایک ان کے جواز کی بات یعنی اس ذہنیت کی بات ہے اور دوسری دو آیات ہیں جو اِس ذہنیت کو کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ تو اِس طرح قرآن کے معاشی نظام کی بنیادیں استوار ہو جاتی ہیں۔ یہ بات چودہ سو سال پیشتر کہی گئی۔ یہ اُس کارل مارکس (83-1818) کی سمجھ میں تو آ گئی کہ

From each according to his capacity.

---

[1] اس آیت کی مکمل و مفصل تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (2003)۔ مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورہ النحل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، ص ص 71 تا 91۔

[2] میرا حصہ مجھے دے دو۔

''ہر ایک کی جو صلاحیتیں ہیں، وہ اکٹھی ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور Produce (پیداوار) کریں''۔ اور اُس کے بعد کہا کہ

And to each according to his need.

''اور ہر ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق ملے''۔

یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ **فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ** (16:71)۔ جو کچھ یہ Produce (پیداوار) ہو رہا ہے، یہ سارے کا سارا اس طرح سے بانٹو کہ سارے اس میں مساوی ہو جائیں۔ **مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53) کسی میں جو جو صلاحیت ہے تو وہ یہ نہ کہے کہ میں اس کا واحد مالک ہوں، یہ میری ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ جو کچھ پیدا ہوا اُسے ضرورت کے مطابق تقسیم کر دو۔ قرآن نے کہا کہ یہ ہے وہ طریق جس سے قوم تباہی سے بچ سکتی ہے۔

اب آپ نے پھر یہ دیکھا کہ کس طرح درمیان میں قارون کی یہ بات آئی اور کیوں آئی اور یہ بھی کہ قرآن اُس کے اندر کیا کہہ گیا ہے۔ یہ آیت ہے **اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ** (28:78)۔ اب وقت ختم ہو گیا ہے اور یہ آیت بھی ابھی باقی ہے اور بات ذرا اور آگے چلتی ہے تو یہ ہم آئندہ لیں گے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ القصص کی آیت 78 تک ہی آئے ہیں اور اس کا ایک حصہ ابھی باقی ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

تیرھواں باب: سورۃ القصص (آیات 78 تا 85)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ
مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫
فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ
بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ
بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا
فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ
عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ
مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1979ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 78 سے ہو رہا ہے: (28:78)۔

قارون کے حوالے سے پیش کردہ معاشی نظام کی اساس اور اس کا جواب

سابقہ درس میں بھی یہی آخری آیت تھی جو آج کے درس میں زیرِ نظر ہے۔ موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے میں اُسی تسلسل سے آگے چلنا چاہتا ہوں۔ نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ قارون کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔ دراصل یہ جو معاشی یا اقتصادی نظام ہے اُس کے اصول اور اساس کے متعلق یہ گفتگو تھی۔ یہ جسے معاشی مسئلہ یا روٹی کا مسئلہ کہا جاتا ہے' یہ تو انسان کے ساتھ پہلے دن سے لگا ہوا ہے لیکن

ہمارے اِس دور میں اِس نے خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اور یوں سمجھیے کہ اب دنیا دو ہی خطوں کے اندر بٹ گئی ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ بلاک کہہ لیجیے اور دوسرا وہ خطہ ہے جو اِس کے خلاف اٹھا۔ عام طور پہ اُسے کمیونسٹ بلاک یا برسبیلِ تنزل سوشلسٹ بلاک کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس مسئلہ کو بڑی اہمیت دی اور دینی بھی چاہیے تھی۔ وہ تو دین کی چابی سے دنیا کے تالوں کو کھولتا ہے۔ اور یہ تو بہت بڑا تالا تھا' اِسے وہ کیوں نہ کھولتا؟ موضوع کے اعتبار سے تو یہ بہت لمبی داستان ہے اور میں نے اِس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ میری کتاب ''نظامِ ربوبیت'' اسی موضوع پہ ایک جامع تصنیف بھی شائع ہوگئی ہے لیکن قرآن نے اِس کے متعلق بنیادی طور پہ دو چار آیات میں سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے۔ قارون کو کہا یہ گیا کہ تم یہ سب کچھ اپنے لیے ہی سمیٹ کر کیوں بیٹھ جاتے ہو۔ اُس سے کہا یہ گیا تھا کہ وَ لَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا (28:77) ہم تمہیں یہ نہیں کہتے کہ تم سنیاس دھار لو' سادھو بن جاؤ' تارکِ دنیا ہو جاؤ' دنیا کا کوئی حصہ اپنے پاس نہ رکھو۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے۔ وَ ابۡتَغِ فِیۡمَاۤ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ وَ لَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا (28:77)۔ یہ اسلام ہے۔ اس دنیا کا حصہ بھی فراموش نہ کرو' اسے اپنے سامنے رکھو' ان نعما سے متمتع ہو' ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تارکِ دنیا بن جاؤ۔ جو رہبانیت ہے وہ اسلام نہیں ہے لیکن زندگی اسی دنیا کی زندگی نہ سمجھو' زندگی آگے بھی چلنی ہے۔ یہ حال (Present) کے متعلق ہے جو تمہیں کہا جا رہا ہے کہ اسے فراموش نہ کرو' اس میں سے اپنا حصہ لو لیکن Future (آخرت) کو نظرانداز نہ کرو۔ یہ ہے سارا اسلام۔

اب اُس نے یہ کہا کہ تم مجھے کس جہت سے یہ کہتے ہو کہ میں یہ سارا کچھ خود ہی نہ رکھوں' اس میں سے اپنے لیے جتنا مجھے دنیاوی ضروریات کے لیے چاہیے' اتنا ہی لوں اور باقی اُنہیں دیدوں جن کی ضرورتیں ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں' ان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے باقی دیدوں۔ تم کس بنا پہ مجھے یہ کہتے ہو؟ دلیل اُس کی طرف سے یہ تھی کہ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ [1] (39:49) یہ مجھے میری ہنرمندی سے ملا ہے اور جو کچھ مجھے میری ہنرمندی سے ملا ہے' میں اُس کا واحد مالک ہوں' کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اُس میں دخل دے۔ یہ تھی قارون کی دلیل۔

---

[1] قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ (28:78) اس نے ان سے کہا کہ تم لوگوں کو میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابکدستی سے کمائی ہے۔ اس لیے اسے جس طرح میرا جی چاہے صرف کروں۔ اس میں خدا کے قانون کا کیا عمل دخل ہے اور کسی کو مجھ سے بازپرس کرنے کا کیا حق ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 904 تا 905)۔

قرآن حکیم کے نزدیک نظام سرمایہ داری فتنے کی جڑ ہے

قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ یہ اُسی کی دلیل نہیں بلکہ سرمایہ داری نظام کے ہر نمائندے کی طرف سے یہی دلیل دی جاتی ہے۔ اُس کے بعد قرآن نے کہا کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (39:49) یہ ذہنیت ہی اصل فتنے کی جڑ ہے۔ قرآن نے اِس نظام کو فتنہ قرار دیا ہے اور اِس کی جڑ اس ذہنیت کو قرار دیا ہے کہ جو کچھ مجھے حاصل ہوتا ہے، یہ میری اپنی ہی کاریگری کا نتیجہ ہے تو میں اس میں کسی دوسرے کو دخیل کیوں ہونے دوں؟ میں اِس کا واحد مالک ہوں، جس طرح سے جی چاہے اِس کو صرف کروں، جہاں جی چاہے اِس کو رکھوں، تم باز پرس کرنے والے کون ہوتے ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ذہنیت اصل فتنے کی جڑ ہے۔

عزیزانِ من! ذہنیت ہی کو تو دین کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ تو بات ذہنیت کے بدلنے کی ہوگی۔ اوپر کی عمارت نہیں بدلی جائے گی، اُس کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب اس سلسلے میں دو تین آیات میں قرآن نے سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے۔ پچھلے درس میں یہ آیت سامنے آ گئی تھی۔ اب میں اُس کو دہرادوں تا کہ آج کا یہ موضوع خود مکتفی ہو جائے۔ یہ بڑا اہم ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ دہرا بھی دوں تو کوئی حرج نہیں۔ کہا یہ گیا تھا کہ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) یہ ٹھیک ہے کہ مختلف لوگوں میں مختلف قسم کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کے لیے اِس کی بھی ضرورت ہے۔ وہاں تو اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہے تو وہاں درزی کی بھی ضرورت ہے۔ مختلف لوگوں میں مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ کہا کہ اب آگے وہ فتنہ آتا ہے کہ جن میں زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں یا اِس قسم کی صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ جن سے اُن کی کمائی زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ سارے کا سارا اپنے لیے رکھ لیتے ہیں۔ وہ جو اُن کے ساتھ کام کرنے والے یا اُن کی ماتحتی میں ہوتے ہیں، وہ اُنہیں اُن کی ضروریات کے مطابق پورا نہیں دیتے کہ اپنی بھی ضرورت کے مطابق رکھیں اور اُن کی بھی ضرورت کو پورا کریں۔ یعنی جو کچھ اُس میں سے حاصل ہوتا ہے تو یہ سمجھیں کہ ہم سب نے مل کر ایک کام کیا ہے اور اِس سے ہماری سب کی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ اس لیے فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) سب لوگ خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہو سکیں۔ یہ مساوات ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مساوات کا مفہوم یا معیار

یہ مساوات نہیں ہے کہ کسی کی ضرورت زیادہ ہے اور کسی کی کم ہے اور ہر ایک کو دو دو روٹیاں ہی دو۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ Equal distribution of wealth (دولت کی مساوی تقسیم) سے تو نظام ہی نہیں چلتا۔ Equal Distribution

(مساوی تقسیم) کا سوال نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ جتنی کسی کی ضرورت ہے تو اُس ضرورت کے مطابق اس میں سے اُسے دیدیا جائے۔ یہ مساوات ہے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اِس ذہنیت کے مالک ہیں جو یہ نہیں کرتے کہ ہرایک کو ضرورت کے مطابق دیدیا جائے حالانکہ یہ سب کچھ ان سب کی محنت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ مختلف صلاحیتوں والے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنی اپنی صلاحیت Contribute (بطور حصہ ادا) کرتے ہیں' اُس سے کچھ حاصل ہوتا ہے تو اُس کے بعد جب بانٹنے کا وقت آتا ہے تو یہ جو اوپر والے کارخانے کے مالک ہیں وہ سارے کا سارا خود لے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ جو کچھ طے کیا ہوا ہوتا ہے وہ اُس کو دیدیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ** (16:71)۔اس تقسیم میں سارے اس طرح مساوات میں آجائیں کہ ہرایک کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ یہ ایسا نہیں کرتے۔کہا کہ یہ کیوں نہیں دیتے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

نظام سرمایہ داری میں وجہ نزاع

یہ بات اگلے دو لفظوں میں بتادی کہ **اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ** (16:71)۔جو چیزیں خدا نے نعمت کے طور پر اِن کو مفت دی تھیں یہ اُس کے متعلق انکار کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ یہ خدا کی دی ہوئی نہیں ہیں بلکہ یہ ہماری ملکیت میں ہے۔ جو اِن کو کچھ زیادہ حاصل ہوا ہے تو وہ تو صلاحیت کی بنا پہ ہے۔اُن صلاحیتوں کے متعلق ان کی ذہنیت یہ ہے کہ ''یہ ہماری ہیں''۔ یہاں **نعمة الله** کہا ہے۔ یہ سارا نقطہ یہ ہے کہ یہ جو صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں تو یہ ان کو اپنی صلاحیتیں کہتے ہیں۔اصل میں یہ خدا کی عطا کردہ صلاحیتیں ہیں۔اور یہی ہے ساری بات' ساری نزاع اسی میں ہے' گفتگو اسی میں ہے' اختلاف اسی میں ہے۔ یہ دو ذہنیتیں ہیں۔ یہ بڑی بنیادی چیزیں ہیں۔سارے مسئلے کا حل ہی اس میں ہے۔اسی سورۃ النحل کی ایک آیت 53 میں کہا کہ یاد رکھو! ایک ذہنیت تو وہ تھی کہ یہ ساری جتنی صلاحیتیں ہیں وہ میری اپنی ہیں' ذاتی ہیں۔کہا کہ **مَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ یہ ہے اصل ذہنیت' یہ ہے وہ ایمان جو ہونا چاہیے کہ ''یہ جتنی صلاحیتیں مجھے حاصل ہیں' یہ خدا کی عطا کردہ ہیں''۔ یہ ہے اس سارے مسئلے کا حل۔اب جب اُس کی عطا کردہ ہوں تو پھر انہیں اُس کے مقرر کردہ طریق کے مطابق صرف کرنا چاہیے اور اِن سے جو حاصل ہو' اُسے اُسی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق تقسیم کرنا چاہیے کیونکہ یہ خدا کی ملکیت ہوئی' جسے اُس نے **نعمة الله** کہا ہے کہ خدا کی طرف سے انعام ملی ہوئی صلاحیتیں ہیں۔ یہ ہیں وہ چیزیں جس کے متعلق ساری گفتگو ہورہی ہے۔وہ کہتا یہ ہے کہ جسے تم قیامت کہتے ہو' وہاں کچھ پوچھا جائے گا' حساب مانگا جائے گا' مواخذہ ہوگا۔ **ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ** (102:8) یہ صلاحیتیں جو تمہیں دی گئی تھیں ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔سارا مسئلہ ہی یہ ہے۔ یہ فتنے کی جڑ ہے کہ جب انسان کہتا ہے کہ یہ میری ملکیت ہیں۔دوسری ذہنیت یہ ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔

انسان کو صلاحیتیں دینے کا جو مقصد تھا وہ اسے پورا کرنا ہوگا

یہ ہے چیز جسے وہ مکافات کہتا ہے یعنی نتائج برآمد کرنے کی بات کہتا ہے، جسے وہ قیامت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اُس میں پوچھا یہ جائے گا کہ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (102:8) انہیں صلاحیتوں کے متعلق سوال ہوگا کہ یہ ہماری عطا کردہ تھیں، انہیں تم نے کس طرح صرف کیا اور ان کا جو ماحصل تھا اُس کے متعلق کیا سمجھا کہ یہ تمہاری ذاتی ملکیت ہے یا جس مقصد کے لیے ہم نے تمہیں یہ دی تھیں اُس مقصد کی تکمیل اور حصول کے لیے تم نے ان کو صرف کیا؟ یہ ہے ساری بات جو پوچھی جائے گی۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، جو میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ یہاں تو دین کی ہر بات مذہب میں تبدیل کی، دنیا کو بیچ میں سے ہٹایا اور مرنے کے بعد پہ رکھ چھوڑا کہ یہاں تو کوئی پوچھنے والا ہے ہی نہیں، وہاں جا کر پوچھا جائے گا۔ ''اے جگ مٹھا تے اگے کن ڈٹھا''۔ ❶

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

قیامت کا غلط تصور انسان کو غافل کر دیتا ہے

کیا کبھی کسی کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ جو پوچھنے والی بات ہے اگر اِس کو قیامت پہ اٹھا رکھیے تو پھر اِس کا عملی تصور ذہن سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ نظری بات رہ جاتی ہے کہ وہاں کچھ ہوگا اور وہاں کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے سے انتظام کر لیا ہوا ہے۔ جو یہاں ایک مسجد بنا دے تو جنت میں اُس کا موتیوں کا محل بن جائے گا۔ یہ سارا کچھ رکھ کر اُس میں سے ایک مسجد بنا دی تو وہاں کا معاملہ تو طے ہو گیا۔ وہاں تو ان کے لیے موتیوں کا محل ابھی بن گیا ہوگا۔ ''فیر اے اوتھے جا کے کرایہ وی منگن گے کہ جی اے تے پہلے بن گیا سی تے اسی مگروں آئے آں تے کرایہ دیوو''۔ ❷ تو وہ تو ان کو اُس کا اطمینان ہو گیا۔ اب یہاں جتنا جی چاہے جمع کرتے چلے جاؤ اور اُس میں اڑھائی فیصد خیرات کے طور پہ دیدو تو باقی تمہارے لیے شیرِ مادر کی طرح حلال ہے۔ ان کا معاملہ تو طے ہو گیا۔ اور اگر اِس میں کچھ رہ جائے گا تو پھر وہ شفاعت کا عقیدہ تو ہے ہی کہ اُس سے بخشے جائیں گے۔ جب قیامت پہ اٹھا رکھنے کی بات جب ہو تو پھر مسئلہ آسان ہوتا ہے۔

خدا انسانی اعمال کے نتائج کے ظہور کے لیے بڑا سریع الحساب واقع ہوا ہے

عزیزانِ من! قرآن اعمال کے نتائج کو قیامت پہ ہی نہیں اٹھا رکھتا، یا یوں کہیے کہ قیامت کا وہ تصور ہی نہیں دیتا جو مرنے کے بعد کا

---

❶ اسی دنیا کی شیرینی اور لذت و خطائظ نصیب ہوئے تو آخرت کی کیا پرواہ، اسے کس نے دیکھا!

❷ پھر یہ وہاں جا کر کرایہ طلب کریں گے کہ جناب! یہ تو پہلے بن گیا تھا مگر ہم بعد میں آئے ہیں اس لیے اس کا کرایہ ادا کرو۔

ہے۔ وہ تصور تو اپنی جگہ درست ہے۔ وہ یہاں کی جو قیامت ہے' اس کا سب سے پہلے ذکر کرتا ہے۔ یہاں ایک قیامت آتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (83:6)۔ لفظ یقوم سے ہی لفظ قیامت ہے یعنی اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ جو اٹھ کھڑے ہونے والی بات ہے تو اسے قیامت کہتے ہیں۔ شروع میں تو یہ ہوتا ہے کہ ٹکڑیاں اٹھتی ہیں جیسے کوئی یہاں اٹھا' کوئی وہاں اٹھا۔ اُس سے زیادہ کامیابی نہیں ہوتی۔ یقُوْمُ النَّاسُ وہ ہے جب نوعِ انسانی ربوبیتِ عالمینی کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی تو اُسے اِس زندگی کی قیامت کہا جائے گا۔ یہ اس لیے دبائے جاتے ہیں کہ دبانے والوں کے پاس زیادہ قوتیں ہوتی ہیں اور یہ دبنے والے انفرادی طور پہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ یقُوْمُ النَّاسُ کچھ عجیب قسم کا ایک دور ہے جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے۔ اور زمانے کا رُخ ہمیں بتا رہا ہے کہ یہ الناس کے اٹھ کھڑے ہونے والی جو چیزیں ہیں جنہیں علاماتِ قیامت کہتے ہیں' وہ نظر آ رہی ہیں۔ دن بدن اِس کی اکثریت بڑھ رہی ہے۔ یہاں کی وہ جو قیامت ہے تو جو میں نے عرض کیا ہے کہ اُس نے ساتھ کہا ہے کہ ہم النعیم کے متعلق پوچھیں گے کہ تمہیں یہ جو صلاحیت ملی تھی جس کی بنا پہ یہ کچھ حاصل ہوا تھا' تو اِس کے ماحصل کو کس طرح سے تقسیم کیا تھا۔ تو انہوں نے مرنے کے بعد پہ ڈال دیا کہ وہاں پوچھا جائے گا لیکن یہ قرآن ہے۔ اس میں دیکھیے' وہ بتاتا ہے کہ کہاں پوچھا جائے گا؟ کہا کہ وَ کَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ کَانَتْ ظَالِمَۃً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ (21:11)۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ کتنی ایسی قومیں تھیں جنہوں نے اس قسم کا غلط نظام قائم کر رکھا تھا' وہ تباہ ہوگئیں۔ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ کر دیا اور اُن کے بعد دوسری قوموں نے اُن کی جگہ لے لی۔ قرآن کا بڑا عجیب محاکاتی انداز ہے جس میں بات کی ہے کہ تباہ ہونے والی قوم کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ یہ تباہ ہونے والی قومیں جو تھیں' ان کی کیفیت یہ تھی کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12)۔ یہ لفظ احسوا بڑا عجیب ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز محسوس طور پہ سامنے آئے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ ''جو اِس قسم کی تباہی ہوتی ہے اُس کا آغاز تو بہت پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے لیکن وہ غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر آ رہی ہوتی ہے۔ ایک وقت پہ آ کر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تباہی آ گئی۔

اعمال کے نتائج تو غیر محسوس طور پر برابر انسان کا پیچھا کرتے چلے آتے ہیں

قرآن نے کہا تھا کہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی (79:36) جہنم تو اُسے نظر آتا ہے جو آنکھیں کھول کر اُسے دیکھے۔ تو یہ تباہی کا جہنم اندر ہی اندر غیر مرئی' غیر محسوس طور پر مدت سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔ اِنہیں وہ محسوس نہیں ہوتا۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ تباہی اُن راہوں سے آتی ہے جو مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (16:26) ان کے شعور میں بھی ابھی نہیں ہوتی۔ اصل میں وہ شعور ہی نشہء قوت سے اور نشہء دولت سے نہ صرف دبا ہوا ہوتا ہے بلکہ خمر ہوتا ہے یعنی ڈھنپا ہوا ہوتا ہے۔ خمر کے معنی ''ڈھانپ دینے والی چیز'' ہے۔

اسی لیے ان کو شعوری طور پہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ چیزیں کدھر سے آ رہی ہیں۔ وہ آ رہی ہوتی ہیں لیکن فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12) جب وہ ان کو محسوس طور پر سامنے نظر آتی ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تباہی آ گئی۔ آتش فشاں پہاڑ کا لاوا چلا آ رہا ہے۔ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) پھر وہ وہاں سے بھاگنا شروع کرتے ہیں۔ یہ احسوا بڑا عجیب لفظ ہے۔ یعنی اُس کی ابتدا تو بہت پہلے ہو چکی ہوتی ہے لیکن جب وہ تباہیاں محسوس طور پر ان کے سامنے آتی ہیں تو پھر وہ وہاں سے اٹھ بھاگتے ہیں۔

انسان کا ہر قدم خدا کے قانون کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے

کیا بات ہے قرآن کے محاکاتی انداز سے سمجھانے کی! کہ یہ بھاگتے ہیں تو پیچھے سے ہمارا قانونِ مکافات انہیں آواز دیتا ہے کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو۔ بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ کھڑے ہو جاؤ' رک جاؤ۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) اور اپنے انہی محلات کی طرف لوٹتے چلو' پوچھا جائے گا کہ ان محلات کی سُرخیاں کن کے خون کی رہینِ کرم تھیں' اُن کی بنیادوں میں کن کی ہڈیوں کا چونا دیا گیا تھا۔ ان مساکن کی طرف پلٹ کر چلو۔ اور آگے ہے کہ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13) تا کہ وہاں جا کر On the spot (جائے وقوعہ پر) تم سے پوچھا جائے کہ یہ جو ہماری دی ہوئی نعمتیں تھیں اُن کو کس طرح صرف کیا تھا۔ چلو پلٹ کے وہاں چلو۔ اور یہ ہیں کہ اِس کو مرنے کے بعد کی قیامت پہ اٹھا کر رکھ دیتے ہیں جبکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن یہاں کی قوموں کی تباہیوں کی بات کس انداز سے کر رہا ہے کہ جب تباہی آتی ہے تو پھر وہ بھاگتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن کا کیا خوب انداز ہے! کہ پیچھے سے آواز آتی ہے کہ بھاگنے کی کوشش مت کرو۔ دوسری جگہ ہے کہ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (21:35) نظر بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُس عدالت سے' اُس تھانے سے' دور بھاگ رہے ہیں۔ ان کو پتہ ہی نہیں کہ ان کا ہر قدم تو اُسی کی طرف لیے جا رہا ہے۔ ہم پیچھے سے آواز دیں گے کہ مت بھاگو بلکہ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ (21:13) چلو لوٹ کے' چلو پلٹ کے وہاں کہ جہاں تم دوسروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر عیش پرستیاں کرتے تھے۔ اُتْرِفْتُمْ کے یہ معنی ہیں کہ وہاں چلو۔ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) اپنے محلات کی طرف تا کہ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13) تم سے وہاں پوچھا جائے گا۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ [1] (102:8)۔ یہاں بھی وہی تسئلون آیا ہے کہ یہیں پوچھا جائے گا کہ جس کے متعلق ہم نے سمجھ

---

[1] اُس وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ خدا کی ان نعمتوں کو جنہیں اس نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے عطا کیا تھا' تم محض اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر' سمیٹتے کیوں چلے جاتے تھے! تم سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے قصرِ تعیش کی رنگینیوں میں کس کس کے خون کی سُرخی شامل تھی۔ جو کچھ تم نے سمیٹا تھا' وہ کس کی محنت کا ماحصل تھا اور تمہیں اسے غصب کر لینے کا کیا حق حاصل تھا (21:13)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1479)۔

رکھا ہے کہ وہاں پوچھا جائے گا' یہاں نہیں پوچھا جائے گا جبکہ وہ تو یہاں کی بات کر رہا ہے۔ یہ تسئلون ہے کہ پوچھا جائے گا۔ اور اس کے بعد پھر مکرنے کا اور معذرتوں کا وقت نہیں ہوگا۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) وہاں اقرار کرنا پڑے گا کہ فی الواقعہ ہم ظالم تھے۔ یہ نعمتیں ہماری ملکیت نہیں تھیں' ہم ان کی بنا پر ظلم کر رہے تھے۔ اُس وقت On the spot (جائے وقوعہ پر) جب ان سے پوچھا جائے گا تو پھر ان کی طرف سے اعتراف کیا جائے گا' اقرار کیا جائے گا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ (21:15) وہاں یہ اس بات کو پکارتے جائیں گے کہ ہاں ہم ظالم تھے' ہم سے زیادتی ہوئی' یہ کچھ ہوا۔ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) تا آنکہ ان کی کیفیت' ان کا انجام یہ ہوگا کہ وہ کٹے ہوئے کھیت کی طرح اور بجھے ہوئے انگارے کی طرح ہونگے۔

فکرِ قرآن کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ ایک یادگار ملاقات

عزیزانِ من! ادبی اعتبار سے بھی دیکھیے اور عربی آتی ہو تو پھر پوچھو نہیں کہ اس میں کیا لطف آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اِس لطف کے متعلق ایک ذاتی سی بات کہہ دوں۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938) کی خدمت میں جب حاضری ہوئی تو میں اُس وقت بہت چھوٹا سا تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتا تھا۔ وہ بہت بلند شخصیت تھیں' ان کا انداز یہ تھا کہ وہ کسی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ بہت اونچے ہیں ''یار بن جاندے ہوندے سن''۔ ❶ یونہی ایک دن پوچھنے لگے کہ یار! تم نے کبھی اپنا کوئی شعر نہیں سنایا؟ میں نے کہا کہ جی! میں نے اپنے شعر پھاڑ کے چولہے میں پھینک دیئے تھے۔ پوچھنے لگے کہ کس دن؟ میں نے کہا کہ جس دن آپ کے شعر سمجھ میں آنے لگ گئے'' اپنے شعر بے سوادے ہوگئے سن''۔ ❷ اِس سواد کا ترجمہ تو لذت یا مزا ہے لیکن پنجابی سواد جیہڑا ہونداا ے نا' او ہ اردو اچ گل نئیں بنڑدی''۔ ❸ جب کوئی فکر کی بات ہوتی تھی تو اُن کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ کچھ وقت کے لیے مستغرق ہو جاتے تھے۔ وہ ذرا فکر میں ڈوبے اور پھر نگاہ اوپر کی۔ کہا کہ ''بچہ! اک دن اقبالؒ دے شعر وی بے سوادے ہو جان گے''۔ ❹ جیسے اُنہوں نے پوچھا تھا کہ کس دن؟ میں نے بھی پوچھ لیا کہ کس دن؟ کہنے لگے کہ جس دن تمہیں قرآن سمجھ میں آنے لگ جائے گا۔ اُس وقت بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے انہی سے پوچھا تھا کہ جی! میں تو بچپن سے قرآن پڑھتا چلا آ رہا ہوں' کچھ سمجھتا ہوں' تھوڑی بہت عربی بھی جانتا ہوں' یہ کیفیت تو نہیں ہے جو آپؒ نے فرمائی تھی۔ کہنے لگے کہ قرآن پڑھا گیا ہے لیکن سمجھا نہیں گیا ہے۔ میں نے کہا کہ بتایئے کہ سمجھنا کیسا ہے؟

---

❶ جگری دوست بن جاتے تھے۔

❷ اپنے اشعار لذت وحلاوت کھو چکے تھے۔

❸ لیکن پنجابی کا جو''سواد'' ہوتا ہے' وہ اردو میں کہنے سے بات نہیں بنتی۔

❹ بیٹا! ایک دن اقبالؒ کے اشعار بھی بے مزا ہو جائیں گے۔

پھر اُنہوں نے بتایا تھا کہ سمجھنا کیسا ہے اور پھر وہ ایسا بتایا کہ پچاس برس ہو گئے ہیں وہ چپک گیا ہے۔ اُنہوں نے ٹھیک کہا تھا کہ جب قرآن سمجھ میں آنے لگ جائے گا تو اقبالؒ (1938-1877) کے شعر بھی ''بے سوادے'' ہو جائیں گے۔ قرآن کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

اب میں کیا عرض کروں کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ کہا ہے کہ **حَتّٰى جَعَلۡنٰهُمۡ حَصِيۡدًا خٰمِدِيۡنَ** (21:15) ہلاک شدہ قوموں کے متعلق یہ دو لفظ کہے ہیں۔ اگر عربی کے مادے آپ کو معلوم ہوں تو آپ کو پتہ چلے کہ ان دو لفظوں کے اندر کتنی وسعتیں ہیں۔ عزیزانِ من! کسی زمیندار کی کھیتی بڑی محنت سے اگائی ہوئی ہو اور وہ اجڑ جائے تو اُس زمیندار سے پوچھیے کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اور دوسری کیفیت بجھا ہوا شعلہ کی ہے۔ پہلے کیا انداز تھا اور اُس تباہی کے بعد کیا انداز ہوا! اِس میں ایک ایک لفظ کے اندر دونوں انداز آ گئے ہیں۔

انسان سے خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مالک بن جانے کا ثبوت طلب کیا جائے گا

بہرحال یہ کہا کہ ان سے کہا جائے گا کہ کہاں بھاگ رہے ہو، ادھر آ ؤ، وہیں واپس چلو: **اِلٰى مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ** (21:13) جہاں تم ان محنت کشوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کیا کرتے تھے، **وَ مَسٰكِنِكُمۡ** (21:13) اور اُن محلات میں چلو۔ **لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ** (21:13) تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ جو ہماری طرف سے ملی ہوئی صلاحیتیں تھیں، تم کس طرح اُن کے مالک بن گئے تھے۔ اور اُن کی بنا پہ جن کے تعاون سے جو کچھ حاصل ہو رہا تھا، تم اُن کو اُس سے محروم اور محتاج رکھتے تھے اور خود وہاں صاحبِ اقتدار بنے ہوئے تھے۔ تو چلو وہاں، تم سے پوچھا جائے گا۔ عزیزانِ من! یہیں پوچھا جاتا ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اب بات ساری یہ ہے، مسئلے کا حل یہ ہے۔

اقبالؒ کا کمیونسٹوں سے کمیونزم کے متعلق ایک بنیادی سوال

کمیونسٹوں نے کہا کہ ہم سرمایہ داری کو ختم کر کے اِس کی جگہ دوسرا نظام دیں گے۔ اقبالؒ (1938-1877) کی بڑی دور رس نگاہ تھی اور اس کی قرآن پہ نظریں تھیں۔ اس نے اُس زمانے میں ان کمیونسٹوں سے کہا تھا کہ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اورا اساسِ محکمے ؟

اے وہ کہ جو تُو نظامِ سرمایہ داری کی جگہ ایک نیا نظام پوری دنیا کے اوپر قائم کرنا چاہتا ہے، اُس اتنی بڑی محکم عمارت کو استوار کرنے کے لیے

کوئی محکم بنیاد بھی تو نے تلاش کی ہے یا نہیں ؟ یہ بڑی اہم چیز تھی۔ یہ محکم بنیاد وہاں کمیونسٹوں کے ہاں نہیں تھی۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے کو جو خط لکھا تھا اُس میں یہ چیز کہی تھی کہ اگر مارکس ازم میں خدا کو ساتھ شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے قریب ہو جاتی ہے۔ ایک فلاسفر کا خط ایک فلاسفر کو لکھا جا رہا ہے تو بات تو اُس نے ایمائیت (Suggestiveness) میں کہی تھی۔ اُس میں خدا کو شامل کر دیا جائے بلکہ اُنہوں نے Plus God لکھا تھا کہ خدا ساتھ شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ ہوئی ساری بات کہ خدا ساتھ شامل کر دیا جائے۔ یہ آپ کو پتہ ہے کہ کیسے شامل کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا: سوشلزم' اِنہوں نے کہا: اسلامی سوشلزم' تو خدا شامل ہو گیا!! ''یعنی اُتے دا لیبل جیہڑا سی' اونواں کر کے لا دتا' تے اندر او ہی پرانا تمبا کو'' ۔[1] کہا کہ جی! دیکھو وہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ خدا کو شامل کر دو تو وہ کر دیا۔

خدا کو ساتھ شامل کرنے کا مفہوم

خدا ساتھ شامل کر دینے کی بات کیا ہے؟ یہ اساسِ محکم ہے' یہ بنیاد ہے جس پہ یہ عمارت استوار ہونی ہے۔ اور وہ عمارت یہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) یہ ہے خدا کو شامل کرنا کہ یہ جتنی صلاحیتیں میرے پاس ہیں یہ میری نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی دی ہوئی ہیں اس لیے اُس کے حکم کے مطابق صرف میں آنی چاہئیں۔ یہ ہے خدا شامل کرنا' یہ ہے اساسِ محکم۔ اور کمیونسٹ تو خدا کا ہی انکار کرتے تھے۔ اساسِ محکم تو کیا' وہاں تو کمزور اساس بھی نہیں مل سکتی تھی۔ یہ دو ذہنیتیں ہیں' دو ایمان ہیں۔ ایک ذہنیت وہ ہے کہ یہ سارا' جتنا کچھ بھی ہے' اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (28:78) یہ میری ہنر مندی کا نتیجہ ہے۔ ایک ایمان یہ ہے کہ میری یہ ہُنر مندی بھی اُسی کی دی ہوئی ہے۔ تو آپ کے ذہن میں آیا کہ ایمان کس کو کہتے ہیں۔ ایمان ذہنیت کو کہتے ہیں۔ یہ دو ذہنیتیں ہیں جن کے اوپر دو قسم کے اقتصادی نظام استوار ہوتے ہیں۔ یہ دو ذہنیتیں ہیں' دو ایمان ہیں۔ کفر بھی ایک ایمان ہوتا ہے' اُسے آپ غلط ذہنیت کہہ لیجیے۔ حق کے مطابق جو ذہنیت ہے تو وہ بھی ایک ایمان ہوتا ہے۔

کمیونزم بذاتِ خود ایک مذہب ہے

یہ جو کمیونزم ہے' یہ ایک Religion (مذہب) ہے۔ یہ آپ عجیب بات سنیں گے۔ اس کے لیے تو اور وقت چاہیے۔ کمیونسٹ Religion (مذہب) کے خلاف ڈنڈے لیے پھر رہے ہیں جبکہ وہ خود ایک Religion (مذہب) ہے۔ وہ خود بھی ایک ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ باطل کے اوپر ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایمان تاریخ کا وجوب' (Historical Necessity) ہے کہ وہ دنیا میں یہ سب

---

[1] یعنی جو اوپر کا لیبل تھا' اسے نیا بنا کر لگا دیا' اندر وہی پرانا تمبا کو ہی رہا۔

کچھ کیے چلے جا رہی ہے۔ یہ بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ جب یہ ایمان ہو جائے کہ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) میرے پاس یہ جتنی صلاحیتیں ہیں، جتنی کاریگری ہے، یہ ہے جسے کہا تھا عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ (28:78) تو یہ ایمان ہو کہ یہ میری نہیں ہیں، یہ اُس کی عطا کردہ ہیں۔ عزیزانِ من! پھر تو یہ ساری کی ساری بھی اُس کے لیے، اُس کے احکام کے مطابق، یا اُسے دیدی جائیں تو اِس میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے کس حسین انداز میں یہ بات کہی ہے! یہاں تو ہم نعمت یا صلاحیت کی بات کہتے ہیں کہ یہ اُس کی دی ہوئی ہیں، تو اُس کے مطابق خرچ کرو جبکہ وہ [1] تو کہتا ہے کہ

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اُسی کی چیز اُس کو دیدی تو ہم نے کیا دیا۔ اسی لیے وہ کہتا تھا کہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

غزل کے انداز میں یہ باتیں کہہ جاتے ہیں، یہ بڑے اونچے لوگ تھے۔ اس ایمان کے اوپر قرآن کا اقتصادی اور معاشی نظام استوار ہوتا ہے۔

مارکس کے ہاں اسی اساس کی کمی تھی جس کی بنا پر وہ خدا کو ساتھ ملانے سے قاصر رہا

یہ ہے وہ اساسِ محکم جو مارکس (83-1818) کو نہیں ملی تھی۔ اُس کی ہسٹری پڑھ کر دیکھیے۔ اُس میں بات یہ تھی کہ اقتصادی مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ یہ نظام دنیا میں قائم ہو جائے کہ ہر ایک سے اُس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور اُس کی ضرورت کے مطابق رزق دیا جائے۔ مارکس نے کہا تھا کہ یہ حل ہے۔ پھر اُس کی پارٹی نے کہا کہ حل یہ ہے تو پھر چلیے Implement (نافذ) کیجیے، اُس پہ عملدرآمد کیجیے۔ اُس نے کہا کہ اِس کے اوپر میں عملدرآمد نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ مجھے وہ اساس نہیں مل رہی، مجھے ابھی تک وہ Incentive (جذبہ محرکہ) نہیں مل رہا جس کی بنا پہ میں ہر ایک سے کہوں کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور صرف اپنی ضرورت کے مطابق اُس میں سے لے، باقی دوسروں کو دیدے۔ وہ کہے گا کہ میں زیادہ کام ''کیوں'' کروں۔ میرے پاس اِس ''کیوں'' کا جواب نہیں ہے۔ مارکس (83-1818) بڑا دیانتدار شخص تھا۔ اُس کی پارٹی میں سے ممبر ٹوٹ گئے، اُنہوں نے بغاوت کر دی۔ مارکس

---

[1] یہ اشارہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797) کی طرف ہے۔

نے کہا کہ جو جی میں آئے کہو لیکن میں منافقت نہیں برت سکتا' میرے پاس یہ اساس نہیں ہے' میرے پاس یہ Incentive (جذبہ محرکہ) نہیں ہے۔

اساس تو یہ ایمان ہے' یہ ذہنیت ہے کہ **مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (16:53)۔ یہ ایمان اور یہ ذہنیت اگر آ جائے تو وہ اس نئے نظام کی اساس بن سکتا ہے۔ یہ چیز مارکس (83-1818) کے سامنے نہیں تھی۔ وہ بڑا عجیب شخص تھا' اُس نے شکست تسلیم کر لی۔ پارٹی والے' پارٹی چھوڑ گئے۔ وہ کہنے لگا کہ میں دھوکا نہیں دے سکتا' یہ اساس نہیں ہے۔ اسی لیے اقبالؒ (1938-1877) بہت بلندی پہ لے جاتا ہے۔ اس کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ

وہ کلیمِ بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

یہ چیز کہ یہ کلیمِ بے تجلی اور مسیحِ بے صلیب تھا اسے خدا کو درمیان میں شامل کرنا تھا لیکن یہ اُسے حاصل نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لاُ' لا کرتا چلا گیا۔

کمیونزم کی موجودہ حالت

کیا آپ کو معلوم ہے کہ کمیونزم کا پروگرام یا ان کی Stages (منازل و مراحل) کیا ہوتی ہیں؟ اب تو وہ ہے ہی نہیں۔ یعنی کمیونسٹ تو دنیا کے اندر ہے ہی نہیں۔ ''اے سارے لے پج ہیگے نیں جیہڑے تہانوں نظر اوندے نیں''۔ ❶ اس کے لیے بھی اردو کا لفظ کیا لاؤں۔ انہوں نے تو کبھی مارکس کی وہ کتاب ❷ بھی نہیں دیکھی ہوتی۔ ان کو تو یہی پتہ ہے کہ یہ جھگڑا' لڑائی' تباہی' بربادی' توڑ پھوڑ کا نام کمیونزم ہے جبکہ وہ بہت اونچی چیز تھی۔ مارکس (83-1818) نے یہ اعتراف کیا کہ ''یہ ایمان ہے جو اتنی بڑی عمارت اُس پہ استوار کرتا ہے۔''

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام اپنے اندر مختلف پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے

عزیزانِ من! بات اس قارون سے چلی تھی جو سرمایہ داری کا نمائندہ ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ **قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ** (28:78) اور قرآن نے کہا تھا کہ یہی **بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ** (39:49) ہے۔ جب تک یہ ایمان ہے' صحیح اقتصادی نظام استوار نہیں

---

❶ یہ جو تمام آپ کو نظر آتے ہیں یہ (نظریات) ادھار لیے ہوئے ہیں' (ان کے اپنے نہیں ہیں)۔
❷ اس کی کتاب کا (1867) Das Kapital ہے۔

ہوسکتا۔ایمان یہ ہونا چاہیے کہ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔اب یہ نظام کو سمجھتے یہ ہیں کہ کسی چیز کی اوپر کی جو شکلیں ہوتی ہیں تو اُس کا نام نظام ہوتا ہے اور اُس کو بدل دیا جائے اور اُس کی جگہ یوں کر دیا جائے تو پھر وہ نظام بدل جاتا ہے۔عزیزانِ من! نظام اسے نہیں کہتے۔نظام تو یونہی ایک محسوس سی عمارت ہوتی ہے جو اوپر کھڑی ہوتی ہے۔نظام کی بنیاد تو یہ ایمان ہوتا ہے۔اس کا نام آپ جو جی میں آئے رکھ لیں۔دہریت بھی تو ایک ایمان ہے یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے کہ خدا نہیں ہے۔یہ باطل پہ ایمان ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ ان لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہے کہ کمیونزم کیا ہے۔ان کا بھی اُس چیز کے اوپر ایمان نہیں ہے بس اوپرا اوپر کی بات ہی ہے۔

بچپن کی تربیت اور تاریخی حقائق کی روشنی میں صفات مومن

اپنے بچپن کی ایک بات یاد آ گئی کہ ہماری تعلیم و تربیت کیسے ہوئی تھی۔یہ بات میں کبھی کبھی کر دیا کرتا ہوں۔یہ بڑی اہم چیز ہے' میری اپنی زندگی ایک پوری تاریخ ہے۔میں نے کہا تھا کہ میں نے دادا جان سے تربیت پائی تھی۔قرآن میں مومنین کی صفات آ رہی تھیں' وہ بتانے والے تھے اور میں سمجھنے والا تھا' ابھی بچپن تھا۔تو مومنین کی صفات آ رہی تھیں۔آپ تو سمجھتے ہیں کہ مومن کا معیار کیا ہوتا ہے:

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

وہ قرآن کی آیتوں سے یہ سمجھا رہے تھے تو میں نے عرض کیا کہ دادا جان! اس اعتبار سے تو مجھے آج دنیا میں کوئی مومن نظر ہی نہیں آتا تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا۔کہنے لگے کہ بیٹا! یہ تو تم نے ٹھیک کہا کہ مومن نظر نہیں آتا اور انجام کی طرف سے تمہاری تشویش اور گھبراہٹ بھی ٹھیک ہے۔ایک ہی بات غنیمت ہے کہ آج دنیا میں کوئی مومن نہیں ہے تو کافر بھی کوئی نہیں ہے۔اُنہوں نے کہا تھا غنیمت جانو کہ آج محمد ﷺ نہیں ہے تو ابولہب [1] بھی کوئی نہیں ہے۔اُنہوں نے بہت بڑی بات کہی تھی۔سمجھ میں آتا ہے کہ وہ لوگ کیسے بات سمجھا جاتے تھے۔قرآن نے کہا کہ اَوَ لَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا (28:78)۔تاریخ کے اوراق سے پوچھو۔ان کے ذہن میں یہ ہے کہ جو قومیں غریب' مفلس اور محتاج رہ جاتی ہیں تو انہی

---

[1] ابولہب یا ابی لہب' نبی اکرم صلی اللہ کے چچا (عبدالعزی بن عبدالمطلب) کی کنیت تھی' یہ غالباً اس کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے تھی۔وہ اسلام کا سخت مخالف تھا۔وہ بدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض (چیچک) میں مر گیا تھا۔(حوالہ کے لیے دیکھئے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد چہارم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص۔1505 نیز پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1949' ص۔571)۔

کی تباہیاں آیا کرتی ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ایک تباہی اُس طور پہ بھی آتی ہے لیکن ایک تباہی اس سے بھی آتی ہے کہ دولت تو بیشمار ہوتی ہے لیکن اُس کی تقسیم صحیح نہیں ہوتی۔ اسی سورۃ کی 58ویں آیت میں ہے کہ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58) تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ ایسی قوموں کی بھی تباہی آئی جن کے ہاں بڑا ہی افراط زر تھا' بڑی دولت تھی لیکن اُس کی تقسیم غلط تھی۔ اور پھر کہا کہ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ (28:58) ان کے کھنڈرات دیکھو۔ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (28:58) ان کے بعد ان گھروں میں کوئی بسا ہی نہیں۔ ایسے ویران ہوئے کہ گھروں کے کھنڈرات تو تھے لیکن ان میں بسنے والا ہی کوئی نہیں رہا۔ کہا کہ اس سے پیشتر کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جو ان سے بھی زیادہ قوت میں بڑی تھیں' ان کی جمعیت (Majority) بھی بڑی تھی' دولت بھی بہت تھی لیکن ایسا غلط نظام تھا۔ یہاں ایک عجیب چیز کہی ہے کہ وَ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (28:78) ایسا تباہ کن نظام تھا کہ ہمیں مجرموں سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہ رہی کہ تم نے کیا جرم کیا تھا۔ جرم کے نتائج پہلے ہی سامنے آ گئے۔ عجیب بات ہے کہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ تمہارا جرم کیا تھا۔

بات آگے پھر قارون والی آ گئی۔ یوں ہو رہا تھا کہ اُس کے دور میں دوسری قوم والوں نے اُس سے کچھ مکالمہ کیا۔ یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ عزیزانِ من! باتیں تو ہم سے ہو رہی ہیں۔ یہ کلام اللہ ہے' خدا ہم سے بات کرتا ہے' اس معنی میں ہم یہاں کلیم ہیں۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ (28:79) اپنی بڑی آرائش اور نمائش سے بھڑکتے ہوئے باہر نکلتا تھا۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں جو' بگھی گاڑی ہوتی تھی' جب شہر کا رئیس نکلا کرتا تھا تو ہم دیکھا کرتے تھے۔ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (28:79) اُسے دیکھ دیکھ کر بیچارے غریب آدمی کہتے تھے کہ یا اللہ! ہمیں بھی کچھ ایسا دیدے۔ دیکھو کہ کس ٹھاٹھ باٹھ سے یہ جا رہا ہے' کتنا کچھ اس کے پاس ہے! وہ اس طرح سے دیکھا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا (28:80) اور جو لوگ صحیح ذہنیت والے تھے' جو ایمان رکھنے والے تھے' جن کی نظر حقائق پر تھی' وہ ان لوگوں سے کہتے تھے کہ ارے اِس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھو۔ اس نے تو تباہ ہونا ہے تو کیا تم بھی تباہ ہونا چاہتے ہو؟

سرمایہ داری نظام کے متبادل ایک اور نظام

اس نظام سرمایہ داری کے مقابلے میں ایک اور نظام ہے۔ وہ نظام یہ ہے کہ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا (28:80) جو نظام صحیح ذہنیت کے اوپر عمل کرنے سے قائم ہوتا ہے وہ ہے صحیح نظام۔ اُس میں اِس سے بھی زیادہ فراوانیوں سے سب کچھ ملتا ہے۔ عزیزانِ من! کیسے ملتا ہے؟ آگے دو الفاظ ہیں جو بتا رہے ہیں کہ کیسے اس سے بھی زیادہ ملتا ہے لیکن قرآن بتاتا ہے کہ وَ لَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا

الصّٰبِرُوْنَ (28:80) یہ انہی کو ملتا ہے جو بڑی استقامت کے ساتھ مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اِس میں بڑی استقامت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ویسے تو ہمارے ہاں صبر کے معنی بے چارگی والا بس صبر شکر کے ہیں لیکن بعض اوقات ایسے الفاظ آ جاتے ہیں کہ ''میاں ذرا صبر کرنا چاہیدا سی''۔ ❶ تو صبر کے معنی استقامت ہوتا ہے۔ پہلے ہی بتا دیا کہ اس سرمایہ داری کے نظام کے ساتھ کتنے تزاحمات ہونگے' کتنا سخت ٹکراؤ ہوگا۔ کہا کہ جو اُس میں ثابت قدم رہتا ہے اُس کو یہ سب کچھ مل جاتا ہے۔

''خسف'' کے لفظ کا قرآنی مفہوم

قرآن کریم نے سرمایہ داری کے نظام کا انجام بتا دیا کہ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ (28:81)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ قارون خود اور اُس کا جو گھر تھا وہ زمین میں دھنس گیا جبکہ بات ایک پورے نظام کی ہو رہی تھی۔ کسی سرمایہ دار کا گھر زمین میں دھنستا ہوا نظر نہیں آتا۔ نظام کے اوپر تباہی آ جائے تو گھر کا زمین میں دھنسنا کیا بات ہوئی! یہ لفظ خسف ہے۔ اس کا استعمال عربوں کے ہاں دیکھیے کہ وہ کس وقت یہ لفظ کہتے تھے۔ وہ بِئْرٌ مَخْسُوفَةٌ اُس کنویں کو کہتے تھے کہ وہ کنواں تو باقی رہے لیکن اُس کے اندر پانی نہ رہے ❷ اور اِس سے بھی زیادہ ایک اور چیز ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ خسوف وہ چاند گہن کو کہتے تھے کہ چاند تو ہو لیکن اُس میں روشنی باقی نہ رہے۔ قرآن اس کا یہ انجام بتاتا ہے۔ ہمارے ہاں جب وہ ہزار ہزار کے نوٹ ہوا کرتے تھے تو وہ جس زمانے میں Demonetize (زر کی حیثیت سے ختم) ہوئے ہیں' گورنمنٹ نے Withdraw کر دیا تھا تو اُن نوٹوں کی شکل وصورت بالکل اُسی طرح کی تھی لیکن ''اوناں دا مُل کوڈی وی نہیں ہیگا سی''۔ ❸ یہ ہے جو قرآن خسف کہہ رہا ہے۔ کہ ''نوٹاں دیا گڈیاں رکھیاں ہویاں ہیگیاں سن لیکن اوناں دا مُل اک پیسہ وی نہیں سی''۔ ❹ اِسے خسوف کہتے ہیں کہ ''چاند کی شکل تو باقی رہے لیکن اُس کی نورانیت اُس میں نہ رہے''۔ نورانیت نہ رہے تو پھر اُس کے بعد چاند کس کام کا ہے' کنویں میں پانی نہ ہو تو وہ کنواں کس کام کا ہے بلکہ الٹی تباہی آ جاتی ہے کہ ''اوہدے اندر آدمی ڈِگ ڈِگ کے مرجاندے نیں''۔ ❺ کہا کہ اُس کا یہ انجام ہوتا ہے کہ نوٹ تو باقی رہتے ہیں لیکن نوٹ کی قیمت باقی نہیں رہتی۔

---

❶ یہاں! ذرا صبر کرنا چاہیے تھا۔

❷ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ بئرٌ محسوفہٌ۔ وہ کنواں ہے جس کا پانی غائب ہو چکا ہے۔

❸ ان کی قیمت کوڑی بھی نہیں رہی۔

❹ نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن ان کی قیمت ایک پیسہ بھی نہیں تھی۔

❺ اس میں آدمی گر کر مر جاتے ہیں۔

فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ (28:81) جب کنویں میں پانی نہ رہا' جب چاند میں روشنی نہ رہی' تو اِس کنویں کے اوپر جو جمگھٹا ہوا کرتا تھا تو اُن میں سے ایک بھی باقی نہ رہا' سارے پھُر کر کے اڑ گئے کیونکہ اِس شخص کے سیرت و کردار کے ساتھ کسی کی وابستگی نہیں تھی۔ وہ جمگھٹا تو اُس روپے کی وجہ سے تھا جو اُس کے پاس تھا۔ اُس کے پاس کوئی ذاتی جوہر نہیں تھا۔ وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ (28:82) اور وہ جو کل کہا کرتے تھے کہ ہمیں بھی اِس قسم کا کچھ مل جائے تو اُنہوں نے کہا کہ یا اللہ! ہماری توبہ' خدا کا شکر ہے کہ اُس انداز کا ہمیں نہیں ملا ورنہ جیسے یہ ڈوبا ہے ہم بھی آج تباہ ہو گئے ہوتے۔

رزق وہی رزق ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق میسر آئے

رزق وہی رزق ہے جو خدا کے قانون کے مطابق ملے۔ لَوْ لَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا (28:82) یہ خدا کا شکر ہے' ہمارے اوپر اُس کی یہ نعمت تھی' اُس کا احسان تھا کہ ہم اُس کے ساتھ نہ لگے اور اُس نظام سے بچ گئے ورنہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی' ہم بھی ڈوب جاتے۔ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (28:82)۔ یہاں لفظ کافر آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو کافر کا ترجمہ کافر ہی کر دیتے ہیں'' تے کافرتوں مراد ہندوے لینے آں''۔ [1] کفر کے معنی یہ ہوتا ہے کہ ''کسی چیز کو' دولت کو' ڈھانپ کر یا چھپا کر رکھنا''۔ تو خدا نے کہا تھا کہ وہ جو رزق کو دوسرے ضرورت مندوں سے چھپا کر رکھتا ہے تو ہم اُس کی کھیتی کو کبھی پنپنے نہیں دیتے' کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا کرتے ہیں۔ دیکھا کہ لفظ کفرون کہاں آ رہا ہے۔ اور اُس کے بعد کہا ہے کہ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (28:83) اور اُس کے مقابلے میں صحیح نظام والوں کی بستیوں کو ذرا دیکھو کہ کس قدر سرسبز و شاداب نظر آتی ہیں۔ الدار الاٰخرۃ وہ ہے کہ جن کی نگاہیں مستقبل پر بھی رہتی ہیں۔ اُن کی بستیوں کو بھی دیکھو کہ کس قدر شاداب ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔

لفظ علوا کا مفہوم اور صفاتِ مومن کی تشریح

قرآن کہتا ہے کہ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (28:83)۔ یہاں ایک لفظ ''متقین'' تشریح طلب آ گیا ہے۔ علوًا کے معنی ''برتری'' ہوتا ہے ''بڑائی'' ہوتا ہے ''بلندی'' ہوتا ہے۔ یہ علوًا جو برتری اور کبریائی ہے تو یہ مومنین کا حق ہے۔ حق نہیں بلکہ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ مومن ہوتے ہی وہ ہیں جن کو یہ حاصل ہوتی ہے۔ مومنوں کے

---

[1] اور کافر سے ہندو مراد لے لیتے ہیں۔

متعلق تو اُس نے کہا ہے کہ وہ جو غلط نظام والے کافرین ہیں وہ مومنین کے اوپر کبھی غلبہ حاصل ہی نہیں کر سکیں گے۔ اور مومن کے متعلق ہے کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) وہ علوا تھا اور یہ الاعلون ہے یہ Super-lative ڈگری (درجہ تفضیل کل) ہے یعنی بلند ترین۔ وہ جو میں نے ابھی کہا تھا کہ

مومنے بالائے ہر بالا ترے

قرآن میں مومن کی یہ صفت ہے۔ اور اس کے برعکس وہ لوگ جو عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ (28:83) نہیں چاہتے تو وہ تو پھر جھونپڑیوں والے، حجروں والے ہو گئے، ننگ دھڑنگ ہو گئے اور انہوں نے اسے مومن کی صفت کہا!! قرآن نے بہت سے مقامات پر علوا اور علوا میں فرق کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک علوا تو بِغَیْرِ الْحَقِّ (7:146) ہوتا ہے یعنی اقتدارِ خداوندی کو چھوڑ کر یہ علوا اور برتری اور Sovereignty (اقتدارِ مطلق) حاصل کرنا۔ یہ فرعونیت ہے۔ اور دوسرا علوا وہ ہوتا ہے جسے حق کے تابع حاصل کیا جائے۔

نوعِ انسانی کی کبریائی کا راز اقتدارِ خداوندی کو اپنانے میں ہی مضمر ہے

مجھے یاد ہے کہ ایک درس میں جہاں کبریائی کی بات آئی تھی، تو وہاں دو قسم کی کبریائی تھی۔ اُس کی تفریق قرآن نے خود کر دی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (7:146) جو الحق کو چھوڑ کر یعنی اقتدارِ خداوندی کو چھوڑ کر ملک میں کبریائی اور بڑائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اپنے قانونِ مکافات کی رو سے اُنہیں راستے سے ہٹا دیں گے۔ جسے آپ صحیح معنی میں اقتدار کہتے ہیں، وہ صحیح اقتدار الحق کے ساتھ ہے، تو جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو مومنین کا ہی حق ہے۔ وہ جماعت ہی ایسی تیار کرتا ہے۔ یعنی یہ اُنہی کا حق ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

قرآن نے فَسَادًا (28:83) کہا ہے کہ مومن ایسا عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ (28:83) نہیں چاہتے، حکومت میں سیاست میں اس قسم کی قوت نہیں چاہتے کہ جس کا نتیجہ ناہمواریاں پیدا کرنا ہو۔ فساد کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (28:83) بات یہ ہے کہ اس راستے میں کتنی ہی مشکلات یا تزاحمات کیوں نہ ہوں لیکن آخر الامر یہ جو نظام ہے وہ متقین کا ہی ہوگا۔ وہ کہ جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ چیز متعدد مقامات پر بتائی ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ هُوَ

الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (9:33) یہ الدین (نظام) بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام پر غالب آ کر رہے۔ یعنی وہ تو بھیجا ہی اس لیے گیا ہے۔

نظامِ خداوندی میں انسانوں کے خودساختہ نظاموں کا ملاپ سب سے بڑا شرک ہے

اب جن کا قرآن پر یا خدا پر ایمان ہے تو وہ تو بہر حال اسے تسلیم کریں گے کہ غالب تو اسی نظام نے آنا ہے۔ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33) وہ لوگ جو نظامِ خداوندی کے ساتھ اور نظام بھی ملائیں اور کہیں کہ یہ ملے جلے نظام ہی چلیں تو خواہ اُن کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے لیکن یہی نظام جو خالص خداوندی ہے یہ غالب آ کر رہے گا۔ یہ غالب آ کر رہنا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ایمان وہ ہونا چاہیے' ذہنیت وہ ہونی چاہیے جو ابھی قرآن نے بتائی ہے۔ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ اور پھر یہ شرط جو بتائی ہے کہ وَ لَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ (28:80) اس کے لیے تزاہم وتصادم ہوگا کیونکہ کوئی اپنا ایک پیسہ بھی ایسے ہی دوسرے کو نہیں دیتا۔ وہ جو سرمایہ داری کا اتنا بڑا نظام ہے تو کیا وہ آسانی سے دوسرے کو دیدیگا؟ اور پھر یہاں نظامِ خداوندی میں یہ صورت ہے کہ مار دھاڑ لوٹ کھسوٹ نہیں ہے نظام کو بدلنا ہے' اس کی جگہ دوسرا نظام لانا ہے۔ وہ تو اس طرح غیر مرئی طور پہ بدلا جاتا ہے۔ یہ انگریزوں کے ہاں جو پُل ہوتے ہیں تو ایک ریل گاڑی وہاں سے جارہی ہوتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک نیا پُل بن گیا ہوتا ہے' پتہ نہیں وہ کیسے بن گیا ہوتا ہے! تو وہ اس طرح سے ہے کہ جس طرح سے چاند کی چاندنی صحن میں آتی ہے تو وہ اندھیرے کی چادر کو لپیٹتی چلی جاتی ہے' تو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیسے لپیٹتی چلی جاتی ہے' چاندنی ہی چاندنی ہوجاتی ہے۔ تو یہ نظام اس طرح سے آتا ہے۔ اور یہ ذہنیتوں کے بدلنے سے آتا ہے۔

ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا استحکام

قرآن نے جو کہا تھا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38) اگر تم نے ان قوانینِ خداوندی سے اعراض برتا تو وہ نظام اس کا محتاج نہیں ہے کہ تم نے اعراض برتا اور ہمارا وہ نظام ٹھپ ہو کے رہ گیا اور آگے چل ہی نہیں سکتا۔ ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ تمہاری جگہ ایک اور قوم آ جائے گی۔ اور اُس قوم کے متعلق کہا کہ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

قوموں کی تعمیر اور جہانِ تازہ کی نمود ہمیشہ فکرِ تازہ کی رہینِ منت ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہاں ایک بہت بڑا نکتہ ہے: جب تک کوئی قوم اپنی اگلی نسل اپنے جیسی پیدا کرتی چلی جاتی ہے' تو اُس میں تبدیلی نہیں

آ سکتی' وہ قرآن پہ آ ہی نہیں سکتی۔ ہمارے ہاں یہ جس کو آپ مذہب پرست طبقہ کہہ رہے ہیں' جو دین کے اجارہ دار ہیں' اُن کے ہاں تو ہزار برس سے اُسی قسم کی وہی ٹائپ چلی آ رہی ہے' اُس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ وہی ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ جن کے ہاتھوں سے تباہیاں آئی ہیں' اگر ہم آگے اُسی قسم کے پیدا کرتے چلے گئے تو وہ یہ قوم نہیں ہوسکتی جو دین کا نظام قائم کرے گی۔ ہم نے پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں قرآن کا نظام ہو۔ ہم جس قسم کی قوم وہاں تھے اُسی قسم کی قوم ہم یہاں پیدا کرتے چلے گئے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ لَا يَكُونُوٓا اَمۡثَالَكُمۡ (47:38) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تو یہ جو کہا ہے کہ یہ نئی قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی تو کیا اُس کے ماتھے پہ سینگ اُگا ہوا ہوگا؟ ہوگا یہ کہ وہ اس ذہنیت کی مالک نہیں ہوگی جس ذہنیت کے مالک تم چلے آ رہے ہو۔ وہ قوم نئی ذہنیت اور نئے ایمان والی ہوگی تو پھر اُس نظام کی ابتدا ہو سکے گی' ورنہ یہ جو اُسی قسم کی قوم چلی آ رہی ہے تو یہ تو حیوانی زندگی ہے یعنی جس قسم کی بکری چار کروڑ سال پہلے تھی تو اُسی قسم کی بکری آج ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جیسے وہ میں میں کرتی تھی ویسے ہی یہ بھی میں میں کرتی ہے۔ ''اوہدا دودھ وی جیہدا دل چاہندا سی چوہ کے لے جاندا سی' تے آج وی ایہوای حال اے''۔ ❶

عزیزانِ من! قرآن کے تو دو دو لفظوں کے اوپر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کہا ہے کہ لَا يَكُونُوٓا اَمۡثَالَكُمۡ (47:38) وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ اس طرح سے یہ دوسری قوم آنی ہے۔ یعنی تعلیم کے بدل جانے سے دل بدل جاتے ہیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو نئی نسل کی تعلیم ہمیں بدلنا چاہیے تھی۔ انہیں قرآن کی اقدار کی تعلیم دینا چاہیے تھی تاکہ یہ جب بڑے ہوتے تو ایک نئی ذہنیت لے کر یہ قوم ابھرتی۔ یہ وہ قوم ہوتی جو پچھلوں جیسی نہ ہوتی' جو ہمارے جیسی نہ ہوتی' ورنہ اگر یہ اُسی قسم کی پیدا کرنی ہے' تو اب یہ جو فرق ہے کہ صاحب! اُس زمانے میں ہم ساڑھے تین کروڑ تھے' پھر سات کروڑ ہوگئے' اُس کے بعد چودہ کروڑ ہوگئے۔ تو اس طرح بڑھتے رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کہا ہے کہ لَا يَكُونُوٓا اَمۡثَالَكُمۡ (47:38)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی کڑی شرط ہے۔ تو ہم نے یونہی ایک لفظ Generation Gap (نسلی خلا) سن رکھا ہے۔ تو یہ بالکل صحیح بات ہے کہ اگلی Generation (نسل) پچھلی Generation (نسل) جیسی نہیں ہونی چاہیے لیکن اُس سے بدتر بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر صحیح اقدار نہ دی جائیں تو بدتر تو ہو ہی جاتی ہے کیونکہ پچھلی اقدار جو چل رہی ہوتی ہیں تو نئی Generation (نسل) اُن سے تنگ آ جاتی ہے۔ جب آپ نئی اقدار نہیں دیتے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جسے ''وارقعہ لا'' کہا جاتا ہے یعنی یہ بھی غلط' یہ بھی غلط' یہ بھی غلط' اس میں یہ کمیونزم اسی وجہ سے نہیں چل سکی اور نہ ہی چل سکے گی۔

---

❶ اس کا دودھ بھی جس کا دل چاہتا تھا دھو کر لے جاتا تھا آج بھی وہی حال ہے۔

اقبالؒ کی نظر میں کمیونزم کا تجزیہ

اقبالؒ (1938-1877) نے اُس زمانے میں اِس کمیونزم کے متعلق یہ کہا تھا کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ

میں نے دیکھا ہے کہ ان کے پروگرام کی Stages (منازل ومراحل) کیا ہیں۔ اس نظام کے عملی تدریجات، مراحل، منازل، مقام کیا ہیں؟

لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

پہلے تو یہ بادشاہ کو ہاتھ ڈالتے ہیں اور یہ نیچے والے سارے ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک کر رہے ہو کیونکہ یہ ہے اصل بدمعاش۔ یہ پہلی منزل ہوئی۔ اب جب یہاں وہ صفایا کر دیتے ہیں تو پھر وہ مولوی صاحب کی طرف آتے ہیں۔ ان کے ہاں لا کلیسا ہے، پھر مذہبی پیشوائیت کی طرف آتے ہیں اور ان کے بارے میں ان نیچے والوں سے کہتے ہیں کہ (تھوڑے سے لفظی تصرف کے ساتھ)

انہیں تو ان کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

جناب تم نے بنایا، حضور تم نے کیا

تم ان کے ماتھے کے اوپر جو تقدس کا ٹیکا لگاتے تھے تو اُس سے یہ خدا کا اوتار بنتا تھا۔ اصل مجرم تو تم ہو۔ اور اُس کے بعد وہ اس اصل چیز کی طرف آتے ہیں کہ یہ جو کلیسا والے، مذہب والے تھے تو یہ کس بنا پر اس طرح سے لوگوں کے اوپر حکومت کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے نام کی آڑ میں کرتے تھے اس لیے یہ خدا کا نام بھی بیچ میں سے ہٹاؤ۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ جو ''لا'' ہے یہ تو زندگی میں خلا پیدا کرتا ہے، زندگی میں Vacuum پیدا کرتا ہے۔ زندگی ''الا'' کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے لیے کوئی Positive (مثبت) منزل ہونی چاہیئے ایک مثبت مقام ہونا چاہیے۔ صرف خالی ''لا'' کے اندر کبھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نئی عمارت استوار کرنے کے لیے پہلی بنیادیں تباہ کی جاتی ہیں۔ جب پرانے مکان میں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی وقت ڈھے سکتا ہے اس لیے اُس کو گرا دو تو کیا محض اُس کے گرا دینے سے آپ محفوظ ہو جاتے ہیں؟ کیا مکان کی چھت آپ کے اوپر آ جاتی ہے کہ پھر بیشک بارش پڑے یا دھوپ ہو اور آپ کو کوئی خطرہ ہی نہ ہو؟ وہ کہتا ہے کہ پرانا مکان اس لیے گرانا ہوتا ہے کہ اُس کی جگہ ایک پختہ محکم مکان بناؤ۔ اور اگر تم کہو کہ ہماری آخری منزل مکان کا گرا دینا ہی تھا تو یہ کافی نہیں ہے کیونکہ چھت اکھیڑ دینے سے یا بنیادیں اکھیڑ دینے یا مکان گرا دینے سے ہی زندگی کو آسائش نہیں ملتی بلکہ دوسرا مکان تعمیر کرنے سے ملتی ہے۔ اگر کسی کے فلسفہ یا نظریہ یا Theme میں ''لا'' ہی ہو تو اُس میں زندگی مطمئن نہیں ہو سکتی بلکہ

اُس کی جگہ ''الا'' کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ان کا گرانا ضروری ہے بشرطیکہ اس کی جگہ دوسرا مکان بناؤ۔ یہ جو چیز ہے یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (28:83) انجامِ کار یہ نظام قائم ہوگا۔ جو پہلے ''لا'' میں سے گزرے گا یعنی ان ساری چیزوں سے انکار کرے گا۔ انجام کار' کامرانی اور خوشگواری صرف ان کے لیے ہے جو زندگی کے ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن نے تو ایمان کی یا نظام کی بنیاد ہی یہ بتائی ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (2:256) پہلے ہر طاغوت سے انکار کرو پھر اللہ پہ ایمان لایا جاتا ہے۔ اُس میں پورا ''لا'' چاہیے پھر اُس کے بعد ایمان آتا ہے۔ اگر پرانا مکان کھڑا رہے تو کیا آپ اُس کی جگہ دوسرا نیا مکان بنا سکتے ہیں؟ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256) وہاں پھر ایک ایسی عمارت کھڑی ہوتی ہے جو ٹوٹتی نہیں ہے یا گرتی نہیں ہے۔ لاسلاطین' لاکلیسا' ان کی ذہنیت کا دیا ہوا جو ''الہ'' تھا اُس کا بھی ''لا'' اور پھر اُس کے بعد یؤمن بالله ہے۔ تو کہا کہ یہ ذہنیت لے آؤ پھر یہ نظام بنے گا۔ اس سے وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (28:83) ہوگا۔ متقین ❶ کے لیے کامرانی وخوشگواری ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے بالمقابل سوشلزم بھی نظام سرمایہ داری پر ہی استوار ہے

قرآن کہتا ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا (28:84) اُس نظام میں یہ ہوتا ہے کہ کوئی جتنا کچھ کر کے لاتا ہے اُسے اُس سے کہیں زیادہ مل جاتا ہے۔ یہاں تو انتہا یہ ہے کہ کوئی جتنا کچھ کرے اُسے اتنا ہی مل جائے تو وہ اُسے غنیمت سمجھتا ہے' یہاں تو Wages (اجرت) کے حساب سے ملتا ہے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ وہ کتنا پیدا کرتا ہے۔ یہاں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اُس کی بھوک کے ذریعے' اُسے محتاج کر کے' اُسے مجبور کر کے' اِس کے ساتھ سودا کتنے میں کیا ہوا ہوتا ہے' خواہ وہ سوشلزم ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں بھی Wages (اجرت) ہیں' بالکل ویسے ہی ہے جیسے نظامِ سرمایہ پرستی ہے:

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات ❷

اس سوشلزم میں بھی وہی سرمایہ داری کا نظام ہے جو اقبالؒ (1938-1877) نے کہا تھا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ❸

---

❶ متقین وہ ہیں جو زندگی کے ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

❷ بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں — اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات ومنات (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

❸ دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (اقبالؒ: بانگِ درا)

Wages (اجرت) کا تصور قرآنی نظام کو قائم کر ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! جہاں Wages (اجرت) ہیں تو وہاں صحیح نظام آ ہی نہیں سکتا۔ آپ مزدور سے مزدوری طے کرتے ہیں تو آپ کون ہیں جو اُس سے طے کرتے ہیں۔ دو الگ فریق ہوگئے۔ آپ اجرت طے کرتے ہیں۔ چوہا اپنی گھات میں اور بلی اپنی گھات میں۔ تم تو کم ازکم دینے کی کوشش کروگے۔ اب اگر وہ تمہاری پوزیشن میں ہے اور تمہارا احتیاج نہیں ہے تو پھر وہ سامنے سے اکڑے گا کہ میں اس میں آنے کو تیار نہیں ہوں۔ پھر پنجابی کا محاورہ آ گیا کہ ''بھاکن وگاڑیا' رات دیاں بھوکیاں نیں''۔ جس مزدور کے بچے گھر میں بھوکے ہوتے ہیں تو وہ کوئی شرط عائد نہیں کرسکتا کہ میں اتنے پہ نہیں جاؤنگا۔ اُن کی بھوک اُسے مجبور کرتی ہے کہ جس قیمت پہ چاہے وہ لے جائے۔ اس منڈی میں نہیں ملتا تو کسی اور منڈی میں جاؤ۔ وہ یوں نیلام ہو رہا ہے۔

آج کا دَور بھی Export of Men (انسانوں کی برآمد) کا دَور ہے

ہم پرانے زمانے کے غلاموں (Slaves) کو تو دیکھتے ہی تھے کہ وہ افریقہ سے پکڑ کر' جہازوں میں لاد کر' امریکہ لے جاتے تھے۔ اگلے دن اخبار میں ایک سرخی آئی تھی' اسے پڑھ کر کلیجہ شق ہو کر رہ گیا۔ ہمارے ہاں سے یہ جو لوگ اب باہر کے ممالک میں کام کرنے کے لیے جا رہے ہیں تو اُس کے لیے اخبار میں عنوان تھا "Export of Men" (انسانوں کی برآمد)۔ اس سے پہلے اجناس یا جنس کو تو ایکسپورٹ (برآمد) کیا جاتا تھا لیکن آج انسانوں کو ایکسپورٹ (برآمد) کیا جا رہا ہے۔ یہ کیا ہے کہ ''بھاکن وگاڑیا' رات دیاں بھوکیاں نیں''۔ یہ کہنا کہ صاحب! جس مزدوری پہ یہ راضی ہوا تھا ہم تو اسے اُس کے اوپر لے کر آئے ہیں' اس کا نام رضامندی ہوتا ہے۔ آپ کی سوشلزم بھی آپ کو Wages (اجرت) ہی دے رہی ہے۔ وہاں بھی دو طبقے ہیں۔ ایک وہ جو Wages (اجرت) دیتے ہیں اور ایک وہ جن کو Wages (اجرت) دی جاتی ہیں۔ تو وہ کہاں آیا جو قرآن کہتا ہے کہ **فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ** [1] (16:71)۔

قرآنِ حکیم نے کسی انسان کے لیے محنت کش یا مزدور کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا

عزیزانِ من! ایک عجیب بات سنیے۔ قرآنِ کریم میں محنت کش یا مزدور کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اِس کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو سارے انسانوں کو محنت کش کہتا ہے۔ **وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی** (53:39)۔ جو محنت کش نہیں ہے وہ انسان نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہاں دو طبقے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ محنت کشوں کی ویلفیئر (بہبود) کے لیے یہ کیا جاتا ہے' وہ کیا جاتا ہے۔ جیسے اب گداگروں کے لیے کچھ مکان وغیرہ بنا رہے ہیں' اُس کا نام دارالرحمت رکھ رہے ہیں۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ

---

[1] وہ سب لوگ خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہوسکیں۔ (30:28) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 610)۔

قرآن کے اندر انقلاب کیا ہے۔ قرآن میں یہ طبقے ہی نہیں ہیں۔ جہاں آپ کسی کو محنت کش کہیں گے تو وہاں کوئی دوسرا طبقہ ہوگا جو محنت کرنے والا نہیں ہوگا۔ بس جہاں آپ نے یہ دوسرا طبقہ Create (پیدا) کیا تو پھر نظام ختم ہوا۔ اسی کا نام سرمایہ داری ہے خواہ وہ روس میں ہو، چین میں ہو یا انگلینڈ میں ہو یا امریکہ میں ہو۔

قرآنِ کریم کے نزدیک جو انسان محنت نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ **وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39)۔ جو محنت نہیں کرتا، وہ انسان ہی نہیں ہے، اُس کو کچھ مل ہی نہیں سکتا۔ قرآن میں دو طبقے نہیں ہیں بلکہ سارے انسان محنت کرنے والے ہیں۔ کہا ہے کہ **مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا** (28:84) اُس نظام کے اندر جو بھی ایسے کام کرتا ہے جن سے اُن کا توازن قائم رہتا ہے، تو وہ جتنے کام کرتا ہے اگر ضرورت اُس سے زیادہ ہے تو اُس سے زیادہ اُس کو مل جاتا ہے لیکن **وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (28:84) اب وہ جو ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اُن کے حصے کے اندر ان کی ناہمواریاں Perpetuate (دائمی) ہو جاتی ہیں، مستقل ہو جاتی ہیں۔

نظام سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ طبقاتی تقسیم کے باعث تباہی ہے

نظامِ سرمایہ داری میں بھی وہ چیز تھی اور

طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی ❶

وہاں بھی وہ طبقاتی چیز موجود ہے۔ اور اُس کے بعد وہ کہتا ہے کہ **مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (28:84) جب وہ گرتے ہیں تو ان کے ہی اعمال تباہیاں اور بربادیاں بن کر ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ قرآن میں مکافاتِ عمل کے نتیجے میں وہ چیز ہوتی ہے۔ ایک تو سزا ملتی ہے کہ ایک مجرم کو جیل خانے میں دیدیا، اُس کو ہنٹر لگا دیئے یا پھانسی دیدیا۔ یہ سزا خارج سے مل رہی ہوتی ہے۔ یہ ہوتا ہے لیکن مکافاتِ عمل یہ ہے کہ **جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (32:17) جو کچھ کرتے تھے اُس کی وجہ سے ان کی تباہی ہوئی۔ یہاں آیا ہے کہ **مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (28:84) ان کا وہ نظام ہی تباہی تھا اس لیے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

نبی اکرم ﷺ کو کامیابی کی نوید

یہ قرآنِ مجید بڑی لطیف کتاب ہے۔ کہا کہ اُس کے اوپر تباہی کہیں اور جگہ سے نہیں آئی، اُس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ نظام خود ہی تباہی

---

❶ زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں ہو پھر کیا! طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی (اقبالؒ: بالِ جبریل)

تھا۔ قارون، فرعون، ہامان کی داستانیں بیان کرنے کے بعد اب آخری آیات آ رہی ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی آخری آیات میں قرآن اُن کا ملخص دہرا دیتا ہے۔ یہ بات تو حضور اکرم ﷺ کے سامنے لوگوں سے ہو رہی ہے، انہیں یہ نظام بتایا جا رہا ہے۔ کہا کہ ہم نے فرعون کی باتیں، ہامان کی باتیں اور قارون کی باتیں بتائیں۔ ہمیں پتہ ہے کہ آج بھی اسی قسم کے فرعون بھی ہیں، ہامان بھی ہیں، قارون بھی ہیں اور اُن کے ساتھ ٹکراؤ بھی ہے، تمہیں مصیبتیں بھی جھیلنی پڑ رہی ہیں حتیٰ کہ انہوں نے تمہیں اپنے گھر بار سے بھی نکال دیا ہے۔ یہ منازل بڑے صبر آزما ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، ہم جانتے ہیں لیکن گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ (28:85) ہم نے تمہارے متعلق یہ طے کیا، تمہارے اوپر قرآن کی اطاعت یا یہ نظام ہم نے فرض کیا ہے۔ تم یہ کرتے رہو۔ پھر کہا کہ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (28:85) جہاں سے انہوں نے نکالا تھا، وہیں جاؤ گے اور فاتح اور منصور حیثیت سے وہاں جاؤ گے۔ اطمینان رکھو۔ کہا کہ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡہُدٰی وَ مَنۡ ہُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (28:85) یہ جو فیصلے ہیں یہ تمہاری مرضی کے مطابق، تمہاری منشا کے مطابق، تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہیں ہوتے۔ وہ جانتا ہے کہ کونسا مسافر منزل کی طرف جا رہا ہے، کونسا وہ ہے جس کی پیٹھ منزل کی طرف ہے اور دوسری طرف اُس کا قدم اُٹھ رہا ہے۔ تم نے مجھے کمزور جان کر مکے سے نکال دیا اور تم وہاں مالک بن کر بیٹھے ہوئے ہو۔ خدا کا گھر کہتے ہو اور خود اُس کے مالک بن کر بیٹھے ہوئے ہو لیکن وہ جانتا ہے کہ تمہارا قدم کس طرف اٹھ رہا ہے اور میرا قدم کس طرف اُٹھ رہا ہے۔ پردہ اٹھنے کی دیر ہے، تم دیکھو گے کہ میں وہاں ہونگا اور تم وہاں نہیں ہو گے۔ اور جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (32:17) یہ بات باہر سے نہیں آئے گی بلکہ تمہاری تہذیب آپ ہی اپنے ہاتھوں سے خودکشی کرے گی۔ وہ اس لیے کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس لیے کہ میرا خدا یہ جانتا ہے۔ اس سورۃ کی آیات تو تین ہی باقی رہ گئی ہیں لیکن وقت ہو گیا ہے۔ اور آخر میں قرآنِ کریم وہ ملخص لے آیا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھیں۔

عزیزانِ من! سورۃ القصص کی آیت 85 تک ہم آ گئے، 86 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

چودھواں باب: سورۃ القصص (آیات 86 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا
لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1979ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القصص کی آیت 86 سے ہو رہا ہے: (28:86)۔

داستانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم علیہ السلام کی کشمکش حیات میں باہمی مماثلت اور کامرانیوں کی نوید

سابقہ آیات میں سلسلہء کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ پہلے داستان صاحب ضربِ کلیم اور اُس کے مقابلے میں تین تخریبی عناصر یعنی فرعون کی ملوکیت، ہامان کی مذہبی پیشوائیت اور قارون کی سرمایہ داری تھی۔ اُس کشمکش میں بھی ہزار تکالیف اور صعوبات کے بعد کامیابی حضرتِ موسیٰ کو ہی ہوئی تھی۔ اور اُنہوں نے پھر فرعون کے پنجہء استبداد سے رستگاری کے بعد سینا کے علاقوں میں بنی اسرائیل کی آزاد مملکت قائم کر لی تھی۔ قرآنِ کریم میں ویسے تو جتنے انبیائے کرام علیہم السلام گزرے ہیں اُن میں یہ چیزیں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہیں۔ اُن کی زندگی اِسی قسم کی کشمکش کی زندگی تھی لیکن خاص طور پہ حضرتِ موسیٰ کے متعلق قرآن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی داستان حضرتِ موسیٰ کی داستان سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اِسی قسم کا یہ سارا ٹکراؤ تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء رضی اللہ عنہم کی جماعت کا پہلے مکی زندگی میں قریش کے ساتھ تھا، پھر اُس کے بعد مدنی زندگی میں قریش بھی اور یہ اہلِ کتاب بھی جنہیں آپ مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تصور کر لیں، ان کے ساتھ رہا۔ یہ زندگی تصادمات سے ہی بھری ہوئی تھی۔ مکی زندگی میں تو اِس قدر صعوبات، مشکلات، دشواریاں، تکالیف اور مصائب برداشت کرنے پڑے کہ بالآخر وطن بھی چھوڑنا پڑا۔ مدنی زندگی میں مسلسل سات سال تک لڑائیاں

پڑیں۔ اِس دوران میں اس چیز کا احساس آ جاتا ہے کہ معلوم نہیں کہ یہ ساری زندگی ان کشمکشوں میں گزر رہی ہے' آخر الامر اِس میں کامیابی بھی ہوگی یا نہیں ہوگی۔ یہ ساری داستانیں بیان کرنے کے بعد یہ کہا گیا کہ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ (28:85) خدا نے تمہارے اوپر قرآن کے مطابق پروگرام کا فریضہ عائد کیا ہے اور کہا ہے کہ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (28:85) گھبراؤ نہیں۔ جہاں سے انہوں نے تمہیں اور تمہاری جماعت کو اس انداز سے نکال دیا تھا تم آخر الامر وہاں لوٹ کر جاؤ گے' تمہیں یہ کامیابی ہوگی۔ اس لیے قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی وَ مَنۡ هُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (28:85) ان سے کہہ دو کہ یہ انسانی قیاسات کی بات نہیں ہے' میرے نشوونما دینے والے کا قانونِ مکافات جانتا ہے کہ کون صحیح پروگرام پہ چل رہا ہے اور صحیح پروگرام پہ چلنے والا منزلِ مقصود پہ پہنچ کر رہتا ہے۔ اور خدا جانتا ہے کہ کون غلط راستوں پہ چل رہا ہے۔

مقامِ نبوت اور علم انسانی میں مابہ الامتیاز بنیادی چیز

عزیزانِ من! یہ بات جو قرآن کہہ رہا ہے کہ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (28:85) یقیناً تم وہاں لوٹو گے جہاں سے تمہیں نکال دیا گیا ہے تو یہ وہ خدا کہہ رہا ہے جو ہر راہرو کے متعلق جانتا ہے کہ اِس کا قدم منزل کی طرف اٹھ رہا ہے یا اِسے منزل سے دُور لیے جا رہا ہے۔ ہم جو تمہارے متعلق کہہ رہے ہیں کہ تم وہاں پہنچ کر رہو گے تو یہ قیاس نہیں ہے۔ یہ اُس خدا کی طرف سے کہا جا رہا ہے جو ہر راہرو کے ہر قدم کے متعلق جانتا ہے کہ وہ کس طرف کو اُٹھ رہا ہے۔ یہ بہت بڑی تسکینِ خاطر یا بہت بڑے اطمینان کی بات تھی جو یہاں کہی گئی اور اُس کے بعد اُس کی دلیل دی گئی۔ یہ بڑی اہم دلیل ہے اور وہ تو حقیقت میں نبوت اور دوسرے انسانی علم کے اندر مابہ الامتیاز چیز ہے۔ اس لیے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں' تم ذرا سوچو کہ وَ مَا کُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡکَ الۡکِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّکَ (28:86) یہ جو پروگرام یا ضابطۂ قانون یا ضابطۂ ہدایت ہے' جس کے مطابق تم یہ کام کر رہے ہو' یہ تمہارا اپنا وضع کردہ تو ایک طرف' تمہیں تو اِس سے پہلے اِس کی توقع تک نہیں تھی' امید تک نہیں تھی' تمہارے خیال میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ تمہیں خدا کی طرف سے یہ ضابطۂ ہدایت دیا جائے گا۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے جو وحی یا نبوت اور علمِ انسانی میں بنیادی طور پر امتیاز کرتی ہے کہ انسان کا ہر علم اُس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے' کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ علمِ انسانی مطالعہ سے' تجربہ سے' مشاہدہ سے' تعلیم سے' کسی سے کچھ سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اُس میں اپنی کاوش اور کوشش ہوتی ہے۔ اُس کے بغیر وہ علم حاصل نہیں ہو سکتا اور جب یہ کوشش ہوتی ہے اور انسان ایک پروگرام کے مطابق علم حاصل کر رہا ہوتا ہے تو اُس کو ہر روز پتہ ہوتا ہے کہ میں اب آگے گیا یا وہیں کھڑا ہوں' اب پہلی جماعت ہے' اب دوسری جماعت آ گئی' اب تیسری آ گئی' اب میٹرک ہو گیا' کالج میں چلا گیا' ایم اے ہو گیا' پی ایچ ڈی ہو گیا۔ ہر روز اندازہ لگاتا ہے۔ اور

یہ جو بچوں کے امتحان ہوتے ہیں تو وہ تو اسی اندازے کے لیے ہوتے ہیں کہ اُس نے حصولِ علم میں کس حد تک ترقی کی ہے اور ہر علم حاصل کرنے والا جانتا ہے کہ میں نے کتنا علم حاصل کر لیا ہے' کتنا ابھی باقی ہے اور مجھے کیا کچھ کرنا چاہیئے' اُسے روز معلوم ہوتا ہے لیکن ایک علم وہ ہے جو انسانی کاوش اور کوشش کے بغیر از خود خدا کی طرف سے اُسے دیا جاتا ہے جسے نبی کہتے ہیں۔ تو اُس کی محنت اور کاوش تو ایک طرف' اُسے ایک دن پہلے بھی اِس کا علم نہیں ہوتا کہ مجھے یہ علم ملنے والا ہے۔ یہ ہے وحی اور علمِ انسانی میں فرق۔ یہاں تو یہ کہا ہے کہ تم تو کبھی اِس کا خیال تک بھی نہیں کر سکتے تھے' تمہیں اِس کی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ خدا کی طرف سے تمہیں یہ ضابطۂ ہدایت ملے گا۔ یہ تو خدا کی طرف سے مراحمت ہے۔ وہی رحمت کا لفظ جو میں کہا کرتا ہوں کہ عربوں کے ہاں اور قرآنِ کریم میں اُس طریقِ نشو ونما کے لیے بولا جاتا ہے جس میں اُس انسان کی اپنی کاوش کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ مرحمت کے طور پہ ہی عطا ہو۔ کہا کہ یہ تو اِس طرح سے تمہیں عطا ہوا ہے۔ دوسرے مقام پہ اِس سے بھی واضح الفاظ میں کہا گیا۔

نبوت سے قبل نبی کی شخصیت

نبوت کے متعلق یہ بڑی خصوصیتِ کبریٰ ہے کہ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (42:53) اِس کتاب کا اور اِس علم کا حاصل کرنا تو ایک طرف' تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور الکتاب کیا ہوتی ہے۔ اور اُس کے فوری بعد خدا کی طرف سے اِس علم کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ یہ ہے نبوت۔ یہ علم جو ملتا تھا اِس میں انسان کی اپنی محنت' ہنر' کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا' اُسے اِس کا خیال تک نہیں ہوتا' آرزو تک بھی نہیں ہو سکتی۔ اب ملتا تھا کہیں گے کیونکہ اب وہ سلسلہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا۔ یہ علم جو تھا اِسے وحی کہا جاتا تھا اور یہ تھا جو اِس انداز سے ملتا تھا کہ جسے یہ علم ملنے والا ہوتا تھا' اُسے ایک دن پہلے تک اِس کا احساس' خیال' قیاس' گمان' وہم تک نہیں ہوتا تھا کہ مجھے نبوت ملنے والی ہے۔ یہ ایک Exceptional (استثنائی) چیز تھی۔ نبی کے علاوہ باقی انسانوں کو جو علم ملتا ہے اُس کا ہر انسان کو پتہ ہوتا ہے کہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ نبوت ایسی چیز تھی کہ اُس میں انسان کے اپنے عقل و فکر کا دخل ہی نہیں تھا۔ یہاں تو مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) ہے یعنی یہ نبی تمہیں جو کچھ خدا کی طرف سے کہتا ہے یہ وحی ہے' یہ اپنے خیالات کی بات نہیں کر رہا۔

ہزار کوشش کے باوجود انسانی تصورات دل کی رنگینی سے مُبرّا نہیں ہو سکتے

یہ ایک بہت بڑی استثنائی (Exceptional) چیز تھی جو نبوت کی تھی۔ پوری انسانیت کی تاریخ میں نبی کے سوا کسی کو یہ بات حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو خدا کی طرف سے اِس طرح ہدایت یا علم ملتا تھا اُس میں انسانی جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا'

ورنہ کتنی ہی کوشش انسان کیوں نہ کرے جو بات بھی اُس کے دل سے نکل کر باہر آئے گی تو دل کی رنگینی کی کوئی نہ کوئی آلائش اُس کے اندر ضرور شامل ہو جائے گی۔ انسان کے لیے جذبات سے یکسر الگ ہو جانا ناممکن ہے۔ اور وحی کا قانون یا وحی کی ہدایت وہ ہونی چاہیے جس میں انسانی جذبات کا کوئی دخل نہ ہو' اُس کے میلانات کا کوئی دخل نہ ہو۔ یہ ہے فرق جو نبوت اور انسانی علم میں ہے۔ اور یہی چیز تھی جو کہی گئی کہ اگر یہ پروگرام تمہارا اپنا وضع کردہ ہوتا' اپنا مرتب کردہ ہوتا تو اُس کی تو صورت یہ ہوتی کہ ہوسکتا تھا کہ تم نے مرتب کیا ہو اس لیے اس میں کوئی غلطی رہ جائے اور اُس کی تصحیح کر لی جائے' اِس میں تبدیلیاں کر لی جائیں' دشمنوں کے ساتھ مفاہمت کر لی جائے۔ کہا کہ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ پروگرام تو تمہارا وضع کردہ ہے ہی نہیں' یہ تو تمہیں دیا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ (28:85) خدا نے اس قرآن کو تمہارے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے۔ تو گویا نبی کا فریضہ خدا کے عطا کردہ یا مرتب کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہونا اور اُسے نافذ کرنا ہوتا تھا' اُس کے مطابق کام کرنا۔ یہ خاصہءِ نبوت تھا۔ اس لیے نبی جب قوانینِ خداوندی کو نافذ کرتا تھا تو وہ نبی اپنا کوئی حکم نہیں منواتا تھا۔

عقلِ انسانی کے مقام اور وحی کی رفعت میں ایک بنیادی فرق ہے

یہ ہے وہ خصوصیت جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح انسانی آزادی ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ کسی انسان کو اِس کا حق حاصل نہیں کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اِس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم ہو جاؤ' خواہ اُسے ضابطہ قوانین دیا گیا ہو' خواہ اُس کے پاس حکومت کے اختیارات ہوں' خواہ اُس کو نبوت ہی کیوں نہ دی گئی ہو۔

کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس

یعنی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور مطیع نہیں ہوسکتا۔ یہ شرفِ انسانیت کے خلاف ہے' احترامِ آدمیت کے منافی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ اسی لیے قانون سازی کا حق کسی انسان کو دیا ہی نہیں گیا۔ یہ ہے جسے صحیح انسانی آزادی کہیں گے۔ نبی جو سب سے پہلے حکومتِ خداوندی قائم کرتا تھا' اُس نبی کے متعلق ہے کہ وہ یہ کہتا تھا کہ میں یہ اپنے احکام نہیں دے رہا بلکہ یہ تو خدا کے دیئے ہوئے احکام تم تک پہنچاتا ہوں اور اُنہی کو نافذ کرتا ہوں اور اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (6:163) سب سے پہلے میں اپنے اوپر نافذ کرتا ہوں۔

قرآنی نظام میں شرفِ انسانیت کے مقامِ بلند کا راز مضمر ہے

یہ ہے نظامِ اسلامی کا صحیح نقشہ کہ نبی کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سے اپنا حکم منوائے۔ اسی لیے یہ کہا کہ یہ پروگرام تیرا اپنا وضع کردہ نہیں ہے کہ اِس کے متعلق تمہیں شک وشبہ ہو کہ آخر میں مجھے کامیابی ہوگی یا نہیں' یا کوئی مفاہمت ہی راستے میں کر لی جائے' یا اسے تبدیل ہی کر لیا جائے۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ میں بغیر تمثیل کے یہ عرض کرونگا کہ جیسے ٹرین کے ڈرائیور کو پہلے سے چارٹ ملتا ہے کہ تم نے اِس اسپیڈ سے جانا ہے' فلاں اسٹیشن پہ رکنا ہے' فلاں جگہ رفتار کم کرنی ہے' اگر وہاں سگنل ڈاؤن نہیں ہے تو تمہیں یہ کرنا ہے۔ وہ پہلے سے اُس کو چارٹ ملتا ہے۔ وہ اُس ٹرین کو اُس چارٹ کے مطابق چلا رہا ہوتا ہے۔ اُس میں اُس کے اپنے فیصلے یا عمل دخل کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ میں ویسے ہی سمجھانے کے لیے ایک بات کہہ رہا ہوں کہ وہ پروگرام جو کسی دوسرے کی طرف سے ملے تو اُس کو اِس طرح نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ جو حکومتِ خداوندی کا پروگرام تھا اسے یہ نبی بھی اسی طرح نافذ کرتا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ارشادِ خداوندی

اِسی لیے قرآنِ کریم میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم تو ایک طرف رہے' میں بھی اگر قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی اُس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ یہ عظیم انقلابی چیز ہے جو قرآنِ کریم نے کہی ہے۔ ہم نے ان ہزار سالوں کے اندر انسانوں کے ساتھ انسانوں کے ہاتھوں جو کچھ کیا ہے' ابلیس کے ہاتھوں وہ کچھ نہیں ہوا ہوگا جو خدا کے نام کے اوپر انسانوں نے انسانوں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن خدا کا دیا ہوا پروگرام تو یہ تھا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس آیت کے اوپر بار بار سوچیے گا۔ نبی کو بھی اِس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ وہ تو خود بھی خدا کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی اُن کی اطاعت کراتا ہے۔ عزیزانِ من! اس سے انسانیت کو کتنی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے!

انسانیت پر مذہبی پیشوائیت کے فتوؤں کا راج ظلم واستبداد کی بدترین شکل ہے

مذہبی پیشوائیت کیا کرتی ہے؟ یہ کہ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) مذہبی پیشوائیت خود اپنے ہاتھوں سے قانون وضع کرتی ہے' فتویٰ اپنے ہاتھ سے لکھتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور تمہیں اِس کو ماننا پڑے گا۔ کیا بات ہے قرآن کی کہ وہ یہ چیزیں بیان کر جاتا ہے! کہ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ میرا فتویٰ ہے لہٰذا اسے مانیے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے اس لیے اسے مانیے۔ اور خدا کا حکم نہ مانیے تو پھانسی پہ لٹکا دیا جائے گا۔ آپ غور کیجیے کہ اِس میں کتنا بنیادی فرق ہے۔ یہ جو خود لکھ کر اِسے خدا کے نام پہ منوانا ہے اِسے تھیوکریسی (Theocracy) کہتے ہیں۔ یہ استبدادِ انسانیت کی بدترین شکل ہے۔

ظالم مستبد حاکم کوئی چیز کرتا ہے تو اُس کے خلاف طبیعت میں ایذا اٹھتی ہے' بغاوت اٹھتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی اُس کا اپنا ضمیر بھی اُسے ملامت کردے لیکن جو شخص کسی ایک چیز کو خدا کے نام پہ نافذ کرتا ہے' اگر وہ خود سچ مچ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ یہ خدا ہی کا ہے تو اتنا بڑا شخص جو ایک بات کو نہیں سمجھ سکتا تو وہ جاہلِ مطلق ہے' وہ خدا کے نام پہ دنیا میں جو کچھ کرے گا وہ ظاہر ہے۔ اور اگر وہ یہ دانستہ کرتا ہے تو اِس سے بڑی استبداد کی شکل کوئی نہیں ہوسکتی۔ جو سچ مچ اِسے یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ یہ فریضہ ہے تو وہ اِسے جہاد قرار دیدیتا ہے۔ استبداد اُن سے بھی زیادہ ظالمانہ کرتا ہے جو نمرود [1] اور فرعون [2] نے کیے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ اُن کے دل میں تو شاید کبھی خیال پیدا ہو ہی جاتا تھا' فرعون نے بھی تو آخری دم میں توبہ کر ہی لی تھی لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ ہم غلط کر رہے ہیں۔ یہ اِسے جہاد قرار دیتے ہیں' فریضہء خداوندی قرار دیتے ہیں اور اپنے استبداد پر خوش ہوتے ہیں۔ اور کوئی اُس کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکتا کیونکہ وہ کہتے کہ یہ تو احکامِ خداوندی ہیں جو ہم نافذ کر رہے ہیں۔

فرعون کی داستان کے ذکر کے بعد ہامان کے تذکرے کا مقصدِ عظیم

یہاں پتہ چلتا ہے کہ قرآن فرعون کو تو پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور آگے ساری داستان ہامان اور موسیٰ کے ٹکراؤ و تصادم کی ہے۔ تو کہا کہ تمہیں اِس کے متعلق گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارا اپنا پروگرام نہیں ہے۔ تم تو اِس کو صرف Execute (نافذ) کرنے پر مامور ہو۔ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ (28:85) یہ تمہارا پروگرام نہیں ہے بلکہ ہم نے تم پہ یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ قرآن کے مطابق یہ سارا پروگرام پورا کرو۔ اس لیے اس میں گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں ہے' نہ ملامت کی کوئی بات ہے' نہ تمہیں کھڑے ہو کر سوچنے کی بات ہے کہ یہ ناکام رہ جائے گا۔ یہ تو ہم نے ایک فریضہ تمہارے ذمہ عائد کیا ہے۔

معاشرتی طور پر انسانیت کے لیے وحی کی اقدار قوانینِ فطرت کی طرح اٹل بھی ہیں اور نتیجہ خیز بھی

قرآن کہتا ہے کہ وَ مَا کُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡکَ الۡکِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ ظَہِیۡرًا لِّلۡکٰفِرِیۡنَ (28:86) اگر تمہارا اپنا پروگرام ہوتو اپنی مرضی سے جس کے ساتھ جی چاہے دوستی کرو یا دشمنی کرو یا رفاقت کرو۔ ٹھیک ہے کیونکہ یہ تمہارا پروگرام ہے لیکن جب ہمارا پروگرام ہے اور تم صرف اِس کو Execute (نافذ) کرنے کے لیے مامور ہو تو تمہیں کیا حق

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور: ادارہ طلوعِ اسلام' رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 216 (فٹ نوٹ 3)

[2] اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ: ادارہ طلوعِ اسلام' رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 119 تا 122 نیز فٹ نوٹ (ص۔ 119)

حاصل ہے کہ جو اِس سے انکار کرتا ہے یا سرکشی کرتا ہے اُس کے ساتھ رفاقت کے تعلقات یا حمایت کے تعلقات یا مددگار ہونے کے تعلقات قائم کرو۔تم کر ہی نہیں سکتے۔ باقی رہے یہ لوگ تو کہا کہ **وَ لَا یَصُدُّنَّکَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْکَ وَ ادْعُ اِلٰی رَبِّکَ** (28:87) یہ قوانین تو فطرت کے قوانین کی طرح ہیں۔قوانینِ فطرت کے راستے میں کوئی رکاوٹیں کھڑی نہیں کر سکتا۔اسی طرح سے یہ قوانین بشرطیکہ اس قرآن کے مطابق تم ان کو نافذ کرتے چلے جاؤ' تو یہ راستے میں روک نہیں بن سکیں گے۔ ہاں البتہ روک بننے کی کوشش تو کریں گے۔

خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ

قرآن نے مذہبی پیشوائیت کے متعلق کہا ہے کہ ان کی کیفیت **یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** [1] (7:45) کی ہے اور **لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ** (9:34) خود کوئی کمائی نہیں کرتے بلکہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا جاتے ہیں اور **یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** (7:45)۔ کہتے یہ ہیں کہ ہم خدا کے راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتے ہیں۔ حقیقت میں ہوتا یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں یہی سب سے بڑی روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی روک خود کرتے ہیں اور اِس قسم کے استبداد والوں کو مطمئن کرتے ہیں کہ یہ بڑا خدائی فریضہ ہے جو تم ادا کر رہے ہو' یہ جو ہو رہا ہے یہ جہاد ہے۔ یہاں **یصدون** آیا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قرآن کیا کہتا ہے کہ یہی ہیں جو راستے میں روک بن کر کھڑے رہتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ یہ تمہارے راستے میں روک بن کر نہیں کھڑے ہو سکیں گے بشرطیکہ تم قرآن کے مطابق یہ کچھ کرتے چلے جاؤ۔ باقی رہا یہ کہ تمہارا فریضہ کیا ہے تو یہ اگلی بات ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان کے مایوس ہونے کی وجہ

میں پہلے بھی کہا کرتا ہوں کہ ہم اُس وقت مایوس ہو جاتے ہیں جب ہم کوئی ایسی ذمہ داری اپنے اوپر خود عائد کر لیتے ہیں جو ہماری ذمہ داری ہوتی ہی نہیں ہے۔ خود ہی اُسے عائد کر لیتے ہیں۔ اُس میں ناکامی ہوتی ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے جو قرآن نے بار بار کہا ہے کہ تمہارا فریضہ یہ نہیں کہ تم اپنی زندگی میں اِس نظام کو ضرور قائم کر کے جاؤ بلکہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اِس چیز کو پہنچاتے چلے جاؤ۔ یہ نظام زبردستی قائم کیا ہی نہیں جائے گا' کرھاً کسی سے منوایا ہی نہیں جائے گا۔

---

[1] وہ خدا کی طرف لے جانے والی راہ میں روک بن کر کھڑے ہیں۔

صبر واستحقام کی آبیاری کے لیے باہم پرواز کے لیے دو پرندوں کی ایک لازوال مثال

یاد کیجیے گا جو میں نے کبھی کہا تھا اور اس کو پھر دہرا دوں کہ ایمان "Inner Urge" (اندرونی تقاضا) کو کہتے ہیں۔یعنی اندر سے ایک تقاضا اٹھتا ہے اور جو تقاضا اندر سے اٹھتا ہے اُس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔آپ کو ایک مثال یاد دلاؤں جو میرا خیال ہے کہ آپ پہ بھی گزر رہی ہوگی۔ہم میں سے بہت سوں پر وہ گزرتی ہے اور انہی دنوں گزرتی ہے اور مجھ پہ تو ہر سال ہی گزرتی ہے اور آپ پہ بھی گزرتی ہوگی۔ یہ جو بہار کا موسم آتا ہے تو یہ جو چڑیاں ہیں' ان کا Mating Season (جُفتی رُت) ہو جاتا ہے' انہوں نے بچوں کے انڈے دینے ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے انہوں نے گھونسلہ بنانا ہوتا ہے۔ایک تو انہی دنوں میں وہ آپس میں کوئی رفاقت کا معاہدہ کرتے ہیں۔یعنی ایک چڑا اور ایک چڑیا اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ اس طرح کا جوڑا نہیں ہوتا بلکہ وہ الگ الگ رہتے ہیں لیکن اُس وقت وہ ''اندر کا تقاضا'' ہوتا ہے اور وہ اندر کے تقاضے سے ''نکاح'' کرتے ہیں۔ پھر وہ کمرے کے اندر کوئی جگہ تلاش کرتے ہیں۔ وہاں آ کر ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے لاتے ہیں۔ چڑیا کمزور ترین پرندہ ہوتا ہے۔ایک ایک تنکا کہیں سے وہ چن کر لاتے ہیں اور وہاں لا کر وہ اکٹھا کرتے ہیں۔ چونکہ اُن کا پروگرام بڑا لمبا ہوتا ہے یعنی گھونسلہ بنتا ہے' پھر انڈے دیتے ہیں' پھر بچے نکلتے ہیں اور جب تک بچے بڑے نہیں ہو جاتے ہیں' وہ وہیں رہتے ہیں۔ ہر وقت وہ چیں چیں چوں چوں کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال وہ میرے کام میں مخل ہوتے ہیں اس لیے میں وہ گھونسلہ نہیں بننے دیتا۔ ہر شخص اپنے مفاد میں دوسرے کا گھر اجاڑتا ہے۔ چڑیا مجھ سے کمزور ہوتی ہے میں اُس کا گھر اجاڑ دیتا ہوں' جو مجھ سے زبردست ہے وہ میرا گھر اجاڑ دیتا ہے۔ یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔کیفیت یہ ہے۔آپ کو بھی تجربہ ہوگا کہ وہ جو تنکے ہوتے ہیں اُن کو آپ اتار لیجیے۔ وہ آ کر دیکھتے ہیں اور مجال ہے کہ جو مایوس ہو جائیں۔ وہ پھر اپنے کام میں شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر اُسی طرح سے ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے شام تک پھر وہ گھونسلہ ویسے ہی بنا ہوا ہوتا ہے۔ اُس کو اجاڑ دیتا ہوں تو صبح کو وہ پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلسل رہتا ہے۔ایک ایک تنکا اکٹھا کرنے کے لیے پتہ نہیں اُن کو کتنے میلوں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ایسا نظر آتا ہے کہ ان دنوں ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں۔ انہیں کون کہتا ہے کہ گھونسلہ بناؤ۔ بار بار اجڑے گا تو بار بار بناؤ' ایک ایک تنکا چن کر لاؤ' یہ اجاڑتے ہیں اجاڑنے دو' یہ تمہارے راستے میں کھڑے نہیں ہو سکتے تم پھر جاؤ۔عزیزانِ من! اسے ایمان کہتے ہیں۔

بس یہ ایمان ہے۔ اگر اس حد تک اندر کا تقاضا نہیں ہے تو یاد رکھیے! آپ مسلمان تو ہو سکتے ہیں لیکن مومن نہیں ہو سکتے۔قرآن نے کہا تھا کہ ان صحرا نشین بدوؤں سے کہو کہ اپنے آپ کو ابھی مومن نہ کہیں بلکہ کہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) یہ ایمان ابھی ان کے دل کا تقاضا نہیں بنا۔ یہ ہے Inner Erge (اندرونی تقاضا)۔ چڑیا

جیسا ایک کمزور اور ناتواں سا پرندہ جسے چھی کیجیے تو وہ اڑ جاتا ہے' اُس کی کیفیت یہ ہے کہ بار بار صفائی کیجیے' وہ پھر سے نیا گھونسلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اِس کی پرواہ ہی نہیں کرتے' مایوس ہی نہیں ہوتے' تنگ نہیں ہوتے' زچ نہیں پڑتے' زچ نہیں ہوتے۔ پھر سے جاتے ہیں اور ایک ایک تنکا اٹھا کر لاتے ہیں۔ اسی کو صبر کہتے ہیں' اسی کو استقامت کہتے ہیں۔ یہی تو قرآن نے شرط قرار دی تھی کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** (41:30)۔ یہ اعلان کر دینا یا کہہ دینا یا دل میں یہ تقاضا ہونا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور اُس کے اوپر پھر اس طرح استقامت سے جم کر کھڑے ہو جانا' تو **تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ** (41:30) اُن پہ فرشتے اترنے شروع ہو جاتے ہیں۔ چڑیا اور چڑے کے اوپر فرشتے اترتے ہیں۔ وہی اُن کو آ کر کہتے ہیں کہ **اَلَّا تَخَافُوۡا** (41:30) **وَ لَا تَحۡزَنۡ** (27:70) حزن نہ کرو کیونکہ **وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** (3:139) تم غالب آ ؤ گے۔ نہ گھبراؤ' نہ مایوس ہو' تم غالب آ جاؤ گے' تم آشیانہ بنا کر رہو گے۔ عزیزانِ من! اسے ایمان کہتے ہیں یعنی Inner Urge (اندرونی تقاضا) اور پھر اُس پہ استقامت سے کھڑے رہنا۔ اتنی استقامت تو چڑیا کے اندر ہوتی ہے' اُن کو کم از کم دو تین مہینے لگتے ہیں' دن میں کتنی باران کا وہ گھونسلہ اجڑتا ہے لیکن وہ پھر اُس کے اوپر بنانا شروع کر دیتے ہیں' کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ یہ ہے **وَ لَا تَہِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا** (3:139)۔

ایمان کی قوت اور جذبۂ استقامت' کامرانی کی سند ہے

مومن کو یہی ہدایت ہوتی ہے کہ مایوس نہ ہو' افسردہ خاطر نہ ہو' دلبرداشتہ نہ ہو جا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم تنکے چنتے چلے جاؤ' بناتے چلے جاؤ۔ ان کو اجاڑنے دو' یہ تھک جائیں گے' یہ ایک دن تنگ آ جائیں گے۔ کہا ہے کہ تم یہ پروگرام رکھو' یہ تمہارے راستے میں روک نہیں بن سکیں گے۔ استقامت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور ایمان کی قوت اور استقامت کا جذبہ ہوتا ہے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُنہوں نے حوصلہ ہار دیا ہو اور اِس معاملے کو چھوڑ دیا ہو۔ جہاں حوصلہ ہارا' ہمت چھوڑی تو وہیں شکست کھائی:

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

کہا کہ تمہارا یہ کام ہے کہ تم تنکے چنتے جاؤ' آشیاں بن کر رہے گا۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہم اُس ذمہ داری کو اپنے اوپر عائد کر لیتے ہیں جو درحقیقت ہماری ذمہ داری نہیں ہوتی۔ یہ جو ذرا سا احساس حضور ﷺ کے دل میں بھی ابھرا تو کہا کہ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ **وَ ادۡعُ اِلٰی رَبِّکَ** (28:87) لوگوں کو دعوت دیتے جاؤ' بلاتے چلے جاؤ۔ تمہارا کام صرف بلانا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور پہ پھیلا' انہوں نے فوجیں بھیجیں اور انہوں نے مملکتیں فتح کیں۔ عزیزانِ من! یہ سارے مسلمانوں کے کارنامے ہیں' یہ اسلام کے

نہیں ہیں۔ جس نظام کی بنیاد ہی دل کا ارادہ اور دل کا تقاضا ہو تو وہ کبھی ڈنڈے کے زور پہ استوار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس میں تو صرف وَادۡعُ اِلٰی رَبِّکَ [1] (28:87) ہے۔ کہا کہ تیری ڈیوٹی یا تیرا فریضہ صرف یہ ہے کہ عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:40) صرف اِس کو پہنچائے چلے جا۔ یہ بات کہ کب یہ گھونسلہ پورا بن جائے گا اِس کا حساب ہمارے قانون کے مطابق ہوگا اور اُس وقت یہ گھونسلہ بن جائے گا۔ تم تنکے لائے جاؤ اور رکھے جاؤ۔

کسی انسان کو بھی آئین سازی کا حق حاصل نہیں کیونکہ خدا کے ہاں یہی شرکِ عظیم ہے

اِس دعوت میں شرط یہ ہے کہ وَادۡعُ اِلٰی رَبِّکَ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (28:87) خالصتاً خدا کے احکام کی دعوت ہو' اس میں کسی اور کی آلائش نہ ہو' کوئی آمیزش نہ ہو۔ اگر قوانینِ خداوندی میں انسانی قوانین کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ شرک ہوتا ہے' اُسے خدا بنا لینا ہوتا ہے۔ اب یہ بات تو بار بار آ گئی کہ یہ شرک صرف بت پرستی کا ہی نام نہیں' بت پرستی جہالت ہے بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو یا احکام کو وہ مقام عطا کر دینا جو خدا کے قوانین کو حاصل ہے تو یہ شرک ہے۔ خدا کے قوانین ابدی ہیں' غیر متبدل ہیں۔ کسی ایک دَور کے یا کسی انسان کے بنائے ہوئے قوانین کو غیر متبدل اور ابدی قرار دینا اُسے شانِ الوہیت عطا کرنا ہے اور اِسے شرک کہتے ہیں۔ یہ جو قرآن کا نظام ہے' قرآن نے جو اصول دیئے ہیں' ان کو نافذ کرنے کے طریقے یا ان کے By laws (ضمنی قوانین)' یہ سارے اسلامی مملکت کو خود بنانے ہونگے۔ یہ کس طرح سے بنانے ہونگے؟ سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے یہ حکومت قائم کی۔ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ (3:159) اپنے رفقا کے ساتھ مشورہ کرو اور مشورے کے بعد طے کرو۔ جو بات بھی مشورے کے ساتھ طے ہوتی ہے وہ غیر متبدل اور ابدی نہیں ہوتی کیونکہ مشورہ تو بدل سکتا ہے۔ وہ ہم عصر یا Contemporary بھی بدل سکتے ہیں' مشورہ تو ایک طرف رہا۔

قانون سازی کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کردار

امامِ اعظم ابوحنیفہ کا [2] قانون سازی میں بہت بڑا مقام تھا' ان کی نگاہ بڑی دور تک جاتی تھی۔ کسی ایک معاملے میں آپؒ نے فیصلہ دیا' دوسرے نے کہا کہ صاحب! یہ جو آپ فیصلہ دے رہے ہیں یہ تو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں جو فیصلہ ہوا تھا اُس کے خلاف ہے۔ اُنہوںؒ نے کہا کہ وہ فیصلہ باہمی مشورے سے طے ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اُس مجلس میں شریک ہوتا تو میری رائے سب

---

1. تمہارے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ تم لوگوں کو خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف دعوت دیتے جاؤ۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 907)۔
2. ابوحنیفہؒ (80-150 H مطابق 699-767 AD)

سے برتر تسلیم کی جاتی۔ اب میرا یہ گناہ ہے کہ میں اُس زمانے میں کیوں نہیں تھا' میں ان کے بعد کیوں پیدا ہوا۔ اور محض اس وجہ سے کہ میں Contemporary (ہمعصر) نہیں تھا اس لیے میری رائے ناقص ہوگئی۔ اور ذرا اُن آرا سے میری آرا کو ماپ کر دیکھ لو۔ اگر یہ ان سے بہتر قرار پاتی تو حضور ﷺ اس کو تسلیم کرتے۔ جو چیز مشورے سے ہوتی ہے اُس کی حیثیت یہ ہوتی ہے اور اِسی کا نام صحیح آزادی ہے۔ حضور ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ **وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** (3:159)۔ مومنین سے کہا گیا کہ **وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38) تمہارا انظام باہمی مشاورت سے طے پائے گا۔ خدا کے احکام کسی کے مشورے کے ساتھ طے نہیں ہوئے تھے۔ جن احکام میں مشاورت شامل نہیں ہے اُنہیں خدائی مقام دیا جائے گا اور جنہیں ابدیت اور غیر متبدلیت حاصل ہوجائے گی تو کیا وہ بھی خدائی احکام ہونگے؟ خدا کے قوانین کے ساتھ' انسانوں کے خودساختہ قوانین کس طرح ملائے جاسکتے ہیں؟

ایمان کسے کہتے ہیں' شرک کیا ہے' اور کفر کیا؟

میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ کے آخر میں جو دو چار آیات آیا کرتی ہیں اُن میں تو سارا نچوڑ ہوتا ہے ''جنوں تت کڈیا ہو یا کہندے نیں''۔ [1] جو احکام پوری سورۃ کے اندر دیئے گئے ہوتے ہیں' آخر میں آ کر ان کا نچوڑ دیا جاتا ہے۔ کہا کہ **وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ** (28:88) ہمارے ہاں تو صرف یہی ہے کہ خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بلاؤ۔ خدا کے ساتھ بلانا کیا معنی ہوئے؟ یہ کچھ کسی سے کہہ دیا تو کیا ہوگیا۔ یہ تو کہنا ایک طرف رہا' ایک شخص کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور ایک کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا تو دونوں میں کیا فرق ہے۔ یہ ماننا کیا ہوتا ہے؟ کبھی آپ نے اس بات کو سوچا ہے کہ ''میں خدا کو مانتا ہوں'' کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ الفاظ ہی نہیں آنے چاہئیں' یہ غلط طرف لے جاتے ہیں۔ انسان اس سے مطمئن ہوجاتا ہے کہ وہ جو مجھ پہ خدا کے ایمان کا تقاضا تھا' وہ پورا ہوگیا یعنی جب میں نے کہہ دیا کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ ایمان یہ ہے کہ ''میں صرف خدا کے احکام کی اطاعت کرتا ہوں''۔ یہ ہے ایمان اور یہ ہے توحید۔ یہ کفر ہے کہ ''میں اُس کے احکام کو نہیں مانتا''۔ یہ شرک ہے کہ ''میں اُس کے احکام کے ساتھ کچھ انسانوں کے احکام کو بھی مانتا ہوں''۔ اگر آپ خدا کو ماننا کہنا چاہتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ ''میں صرف خدا کے احکام کو مانتا ہوں''۔ اس دور میں کون مائی کا لعل سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ میں صرف خدا کے احکام کا مطیع ہوں۔ **وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (28:87) کے یہ معنی ہیں کہ دیکھنا! ان احکام کی اطاعت میں کسی انسانی احکام وقوانین کی آمیزش نہ کر دینا۔ یاد رکھو کہ یہ جو دو قسم کی اطاعتیں ہیں' یہ بہت بڑا شرک ہے۔

---

[1] جنہیں ان کا نچوڑ کہتے ہیں۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہء حق و باطل نہ کر قبول

خدا کے احکامات کی اطاعت کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ شرک ہے' توحید نہیں ہے

قرآن نے کہا ہے کہ وَ لَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ (28:88)۔ الہ کے معنی ہی وہ ہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ دع بلانا نہیں ہے بلکہ اطاعت کرنا ہے کہ میں اُس کے سوا کسی حاکم کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وَ لَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ (28:88)۔ عزیزانِ من! ذرا ذرا سے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ان پہ وجد آ جاتا ہے۔ وَادۡعُ اِلٰی رَبِّکَ (28:87) صرف خدا کی طرف دعوت دو۔ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (28:87) کسی انسانی دعوت کو بیچ میں شریک نہ کرو۔ یہ ''شریک نہ کرو'' کہنے سے بات واضح ہو جاتی ہے' صرف مشرک کہہ دینے سے بات واضح نہیں ہوتی۔ وَ لَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ (28:88) یعنی اُس کے سوا کسی اور کی دعوت' کسی اور کو بلانے' کسی اور کے احکام کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (28:88)۔ پھر اس کی اور وضاحت کر دوں کہ اُس کے سوا کوئی اور حاکم ہے ہی نہیں۔ جو ہے نہیں تو اُس کو تم خود موجود کرتے ہو' اپنے ذہن سے تم معبود تراشتے ہو۔ فی الحقیقت وہ نہیں ہیں لیکن تم اُن کو بنا دیتے ہو۔ یہ لا الـہ کے بڑے عجیب معنی ہیں کہ درحقیقت کوئی اور ہے ہی نہیں۔ یہ نہیں ہے کہ بہت سے ہیں اور تم اُن کو نہ مانو بلکہ اُس میں سے صرف خدا کو مانو۔ حقیقت میں ان کا وجود ہی نہیں ہے' اب تم اپنے ہاں سے جس کو جی چاہے بنا لو۔ اسٹیج کے ایکٹر (اداکار) ہیں' اندر سے ایک چوکیدار کو بادشاہ بنا کر لے آ ؤ۔ اسٹیج پہ کھڑا کر دیا اور سارے جھک رہے ہیں۔

عزیزانِ من! سنتے ہیں کہ اس لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ کے معنی کیا ہیں۔ یعنی کوئی اور ہے ہی نہیں۔ یہ جتنے دنیا کے الہ بنتے ہیں اور اپنے احکام منواتے ہیں یا اپنی حکومت قائم کرتے ہیں' یہ سارے الہ بنے ہوئے ہوتے ہیں' یہ اسٹیج کے ایکٹر (اداکار) ہوتے ہیں۔ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (28:88) یعنی یہ نہیں ہے کہ میرے یا آپ کے ایمان پہ منحصر ہے کہ ہم نے اگر کسی کو الہ بنا لیا۔ وہ تو لا الہ والی بات ختم ہو گئی کہ ہم نے کہا کہ ہے ہی یہ الہ۔ یہ میرے یا آپ کے بنانے کی بات نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی اور ہے ہی نہیں۔ آگے جو فقرہ ہے اُس کے ہمارے ہاں جو عام ترجمے اور مفہوم ہیں وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کے چھوٹے چھوٹے نسخے ہی اپنے ساتھ لے آیا کریں' سامنے رکھیں تو بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ اُس وقت دو صلاحیتیں کام کرتی ہیں: کان بھی سنتے ہیں اور آنکھیں بھی دیکھتی ہیں جبکہ اِس وقت صرف آپ کے کان سن رہے ہیں۔

مروجہ غلط تراجم کی ایک مثال لفظ ''فان'' یا ''ھالک'' کا غیر قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (28:88)۔ ہمارے ہاں اس کے ترجمے یہ ہوتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے ایک دن ختم ہو جانے والی ہے سوائے خدا کی ذات کے۔ وہ جو مولوی بیچارہ کہتا ہے کہ قرآن میں ربط نہیں ہے تو وہ سچا ہے۔ اس ترجمے سے' اس ذہنیت سے' کہاں ربط رہتا ہے۔ یہ ساری کائنات ایک دن ختم ہو جانی ہے تو ہمیں یا آپ کو اس سے کیا۔ جس دن ہم ختم ہو گئے تو ہمارے لیے کائنات ختم ہو گئی۔ یعنی یہ جو چیز ہے' اس کا اثر مجھ پہ اور میری سیرت اور ایمان پہ کیا ہے کہ کسی ایک دن کروڑوں سال کے بعد یہ زمین آسمان نہیں رہنا۔ اس سے میرا کیا بگڑتا ہے کہ اُس نے نہیں رہنا۔ اور آپ سوچیے کہ یہاں کس مقام پہ یہ بات کہی گئی ہے۔ وہ بیچارے ٹھیک کہتے ہیں کہ اِس میں ربط نہیں ہے کہ بات چلی آ رہی ہے کہ شرک نہ کرنا اور وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (28:88) اور اُس کے بعد کہنا کہ یاد رکھو! ایک دن زمین و آسمان نہیں رہے گا۔ تو لا اله الا هو ہم نے یہ بنا لیا کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بیچ میں یہ آیت آ گئی کہ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (28:88) اور آگے ہے کہ لَهُ الْحُكْمُ (28:88) حکومت صرف اُس کی ہے۔ تو اِسی نے ساری بات واضح کر دی۔ قرآن میں دو جگہ اسی مضمون کی آیات آئی ہیں۔ ایک یہ کہ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (28:88) اور دوسری جگہ سورۃ رحمٰن میں ہے کہ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (55:26-27)۔ اُس کا بھی یہی ترجمہ کیا کہ اِس زمین پر یا کائنات میں جو شے بھی ہے وہ فنا ہو جانے والی ہے اور صرف خدا کی ذات باقی رہے گی۔

عزیزانِ من! یہ بڑی اہم آیات ہیں انہیں غور سے سن رکھیے' کبھی یہ مفہوم کام آ جائیں گے۔ یہ پورا سلسلہء کائنات خدا کی تخلیق ہے' اُس کا پیدا کردہ ہے۔ خدا کی طرح یہ ابدی تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ایک دن ختم ہونا ہے۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (39:5) جو چل رہا ہے' یہ ایک معینہ مدت تک کے لیے ہی چل رہا ہے' اُس کے بعد نہیں رہے گا۔ یہ بات تو حقیقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو مقامات ہیں کہ ہر شے یہاں کی ختم ہونے والی یا فانی ہے یا ہلاکت آمیز ہے سوائے خدا کی ذات کے تو اِس کا تعلق ہمارے ایمان' سیرت' کردار' نظریہ اور نظام سے کیا ہے۔ ان مقامات میں یہ آیت کیوں لائی گئی ہے۔ آیت تو صحیح لائی گئی ہے لیکن اس کا ترجمہ اور مفہوم ہی غلط کیا گیا ہے۔

''فان'' اور ''ھالک'' کے معنی معدوم ہونے کے بجائے تغیر رونما ہونے کے ہیں

یہ جو لفظ فان یا ھالک ہے تو ہمارے ہاں تو یہ فنا ہوتا ہے کہ بس جو چیز ختم ہو جاتی ہے وہ فنا ہو گئی۔ اسی طرح سے ہلاکت بھی اُس

وقت ہی بولتے ہیں جب کوئی چیز ختم ہوجاتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو ابتدائی عربی جاننے والے ہیں' وہ یہ جانتے ہونگے کہ یہ اسمِ فاعل ہے لہٰذا ھالک اور فان کے معنی یہ نہیں کہ کسی وقت میں جا کر ایسا ہوگا۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ مستقبل میں ایسا ہوگا کہ یہ ایک دن فنا ہوجائے گی' یہ ایک دن ہلاک ہوجائے گی۔ مثال کے طور پہ خدا نے جو قرآن میں کہا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (2:30) میں زمین میں ایک صاحبِ اختیار بھیج رہا ہوں۔ یہاں جاعل جو اسم فاعل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں بھیجونگا۔ یہ میں نے آپ کو مثال دی ہے کہ یہ جو عربی زبان میں اس طرح سے اسمِ فاعل آتے ہیں تو اُس کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ مستقبل میں یہ کچھ ہوگا بلکہ وہ اُس وقت کر رہا ہوتا ہے۔ فان اور ھالک کے معنی یہ ہیں کہ یہ سارا کچھ اس وقت ہو رہا ہے۔ پہلی چیز یہ سمجھ رکھیے کہ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اب آیئے اس فان اور ھالک کی طرف۔ فنا کے معنی معدوم ہونے والی یا ختم ہوجانے والی چیز نہیں ہوتا بلکہ عربی زبان میں فنا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''کسی چیز میں تغیر رونما ہو رہا ہو''۔ اور اِس کے مقابل میں لفظ بقا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ''کسی چیز میں تغیر نہ ہو''۔ ہلاکت کے معنی یہ ہیں کہ ''کسی چیز کی قوت کمزور پڑتی چلی جائے' جو اپنی قوت برقرار نہ رکھے بلکہ تغیر پذیر ہوتی جائے''۔ اب بات سامنے آئی۔

خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مقابلے میں انسانی قانون ہمیشہ تغیر پذیر واقع ہوا ہے

اِلَّا وَجْهَهٗ (28:88) کہا ہے۔ وجھہ کے معنی ہوتا ہے ''خدا کی ذات''۔ ویسے تو وجھہ کے معنی چہرہ بھی لیا جاتا ہے کہ جو چیز سامنے ہو۔ عزیزانِ من! یہ قرآن بڑی عجیب چیز ہے' اب میں کیا عرض کروں۔ وجھہ کے معنی ہوتے ہیں ''وہ راستہ' وہ طریق' وہ ذریعہ جو انسان کو کسی منزل کی طرف لے جا رہا ہو''۔ وجھہ خدا کے لیے ہے کہ وہ راستہ' وہ طریق' وہ ذریعہ جو انسان کو کسی منزل کی طرف لے جا رہا ہو جو خدا نے مقرر کی ہوئی ہے۔ سنیے کہ بات کیا ہوئی؟ یہ کہ اُس کے سوا کسی کی حکومت ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔ اس لیے کہ انسان کا بنایا ہوا کوئی قانون یا کوئی حکم ہو ہمیشہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔ کونسا قانون تغیر پذیر نہیں ہوتا؟ اِلَّا وَجْهَهٗ (28:88) وہ قانون' وہ طریق' وہ پروگرام' جو خدا کی طرف لے جانے والی منزل کے لیے ہوتا ہے' وہ تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ اس لیے اُس کی اطاعت کرو۔ قرآن تو ہر حکم کے لیے Reason (وجہ) ساتھ دیتا ہے کہ خدا کے احکام کی اطاعت کیوں کرو؟ اس لیے کہ وہ غیر متبدل ہے۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) اللہ کے کلام میں تبدیلی نہیں ہے' یہ غیر متبدل ہے۔ وَ لَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (28:87) اُس میں انسان کے قانون کی ذراسی آمیزش بھی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ تغیر پذیر ہے اور خدا کا قانون غیر متبدل ہے دونوں کیسے مل سکتے ہیں' اس لیے وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (28:88) اُس کے سوا کسی اور کو حاکم تصور نہ کرو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (28:88) دنیا میں اُس کے سوا کوئی حقِ حکومت رکھنے والا موجود ہی نہیں ہے۔ کیوں موجود نہیں ہے؟ اس لیے کہ کُلُّ

شَـیْءٍ هَـالِکٌ اِلَّا وَجْهَـهٗ (28:88) کسی کا بھی بنایا ہوا کوئی قانون' کوئی قاعدہ یا کوئی پروگرام ہوگا تو وہ تغیر پذیر ہوگا۔ اِلَّا وَجْهَـهٗ (28:88) غیر متغیر' صرف وہ قانون' وہ راستہ ہوگا جو اُس کی بتائی ہوئی منزل کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس لیے اُس کی اطاعت کرو۔ یہ جن میں ہر آن تغیر آتا رہتا ہے تو ان کی اطاعت کے کیا معنی!!

توحید کی خصوصیت' عظمت اور منفعت

اب آپ کہیں گے کہ یہ بات کچھ نظری سی ہے' اس کا عملی زندگی پہ کیا اثر پڑتا ہے۔ عزیزانِ من! توحید کا تو اتنا بڑا اثر پڑتا ہے۔ آپ کے سامنے ایک کتاب کے اندر نہایت واضح انداز میں قوانین دیدیئے گئے ہوں۔ کہہ دیا گیا کہ اِن کو سمجھ سوچ کر دیکھو۔ اگر جی میں آتا ہے تو کہو کہ ہم اِس کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ یہ ہوگا اُس کی محکومیت اختیار کرلینا۔ اگلی بات یہ ہے کہ جو شے غیر متبدل ہے اُس میں کیسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ یہاں اپنی تو ایک طرف رہا امریکہ کی حکومت کا صدر بدلتا ہے تو یہاں کپکپی شروع ہو جاتی ہے کہ پتہ نہیں اب اُس کی کیا پالیسی ہو اور اُس کا ہم پہ کتنا بڑا اثر ہو۔ ہر حکومت کے بدلنے کے بعد دل دھڑکنے لگ جاتے ہیں کہ پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایران میں کیا ہو رہا ہے۔ ہر حکومت بدلنے کے بعد وہ اِس قسم کی ظلم وستم کی چیزیں نہ بھی ہوں' قانون سازی ہی کیوں نہ ہو' جس دن بھی پارلیمان میں ایک کی اکثریت دوسری طرف چلی جاتی ہے تو پہلا قانون بدل جاتا ہے' ایک کا بنایا ہوا قانون کتنا ہی قابلِ اطمینان کیوں نہ ہو۔ جب یہ چیز ہو کہ دوسرا اِسے بدل سکتا ہے تو اُس میں اطمینان نہیں رہتا۔ آج تو انہوں نے کہا ہے کہ ہم Industrialize (صنعتکاری) نہیں کریں گے' اعتبار کیجیے۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ اگر یہ نہ بھی بدلیں تو دوسری حکومت آجائے گی وہ اِس کو بدل دے گی۔ جو ہزار ہزار کے نوٹ تھے وہ بیک جنبشِ قلم سارے کے سارے کاغذ کے ٹکڑے رہ گئے تھے۔ اب ہر ایک کا دل دھڑکتا ہے کہ پتہ نہیں کس وقت بدل دیں گے۔ عزیزانِ من! انسانوں کا بنایا ہوا کوئی بھی قانون ہوگا تو اُس میں تو یہ چیز ہوگی کہ وہ بدلا جاسکتا ہے۔ آپ کو وہ یقینی اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اگر یہ ہو کہ یہ ہیں وہ قوانین جن کو میں نہ برضا ورغبت لایا ہوں' میں نے ان کی محکومیت اختیار کی ہے' اور حکومتیں آئیں اور حکومتیں جائیں انہیں کوئی نہیں بدل سکتا۔ اس سے آپ کو کتنا بڑا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

وحی انسان کو اطمینانِ قلب کی نعمت سے نوازتی ہے

قرآن بتاتا ہے کہ یاد رکھو کہ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (13:28) صحیح اطمینانِ قلب صرف خدا کے قوانین سے حاصل ہوسکتا ہے' جن کے متعلق پتہ ہے کہ اِن کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ سب سے زیادہ نقصان رساں وہ دوست' وہ رفیق ہوتا ہے جس کے متعلق یہ ہو کہ صاحب! اِس کی بات کا اعتبار ہی کچھ نہیں ہے' یہ آج کچھ کہہ رہا ہے' کل کچھ کہہ دے گا۔ یہ چیز کہ کسی کے متعلق اطمینان ہو کہ

صاحب! وہ بات کا بڑا پکا ہے' یعنی انسانیت کی سطح کے اوپر بھی جب یہ بات ہو کہ اُس نے جب وعدہ کر لیا ہے تو نہیں پھرے گا۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ اللہ اپنے وعدوں سے کبھی نہیں پھرا کرتا' وہ وعدے یہی ہیں۔ اگر کسی قانون یا کسی نظام کے متعلق معلوم ہو کہ انسان آئیں یا انسان جائیں' یہ نہیں بدلا جا سکتا تو یہ بڑی چیز ہے۔ اب روز یہ چیز سننے میں آتی ہے کہ فلاں قانون کو بدل دیا جائے گا۔ یہ جو بدل دیا جائے گا کی صورت ہے تو اِس سے دل دھڑکنے شروع ہو جاتے ہیں کہ پتہ نہیں اِس کی جگہ کیا نیا ہو گا لیکن جس محکومیت یا جس حکومت کے متعلق یہ ہو کہ یہ اُس نے کہہ دیا ہے کہ **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ** (28:88) ہر شے بدل سکتی ہے لیکن **اِلَّا وَجْهَهٗ** (28:88) اُس کا بنایا ہوا قانون نہیں بدل سکتا۔ کہا کہ **لَهُ الْحُكْمُ** (28:88) بتاؤ کہ اِس کو جچتا ہے کہ وہ حاکم بنے:

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اور وہ ''آزر'' تو پھر بھی پتھر سے بنایا جاتا تھا لیکن ہمارے دور میں تو یہ برف کے تودے ہیں اور وہ بنتے ہیں۔ ذرا سا سورج چمکے تو خود ہی پگھل جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہونے کے باعث اسے علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کیا جاتا ہے

عزیزانِ من! دیکھیے کہ ان آیات کے اندر کتنا ربط ہے! **وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ** (28:87-88) اور اُس کے بعد ہے کہ **وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ** (28:88) تو پھر وہی ایسا ہے جس کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن زبردستی نہیں منوا رہا۔ خدا جیسا احکم الحاکمین جب قانون دیتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ یہ ہمارا حکم ہے اس لیے ماننا پڑے گا بلکہ جو حکم دیتا ہے اُس کی وجہ سمجھاتا ہے' Reason (وجہ) سمجھاتا ہے' یہ کہہ کر Rationally (عقل و فکر سے) واضح کرتا ہے کہ **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ** (28:88) اس لیے کہتا ہے کہ **لَهُ الْحُكْمُ** (28:88). یہ بات ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ حکومت صرف اُسی کی ہونی چاہیے۔ **وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ** (28:88) تو ٹھیک بات ہے اُسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جہاں جہاں جن جن راستوں پہ تم چل رہے ہو اُن کو چھوڑو' پلٹ کر اِس راستے کی طرف آؤ۔ قرآن یوں منواتا ہے۔

حقیقت ہمیشہ اپنے زورِ دروں سے اپنے آپ کو منوا لیتی ہے شرط صرف غور و فکر اور استقامت کی ہے

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے' مانی نہیں جاتی۔ ایمان اِس کو کہتے ہیں۔ اُن سے منوا لے گا جو **لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ** (16:11) غور و فکر

سے کام لیں گے۔ جو چیز غور و فکر سے روبہ عمل ہوگی تو اُسے وہی مانے گا جو غور و فکر سے کام لے گا۔ یہ نہیں کرے گا تو پھر وہ وہی ہوگا جو کہے گا کہ جی! میں خدا کو مانتا ہوں اور بس۔ عزیزانِ من! گھر جائیے گا اور یہ آیات نکالیے گا اور پھر دیکھیے گا جو میں نے کہا تھا کہ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے مجھ سے کہا تھا کہ ''اک دن اقبال دے شعروی بے سوادے ہو جان گے''[1] تو میں نے پوچھا تھا کہ کس دن؟ اُنہوںؒ نے کہا تھا کہ جس دن قرآن سمجھ میں آنے لگ جائے گا' کس قدر صحیح ہے! یہ بڑی عجیب جاذب کتاب ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القصص یہاں ختم ہوگئی۔ کہا ہے کہ یہ ہے انسانوں کے ہر بنائے ہوئے نظام سے کفر برتنا' انکار کرنا' سرکشی کرنا۔ اور صرف اُس ایک کے احکام و قوانین کے سامنے جھکنا' صرف اُس کی اطاعت اختیار کرنا۔ یہ اس لیے کہا تھا کہ تم نے موسیٰ کی داستان تو سن لی کہ اس میں اتنی بڑی کشمکش تھی۔ اور اب ہم جو ورق پلٹتے ہیں تو اگلی سورۃ جو ہمارے سامنے آتی ہے' وہ العنکبوت ہے۔ عنکبوت کا نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے جتنے بھی قوانین اور نظام ہیں' یہ مکڑی کے جالے کی طرح ہیں۔ یہ اپنے سے کمزور جو مکھی ہے اُس کو پھنسا لیتے ہیں لیکن جو ذرا اپنے سے طاقتور ہو' وہ اُس کی پھونک کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کی تفصیل ہم سورۃ العنکبوت میں دیکھیں گے۔[2]

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀............❀❀............❀❀

---

1. ایک دن آئے گا کہ اقبالؒ کے اشعار بھی بے مزہ ہو جائیں گے۔
2. مارچ 1979 کی 16 تاریخ کے اس درس میں سورۃ العنکبوت کی بھی ابتدا کر دی گئی تھی۔ اس کے لیے سورۃ العنکبوت دیکھیے۔

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)